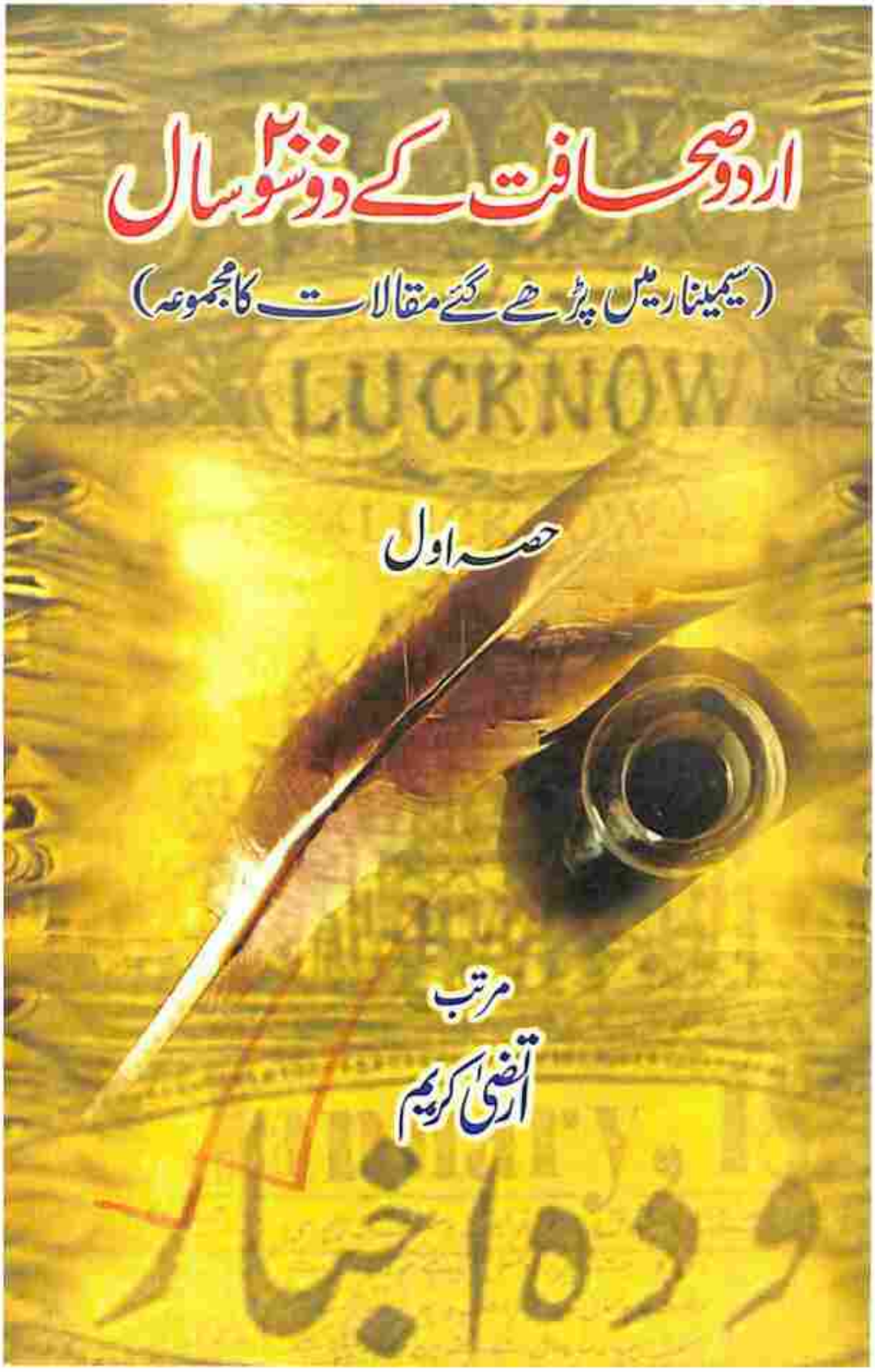
اردو صحافت کے دو سو سال
(سیمینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ)
LUCKNOW
حصہ اول
مرتب
ارتضیٰ کریم
روزنامہ

اردو صحافت کے دو سو سال

(سیمینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ)

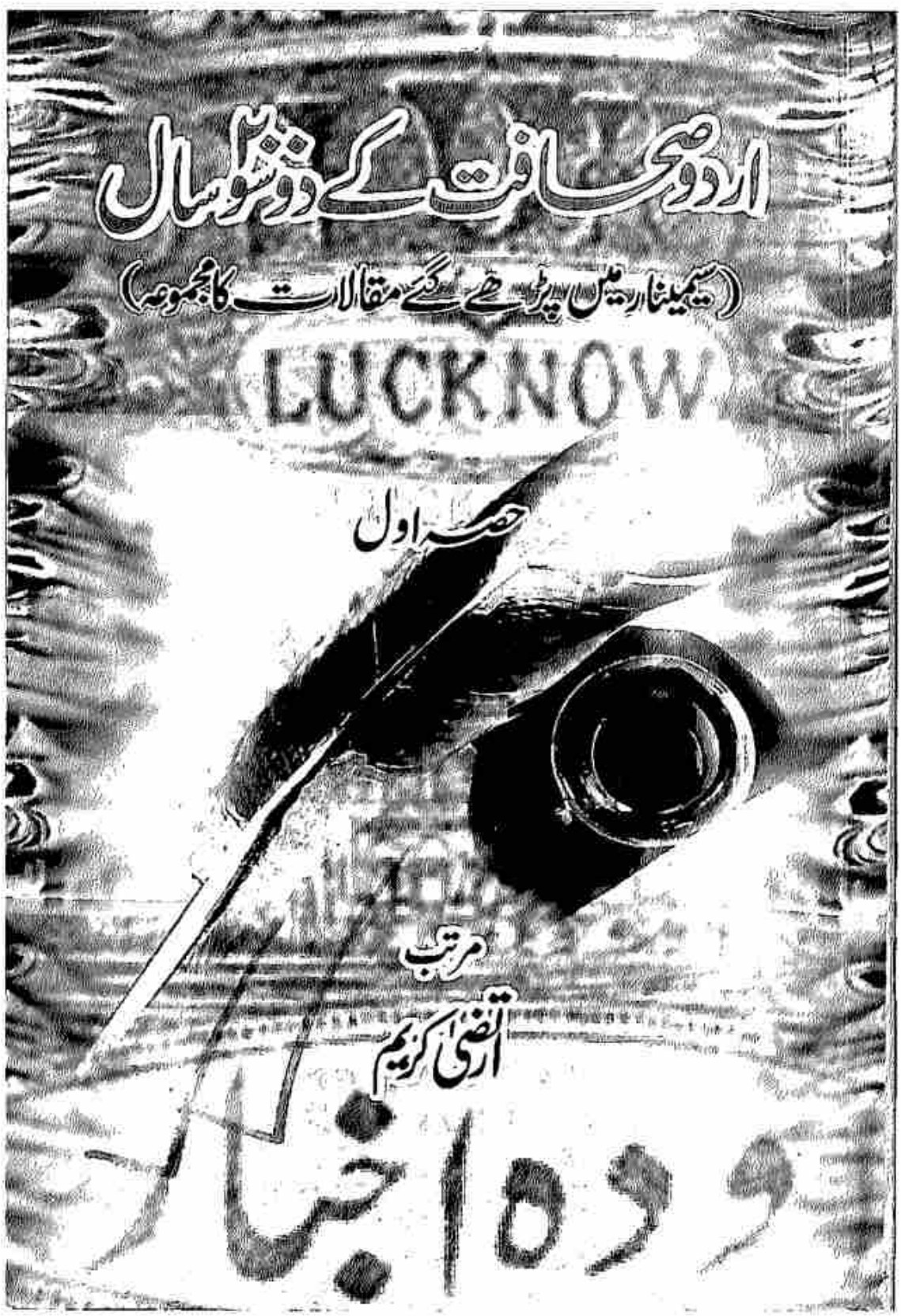

حصہ اول

مرتب

ارتضیٰ کریم

اردو صحافت کے دو سو سال

(سمینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ)

حصہ اوّل

مرتب
ارتضیٰ کریم

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	2017
تعداد	:	550
قیمت	:	-/435روپے فی سیٹ
سلسلۂ مطبوعات	:	1943

Urdu Sahafat Ke Do Sau Saal (Part-I)

Compiler: **Irteza Karim**

ISBN for Set :978-93-5160-184-5

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025 فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066 فون نمبر: 26109746

فیکس: 26108159 ای۔ میل: ncpulsaleunit@gmail.com

ای۔ میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس، D-31، ایس ایم اے انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔ 110033

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, Natural Color کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

اردو صحافت نے اپنے دو سو سالہ سفر میں بہت سی صعوبتیں سہی ہیں، نشیب و فراز دیکھے ہیں، پابندی، ضبطی اور ضمانت کی سزائیں جھیلی ہیں مگر صحافت کے پایہ استقامت میں لرزش نہیں آئی۔ انیسویں صدی سے اکیسویں صدی تک اردو صحافت کا سفر تسلسل اور تواتر کے ساتھ جاری ہے اور اب نئے عہد میں جدید ترین تکنیکی وسائل اور آلات کی وجہ سے اردو صحافت انقلابی تبدیلیوں کی نئی تاریخ اور کامرانی کی نئی عبارت لکھ رہی ہے۔

محققین کے مطابق اردو صحافت کا آغاز 27 مارچ 1822 کو ہفت روزہ 'جامِ جہاں نما' کلکتہ سے ہوا۔ جس کے مالک ہری ہردت اور مدیر منشی سدا سکھ رائے تھے۔ اس اخبار کو کمپنی سرکار کی سرپرستی حاصل تھی۔ یہ بنیادی طور پر فارسی کا اخبار تھا اور اس میں اردو کی حیثیت ایک ضمیمے کی سی تھی۔ کچھ محققین کا یہ بھی خیال ہے کہ 1794 میں شائع ہونے والا ٹیپو سلطان کا ہفت روزہ 'فوجی اخبار' اردو کا اولین اخبار ہے اور ایک تحقیق یہ بھی ہے کہ ہندوستانی پریس کلکتہ سے شائع ہونے والا مولوی اکرام علی کا اخبار 'اردو اخبار' اردو کا پہلا اخبار ہے جو 1810 میں شائع ہوا۔ ان تحقیقات کی روشنی میں دیکھا جائے تو اردو صحافت کی تاریخ 200 سال سے کچھ آگے بڑھ جاتی ہے۔

اردو صحافت کے آغاز کی کوئی حتمی تاریخ نہیں ہے اس لیے قطعیت کے ساتھ کسی سنہ کا تعین مشکل ہے۔ پھر بھی قیاسی تاریخ کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو صحافت نے دو سو سالہ

مدت میں تیزی کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کی ہیں اور تہذیب وتمدن، ثقافت اور سماجی قدروں کی عکاسی اور اپنے عہد کی تاریخ مرتب کی ہے۔

اردو صحافت کو ہم مختلف ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں:

1810 سے 1857 کی صحافت کا جائزہ لینے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں اردو اخبارات کی خاصی تعداد تھی۔ ان میں 'سید الاخبار' دہلی، 'اسعد الاخبار' آگرہ، 'زبدۃ الاخبار' آگرہ، 'کوہ نور' لاہور، 'عمدۃ الاخبار' بریلی، 'صدر الاخبار' آگرہ، 'کریم الاخبار' دہلی، 'طلسم لکھنؤ' اور 'صادق الاخبار' دہلی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان اخبارات میں بھی 'دہلی اردو اخبار' کو اہمیت حاصل ہے کہ اس کے مدیر مولوی محمد باقر تھے جنھیں انگریزوں کی مخالفت کی پاداش میں جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ وہ اردو کے پہلے شہید صحافی ہیں۔ مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی باقر دلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ صحافت میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ 'دہلی اردو اخبار' کو آج بھی صحافت میں ایک مینارۂ نور کی حیثیت حاصل ہے۔ سرسید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں نے 1838 میں 'سید الاخبار' نکالا جو اردو کا ایک بڑا اخبار تھا۔ 1852 میں 'فوائد الناظرین' اور 'قران السعدین' جیسے اخبارات شائع ہوئے جس کے مدیر ماسٹر رام چندر تھے۔ اسی دور کے اخبار میں 'کوہ نور' لاہور بھی ہے جو ہر سکھ لال کی ادارت میں 1850 سے شائع ہو رہا تھا۔ یہ عوام کا مقبول اخبار تھا اور تحریک آزادی کا علمبردار۔ 1823 سے 1857 تک ہندوستان کے مختلف علاقوں سے اردو اخبارات شائع ہوتے رہے جن میں سب سے زیادہ اخبارات آگرہ سے شائع ہوئے۔ نئی تحقیق کے مطابق مدراس سے تقریباً 16 اردو اخبارات شائع ہوئے جن میں 1841 میں شائع ہونے والا ہفت روزہ 'جامع الاخبار' مدراس کا پہلا اخبار ہے جس کے مدیر سید رحمت اللہ تھے۔ اس کے علاوہ 1848 میں اعظم الاخبار، 1849 میں آفتاب عالم تاب، رئیس الاخبار، تیسیر الاخبار، عمدۃ الاخبار، 1850 میں مخزن الاخبار، 1851 میں تعلیم الاخبار، نعیم الاخبار، 1853 میں امیر الاخبار، 1854 میں مرآۃ الاخبار، قاصد الاخبار، صبح صادق، 1856 میں طلسم حیرت، مظہر الاخبار اور 1857 میں خلاصۃ الاخبار شائع ہوتے رہے۔

پنجاب سے اس دوران جن اخبارات کی اشاعت عمل میں آئی ان اخبارات نے قومی جذبات

اور احساسات میں انقلابی روح پھونکی اور حکومت انگلشیہ کے خلاف جذبات کو بیدار کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

1857 سے 1900 تک بہت سے اخبارات شائع ہوئے جن میں اردو کا اولین اردو روزنامہ 'اردو گائیڈ' ہے جو 1858 میں مولوی کبیر الدین احمد خاں کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ 'اکمل الاخبار' ایک اہم اخبار تھا جو 1886 میں جاری ہوا۔ اس کے روح رواں حکیم محمود احمد خان تھے۔ یہ ایسا اخبار تھا جس سے مرزا غالب کو بھی دلچسپی تھی۔ منشی میاں داد خاں سیاح اور بہاری لال مشتاق کو لکھے گئے خطوط سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ 1871 میں 'اخبار عام' جاری ہوا جس کی روزانہ اشاعت 1893 میں دو ہزار سے زیادہ تھی۔ یہ مقبول اخبار تھا۔ سوم آنند نے لکھا ہے کہ "جب لاہور کا مشہور انگریزی اخبار 'سول اینڈ ملٹری گزٹ' صرف سو دو سو چھپتا تھا تو اس کی روزانہ اشاعت دو ہزار سے بھی زیادہ تھی۔"

اسی دور میں منشی نولکشور کی ادارت میں ہفت روزہ اودھ اخبار لکھنؤ سے جاری ہوا جو 1874 میں روزنامے کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ اردو کا ایک مکمل اور مقبول ترین اخبار تھا جس میں تمام طرح کے موضوعات اور مضامین کا احاطہ کیا جاتا تھا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کا 'فسانۂ آزاد' بھی اسی میں قسط وار شائع ہوا۔ 1877 میں منشی سجاد حسین کا 'اودھ پنچ' بھی ایک مقبول اخبار تھا۔ ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار اس اخبار نے بھی صحافتی دنیا میں اپنا نقش چھوڑا ہے اور آج بھی اس اخبار کے حوالے سے تحقیقی مضامین اور مقالے لکھے جاتے ہیں۔ 1866 میں شائع ہونے والے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے بھی صحافت کو نئی سمت اور نئی رفتار دی۔ لاہور کے 'پیسہ اخبار' کا شمار بھی اس دور کے اہم اخباروں میں ہوتا ہے۔ یہ 1887 سے شائع ہونا شروع ہوا۔ پیسہ اخبار نے صحافت کو ایک معیار و وقار عطا کیا۔ قیمت کم ہونے کی وجہ سے یہ اخبار عوام میں بہت مقبول تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس دور میں بہت سے اخبارات شائع ہوتے رہے۔

1901 سے 1947 کے دور کو اردو صحافت کا عہد زریں کہا جا سکتا ہے۔ اس دور میں بڑے اہم اخبارات شائع ہوئے جن میں 'زمیندار' لاہور، 'اردوئے معلیٰ' علی گڑھ، 'الہلال' کلکتہ، 'ہمدرد' دہلی، 'مدینہ' بجنور، ہفت روزہ 'سچ' لکھنؤ، 'الجمعیۃ' دہلی، 'الہند' کلکتہ، 'پرتاپ' لاہور، 'ملاپ' لاہور،

'انقلاب' ممبئی، 'عصر جدید' کلکتہ، 'آزاد ہند' کلکتہ، 'پاسبان' بنگلور، روزنامہ 'روشنی' سری نگر، روزنامہ 'خدمت' سری نگر، روزنامہ 'مسلمان' مدراس، روزنامہ 'اتحاد' پٹنہ، روزنامہ 'ندیم' بھوپال، روزنامہ 'ہندوستان' ممبئی اہم ہیں۔ ہفت روزہ 'زمیندار' لاہور 1903 میں منشی سراج الدین احمد خان نے کرم آباد سے شائع کیا تھا۔ ان کے صاحب زادے مولانا ظفر علی خان نے اسے روزنامے کی شکل دی۔ یہ تحریک آزادی کا حامی اخبار تھا اسی وجہ سے اس اخبار کی ضمانتیں بار بار ضبط ہوتی رہیں اور ادارتی عملے کو بھی قید و بند کی مشقتیں جھیلنی پڑیں۔ اس اخبار کی روزانہ اشاعت 30000 تیس ہزار تھی۔ مولانا حسرت موہانی کے 'اردوئے معلیٰ' کی اشاعت کا آغاز بھی 1903 میں ہی ہوا۔ اس اخبار میں مولانا عصری مسائل، سماجیات، ادب کے علاوہ صحت عامہ اور کھیل کے صفحات بھی شامل کیا کرتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار 'الہلال' کا اجرا 13 جولائی 1912 کو کلکتہ سے ہوا۔ یہ اپنے عہد کا بہت ہی مقبول اخبار تھا۔ اس وقت اس کی اشاعت 26000 کے قریب تھی۔ 'الہلال' نے اردو صحافت کو ایک اعلیٰ معیار عطا کیا۔ حکومت مخالف سرگرمیوں کی وجہ سے اس اخبار پر بھی قیامتیں ٹوٹتی رہیں۔ حکومت برطانیہ بھی اس اخبار سے گھبراتی تھی اور بار بار ضمانتیں طلب کرتی تھی۔ یہ اخبار بھی تعطل کا شکار رہا۔ گیارہ سال کے بعد 10 جون 1927 کو اس کا دوبارہ اجرا ہوا اور 9 دسمبر 1927 کو ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ اسی دوران مولانا ابوالکلام آزاد نے 'البلاغ' کے نام سے ایک اخبار 12 نومبر 1915 کو جاری کیا۔ ان دونوں اخبارات نے اردو صحافت میں جو نقوش قائم کیے ہیں وہ ہمیشہ تابندہ رہیں گے۔ مولانا محمد علی جوہر نے یکم جون 1913 کو 'ہمدرد' کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ یہ اردو کا واحد اخبار تھا جس نے راشٹر اور ایسوسی ایٹڈ پریس کی خدمات حاصل کی تھیں۔ یہ ایک سنجیدہ اور برطانیہ مخالف اخبار تھا۔ پچیس ہزار کے قریب اس کی اشاعت تھی۔ 'ہمدرد' بھی 9 سال تک بند رہا۔ اس کا دوبارہ اجرا 9 نومبر 1924 کو ہوا اور 12 مئی 1929 کو ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ ہمدرد نے اردو صحافت کو ایک نیا مزاج اور [illegible] صحافت کی تاریخ اور تنقید میں 'ہمدرد' کی حیثیت مسلم ہے۔ [illegible] جاری ہے۔ 'مدینہ' (بجنور) بھی ایک ایسا اخبار ہے جس کا سلسلہ بہت دیر [illegible]

تھے۔ یہ اخبار برطانیہ مخالف تھا اور عوام میں بہت مقبول بھی۔ 1940 تک آتے آتے اس کی اشاعت ایک لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ یہ اخبار اتنا انقلابی تھا کہ انگریز حکومت نے پنجاب میں اس کے داخلے پر پابندی لگادی۔ اس اخبار سے بڑے ذی علم اور اہل قلم حضرات وابستہ تھے جن میں آغا رفیق بلند شہری، امین احسن اصلاحی، نصر اللہ خاں عزیز، حامد الانصاری غازی، ابوسعید بزمی اہم ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کا ہفت روزہ 'سچ' بھی جنوری 1925 سے شائع ہونا شروع ہوا۔ یہ اخبار ہندو مسلم اتحاد کا حامی اور اسم بامسمیٰ تھا۔ اس نے ہمیشہ ہی سچ لکھا۔ ہفت روزہ 'سچ' بھی اپنی صحافتی اہمیت اور معنویت کی وجہ سے آج صحافتی تحقیق کے حوالوں میں شامل ہے۔ اس اخبار نے بھی اردو صحافت کے معیار و وقار کو بلند کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسی دور میں 'جنگ' دہلی، 'ہمدائے عام' پٹنہ، 'پربھات' لاہور، 'اجیت' لدھیانہ، 'قومی آواز' لکھنؤ، 'نوائے وقت' لاہور اور 'انقلاب' ممبئی جیسے اخبارات شائع ہوئے جن میں قومی آواز کو اس اعتبار سے اہمیت حاصل ہے کہ اس نے اردو صحافت کو نئی بلندی عطا کی اور حیات اللہ انصاری کی ادارت نے صحافت کو نئے رنگ و روپ سے روشناس کرایا۔ 'قومی آواز' اپنی معیاری زبان اور مضامین کی وجہ سے آج بھی ایک مثال اور نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ بہت سی نئی صحافتی اصطلاحات اور لفظیات، قومی آواز نے وضع کیں جو آج صحافت میں رائج ہیں۔ انقلاب ممبئی کا شمار بھی اردو کے اہم اور مقبول ترین اخباروں میں ہوتا ہے۔ اس کی اشاعت کا آغاز 1938 سے ہوا۔ مولوی عبدالحمید انصاری اس کے بانی مدیر تھے اور اس کی ادارت سے فضیل جعفری، خالد انصاری، ہارون رشید عیگ، حسن کمال جیسے نامور صحافی وابستہ رہے ہیں۔ اب یہ اخبار دہلی اور دیگر شہروں سے بھی شائع ہوتا ہے۔ جنگ کا شمار بھی اہم اخبارات میں ہوتا ہے جو دہلی سے 1942 میں نکلنا شروع ہوا۔ اس کے مدیر خلیل الرحمن تھے اب یہ اخبار پاکستان کے اہم اخبارات میں سے ایک ہے جو امریکہ اور دیگر علاقوں سے بھی شائع ہوتا ہے۔ یہاں تعمیل ناؤو کا ذکر بھی ضروری ہے جو 1927 سے پابندی سے شائع ہورہا ہے۔ یہ تعمیل ناؤو کا واحد اردو روزنامہ ہے جو نامساعد حالات کے باوجود نکل رہا ہے۔

1947 سے 1990 تک بہت سے اہم اخبارات شائع ہوئے جن میں ہند سماچار، [illegible] 'عکاس' کلکتہ، 'اخبار مشرق'

کولکاتا' 'عزائم' لکھنؤ، روزنامہ 'ساتھی' پٹنہ، روزنامہ 'سنگم' پٹنہ، 'قومی تنظیم' پٹنہ، 'عظیم آباد ایکسپریس'، روزنامہ 'ایثار' پٹنہ، 'فاروقی تنظیم' پٹنہ، روزنامہ 'پندار' پٹنہ، اردو ایکشن' بھوپال، 'اردو ٹائمز' ممبئی، ہفت روزہ 'اخبار عالم' ممبئی وغیرہ اہم ہیں۔ ہند سماچار کا آغاز جالندھر سے 4 مئی 1948 کو ہوا۔ اس کے ایڈیٹر لالہ جگت نارائن تھے۔ 1949 میں اس کی اشاعت 1800 تھی اور 1965 میں سات ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ سیاست حیدرآباد سے 15 اگست 1949 میں نکلنا شروع ہوا۔ میر عابد علی خان اور محبوب حسین جگر کی ادارت میں اس اخبار نے کامیابی کی نئی منزلیں طے کیں۔ یہ آج بھی حیدرآباد کے اہم اخباروں میں شمار کیا جاتا ہے اور اس کے ایڈیشن مشرق وسطیٰ سے بھی شائع ہوتے ہیں۔ روزنامہ سالار کرناٹک کا ایک بڑا اخبار ہے۔ جس کے بانی مدیر 'سوغات' کے مدیر ناموَر ناقد محمود ایاز تھے۔ انھوں نے 2 فروری 1984 کو اس اخبار کی اشاعت کا آغاز کیا جو اس وقت کرناٹک کا مقبول ترین اخبار ہے۔ منصف حیدرآباد نے بھی صحافت میں نئی تاریخ رقم کی ہے۔ یہ وہاں کے اہم اخبارات میں سے ایک ہے۔ ہفت روزہ 'بلٹز' بمبئی، ہفت روزہ 'آئینہ' ہفت روزہ 'نشیمن'، ہفت روزہ 'نئی دنیا' بھی اسی دور کے اخبارات ہیں۔ ان تمام اخبارات نے مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کیے ہیں۔ ظ انصاری کی ادارت میں ہفت روزہ آئینہ 1965 میں منظر عام پر آیا۔ یہ ایک مثالی اخبار تھا جس نے اپنی طباعت، مواد، پیش کش کی وجہ سے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کیا اور اس نے ایک نئی مثال قائم کی۔ 1963 میں ممبئی سے ہفت روزہ بلٹز کی اشاعت شروع ہوئی۔ انور عظیم اس اخبار کے پہلے ایڈیٹر تھے۔ 'بلٹز' عوام و خواص کا ایک مقبول ترین اخبار تھا۔ اس کی اشاعت ایک لاکھ ستر ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ اس اخبار کا آخری صفحہ آزاد قلم کے عنوان سے خواجہ احمد عباس لکھا کرتے تھے اور اس کالم کی وجہ سے اس کے قارئین کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ اس اخبار کا اپنا ایک مخصوص مزاج تھا۔ اس اخبار کا قارئین کو بے چینی سے انتظار رہتا تھا۔ بنگلور سے 'نشیمن' 26 جنوری 1962 کو نکلنا شروع ہوا۔ عثمان سعید مرحوم اس کے بانی مدیر تھے۔ اس اخبار نے بھی عوام میں اپنی ایک الگ پہچان بنائی۔ یہ اخبار اتنا مقبول تھا کہ بہت سے علاقوں میں یہ بلیک میں حاصل کرنا پڑتا تھا۔ اس کا خاص کالم 'تھپڑ انھیں' عوام و خواص میں بہت ہی مقبول تھا۔ دہلی سے 'نئی دنیا' 16 جولائی 1951 سے نکلنا شروع ہوا۔ یہ پہلے روزنامہ تھا مگر 1971 میں ہفت روزہ

ہوگیا۔ اس کے بانی مدیر مولانا عبدالوحید صدیقی تھے اس اخبار نے بھی عوام میں اپنی مقبولیت اور پہچان قائم کی۔ اس کی اشاعت بھی لاکھوں کے قریب تھی۔

1990 سے 2015 دور میں بہت سے اخبارات شائع ہوئے جن میں راشٹریہ سہارا ایک اہم نام ہے جس کی اشاعت جون 1999 سے ہوئی۔ یہ اخبار پہلے لکھنؤ سے شائع ہوا اور پھر دہلی اور اس کے بعد مختلف شہروں سے اس کی اشاعت شروع ہوئی۔ اس اخبار نے بھی اپنی الگ شناخت قائم کی ہے اور اس کا شمار اردو کے کثیر الاشاعت اخباروں میں ہوتا ہے۔ اس اخبار کے علاوہ اور بھی اخبارات مختلف ریاستوں اور شہروں سے شائع ہو رہے ہیں ان میں 'اودھ نامہ' لکھنؤ، 'آگ' لکھنؤ، 'متاع آخرت' کانپور، 'اورنگ آباد ٹائمز' اورنگ آباد، 'ایشیا ٹائمز' کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ دہلی سے بھی بہت سے اخبارات شائع ہو رہے ہیں جن میں ہفت روزہ خبردار جدید، روزنامہ ہمارا سماج، صحافت، جدید خبر، روزنامہ خبریں، ہندوستان ایکسپریس، سیاسی تقدیر، ہند نیوز قابل ذکر ہیں۔

اکیسویں صدی میں نئی ٹکنالوجی کی وجہ سے اردو اخبارات کو بہت سی سہولتیں میسر ہیں۔ اب اردو اخبارات کو خبروں کے حصول میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ بہت سی خبر رساں ایجنسیاں ہیں جن میں یو این آئی اردو ایک ایسی ایجنسی ہے جس پر زیادہ تر اردو اخبارات کا انحصار ہے۔

اردو کے دوسو سالہ صحافتی سفر پر نگاہ ڈالی جائے تو بہت سی حقیقتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک بڑی حقیقت یہ ہے کہ 1823 سے 1900 تک شائع ہونے والے تقریباً 25 فیصد اردو اخبارات کے مالکان ہندو تھے اور پڑھنے والوں کی اکثریت ہندو طبقے پر مشتمل تھی اور ایک خوش کن حقیقت بقول ممتاز صحافی جمنا داس اختر یہ ہے کہ ''انقلاب زندہ باد کا نعرہ برصغیر میں دینے والے اردو صحافیوں نے نامساعد حالات کے باوجود برطانوی سامراج کے خلاف جنگ میں جو نمایاں حصہ لیا اس کی کوئی مثال کسی دوسری زبان کے صحافی پیش نہیں کرسکتے'' اور افسوس ناک حقیقت یہ ہے کہ مشرقی پنجاب جو کبھی اردو صحافت کا گہوارہ تھا اب وہاں سے اردو صحافت تقریباً غائب سی ہوگئی ہے اور یہ بھی ایک تشویش ناک بات ہے کہ 1857 میں جن شہروں سے کثیر تعداد میں اخبارات شائع ہوتے تھے وہاں سے اب اردو کا کوئی اخبار شائع نہیں ہوتا۔ امرتسر، انبالہ، جھجر، شملہ، کرنال، کپورتھلہ وغیرہ سے کثیر تعداد میں اخبارات شائع ہوتے تھے مگر شاید اب یہ علاقے اردو خواندگی

سے بھی محروم ہیں۔ امرتسر سے ہفت روزہ 'باغ نور' (1851)، 'تحفہ پنجاب' (1875)، 'ہندو پرکاش' (1873)، 'سفیر ہند' (1877)، 'ریاض ہند' (1886)، 'امرتسر گزٹ' (1888)، 'عزیز الہند' (1889) ہفت روزہ 'وکیل' (1895) ہفت روزہ 'جہاں نما' (1895)، ہفت روزہ 'مسلمان' (1902)، اور دیگر اخبارات شائع ہوتے تھے۔ شملہ سے پندرہ روزہ 'چمن ہند' (1886)، ہفت روزہ 'بہار شملہ' (1886)، 'شملہ گزٹ' (1889)، 'پائے تخت' (1899)، جھجر سے ہفت روزہ 'ہریانہ پنچ' (1884)، پندرہ روزہ 'ہریانہ اخبار' (1884)، انبالہ سے ہفتہ وار 'مرچنٹ' (1886)، ہفتہ وار 'انبالہ گزٹ' (1888)، ہفتہ وار 'خیر اندیش' (1869)، ہفت روزہ 'لسان الہند' (1889) جیسے اخبارات نکل رہے تھے مگر اب ان علاقوں میں اردو اخبارات کی رسائی بھی دشوار ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اردو صحافت کی کوئی مبسوط تاریخ نہیں لکھی گئی اور نہ ہی مختلف ادوار میں قومی شعور کی بیداری میں اردو صحافت کے مکمل کردار کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے صحافت کے وسیع تر کردار سے روشناس کرانے ہی کے لیے ہندوستان کے مختلف شہروں (کولکاتا، سری نگر، پٹنہ، ممبئی) میں جشنِ صحافت کے علاوہ 'اردو صحافت کے دوسو سال' کے موضوع پر عالمی اردو کانفرنس (5 تا 7 فروری 2016) کا بھی انعقاد کیا گیا جس میں ملک و بیرونِ ملک کے ماہرینِ صحافت اور دانشوران ادب و ثقافت نے پرمغز مقالے پڑھے۔

یہ کتاب صحافت پر منعقدہ مختلف سمیناروں میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ ہے۔ ان کے علاوہ کچھ اور مضامین بھی بطور خاص اس میں شامل کیے گئے ہیں اور ان تمام مضامین کی ترتیب اور تصحیح کے لیے ماہرین کی خدمات بھی لی گئی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اردو صحافت کے باب میں یہ کتاب کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہوگی۔

قومی اردو کونسل صحافت سیریز کے تحت کچھ اور کتابیں بھی شائع کرنے جارہی ہے، یہ سلسلے کی پہلی کتاب ہے!

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)
ڈائرکٹر

فہرست

پہلا باب

اردو صحافت آغاز و ارتقا

1-	اردو صحافت کا آغاز اور ارتقا	ڈاکٹر محمد نصیر الدین	1
2-	اردو صحافت کے 200 سال	شیخ منظور احمد	13
3-	اردو صحافت، ماضی میں	ملک محمد کامران یونس	21
4-	اردو صحافت کا دو صدیوں پر محیط عہد بہ عہد سفر	عبدالسلام عاصم	27
5-	اردو صحافت پر ایک طائرانہ نظر	تاشیانہ شعالی	33
6	اردو صحافت کا اجمالی جائزہ	ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری	49

دوسرا باب

اردو صحافت عالمی تناظر

7	پاکستان میں اردو صحافت ایک مختصر سا جائزہ	ملک	73

8.	بنگلہ دیش میں اردو صحافت ماضی اور حال	ڈاکٹر محمد غلام ربانی	81
9.	ماریشس میں اردو صحافت کا جائزہ	ڈاکٹر علی عادل علی محمد	95

تیسرا باب

اردو صحافت علاقائی تناظر

(الف) کلکتہ، مغربی بنگال

10-	بنگال میں اردو صحافت: ابتدا تا 1857	امان اللہ محمد	107
11-	ارض بنگالہ کی اردو صحافت 1858 سے 1900 تک	ابوذر ہاشمی	111
12	مغربی بنگال میں اردو صحافت 1900 سے 1947 تک	محمد وسیم الحق	117
13	اردو صحافت 1948-2015	کریم رضا مونگیری	121
14	کولکاتا میں اردو صحافت	ڈاکٹر امام اعظم	131
15	تحریک آزادی میں صحافت اور بنگال	ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی	141

(ب) بہار

16	بہار میں اردو صحافت اور جذبۂ قومیت 1900 تا 1947	ڈاکٹر سید احمد قادری	151
17	بہار میں اردو صحافت	صفدر امام قادری	173
18	بہار میں اردو صحافت کے خدوخال	پروفیسر ایجاز حسن ارشد	191
19	بہار میں اردو صحافت کا آغاز وارتقا 1858 تا 1900	ڈاکٹر ریحان غنی	197

20	بہار میں اردو صحافت: نشیب و فراز	حسن نواب حسن	203
21	اردو صحافت اور بہار: ایک جائزہ	ڈاکٹر شمیم قاسمی	207
22	دربھنگہ میں اردو صحافت	ڈاکٹر مشتاق احمد	215

(ج) مہاراشٹر

23	مہاراشٹر میں اردو صحافت 1948 تا 2015	جاوید جمال الدین	225
24	مہاراشٹر کے اردو اخبارات	احمد عثمانی	237
25	مہاراشٹر میں اردو صحافت اور اشتہارات	نذیر فتح پوری	243

(د) تمل ناڈو

26	تمل ناڈو میں اردو صحافت	ڈاکٹر سید سجاد حسین	251

(ر) آندھرا

27	آندھرا و تلنگانہ میں اردو صحافت	رؤف خیر	263

(ز) کشمیر

28	کشمیر میں اردو صحافت معیار و مشکلات، مسائل اور امکانات	غلام نبی خیال	283
29	اردو صحافت اور جموں و کشمیر	بلراج بخشی	289
30	کشمیر میں ادبی صحافت	ڈاکٹر الطاف حسین	295
31	جموں و کشمیر میں اردو صحافت زوال پذیر کیوں؟	ہارون رشید	301
32	لداخ میں اردو صحافت	کاچو اسفندیار خان	307

(س) پنجاب

33- پنجاب میں اردو صحافت ماضی کے آئینے میں (ایک طائرانہ نگاہ) — نصر ملک — 319

(ش) اتر پردیش

34- یوپی میں اردو روزنامے: عصری منظر نامہ — شکیل احمد صبر حدی — 333

35- اتر پردیش میں اردو صحافت — محمد وصی اللہ حسینی — 339

(ص) کرناٹک

36- کرناٹک میں اردو صحافت: ایک تحقیقی جائزہ — ڈاکٹر انیس صدیقی — 381

(ض) مدھیہ پردیش

37- مدھیہ پردیش میں اردو صحافت — عارف عزیز — 403

(ط) ہریانہ

38- ہریانہ میں اردو صحافت — ڈاکٹر محمد مستمر — 413

(ظ) راجستھان

39- اردو صحافت اور صوبہ راجستھان — ڈاکٹر زیبا زینت — 431

چوتھا باب

اردو صحافت کا عصری منظر نامہ

40 اردو صحافت: نئے دور میں — ضامن جعفری — 443

41-	اردو صحافت کا عصری منظر نامہ	احمد اشفاق	451
42-	اردو جرنلزم، دور حاضر میں	ڈاکٹر مختار احمد فردین	459

پانچواں باب

اردو کے اہم اخبارات ورسائل

43-	''جام جہاں نما'' کا مکمل تعارف امتیازات وخصوصیات	پروفیسر یوسف تقی	467
44-	شمالی امریکہ کا پہلا اردو اخبار 'غدر'	جاوید دانش	477
45-	ابوالکلام آزاد کا البلاغ پہلی جنگ عظیم کے دنوں میں ایک مختصر مطالعہ	ایلن ڈیسروئرس	487
46-	مولانا آزاد کی نثر کا نمونہ البلاغ اور البلاغ	ندیم احمد	493
47-	اخبار نور افشاں پر ایک نظر	ڈاکٹر سہیل عباس	499
48-	اردو کے دو عہد ساز ادبی جرائد 'ادب لطیف' (لاہور) 'شاعر' (ممبئی)	احمد سہیل	511
49-	'مدینہ' اخبار اور تحریک آزادی	ڈاکٹر فرزانہ خلیل	519
50-	جنگ آزادی کا نقیب: روزنامہ 'ہمدرد'	ڈاکٹر محمد قمر تبریز	529

پہلا باب

اردو صحافت آغاز وارتقا

اردو صحافت کا آغاز اور ارتقا

ڈاکٹر محمد نصیر الدین

اردو زبان دنیا کی جدید اور عظیم زبانوں میں سے ایک ہے۔ اس زبان کا وجود عربی، فارسی اور ہندوستانی زبانوں کے آپس میں اختلاط سے ہوا ہے۔ صحافت عربی لفظ ہے جس کو انگریزی میں Joumalism کہتے ہیں۔ آج کل ہم صحافت کو اخبار نویسی سے بھی پہچانتے ہیں۔ اردو میں اخبار نویسی کی ابتدا چھاپہ خانے کے رواج کے بعد ہوئی اور تقریباً دو سو برس میں اس نے بہت سی ارتقائی منزلیں طے کیں جس کی تاریخ بڑی روشن اور تابناک ہے۔

اردو ادب کی تاریخ میں صحافت کا میدان بہت وسیع ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام سے اردو نثر کا جو زریں باب شروع ہوتا ہے اس باب کی ایک اہم کڑی اردو صحافت کو کہا جا سکتا ہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں صحافت کا باقاعدہ آغاز اٹھارھویں صدی کے آخر میں ہوا۔ 29 جنوری 1780 کو کلکتہ سے جیمس آگسٹس ہکی نے انگریزی زبان کا ایک ہفت روزہ اخبار ہکیز گزٹ "Hicky's Gazette" کے نام سے شائع کیا[1]۔ بعد ازاں دوسرے اخبارات اور دیگر زبانوں میں جاری ہوئے۔ 1810 میں مولوی اکرام علی نے (جنھوں نے فورٹ ولیم کالج میں

اخوان الصفا کا اردو میں ترجمہ کیا) اردو رسم الخط کا پہلا پریس ''ہندوستانی پریس'' کلکتہ میں قائم کیا اور اس پریس سے اسی سال میں اردو زبان کا سب سے پہلا اخبار ''اردو اخبار'' نکالا[2]۔ اس کے بعد مئی 1822 میں ''جام جہاں نما'' کے نام سے کلکتہ ہی سے دوسرا اردو اخبار شائع ہوا جس کے مدیر منشی سدا سکھ اور بانی ہری ہردت تھے۔ یہ اخبار فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ 23 جنوری 1828 میں یہ اخبار بند ہو گیا[3]۔

''جام جہاں نما'' کی اشاعت کے ایک سال بعد 1823 میں سن رام ٹھاکر نے کلکتہ سے شمس الاخبار (اردو فارسی) کے نام سے اور ایک ہفتہ وار اخبار نکالا[4]۔ شمس الاخبار بھی فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ مگر شمس الاخبار کو وہ مقبولیت نصیب نہیں ہوئی جو ''جام جہاں نما'' کو ہوئی تھی۔ 1836 میں اردو کا سب سے پہلا مکمل اخبار ''دہلی اردو اخبار'' شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولانا محمد باقر نے دہلی سے شائع کیا۔ اس اخبار کا مقصد قوم کو آزاد خیالی کی طرف توجہ دلانا تھا۔ اس میں اکثر علمی، ادبی اور تاریخی معیاری مضامین شائع ہوتے تھے۔ مولوی محمد باقر نہ صرف ایک نامور صحافی تھے بلکہ اس پیشے کے وہ ہادی اور موجد بھی تھے۔ صحافت ان کا فطری جوہر بن گیا۔ انھوں نے اپنے اخبار میں کئی ایسی جدتیں برتیں جن میں جدید صحافت کے رجحانات نظر آتے ہیں۔ ہر کالم میں عنوان یا مواد کی دلچسپی پیدا کی۔ مضامین کے علاوہ خبروں پر خصوصی توجہ دی۔ وہ اپنے اخبار کے مدیر اور تبصرہ نگار ہونے کے علاوہ اس کے چیف رپورٹر بھی تھے۔ ان کی بعض خبریں اتنی دلچسپ ہوتی تھیں کہ دوسرے اخبار انھیں نقل کرتے تھے۔ دہلی اردو اخبار اگرچہ ہفتہ وار اخبار تھا لیکن خبروں کے لحاظ سے اس میں ایک روزنامے کی خصوصیات تھیں۔ یہ اخبار 1857 تک جاری تھا[5]۔

1837 میں سرسید احمد خاں کے بڑے بھائی سید محمد نے بھی ایک اخبار ''سید الاخبار'' دہلی سے نکالا تھا۔ سرسید احمد خاں بھی اس میں تحریری کام کیا کرتے تھے اور سب سے پہلے اسی اخبار کے ذریعہ سرسید کے خیالات عوام تک پہنچے تھے۔ یہ اخبار 1850 میں بند ہو گیا[6]۔ اس کے بعد ہندوستان میں بے شمار اردو اخبار، رسائل اور جرائد شائع ہوئے، جن میں جامع الاخبار (1840 مدراس)، نور مشرقی (1844 دہلی)، فوائد الناظرین (1846 دہلی)، اعظم الاخبار (1848

مدراس)، دارالاسلام (1849 دہلی)، وغیرہ نہایت قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام اخبارات 1857 سے پہلے کے ہیں۔ رئیس الدین فریدی اپنے مضمون ''اردو صحافت عہد بہ عہد'' میں لکھتے ہیں:

> ''1822 سے 1857 تک اردو کے جو اخبار نکلتے اور بند ہوتے رہے ان کا شمار اب ناممکن ہو چکا ہے مگر انھوں نے جو شمع جلائی تھی وہ بجھی نہیں اور غدر کے بعد دوپہر کا سورج ہو کر چمکی[7]۔''

1857 کے ہنگامے کے وقت صحافت پر پابندیاں عائد کرنے سے بہت سے اردو اخبار بند ہو گئے۔ جو بچے ان میں لاہور کا ''کوہ نور'' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ 1850 میں پنجاب کے انگریز حاکموں کی سرپرستی میں یہ اخبار نکلنا شروع ہوا تھا اور منشی ہرسکھ لال اس کے پہلے مدیر تھے۔ غدر کے بعد 1858 میں خان بہادر مولوی کبیر الدین نے اردو کا پہلا روزنامہ ''اردو گائڈ'' کلکتہ سے نکالا۔ یہ اخبار 1893 تک جاری رہا[8]۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ غدر کے بعد اردو صحافت کی ترقی کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں اکثر مضامین سیاسی مسائل پر ہوتے تھے، مغربی علوم کی اشاعت پر زور دیا جاتا تھا اور ساتھ ساتھ زبان کی سادگی پر بھی خاص توجہ دی جاتی تھی۔ یہ دور سرسید احمد خاں سے شروع ہوتا ہے۔ وہ پہلے صحافی تھے جنھوں نے مسلمانوں میں جدید علوم حاصل کرنے کی ضرورت کا شعور پیدا کرنے کے لیے ''اخبار سائنٹیفک سوسائٹی'' (1866) جاری کیا جو بعد میں ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' بن گیا۔ یہ اخبار انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوتے تھے۔ بعد میں انگلستان سے واپس آنے کے بعد سرسید نے 1870 میں ایک خالص علمی جریدہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا[9]۔ اس اخبار کے ذریعہ وہ مسلمانوں میں آزادئ رائے، مذہبی عقائد کی اصلاح اور عورتوں کی تعلیم کی درستگی کی ترغیب دیتے تھے۔ یہ ماہنامہ رسالہ اپنے مفید اور معلوماتی مضامین کی وجہ سے بہت مشہور ہوا۔

اس دور میں اردو میں شائع ہونے والے اخباروں میں ''اودھ اخبار'' اور ''اودھ پنچ'' بھی نہایت قابل ذکر ہیں۔ اودھ اخبار لکھنؤ سے منشی نول کشور نے جاری کیا تھا۔ جو پہلے ہفت روزہ تھا 1874 میں روزنامہ ہو گیا۔ اس اخبار میں عبدالحلیم شرر اور پنڈت رتن ناتھ سرشار بھی شامل رہے۔ سرشار کا ''فسانۂ آزاد'' سب سے پہلے اسی اخبار میں قسط وار شائع ہوا۔ اودھ پنچ (1887)

منشی سجاد حسین کا اخبار تھا۔ اودھ پنچ نے اردو نثر کی ترقی میں جو حصہ لیا اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس اخبار نے مزاحیہ صحافت کو ایک تحریک بنا دیا۔ اس کی مقبولیت سے متاثر ہو کر برصغیر میں متعدد مزاحیہ اخبار شائع ہونے لگے [10]۔ مشہور ادیب اور محقق شانتی رنجن بھٹا چاریہ کی تحقیق کے مطابق:

"انیسویں صدی میں یعنی 1822 سے 1899 تک کم و بیش پانچ سو اخبارات و رسائل ہندوستان کے کونے کونے سے نکلے ہیں [11]۔"

بیسویں صدی کے آغاز میں اردو صحافت کو لاہور سے شائع ہونے والے "زمیندار" (1903) نے ایک نیا موڑ دیا۔ اس اخبار کے مدیر مولانا ظفر علی خاں تھے۔ اردو صحافت میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔ وہ فطرتاً آزاد طبع تھے۔ اپنے اخبار میں انھوں نے انگریزی حکومت کے خلاف بڑی جرأت مندی کے ساتھ لکھا۔ لوگوں نے ان کے مقالات کو صحافت کا بہترین نمونہ سمجھا۔ ان کی تحریروں نے اردو ادب میں تہلکہ مچا دیا۔ اسی سال مولانا حسرت موہانی نے علی گڑھ سے "اردوئے معلی" جاری کیا۔ یہ ادبی رسالہ تھا مگر اس میں سیاسی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ اصل میں اردو میں سیاسی صحافت کا آغاز حسرت ہی نے کیا۔ وہ داستان گو نہیں تھے۔ ایک باغی صحافی تھے۔ انھوں نے صرف نعرہ ہی نہیں لگایا بلکہ اس کے لیے جہاد بھی کیا۔ یہ جہاد بھی ایک ایسے زمانے میں کیا جب انگریزی حکومت کو سب سے آزاد کا لفظ تک سننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ حسرت نے اپنے اخبار "اردوئے معلی" میں اس دور کے بڑے بڑے ادیبوں سے لوہا منوایا۔ حقیقت میں "اردوئے معلی" نے ایک معیاری صحافت کو فروغ دینے میں نمایاں [illegible]۔ زمیندار اور اردوئے معلی ان دونوں اخبارات سے اردو صحافت میں [illegible]۔

بیسویں صدی کی اردو صحافت میں سب سے اہم اور روشن [illegible] مولانا ابوالکلام آزاد ہے۔ وہ 1903 میں "لسان الصدق" کلکتہ سے اپنی صحافت کا میدان میں آئے۔ جب لسان الصدق نکالا تو ان کی عمر چار برس تھی۔ [illegible] آزاد لسان الصدق اور ان میں جدید تعلیم کا شوق پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ جدید [illegible] اخبارات سے اردو صحافت نے میدان میں آزادی کا [illegible] مولانا ابوالکلام آزاد سے مشہور اخبار "الہلال" [illegible] "البلاغ" [illegible] 1908 [illegible]

قومی بیداری کی روح پھونک دی[12]۔ ان دونوں اخبارات نے اردو صحافت کو نئی راہ دکھائی۔ اس لیے اردو صحافت کی تاریخ میں ان اخبارات کا درجہ بہت بلند ہے۔

1912ء ہی میں مولانا محمد علی جوہر نے دہلی سے ''نقیب ہمدرد'' شائع کیا جو بعد میں صرف ''ہمدرد'' کے نام سے اردو کا اہم اخبار بنا۔ یہ اخبار اپنے زمانے میں کافی مقبول تھا۔ اردو صحافت کو عوام تک پہنچانے اور مقبول بنانے میں محمد علی جوہر کا بہت بڑا حصہ ہے۔ مشہور مورخ ڈاکٹر سید اشرف حسین لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک اردو صحافت کا تعلق ہے محمد علی جوہر اپنے زمانے کے بہترین انشاپردازوں میں تھے۔ انھوں نے صحافت کے میدان کو بڑھایا اور جو کچھ لکھا عوام کے مفاد کو سامنے رکھ کر لکھا۔ انھوں نے اخبار نویسی کو کسب معاش کا ذریعہ نہیں بنایا، صحافت ان پر جتنا ناز کرے کم ہے۔[13]''

اس کے بعد بہت سے اردو اخبار شائع ہوئے، جن میں انقلاب، سیاست، ہند، پیام، قومی آواز، آفتاب، ہندوستان، جمہوریت، اقبال، زمانہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام اخبارات تقسیم ملک سے قبل کے ہیں۔ 1947ء کی تقسیم ملک کے اثرات اردو صحافت پر بھی گہرے مرتب ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد ہندوستان اور پاکستان سے بے شمار اردو اخبار شائع ہونے لگے۔ رجسٹرار آف نیوز پرنٹس آف انڈیا کی رپورٹ کے مطابق 1982ء میں ہندوستان سے شائع ہونے والے اردو اخبارات (روزنامہ، ہفتہ وار، پندرہ روزہ، ماہنامہ وغیرہ) کی تعداد 320 تھی۔ پاکستان بننے کے بعد پاکستان سے شائع ہونے والے اخبارات میں روزنامہ جنگ، روزنامہ امروز، روزنامہ مشرق وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اردو صحافت میں رسائل و جرائد نے بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ ان میں مخزن، علی گڑھ منتھلی، معارف، اردو ادب، نقاد، شاعر، عالمگیر، نگار، ساقی، ادب لطیف، نقوش، افکار وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

1905ء میں لارڈ کرزن نے بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ مغربی بنگال کے ہندو اکثریت کو غصہ دلایا اور وہ حکومت برطانیہ کے خلاف ہو گئے۔ [illegible]

بعد یعنی 1906 میں ڈھاکہ سے ہوا۔ اردو کا پہلا جریدہ ''المشرق'' اکتوبر 1906 میں حکیم حبیب الرحمٰن نے ڈھاکہ سے جاری کیا[15]۔ اس سے ڈھاکہ میں اردو صحافت کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ پہلے یہ ماہوار تھا بعد ازاں ہفتہ وار ہو گیا۔ اس کی اشاعت پہلے رضوانی پریس کلکتہ سے شروع ہوئی پھر سلیمی پریس چھوٹا کٹرا ڈھاکہ سے شائع ہونے لگا۔ ''المشرق'' کے اجرا کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے حکیم صاحب لکھتے ہیں:

> ''بنگلہ و آسام میں مسلمانوں کی قومی زبان اور انڈیا کی لنگوافرینکا (اردو) کی توسیع و اشاعت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی دینی و دنیوی فلاح کی فکر کرنا اور رعایا اور گورنمنٹ کے تعلقات میں غلط فہمیوں کے انسداد کی کوشش کرنا اور بالائے ہند کے برادران مذہب سے تبادلۂ خیالات کے ذریعہ رابطہ اتحاد اور تعلقات اخوت کو مضبوطی سے قائم کرنا اور مسلمانان ہند میں اتحاد اور یکجہتی کی روح پھونکنا جو بلا اردو کے ناممکن ہے اس کے خاص مقاصد ہیں۔[16]''

المشرق کی چند کاپیاں ڈھاکہ یونیورسٹی کے کتب خانے میں اب بھی محفوظ ہیں۔ یہ رسالہ مشرقی بنگال کے مسلمانوں کا نقیب تھا۔ اس کے زیادہ تر مضامین مدیر حکیم حبیب الرحمٰن کے زور قلم کا نتیجہ تھے جو ان کی وسیع الدماغی اور اعلیٰ ذہنیت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ المشرق کے دوسرے مضمون نگاروں میں مسٹر ابوالفیض عبدالعلی، سید محمود آزاد، سید شرف الدین جہانگیر نگری، حضرت شاہ اکبر، مولوی نجم الدین، خواجہ ممتاز جہانگیر نگری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اسلامی، علمی، سیاسی، ادبی، اخلاقی اور تاریخی مضامین کے علاوہ دلچسپ اور اہم خبروں سے یہ رسالہ بھرپور تھا۔ ادبی لحاظ سے اس رسالہ کے تمام مضامین معیاری اور بلند پایہ تھے۔ تقریباً دو سال بعد 1908 میں یہ اخبار بند ہو گیا۔

بنگلہ دیش کی اردو صحافت کا دوسرا درخشاں ستارہ ''جادو'' کے نام سے چمکا۔ اس کے مدیر بھی حکیم حبیب الرحمٰن ہی تھے۔ جنوری 1932 میں خواجہ عادل کی معاونت سے انھوں نے اس ماہنامہ کو جاری کیا۔ اس جریدے کے سرورق پر اکثر خواجہ عادل کا نام بحیثیت مدیر لکھا جاتا تھا۔ مگر

کسی پرچے میں حکیم صاحب اور خواجہ عادل دونوں ہی نام موجود ہیں۔ اس رسالے کے اغراض و مقاصد وہی تھے جو المشرق کے تھے۔ اس رسالے کے لکھنے والوں میں علامہ رضا علی وحشت، مولوی عبدالوہاب، نصیر حسین خیال، مولانا مظفرالدین ندوی، خواجہ شہاب الدین، خالد بنگالی، خواجہ بیدار بخت، حافظ نذیر احمد اور حکیم حبیب الرحمٰن وغیرہ شامل تھے[17]۔

مشرقی بنگال سے شائع ہونے والا تیسرا معیاری جریدہ ''اختر'' ہے۔ 1924 میں ضلع میمن سنگھ کے ایک دور دراز علاقے کشور گنج کے گاؤں بولائی سے خالد بنگالی (جن کا اصل نام محمود الرب صدیقی تھا) نے اپنے والد عبدالحی اختر کے نام پر اردو رسالہ ''اختر'' شائع کیا[18]۔ اس کے لکھنے والوں میں نیاز فتح پوری، وحشت کلکتوی، دلگیر اکبر آبادی، عزیز لکھنوی، واقف بہاری، مائل الہ آبادی اور بسمل بریلوی قابل ذکر ہیں۔ اردو رسالہ اختر کی اشاعت، وہ بھی بنگال کے ایک ایسے دور دراز گاؤں سے جہاں کے باشندے خود اپنی مادری زبان بنگلہ صحیح طور پر نہ بول پاتے ہوں وہاں ایک اردو رسالے کی کامیابی کی امید کس طرح ممکن تھی۔ اس حقیقت سے خالد بنگالی خود بھی واقف تھے۔ چنانچہ اختر کے اداریہ میں لکھتے ہیں:

> ''اختر اردو رسالہ ہے اور مجھے اس سے انکار نہیں کہ اس کی اشاعت ایک ایسے مقام سے ہو رہی ہے جہاں اس رسالے کی زبان یعنی اردو صرف بعض حلقوں میں سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے اختر کے مستقبل کی نسبت کوئی ایسی پیش گوئی جو موافق اور خوشگوار ہو نہیں کی جا سکتی ہے۔[19]''

قیام پاکستان سے پہلے مشرقی بنگال موجودہ بنگلہ دیش سے ایک اور رسالہ ''العلاما'' نواکھالی سے 1939 میں جناب مصطفیٰ حسین نعمانی اور جناب رشید احمد کی زیر نگرانی شائع ہوا۔ یہ ایک مذہبی رسالہ تھا۔ قیام پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان سے نکلنے والا پہلا سہ روزہ اخبار ''مشرقی پاکستان'' تھا۔ جو ڈاکٹر عندلیب شادانی کی نگرانی میں نکلا۔ یہ اخبار صرف ایک سال تک جاری رہا۔ اس اخبار کی اہمیت بیان کرتے ہوئے وحید قیصر ندوی لکھتے ہیں:

> ''تقسیم کے بعد ڈھاکہ یا مشرقی پاکستان کے کسی دوسرے شہر سے کسی بھی زبان کے کسی اخبار یا رسالے کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ یہ فخر تو صرف

اردو ہی کو حاصل ہے کہ ڈھاکہ سے 1947 میں سب سے پہلے اردو کا
روزہ اخبار "مشرقی پاکستان" جاری ہوا۔ اس وقت تک بنگلہ اور انگریزی
وغیرہ کے تمام اخبارات یا تو کلکتہ سے نکل رہے تھے یا کلکتہ سے منتقل
ہونے کی فکر میں تھے۔[20]

"مشرقی پاکستان" بند ہو جانے کے بعد ڈاکٹر عندلیب شادانی نے 1952 میں ڈھاکہ سے ایک دوسرا معیاری ادبی رسالہ "خاور" نکالا[21]۔ اس میں اس زمانے کے مختلف اصناف کے مکاتیب فکر کے لکھنے والے حضرات شامل تھے۔ ان لکھنے والوں میں نواب جعفر علی اثر لکھنوی، حامد حسن قادری، احتشام حسین، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر طاہر فاروقی، پروفیسر عطا کاکوی، ابوالفضل صدیقی، ثاقب کانپوری، سید ابواخیر کشفی، قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی، جمیل مظہری، سید وقار عظیم اور شوکت تھانوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بنگلا زبان اور ادب کے اہم ذخیروں کو اردو کے قالب میں ڈھال کر اس ذریعے سے نئے اردو ادب کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا۔ ڈاکٹر شادانی نے اس رسالے کی ترتیب میں جدت آمیزی پیدا کی یعنی مشرقی پاکستان کی تہذیب و تمدن کو مغربی پاکستانیوں کے سامنے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا۔ اسی سال میں ابوالخیرات عبدالقادر نے ڈھاکہ سے ماہنامہ اردو پرچہ "دلربا" شائع کیا۔ عبدالقادر نے اس پرچے کا نام اپنی محبوب بیوی کے نام کی مناسبت سے رکھا تھا۔ یہ ایک غیر سیاسی پرچہ تھا۔ پہلا شمارہ اگست 1952 کو جاری ہوا اور آخری شمارہ مئی، جون 1953 میں ایک ساتھ شائع ہوا۔

قیام پاکستان کے بعد اور ماہنامہ "خاور" سے قبل ڈھاکہ سے اردو کا دوسرا رسالہ "پاکستان" شائع ہوا تھا۔ اس کے ایڈیٹر [illegible] کے بعد جناب مصطفیٰ [illegible] فیروز نے [illegible] ادارت کے فرائض کو فنی انجام دیا۔ مشرقی پاکستان سے اشاعت پذیر [illegible] 1948 تا 1969 جاری رہا۔ یہ اخبار مشرقی پاکستان کی سیاسی، [illegible] اور [illegible] کا مکمل آئینہ [illegible]

[illegible] شادانی [illegible] نے 1960 میں ایک رسالہ [illegible]

نکالا[22]۔ یہ خالصتاً ایک ادبی رسالہ تھا۔ بنگلہ اور اردو زبان کے شاہکار مضامین اس میں شائع ہوتے تھے۔ اس کے کل بارہ شمارے شائع ہوئے۔ آخری شمارہ اپریل 1962 میں شائع ہوا۔ تمام شمارے ڈھاکہ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ یہ رسالہ صحیح معنوں میں ایک معیاری رسالہ تھا۔

اس کے بعد بہت سے اردو اخبارات، رسائل اور جرائد بنگلہ دیش کے مختلف شہروں سے شائع ہوئے۔ روزناموں میں ستارہ، انگارہ، ہنگامہ، انقلاب، سرافراز، ہماری آواز، وطن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ہفت وار رسالوں میں امین، منشور، میزان، سب رنگ، شہاب، پیام مشرق، حقیقت، قوم، انصاف وغیرہ منظر عام پر آئے۔ ماہناموں میں شاہین، رفتار، مشعل، فنکار، کرناٹی، شاہکار، دبستان مشرق وغیرہ پرچے نمودار ہوئے۔ ان پرچوں یا رسالوں کے علاوہ ڈھاکہ کالج، جگن ناتھ کالج، چاٹگام کالج، راج شاہی کالج سے میگزین نکلتے رہے۔ دبستان مشرق آخری پرچہ تھا جو 1970 میں ڈھاکہ سے جاری ہوا۔ بنگلہ دیش میں اردو زبان و ادب کی ترقی میں ان اخبارات نے بہت بڑا حصہ ہے۔

1971 میں قیام بنگلہ دیش کے بعد اردو اخباروں سے وابستہ اکثر صحافی اور کاتب بنگلہ دیش سے ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ اس لیے ایک طویل مدت تک اردو صحافت پر مکمل خاموشی چھائی رہی۔ بعد ازاں چند اردو رسالے بنگلہ دیش کے مختلف شہروں سے شائع ہوئے۔ جن میں گلشن چمن (اشوگنج)، تماشہ (ڈھاکہ)، نئی روشنی (سید پور)، سنگ میل (کھلنا)، نیا آدم (ڈھاکہ)، صبح امید (چاٹگام)، انجمن (ڈھاکہ)، انتخاب (سید پور) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

2005 سے ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے اردو زبان میں ایک تحقیقی جرنل "ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو" کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ جو اب تک جاری ہے۔ اس جرنل میں یونیورسٹی کے اساتذہ کرام اور محققین کے اہم مقالات شائع کیے جاتے ہیں۔ راج شاہی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے بھی عنقریب ایک تحقیقی جرنل منظر عام پر آنے والا ہے۔

اردو صحافت کی راہ میں اگرچہ بہت مشکلات ہیں تاہم اردو صحافت کا مستقبل اور اس کے امکانات بہت روشن ہیں۔ [illegible] سے رابطہ [illegible] اردو دوست ممالک کے [illegible]

بھی اردو صحافت سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ آج تقریباً دو سو برس گزرنے کے بعد بھی اردو صحافت کی مقبولیت میں کمی نہیں ہوئی۔ مجھے پوری امید ہے کہ اگر حکومت کی طرف سے اس جانب زیادہ توجہ دی جائے تو انٹرنیٹ کے اس دور میں اردو صحافت دنیا کی دوسری زبانوں کی صحافت کے مقابلے میں ایک اہم مقام حاصل کرنے میں پیچھے نہیں رہے گی۔

حوالے:

1- اردو صحافت، مرتبہ انور علی دہلوی، دہلی، اردو اکادمی، 1987، ص۔ 11

2- سید صفی مرتضیٰ، اصناف ادب کا ارتقا، لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، 1986، ص۔ 74

3- نقوش ادب، مرتبہ سید اعجاز، لکھنؤ: خورشید بک ڈپو، 1998، ص۔ 432

4- ڈاکٹر جاوید نہال، بنگال کا اردو ادب، دہلی: ایم۔ اے۔ پرنٹرز، 1984، ص۔ 323

5- ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، صحافت پاکستان و ہند میں، لاہور: مجلس ترقی ادب، 1963، ص۔ 35

6- اردو صحافت، ص۔ 46

7- رئیس الدین فریدی، "اردو صحافت عہد بہ عہد" اردو صحافت، ص۔ 49

8- وقار اشدی، بنگال میں اردو، حیدرآباد: اشاعت اردو پاکستان، 1955، ص۔ 269

9- علامہ سید مسیر علی جعفری، جدید اردو ادبیات، کراچی: بک لینڈ پبلشرز، 1992، ص۔ 27

10- اصناف ادب کا ارتقا، ص۔ 75

11- شانتی رنجن بھٹا چاریہ، روح ادب، کلکتہ: مغربی بنگال اردو اکادمی، 2003، ص۔ 71

12- نقوش ادب، ص۔ 435

13- ڈاکٹر سید اعجاز حسین، مختصر تاریخ ادب اردو، دہلی: اردو کتاب گھر، 1946، ص۔ 273

14- اردو صحافت، ص۔ 27

15- ڈاکٹر جعفر احمد بھوئیاں، بنگلہ دیش اردو ساہتیہ، ڈھاکہ: کامیاب پرکاشن، 2004، ص۔ 132

16- المشرق، مدیر حکیم حبیب الرحمٰن، ڈھاکہ اکتوبر، 1906، ص۔ 31

17- پروفیسر ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، بنگلہ دیش میں اردو ادب، ڈھاکہ: بنگلہ اردو ساہتیہ فاؤنڈیشن، 2015، ص۔64
18- احمد الیاس، بنگلہ دیش میں اردو، ڈھاکہ: بنگلہ اردو ساہتیہ فاؤنڈیشن، 2014، ص۔149
19- رسالۂ اختر، مدیر خالد بنگالی، یسین سنگھ، 1924، ص۔2
20- وحید قیصر ندوی، ''تقسیم کے بعد اردو صحافت'' ماہنامہ نقوش، کراچی، مارچ، 1963، ص۔276
21- بنگلہ دیش میں اردو ادب، ص۔69
22- ڈاکٹر لطیف احمد، بنگلہ دیش میں اردو صحافت، ماہنامہ انشاء، کلکتہ: مارچ، اپریل، 2008، ص۔44

اردو صحافت کے 200 سال

شیخ منظور احمد

اردو کو ایک مخصوص فرقے کے ساتھ جوڑنا سراسر ناانصافی اور غلط بیانی ہے بلکہ یہ گنگا جمنی زبان اسی ملک میں پھولتی پھلتی ہوئی بیک وقت درباری اور عوامی زبان بن گئی۔ یہ شرف اردو زبان کو ہی حاصل ہے جس نے ہندوستان میں آزادی کی تحریک کی قیادت کی۔ تحریک کا اصل نعرہ انقلاب زندہ باد اسی زبان کی دین ہے۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

کسی اردو کے شاعر کا شعر نہیں۔ ایک مجاہد آزادی رام پرساد بسمل کا یہ نعرہ آزادی کے مجاہدوں کے لبوں پر ہمیشہ رہا اور آزادی کے بعد بھی کچلے مسلے ہوئے انسانوں کے جذبات کی ترجمانی کر رہا ہے۔ ہندوستان کی سیاست اور حکومت پر مسلمانوں کے غلبے کے ساتھ فارسی زبان کا بول بالا رہا۔ لیکن مغلوں کے زوال کے بعد اس زبان کی اہمیت بھی دھیرے دھیرے ختم ہونے لگی۔ سامراجی حکومت میں غیر ملکی فوجیوں اور مقامی آبادی کے درمیان ربط ضبط قائم کرنے کے لیے ایک نئی زبان

کے طور پر ابھرنے والی اردو نے اپنے ہندوستانی حسب نسب کے ساتھ خواص اور عوام دونوں میں اپنی قبولیت حاصل کی اور اسی وجہ سے یہ زبان ملک کی واحد سرکاری اور عوامی زبان کی حیثیت سے قائم ہوئی۔

ادب اپنا کام کرتا ہے۔ صحافت کا اپنا کام ہے۔ صحافت عوام کو باخبر رکھنے اور ان کی فکر کو صحیح سمت میں ڈالنے کی کوشش کا نام ہے۔ جس عہد میں بھی سیاسی قیادت منظر پر نہیں ہوتی، یا اپنا کام نہیں نبھاتی وہ عہد قیادت کے لیے صحافت کی طرف دیکھتا ہے۔ اردو صحافت کے آغاز میں بھی یہ مجبوری موجود تھی اور آج بھی ہے۔ اردو صحافت کا ابتدائی دور یا عہد طفلی دیکھا جائے تو یہ سچ سامنے آتا ہے کہ ملک کا سب سے زیادہ بیدار شہر کلکتہ تھا۔ کیونکہ کلکتہ میں اردو، بنگلہ اور انگریزی تینوں زبانوں میں صحافت کا آغاز ہوا۔

پوری جنگ آزادی اردو کے بل پر لڑی گئی۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں اردو صحافت نے جو رول ادا کیا ہے وہ تاریخ کے اوراق میں سنہرے لفظوں میں درج کیا جائے گا۔ اردو صحافت نے اپنی تحریروں سے محب وطن ہندوستانیوں کو آزادی کے جذبے سے سرشار کیا اور ایسی تحریک چھیڑ دی جس نے سامراجی حکمرانوں کو ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اردو صحافت کے قلم نے تلوار کا روپ اختیار کیا اور نامور شخصیات جیسے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، حسرت موہانی جیسے جنگ آزادی کے مجاہدوں نے اپنے قلم کے زور سے انگریزی حکومت کی جڑیں اکھاڑ دیں۔ اردو صحافت کا دائرہ 19 ویں صدی میں اتنا وسیع تھا کہ اس کا اثر پورے سماج پر رہا اور یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ پورے برصغیر میں آزادی کی جنگ کے دوران اردو نے لنگوا فرینکا کا کام کیا۔ لیکن بدقسمتی سے تقسیم ہند نے اس شیریں زبان اور اردو صحافت کو زبردست نقصان پہنچایا۔

ایک طرف یہ جلیل القدر صحافی اور سیاست دان اپنے ہم وطنوں کے ساتھ آزادی کی لڑائی میں پیش پیش رہے تو دوسری طرف ان کے سامنے یہ چیلنج بھی تھا کہ ملک میں باہمی اتحاد اور مذہبی رواداری کو کیسے مضبوط کریں۔ ان کے سامنے ایک بڑا چیلنج یہ تھا کہ مسلک اور مذہب کے نام پر جو ملک بٹوارے کے طرف بڑھ رہا تھا اس میں اردو صحافت ملک کی گنگا جمنی تہذیب کو قائم اور دائم رکھنے کے لیے کیا کیا جتن کر سکتی ہے۔ ایک سازش کے تحت سامراجی طاقتیں ملک کے

ہندوؤں اور مسلمانوں کو بانٹنے لگیں جس سے فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھ گئی۔ اردو صحافت نے نہ صرف عوام میں فرقہ پرستی کے خلاف بگل بجایا بلکہ برطانوی سامراجی حکومت کے ان خطرناک عزائم کو ناکام بنانے کے لیے بھی زبردست کوششیں کیں لیکن سیاست کے گلیارے اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور ملک کو مذہب اور دوقومی نظریے کی بنیاد پر بانٹ دیا۔

مغل دور کے زوال کے بعد ملک کے سیاسی اور سماجی حالات ابتر ہو گئے تھے۔ 1857 کی جنگ آزادی کے بعد ہندوستان کے عوام خاص کر مسلمان سیاسی طور پر مفلوج ہو گئے تھے۔ اس قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے میں اردو صحافت نے پہل کی اور کچھ ہی دہائیوں میں ملک میں ایسے فضا بنی کہ انگریزوں کو تحریک آزادی کو دبانے کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کرنے پڑے۔ انگریز حکمرانوں نے ہندوستان کے عوام کو کچلنے اور دبانے کے لیے ہر ممکن حربے استعمال کیے۔ مولوی باقر کو جنھوں نے 1822 میں ہفت روزہ دہلی اردو اخبار نکالا تھا، تختۂ دار پر چڑھایا تا کہ لوگوں کی آواز دبائی جا سکے۔ روزنامہ کو ضبط بھی کیا گیا کیونکہ سامراجی طاقتوں کا یہ خیال تھا کہ اس اخبار نے ہی سارے ہندوستان میں آزادی کی چنگاری سلگائی ہے۔ اس کے بعد 1854 میں منشی نول کشور نے اودھ اخبار نکالا جس میں انگریز حکمرانوں کے انتظامی ڈھانچے پر نکتہ چینی کی۔ اسی طرح ملک کے کئی حصوں میں چھوٹے بڑے اخبارات شائع ہوئے جن میں خلق خدا اور تاریخ بغاوت قابل ذکر رہے۔ چونکہ اردو صحافت کا اثر سماج پر انگریزی سے کہیں زیادہ تھا اسی لیے حکمرانوں نے بھی اسی پر سب سے زیادہ وار کیا اور اس صحافت سے وابستہ صحافیوں کو طرح طرح کی مشکلات میں ڈالا گیا۔ کچھ صحافیوں کی زندگی جیلوں میں ہی گزر گئی۔ مولانا ظفر علی خان نے اپنی تحریروں سے اس عہد کی سیاسی اور علمی سرگرمیوں سے قارئین کو واقف کرایا۔ اسی طرح مولانا محمد علی جوہر نے ہمدرد اخبار کے ذریعے انگریز حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں کی نیندیں حرام کر دیں۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ناخواندگی کی شرح ملک میں بہت زیادہ تھی اور پڑھنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ اس لیے کئی اردو اخبارات کی اشاعت محدود رہی۔ لیکن سرسید احمد نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی بنیاد ڈال کر عوام میں خاص کر مسلمانوں میں تعلیم کی طرف رغبت بڑھائی اور تعلیم کی روشنی جگہ جگہ آنے لگی۔ اس سے اردو صحافت کی مانگ بھی بڑھنے لگی۔ مرحوم مولانا محمد قاسم

نانوتوی نے اسی دوران دارالعلوم کے قیام سے اسلامی تعلیمات کو بڑھاوا دیا۔ اس سے بھی اردو صحافت کو تقویت ملی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تحریروں کے ذریعہ آزادی کی چنگاری کو شعلوں میں تبدیل کیا۔ یہ صحافت کا وہی دور تھا جب قلم کار مادر وطن کے لیے مر مٹنے کو تیار تھے۔ ان کو کسی چیز کا بھی لالچ نہیں تھا اور وہ نہ ہی زر خرید غلام بنے۔ ان صحافیوں نے اپنی تمام زندگی سادگی سے گزاری اور حکومت کی جابرانہ پالیسیوں کے سامنے نہیں جھکے بلکہ قید و بند کی زندگی بسر کرنا ہی پسند کیا۔

اس وقت کی اردو صحافت ایک مشن تھی جسے صحافی اپنے خون سے پورا کرنا چاہتے تھے نہ کہ ایک پیشہ جس کے ذریعہ وہ اپنے عیش و آرام کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ اسی لئے اردو صحافت کا یہ دور تابناک رہا۔ لیکن ستم ظریفی دیکھیے کہ تقسیم ہند کے ساتھ ساتھ اردو صحافت بھی زوال پذیر ہوئی۔ جو صحافت پورے ہندوستانی معاشرہ کی ترجمانی کر رہی تھی اسے فرقہ پرست طاقتوں نے ایک مخصوص فرقے کے ساتھ جوڑ دیا۔ سوتیلے پن کے رویے سے اردو صحافت گھٹنے لگی، لیکن قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی کاوشوں سے 90 کی دہائی سے اس میں جان آ گئی۔ جدید ٹکنالوجی اور اردو خبر رساں ایجنسیوں کے کام سے صحافت کے کام میں سہولتیں بھی پیدا ہوئیں اور چیلنج بھی سامنے آئے۔ آج معاملہ یہ ہے کہ اردو اخبارات بھی شانہ بشانہ انگریزی اور دوسرے اخبارات کے ساتھ اپنا رول ادا کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے کہ اردو پڑھنے والوں کی تعداد میں دن بدن کمی ہی آ رہی ہے لیکن اس کے باوجود اردو صحافت نے ملک میں ایک مقام حاصل کیا ہے جس کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ ''جام جہاں نما'' اردو کا پہلا ہفتہ وار اخبار تھا جو 1822 میں کلکتہ سے شروع ہوا تھا۔ اس سے قبل اردو کا کوئی اخبار ہندوستان میں شائع نہیں ہوا تھا۔ گویا اس طرح یہ اردو کا پہلا اخبار تھا جس کے ایڈیٹر منشی سدا سکھ تھے۔ یہ اخبار ہری ہردت نے نکالا تھا۔ ہری ہردت بنگلہ زبان کے ممتاز صحافی تارا چندوت کے بیٹے تھے۔ تارا چندوت نے بنگلہ زبان کا پہلا ہفت روزہ ''سمباد کومودی'' 1821 میں جاری کیا تھا۔ سمباد کومودی انگریزی میں بھی چھپتا تھا۔ انگریزی اور بنگلہ کے بعد اسی گھرانے سے اردو کے ہفت روزہ ''جام جہاں نما'' میں جب حکومت کی پالیسی پر کچھ تنقید کی گئی تو اس پر مختلف انداز کے عتاب

نازل ہونا شروع ہوئے۔ اور منشی سدا سکھ کو اخبار بند کرنا پڑا۔ منشی جی نے اس کے بعد بنارس آ کر یہاں سے ''نور الابصار'' شروع کیا جو سہ روزہ تھا۔ یہ اخبار 1853 میں شروع ہو چکا تھا جبکہ پہلی جنگ آزادی کو صرف چار سال باقی تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے طول وعرض سے درجنوں اردو اخبار شائع ہونے لگے تھے۔ دہلی، لاہور، لکھنؤ، کلکتہ، مدراس، حیدرآباد، بمبئی اور بنگلور اردو اخبارات کا مرکز سمجھے جانے لگے تھے۔ ان اخبارات کی اکثریت انگریز حکومت کی غلطیوں کو نظر انداز کرنا صحافت کی توہین سمجھتی تھی۔ بعض اخبارات تو حکومت وقت پر بہت ہی سخت تنقید کرتے تھے اور حکومت ان کے خلاف کارروائی بھی کرتی رہتی تھی۔ 1857 کی جنگ آزادی کا بگل بجا تو متعدد اردو اخبارات کے ایڈیٹر اس میں شریک ہو گئے۔ غدر ختم ہوا تو پھانسی پانے والوں میں دہلی کے ایڈیٹر مولوی محمد باقر بھی تھے جو مولانا محمد حسین آزاد کے والد تھے۔

پہلی جنگ عظیم سے قبل اور اس کے بعد اردو اخبارات کی ایک بڑی اکثریت جنگ آزادی میں شریک ہو چکی تھی اور بھرپور قربانیاں دے رہی تھی۔ اخبارات سے بڑی بڑی رقموں کی ضمانتیں مانگی جا رہی تھیں۔ ان کے پریس ضبط کیے جا رہے تھے، ان کے ایڈیٹروں کو سزائیں ہو رہی تھیں لیکن اردو اخبارات سپر نہیں ڈال رہے تھے۔ جو اخبار بند کر دیا جاتا تھا اس کے بدلے فوراً دوسرا اردو اخبار شروع ہو جاتا تھا۔ لاہور میں مولانا ظفر علی خان کا زمیندار، لالہ لاجپت رائے کا بندے ماترم، ملاپ، پرتاپ، انقلاب اور کئی دوسرے اردو اخبار دہلی سے ہمدرد، تیج، انصاری، الجمعیۃ اور کئی ہفتہ وار، ماہنامے، لکھنؤ سے حقیقت، اودھ، ہندوستان، پٹنہ سے ساتھی، الٰہ آباد سے زندگی، کانپور سے قومی جنگ، کلکتہ سے آزاد ہند اور کئی اخبارات ورسائل جن میں مولانا آزاد مرحوم کے الہلال اور البلاغ بھی شامل ہیں۔ بمبئی سے اجمل، خلافت، انقلاب کے علاوہ متعدد اردو اخبارات اردو کے ذریعہ ہی آزادی کی لڑائی اتنی بہادری اور بیباکی سے لڑ رہے تھے کہ آئے دن اردو اخبارات کے ایڈیٹروں کی گرفتاری نظر بندی اور سزا پانے کی خبریں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ اردو پریس حکومت برطانیہ کے لیے دردسر بن گیا تھا۔

دوسری جنگ عظیم شروع ہونے سے قبل تقریباً ہر اردو اخبار آزادی کا نعرہ لگا رہا تھا۔ ہر سیاسی پارٹی اردو میں اپنا ترجمان شائع کر رہی تھی۔ اردو اخبارات صرف ہندوستان میں ہی آزادی

کی جنگ پوری شدت کے ساتھ نہیں لڑ رہے تھے بلکہ کابل، رنگون، پیرس، لندن اور نیویارک میں بھی اردو اخبارات شائع ہو رہے تھے اور اس لیے شائع ہو رہے تھے کہ ہندوستان سے دور رہ کر ساری دنیا میں ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑی جائے۔ راجا مہندر پرتاپ، مولوی برکت اللہ بھوپالی، مولانا عبیداللہ سندھی اور متعدد جلاوطن لیڈروں نے آزادی کی تحریک کو آگے بڑھانے میں اردو کا ہی سہارا لیا تھا۔

ہندوستان میں فارسی اور اردو کے چھاپے خانے اٹھارھویں صدی کے ربع آخر میں قائم ہو چکے تھے۔ ایک تحقیق کے مطابق فارسی کی سب سے پہلی کتاب قواعد کے موضوع پر 1780 عیسوی میں مالدہ (مغربی بنگال) میں چھپی۔ انہی دنوں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کا قیام عمل میں آیا اور اس ادارے سے عربی، فارسی کی نادر و نایاب کتابیں شائع ہونے لگیں۔ 1800 میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ شہر میں قائم ہوا تھا جہاں انگریزوں کو اردو زبان سکھائی جاتی تھی۔ اس کالج کے شعبۂ تصنیف و تالیف سے جدید اردو ادب کی کتابیں شائع ہوئیں، جن میں قابل ذکر باغ و بہار ہے۔ اسی شہر سے اردو کا پہلا اخبار جام جہاں نما 1822 میں شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کے بعد ہندوستان کے دوسرے شہروں دہلی، بمبئی اور مدراس سے اردو اخبارات شائع ہوئے۔ بہار کا اولین اردو اخبار ''نور الانوار'' جولائی 1853 میں شہر آرا ضلع شاہ آباد سے جاری ہوا۔

صوبہ بہار کا دوسرا اخبار پٹنہ ہرکارہ 21 اپریل 1855 سے شائع ہونا شروع ہوا۔ بمبئی میں اردو صحافت کا آغاز 1834 سے ہوا۔ پنجاب میں اردو صحافت کا آغاز لاہور سے ہوا 19 ویں صدی کے آخر میں وہاں سے ''اخبار عام'' جاری ہوا جس کے مالک پنڈت سکندرام اور ایڈیٹر پنڈت گوپی ناتھ تھے۔ یہ ہفتہ وار اخبار تھا جسے بعد میں روزنامہ کر دیا گیا اور یہ اخبار 1930 تک باقاعدہ چھپتا رہا۔ جموں و کشمیر میں اردو صحافت کا آغاز 1882 میں ہوا جب مہاراجا رنبیر سنگھ نے اپنے سرکاری پریس سے بدیا ولاس نامی گزٹ شائع کرنا شروع کیا۔

مدھیہ پردیش میں اردو کا پہلا اخبار 1840 سے اخبار گوالیار نام سے شروع ہوا۔ اس کے چند سال کے بعد اندور شہر سے مالوا اخبار 1849 میں پریم ناتھ دھرم نارائن کی ادارت میں شائع ہوا۔ ریاست حیدرآباد و تلنگانہ میں اردو صحافت کا آغاز حیدرآباد شہر سے 1878 میں

''آصف الاخبار'' کے اجرا سے ہوا جس کے مدیر نارائن راؤ تھے۔ مدراس میں اردو کا پہلا اخبار ہفت روزہ ''جامع الاخبار'' 1841 سے شروع ہوا جس کے مدیر رحمت اللہ تھے۔ کیرل کا پہلا اخبار 1841 میں جامع الاخبار کے نام سے شائع ہوا۔

دوسری جنگ آزادی کے دوران درجنوں اردو اخبارات نے اپنی موت پسند کی، ان کے ایڈیٹروں نے جیل میں رہنا گوارہ کیا لیکن برطانوی حکومت کے سامنے جھکنے سے صاف انکار کردیا اور وہ جنگ آزادی میں حصہ لیتے رہے اور قربانیاں دیتے رہے۔ آزادی کی تحریک کو قوت پہنچانے کے لیے اردو کے شاعر جوشیلی نظمیں کہتے رہے۔ اردو مصنفین کتابیں تصنیف کرتے رہے۔ مضامین لکھتے رہے۔ ''انقلاب زندہ باد'' کا نعرہ اردو ہی کا دیا ہوا ہے، جس نے برطانوی حکومت کی بنیادیں ہلادی تھیں اور جسے سن کر انگریز حکمرانوں کے دل دہل جایا کرتے تھے۔ آزادی سے قبل اردو نے آزادی کی لڑائی لڑی تھی، آزادی کے بعد آزادی کو باقی رکھنے کے لیے لڑائی لڑ رہی ہے اور بڑی شدت سے لڑ رہی ہے۔ کیونکہ آزادی اور اردو ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم بن چکے ہیں۔ پہلے بھی لازم وملزوم تھے اور آج بھی لازم وملزوم ہیں۔

اردو صحافت، ماضی میں

ملک محمد کامران یونس
(ملک امجد اسلام امجد) پاکستان

ذرائع ابلاغ کی اہمیت ہر دور میں مسلّم رہی ہے۔ آگاہی اور جاننے کا جذبہ انسانی جبلتوں میں سے ایک ہے اور ذہن کے صحت مند ہونے کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ موجودہ دور برقی اور طباعتی ذرائع ابلاغ (Electronic and Print Media) کے حوالے سے ایک ترقی یافتہ دور ہے۔ خبر رسانی کی خاطر حضرت انسان نے ہر دور میں دستیاب وسائل کو بڑی مہارت سے استعمال کیا اور موجودہ دور میں سائنسی آلات کو اس شعبے میں بروئے کار لا کر انسانی تاریخ کا ایک انقلابی کارنامہ سرانجام دیا۔ جدید صحافت کا فن عتیق صدیقی کے مطابق ''ہندوستان میں برسراقتدار طبقے کے علی الرغم دبے پاؤں داخل ہونے والے یورپ کے ان ترقی یافتہ اور مفید فنون میں سے ایک ہے جو برطانوی استحصال کے جلو میں یہاں داخل ہوئے۔ انگریز قابضین نے پوری کوشش کی کہ صحافت کی ''وبا'' پھیلنے نہ پائے یا کم از کم دیسی باشندے اس سے محفوظ رہیں لیکن یہ نہ ہو سکا اور ایسا ہونا ممکن بھی نہ تھا۔ پہلا انگریزی اخبار 1780 میں نکلا اور اس کے 42 سال بعد 1822 میں ہندوستانی اخبار نویسی

بھی میدان میں آ گئی۔ ہندوستانی اخبار نویسی کے ابتدائی دور (1822 تا 1857) کا اگر جائزہ لیا جائے تو بڑی حد تک یہ دور فارسی اور اردو اخبار نویسی کا نظر آتا ہے[1]۔

ہندوستانی معاشرہ ان تکثیری معاشروں میں سے ایک ہے جن میں مختلف مذاہب کے ماننے والے اور مختلف زبانیں بولنے والے افراد آباد ہیں۔ حکیم کبیر الدین کے مطابق ''انیسویں صدی کے آخر تک فارسی ہندوستان کی مادری زبان سمجھی جاتی تھی اور پڑھا لکھا ہونے کے لیے عربی زبان جاننا شرط متصور ہوتا تھا''[2]۔ لیکن اس کے بعد اردو پورے ہندوستان میں رابطے کی زبان کا درجہ اختیار کر گئی۔ اگرچہ اس سے پہلے اردو زبان میں ایک معتد بہ ادبی ذخیرہ نثر و نظم کی صورت میں جمع ہو چکا تھا۔ ولی دکنی سے لے کر میر تک شعرا اپنا کلام اہل سخن تک پہنچا کر مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی مقامی صحافت میں اردو صحافت ایک بلند مرتبے پر فائز ہو گئی۔

اردو صحافت کو اپنے آغاز سے لے کر عصر حاضر تک ہندوستان میں ایک معاشرتی ضرورت کا درجہ حاصل رہا ہے۔ ہر شعبۂ زندگی خواہ وہ حکومت ہو یا سیاست، تجارت ہو یا معیشت، طب ہو یا تعلیم، تاریخ ہو یا ادب، مذہب ہو یا معاشرت، تہذیب ہو یا ثقافت، اردو صحافت نے اس پر گہرے اور دور رس اثرات مرتب کیے ہیں۔ قومی و ادبی تحریکوں کی تشکیل، ترویج اور ان کی اثر پذیری میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی وہ شخصیات جن کا تذکرہ کیے بغیر ہندوستان کی تاریخ ادھوری رہے گی، اردو صحافت سے وابستہ نظر آتی ہیں۔ اردو صحافت کی بدولت ان شخصیات کے معاشرتی رسوخ میں قابل ذکر اضافہ ہوا اور ان کی نادر صلاحیتوں کے باعث اردو صحافت تاریخ کے ماتھے کا جھومر بنی۔ تاریخ کے جھروکوں سے اردو صحافت اور اس سے وابستہ افراد کے حوالے سے چند اہم کارناموں کا اجمالی تذکرہ سطور ذیل میں کیا جاتا ہے۔

اردو صحافت کے اجرا کے بعد ہندوستان کی تاریخ کا سب سے اہم جو واقعہ پیش آیا وہ اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی ہے۔ عام ہندوستانیوں نے اس موقع پر بلا تفریق مذہب و ملت انگریزوں کی اس صد سالہ غلامی کے خلاف بغاوت کی شکل میں شدید احتجاج کیا جس کا آغاز جون 1856 میں پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ کی شکست کے ساتھ ہوا۔ ہندوستانیوں نے اس جنگ کو ''جنگ آزادی'' اور انگریز سرکار نے اسے بغاوت کا نام دیا۔ اس ملک گیر بغاوت کو

بروئے کار لانے میں جن عناصر نے حصہ لیا ان میں ہندوستانی اخبار نویسی کی حیثیت شریک غالب کی تھی حالانکہ اس کی عمر اس وقت تیس پینتیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے بغاوت شروع ہونے کے بعد کونسل میں تقریر کرتے ہوئے اس حقیقت کا ان الفاظ میں واضح اعتراف کیا، ''دیسی اخباروں نے خبریں شائع کرنے کے پردے میں ہندوستانی باشندوں کے دلوں میں دلیرانہ حد تک بغاوت کے جذبات پیدا کر دیئے ہیں یہ کام بڑی مستعدی، چالاکی اور عیاری سے انجام دیا گیا ہے۔[3]''

ہندوستانی اخباروں نے گائے اور سور کی چربی چڑھے ہوئے کارتوسوں کے معاملے کو خوب اچھی طرح اچھالا تھا۔ اس وقت کے اردو اخبارات میں سے ایک ''صادق الاخبار'' تھا جس کے ایڈیٹر سید جمیل الدین تھے، یہ تند و تیز اخبار انگریز دشمن تھا، اس کے ایڈیٹر کو بہادر شاہ ظفر کے مقدمے میں خصوصیت سے پیش کیا گیا تھا۔ ایک سرکاری گواہ ''چنی لال'' کے مطابق یہ دہلی کا منہ زور اخبار تھا اور شہر کے تمام طبقوں میں مقبول بھی تھا۔ مولوی ذکاء اللہ کے بیان کے مطابق بغاوت پھیلانے کے الزام میں سید جمیل الدین کو تین سال قید بامشقت کی سزا بھی ہوئی تھی۔ بہادر شاہ ظفر کے دربار کا روزنامچہ فارسی ہفتہ وار ''سراج الاخبار'' میں شائع ہوتا تھا اس کا اردو ترجمہ ''صادق الاخبار'' کے ساتھ ساتھ ''دہلی اردو اخبار'' بھی پابندی سے شائع کیا کرتا تھا۔

ایک دوسرا اخبار ''دہلی اردو اخبار'' کے نام سے موسوم تھا یہ مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر کا اخبار تھا۔ بغاوت شروع ہونے کے وقت تک یہ اخبار غیر جانبدارانہ کسی حد تک حکومتی پالیسی کی جانب مائل تھا لیکن بغاوت ہونے کے دو ہفتے بعد اس کی روش میں انقلاب آ گیا اور دو ماہ بعد تو اس اخبار کا نام بدل کر ''اخبار الظفر'' ہو گیا تھا اور اس نے اس وقت کے انگریزی اخباروں کی مزاحمت کی۔

اس زمانے میں ہندوستان اگرچہ طباعتی آلات و سہولتوں کے اعتبار سے ایک نہایت پسماندہ ملک تھا لیکن اس کے باوجود اردو صحافت نے مختلف شعبوں میں مستقل جرائد کے اجرا سے اپنی اہمیت کا لوہا منوایا۔ اردو ادب میں ایک مستقل صنف مزاح نگاری ہے۔ اردو صحافت کا امتیاز ہے کہ اس نے اپنی عمر 60 سال ہونے تک برصغیر سے سات مزاحیہ اخباروں کا اجرا کیا جن میں

(1) ''مذاق'' رام پور 1855 ، (2) ''مدراس پنچ'' 1879 ، (یہ اردو کا پہلا پنچ اخبار تھا)، (3) ''فرحت الاحباب'' بمبئی جنوری 1876 ، (4) ''روہیل کھنڈ'' مراد آباد 1876 ، (5) ''بہار پنچ'' پٹنہ 1876 ، (6) ''پنجاب پنچ'' لاہور 1876 ، (7) ''اودھ پنچ'' جنوری 1877 ۔

''اودھ پنچ'' میں لسان العصر اکبر الہ آبادی نے مضامین لکھے اور ہندوستان پر انگریزی تسلط کے خلاف راہ ہموار کی۔ یہاں کی گنگا جمنی اور اسلامی تہذیب پر مغربی تہذیب کی یلغار کو مزاحیہ اردو صحافت کے اس اخبار کے ذریعے روکنے کی بھرپور کوشش کی، یاد رہے کہ شاعر مشرق علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے اکبر الہ آبادی کو اپنا پیش رو قرار دیتے ہوئے کہا تھا، ''کہ مجھے یقین ہے کہ تمام ایشیا میں کسی قوم کی ادبیات کو اکبر نصیب نہیں ہوا[9]۔''

صحت کو دنیا بھر میں انسان کی بنیادی ضرورت تصور کیا جاتا ہے۔ دنیا بھر کی حکومتیں اپنے باشندوں کو ترجیحاً صحت کی سہولتیں مہیا کرتی ہیں۔ اردو صحافت کا دامن اردو طبی صحافت کے حوالے سے بھی شاندار ماضی کا حامل ہے۔ ''آیورویدک'' اور ''طب یونانی'' یہاں کے مقامی اور روایتی طریقۂ علاج ہیں۔ اس شعبے میں جاری ہونے والے جرائد میں ''مجلہ طبیہ دہلی''، ماہنامہ ''المسیح'' دہلی، ''ماہنامہ ''الحکیم'' لاہور، ماہنامہ ''حاذق'' گجرات (پاکستان)، ماہنامہ ''ہمدرد صحت'' دہلی، ماہنامہ ''رہنمائے صحت'' لائل پور (فیصل آباد)، ماہنامہ ''قومی صحت'' لاہور سمیت متعدد جرائد شامل ہیں۔ مذکورہ جرائد میں سے بعض کا اجرا ہندو پاکستان دونوں جگہ سے ہوا۔ مجلہ طبیہ بعد میں لاہور اور ہمدرد صحت کراچی سے بھی جاری ہوا۔ ان میں سے بعض جرائد کی اشاعت مستقل نہ ہوسکی اور بعض جرائد اب بھی اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ طبی جرائد میں ماہنامہ ''مسیحائے زمان'' تجارہ ریاست الور سے 1927 میں حکیم سید کرم حسین کے زیر ادارت جاری ہوا۔ اس جریدے کی شہرت اگرچہ طبی رہی لیکن اس میں مذہبی اور ادبی موضوعات پر سوقر نگارشات کی اشاعت کا عرصے تک سلسلہ رہا۔ طبی اردو صحافت سے وابستہ ایک شخصیت حکیم عبدالحمید دہلوی مرحوم کی علمی و قومی خدمات کو ملکی اور بین الاقوامی سطح پر تسلیم کیا گیا۔

اردو صحافت کے مذہبی اور ادبی شعبہ جات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی نامور شخصیات نے اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے اس میدان کو اپنی جولان گاہ بنایا۔ مسلم

یونیورسٹی علی گڑھ کے بانی سرسید احمد خان بھی اردو صحافت سے وابستہ رہے۔ انھوں نے اپنی ادارت میں ''تہذیب الاخلاق'' کا اجرا کیا۔ اس جریدے کے باعث ان کا پیغام معاشرے میں پھیلا اور ان کے متاثرین کا ایک وسیع حلقہ وجود میں آ گیا۔ اُنھی کے متاثرین میں ایک نام علامہ شبلی نعمانی کا ہے۔ ''الندوہ'' کے مدیر علامہ شبلی نعمانی ایک ناقابل فراموش مصنف اور ادیب کی حیثیت سے معروف ہیں لیکن ان کے دائرۂ وسعت میں اردو صحافت کا ایک بنیادی کردار ہے۔ ''الندوہ'' ہی کے سائے تلے ایک اور شخصیت متعارف ہوئی جس نے آگے چل کر ہندوستان کی سیاست، خطابت اور ادب پر اَن مٹ نقوش چھوڑے اس شخصیت کا نام مولانا ابوالکلام آزاد ہے جو بعد ازاں ہندوستان کی سیاسی جماعت کانگریس کے صدر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ہندوستان کے وزیر تعلیم رہے اور یہی نہیں بلکہ ''الہلال'' کا اپنی ادارت میں اجرا کیا اور ملک گیر سطح پر اس میدان میں شہرت حاصل کی۔ یہ اخبار اگرچہ انگریز دشمن پالیسی کے سبب بند کر دیا گیا لیکن تاریخ میں اس کا تذکرہ کیا جاتا رہے گا۔ صحافت اور خطابت میں ''آزاد'' کے شاگرد شورش کاشمیری جو ''چٹان'' کے مدیر تھے بھی اسی اردو صحافت کی نرسری سے پل بڑھ کر نامور لوگوں کی فہرست میں شامل ہوئے۔ مذہبی و ادبی صحافت کا میدان ادھورا رہے گا جب تک ''معارف'' اعظم گڑھ اور اس کے مدیر سید سلیمان ندوی کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ معارف کے ''شذرات'' نے اردو ادب میں کلاسک کا درجہ حاصل کیا۔

''زمیندار'' کے مدیر مولانا ظفر علی خان نے نظم و نثر میں اردو صحافت کے دامن کو مالا مال کیا۔ وہ اپنی رائے کے اظہار میں بیباک تھے۔ اس سلسلے میں پیش آنے والے مصائب کی بھی کوئی پروانہ کی۔ مذہبی و ادبی صحافت میں ''الفقیہ'' امرتسر، ''سراج الاخبار'' جہلم، ''سوادِ اعظم'' مرادآباد اور دیگر کئی تاریخی حیثیت کے حامل جرائد بھی ناقابل فراموش صحافیانہ خدمات کے حق دار ٹھہرتے ہیں۔ اردو صحافت پر جس شخصیت کے اَن گنت احسانات ہیں اس کا نام حسرت موہانی ہے۔ ''اردوئے معلیٰ'' کے اجرا کے ذریعے انھوں نے صحافت اور ادب کے کئی سنگ میل عبور کیے۔ خواجہ حسن نظامی کا ''منادی'' کئی ''تحریری علمی مناظروں'' کے حوالے سے تاریخ میں معروف ہے۔ اسی طرح روزنامہ ''ہمدرد'' دہلی، مولانا محمد علی جوہر کی ادارت کے باعث اردو صحافت میں یادگار مقام رکھتا

حق دار ٹھہرا۔ اردو صحافت میں ''نقوش'' کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس مجلے نے کئی ایک موضوعات پر متعدد جلدوں پر مبنی نمبر شائع کیے اور تاریخ میں اپنے انفرادی مقام کا حصول یقینی بنایا۔

اردو صحافت کی دو سو سالہ تاریخ کا یہ ہرگز تفصیلی اور قابل اطمینان جائزہ نہیں ہے اس کے اجمالی اور مختصر جائزے کے لیے بھی متعدد مقالات کی حاجت درپیش ہے۔ زیر نظر مقالے کو اردو صحافت کے شاندار ماضی کی صرف چند ''جھلکیاں'' ہی تصور کرنا چاہیے۔

حوالے:

1- عتیق صدیقی، انھارہ سو ستاون (1857)، اخبار اور دستاویزیں، مجلس ترقی ادب لاہور، پاکستان، 2009، ص۔2-1

2- حکیم کبیر الدین، کلیات الادویہ۔

3- عتیق صدیقی، انھارہ سو ستاون (1857)، اخبار اور دستاویزیں، مجلس ترقی ادب لاہور، پاکستان، 2009، ص۔2

4- ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، بزم اکبر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، پاکستان، 1992، ص۔8

اردو صحافت کا دو صدیوں پر محیط عہد بہ عہد سفر

عبدالسلام عاصم

اردو صحافت کے دو سو سال کے سفر کا آغاز عملاً خبر و نظر کے صحافتی معیار سے الگ مسلمانوں کو درپیش حالات کی محدود تر جہانی کے ساتھ ہوا تھا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد، تہذیبی ارتباط و اختلاط، فارسی کے غلبے سے متاثر ماحول سے برطانوی سامراج کا سیاسی استفادہ اور پھر پے بہ پے رونما ہونے والے اختلافی سیاسی واقعات کے راست اور بالواسطہ نتیجے میں مسلمانوں کی معاشرتی حالت میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے ہم جس اردو صحافت کو (ایک سے زیادہ حوالہ جاتی تحریروں میں) منسوب پاتے ہیں وہ دراصل ابتدا میں مسلم صحافت تھی۔ باوجودیکہ اس صحافت کا روشن پہلو یہ تھا کہ اس کا دامن غیر مسلموں کے لیے کبھی تنگ نہیں رہا۔ بصورت دیگر اردو کے غیر مسلم صحافی کم سے کم بیسویں صدی کا حصہ نہیں ہو پاتے۔ اردو اخبار کی اولین اشاعتوں کا سہرا 1810 میں جہاں مولوی اکرم کے سر بندھتا ہے وہیں 1822 میں جام جہاں نما کلکتے کے ممتاز بنگالی صحافی تاراچنددت کے بیٹے ہری ہردت کے سر بھی بندھتا ہے۔

اس پس منظر میں اردو صحافت جب دو صدیوں پر محیط اپنے عہد بہ عہد سفر میں

ہندوستان کی آزادی کے سوڑ سے گزرتی ہے تو اس کے دامن پر ملک کی آزادی کے لیے دی جانے والی قربانیوں کے خون کے بے شمار دھبے ہی نظر نہیں آتے بلکہ اس کی پیشانی پر تقسیم ہند کا وہ الزام بھی نظر آتا ہے جسے غلط ثابت کرنے میں اردو والے خود اپنی غیر مربوط اور بے سمت کوششوں کا شکار ہو کر رہ گئے۔ یہ معاملہ کل کی طرح آج بھی صحیح اور غلط کا نہیں بلکہ اس تفہیم کا ہے جو اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں کو بالترتیب ان کے مزاج اور وقتی تقاضے کے حساب سے متاثر کر رہی تھی۔ انگریزوں نے اس کا غائر مطالعہ کر کے جب دیکھا کہ مسلمان انھیں اپنا دشمن سمجھتے ہیں اور ہندو مصلحت سے کام لے رہے ہیں تو وہ برسرپیکار طبقے سے لڑنے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنی توانائی مصلحت کوشوں سے معاملات کرنے میں صرف کرنے لگے۔ یہاں سے انیسویں صدی کا آغاز تعلیمی محاذ پر مسلمانوں کی خستہ حالی کے ماحول میں ہوتا ہے جس کی وجہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد ہرگز نہیں تھی۔ اس خستہ حالی کا سبب یہ تھا کہ مسلم قیادت کسی تبدیلی کو دیکھنے اور سمجھنے کے بعد قبول یا مسترد کرنا تو درکنار، محسوس تک کرنے کی روادار نہیں تھی۔ اس طرز فکر کا تعلق کسی منصوبے یا عزم سے زیادہ مزاج سے تھا۔ مسلمان تقریباً ہندوستان کے نظم پر اپنی گرفت کھو چکے تھے اس کے باوجود وہ ذہنی طور پر اسے قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اس عہد کی اردو صحافت کو متذکرہ صورتحال کے ترجمان کے طور پر ان دستاویزات میں دیکھا جا سکتا ہے جو شامل محفوظات ہیں۔

برطانوی عہد حکومت اگر مسلمانوں کو راس نہیں آیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اردو صحافت کے نام پر کی جانے والی مسلم صحافت قاری کو مکمل طور پر خبر و نظر سے گزارنے میں ناکام تھی۔ حالات کا رونا اور سب کچھ چھن جانے کے اسباب کا بے لاگ جائزہ لینے کے بجائے الزام تراشی کو ادارتی شیوہ بنا لیا گیا تھا۔ اس طرز فکر و عمل نے انگریزوں کے اس شبہ کو تقویت دی کہ 1857 کا غدر بنیادی طور پر مسلمانوں نے برپا کیا تھا۔

بیسویں صدی کا آغاز بھی ہندوستان میں بالخصوص شمالی، مشرقی اور مغربی ہند کے مسلمانوں کے حق میں مالی اور معاشی طور پر خستہ حالی کے دوران ہوا۔ یہ صورت حال انھیں دیگر ہم وطنوں سے کمتر اور کمزور بناتی جا رہی تھی۔ اس وقت اردو صحافت کی نمائندگی جن تین اخباروں تک محدود رہ گئی تھی ان کے نام ''پیسہ اخبار''، ''صلح کل'' اور ''اودھ نامہ'' تھے۔ ان اخبارات کے ذریعہ

اردو قاریوں کی سوچ کا رخ عظمت رفتہ کے تذکروں سے ہٹا کر اعتدال پسندی کی طرف موڑنے کی کوشش کی گئی جس میں آگے چل کر زمیندار، الہلال اور ہمدرد کے علاوہ ہندستانی نامی ایک اخبار نے بھی بساط بھر اپنا کردار ادا کیا۔ یہیں سے آزادی کی قومی تحریک میں اردو صحافت کا وہ رول شروع ہوتا ہے جس نے انقلاب زندہ باد جیسے نعرے کو بلا تفریق مذہب وملت زبان زد عام کر دیا تھا۔ لاہور، امرتسر، کانپور، لکھنؤ، بجنور، الٰہ آباد سے شائع ہونے والے ایک سے زیادہ اردو اخبارات نے جن میں ہندوستان، دیش، دیپک، ہمدم، سوراج، مدینہ اور مسلم گزٹ بھی شامل تھے، سیاسی بیداری کی وہ لہر چلائی کہ جد وجہد آزادی کو قومی زندگی کے تقاضوں میں اولین ترجیح حاصل ہوگئی تھی۔ حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ مسلم لیگ کے ساتھ ساتھ ہندو مہاسبھا نے بھی اردو صحافت کو ہی اپنی سیاسی تحریک کا اخباری ذریعہ بنایا تھا۔

خبر رساں ایجنسیوں سے استفادہ کرنے تک آگے بڑھنے میں اردو اخبارات کو ایک لمبا سفر طے کرنا پڑا۔ ریکارڈ کے مطابق زمیندار پہلا اردو اخبار ہے جس نے اردو صحافت کو درپیش شکایات، مشکلات اور جہادی ترجیحات تک محدود رکھنے کی یک طرفگی کو ختم کرتے ہوئے اسے خبر و نظر کا آئینہ دار بنانے کے لیے خبر رساں ایجنسیوں کو سبسکرائب کرنا شروع کیا۔ بہر حال مسلمانوں میں مذہبی اور قومی بیداری کو نتیجہ خیز بنانے میں مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال کا کردار سب سے نمایاں رہا۔ اس بیداری نے ہندوستانی مسلمانوں کی ذاتی اور اجتماعی سوچ کو کس طرح متاثر کیا اس پر روشنی ڈالنے کے لئے چونکہ الگ سے ایک باب درکار ہے اس لیے یہاں بات اردو اخبارات کے عہد بہ عہد سفر تک محدود رکھی جاتی ہے۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں تحریک آزادی کے خطوط پوری طرح نمایاں ہو چکے تھے۔ 1919 میں مہاتما گاندھی کی تحریک آزادی اور انڈین نیشنل کانگریس کی سیاسی سوچ کی ترسیل و اشاعت میں لاہور کے روزنامہ پرتاپ نے اہم کردار ادا کیا۔ برطانوی حکومت نے اس کا اس قدر سخت نوٹس لیا کہ اس اخبار کی کئی مرتبہ اشاعت روک دی گئی۔ باوجودیکہ آزادی کے حق میں صف بندی غیر متاثر رہی۔ انگریزوں نے مسلمانوں کو جداگانہ قومی شناخت کے ساتھ ایک الگ ملک کے حق میں ہندوستان کی تقسیم پر راغب دیکھ کر اس جذبے کو مہمیز لگانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں

رکھی۔ اس طرح نوبت 1947 میں عملاً فیصلہ کن تقسیم تک پہنچی۔ اس وقت ہندوستانی اردو اخبارات بشمول میقاتی رسائل کی مجموعی تعداد 415 تھی۔ منقسم ہندوستان میں یہ تعداد گھٹنے کے باوجود ریکارڈ کے مطابق 345 تھی۔ یعنی صرف 70 اردو اخبارات مالکان سمیت پاکستان کا حصہ بنے۔

تقسیم ہند کے بعد بہر حال اب یہ حقیقت صرف دستاویزات کا حصہ ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان نہیں ہے اور مغل حکمرانوں نے اسے غیر مہذب زبان قرار دے کر مسترد کر دیا تھا۔ اس کی دوٹوک وجہ یہ تھی کہ اردو مختلف تہذیبوں اور زبانوں سے تعلق رکھنے والے ہندوستانی لوگوں کے درمیان رابطے کی زبان ہوا کرتی تھی۔ مسلمان ہرگز یہ زبان کہیں سے اپنے ساتھ لے کر نہیں آئے تھے۔ بصورت دیگر اردو صحافت کا آغاز غیر مسلم صحافیوں کے سرگرم اشتراک سے ہرگز نہ ہوتا۔ تقسیم ہند کے بعد کی ابتدائی دہائیوں میں جب سماجی اور اقتصادی بہبود کا بیشتر انحصار غالب سوویت اشتراک سے رفتار پکڑنے والی صنعتی ترقی پر تھا، اس وقت ہندوستان میں اردو والوں بہ الفاظ دیگر مسلمانوں کی سوجھ بوجھ کو خوش ست بنانے میں اردو کے یومیہ اور میقاتی اخبارات کو انتہائی ذمہ داری کے ساتھ جو کردار ادا کرنا چاہیے تھا اس میں وہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ ناموافق حالات میں کوئی تین دہائیاں ایسی گزریں جن میں کہیں جوابی الزام تراشی اور غیر ضروری صفائی پیش کرنے کے رجحان کو فروغ ملا تو کہیں اس قدر شاکی انداز اپنایا گیا کہ بیشتر اخبارات شکایت نامے میں تبدیل ہو کر رہ گئے تھے۔ اُس زمانے میں اردو اخبارات کو آج کی طرح اشاعتی گھرانوں کی سرپرستی حاصل نہیں تھی اور محدود فکری پیمانے پر جو اشاعتی گھرانے تھے وہ اس قابل نہیں تھے کہ اردو بولنے والی لسانی اقلیت کے لیے، جسے جذباتی تسکین پہنچانے والوں سے زیادہ زمانہ ساز پُرسان حالوں کی ضرورت تھی، اپنے ملی کاروبار سیاست پر عصری تقاضوں کو ترجیح دیتے۔ مسلمانوں کے غیر اردو حلقے جن میں جنوبی ہند اور مراٹھواڑہ خطہ شامل تھا بہر حال اس حوالے سے نسبتاً کم متاثر رہے۔ حیدرآباد کے اردو اخبارت نے سب سے پہلے سنبھالا لیا اور اپنے قارئین کی عصری رہنمائی شروع کی۔ ممبئی اور کلکتہ کے اردو اخبارات نے بھی مرحلہ وار نئی سوچ اور نئی فکر کے ساتھ اپنے ادارتی صفحات کی گنجائش بڑھائی۔

آزاد ہندوستان میں ہر چند کہ آج اردو اخبارات سرکولیشن کے اعتبار سے ہندی اور

انگریزی کے بعد تیسرے مقام پر ہیں اور عملاً مسلمانوں کی زبان بن کر رہ جانے کے باوجود اردو اخبارات کے مالکان کی اچھی خاصی تعداد غیر مسلموں پر مشتمل ہے لیکن یہ دونوں باتیں صرف اخباری صنعت وتجارت سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کا اردو صحافت کے ماضی کے کسی کردار سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اردو اخبارات کی نمایاں تعداد اب خبر ونظر کے معیار پر ملک کی دوسری زبانوں سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ تقریباً ہر اردو اخبار کی آن لائن اشاعت بھی موجود ہے۔ رفتار زمانہ کے ساتھ اردو صحافت میں بھی کچھ خرابیاں در آئی ہیں۔ تجارتی اور دوسرے مفادات نے ایسی مقابلہ جاتی صحافت کو ضروری بنا دیا ہے جو مالی اغراض پر مبنی ہو۔ ذمہ داران صحافت کو اس کا نوٹس لینے کی ضرورت ہے کیونکہ خبر نویسی کی اقدار سے سمجھوتہ کرنے والی نامہ نگاری سے نہ صرف سماجی مقاصد کو پورا کرنے کی پریس کی صلاحیت محدود ہو جاتی ہے بلکہ جمہوریت کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔

ایک تبدیلی زبان کی سطح پر بھی آئی ہے جسے محض ناپسندیدگی کی بنیاد پر خرابی کا نام نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس کا راست تعلق اطلاعاتی ٹیکنالوجی کے انقلاب، اقتصادی سرگرمیوں کے دائرے میں وسعت اور تنوع کے ساتھ دنیا کی ہر تہذیب میں صارفیت کے در آنے سے ہے۔ البتہ خالص تجارتی حلقوں کی طرف سے بہ انداز دیگر اردو کے استحصال کا بھی اس میں بھرپور عمل دخل ہے۔ مثلاً بالی ووڈ کو نغمات سے مکالمات تک اردو سے راست اور بالواسطہ طور پر محروم کر دینے کی زائد از تین دہائیوں کے بعد ٹیلی ویژن کے چھوٹے اور سینما گھروں کے بڑے پردوں پر دوبارہ اردو سے مراجعت کی ذمہ داری جس نسل کو سونپی گئی ہے وہ ہرگز اردو سے مبینہ قطع تعلق کی ذمہ دار نہیں۔ روزگار زخی تعلیم کے موجودہ عہد کی نمائندگی کرنے والی اس نسل میں چونکہ نتیجہ خیز کارکردگی پیش کرنے کا جوش بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ اس لیے اس نے اس ذمہ داری کو بھی ایک دم سے قبول کر لیا۔ نتیجہ ہمارے سامنے ہے اور وہ یہ ہے کہ آج اردو سے ناواقف نئی نسل اردو میڈیا کا بیشتر کاروبار چلا رہی ہے جس میں غیر اردو مکالموں اور انداز بیان کو اردو دکھانے کے لیے محض جذباتوں، حالاتوں اور مشکلاتوں کی ادائیگی پر ہی زور نہیں دیا جاتا بلکہ ''آپ'' کو ''خود''، ''اپنا'' کو ''تمھارا'' یہاں تک کہ ''عینی شاہدوں'' کو ''چشم دیدوں'' میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اس کا اثر اردو

گھرانوں پر بھی پڑ رہا ہے جہاں نئی نسل ''پھر'' کو ''فر'' کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتی بلکہ کچھ اس لحاظ سے فخر محسوس کرتی ہے جیسے اس طرح اُس نے اپنے آپ کو (نئے لفظ کے حساب سے ''خود'') کو ہم عصروں سے جوڑ رکھا ہے۔

اردو صحافت پر ایک طائرانہ نظر

تاشیانہ شمعالی

صحافت لفظ ''صحیفہ'' سے مشتق ہے۔ ''صحیفہ'' کے لغوی معنی کتب یا رسالہ کے ہیں۔ صحیفے سے ایک ایسا مطبوعہ مواد بھی مراد لیا جاتا ہے جو مقررہ وقت پر شائع ہوتا رہے۔ اس اعتبار سے اخبارات و رسائل کو صحیفے بھی کہا جا سکتا ہے۔

صحافت بنیادی طور پر اخبار نویسی اور رسالہ نگاری کے عمل کا نام ہے۔ تازہ خبریں اور حالاتِ حاضرہ پر مختلف قسم کے مضامین جمع کر کے انھیں معینہ وقفے سے شائع کرنا صحافت ہے۔

صحافت سے مراد خبر اور خبر سے متعلقہ مواد کا حصول، جمع کاری، ترتیب و تدوین، تنقید و تبصرہ اور فیچر نگاری کے بعد اخبار، رسالہ، پمفلٹ، ریڈیو، ٹیلی ویژن، فلم یا کتاب کے وسیلے سے اشاعت اور اس کی تقسیم ہے۔

دراصل صحافت ایسی تحریر کا نام ہے جو تقریباً زندگی کے تمام تر پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ صحافت میں سیاسی، سماجی، ثقافتی، قومی یا بین الاقوامی، سائنسی غرضیکہ ہر قسم کے

خیالات و افکار جگہ پاتے ہیں جن کا تعلق اطلاعات کی فراہمی نیز رائے عامہ کی تشکیل سے ہوتا ہے۔ اس میں کسی ادیب کا ادب، مفکر کا خیال، مبصر کا تبصرہ، فلسفی کا فلسفہ اور مصلح کی اصلاح، یہ تمام چیزیں سما سکتی ہیں۔ یہ درحقیقت حالیہ امور کو گرفت میں لینے اور ان پر سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کی نئی دنیا آباد کرنے کا فن ہے۔ صحافت شب و روز کے حالات کی مکمل عکاسی نیز ان حالات کے پس منظر سے ابھرنے والے انسانی نظریات کی ترویج و اشاعت اور حالیہ امور سے متعلق موضوعات کی ترسیل و تبلیغ کا نام ہے۔

صحافت ایک معزز پیشہ ہے۔ اخبار نویسی جرنلزم سے بھی معروف ہے۔ صحافت نگار صحافی، اخبار نویس یا جرنلسٹ کہلاتا ہے۔ صحافت آگاہی کا نام ہے اور اس میں واقعات کی عکاسی کی جاتی ہے۔

صحافت کا زندگی اور زندگی کا ادب سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ آج مغرب میں ادب اور صحافت نہ صرف دوش بدوش ہیں بلکہ زندگی کی ہمہ ہمی میں دونوں کا رول لازم و ملزوم ہو کر رہ گیا ہے۔ ادب اب زندگی کا ترجمان بن گیا ہے اور زندگی واقعات کے گرد و پیش سے اپنا رشتہ نہیں توڑ سکتی۔ طاقت، قوت اور اثر میں صحافت کو پارلیمنٹ کے مماثل قرار دیا گیا ہے۔ مزید برآں صحافت کا انسانی جذبات و احساسات سے گہرا تعلق ہے۔ بعض اوقات ایک افسانہ یا نظم سے زیادہ کسی اخبار کی سرخی ہمارے جذبات و احساسات کی دنیا میں آگ لگا دیتی ہے۔

صحافی سماج کا نہ صرف نمائندہ ہوتا ہے بلکہ جوابدہ نقاد بھی ہوتا ہے۔ حالات و واقعات کی جتنی صحیح ترجمانی اخبارات کر سکتے ہیں، وہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے ناممکن تو نہیں البتہ مشکل ضرور ہے۔ آج کے ترقی یافتہ ممالک میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی عمدہ ترین خدمات کے باوجود بھی عوام اخبارات پر زیادہ انحصار کرتے ہیں۔ علاوہ بریں اخبارات عوامی تحریکات کی حمایت کرتے ہیں۔ وہ کسی بھی حق پرست اور انصاف پسند مہم کا ساتھ دیتے ہیں۔ تحقیقاتی نامہ نگاری اخبارات کا حصہ ہے اور اس معاملے میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن اخباروں کے مقابلے میں ہمیشہ پیچھے رہ جاتے ہیں۔

اخبارات کی تاریخ گواہ ہے کہ اخبارات نے حکومتیں قائم کی ہیں، کئی حکومتوں کو استحکام بخشا ہے اور کئی حکومتوں کو جڑ سے اکھاڑ کر بھی پھینکا ہے۔

ہندوستان کی آزادی کی تاریخ ہندوستانی اخبارات کی مدد کے اعتراف کے بغیر نامکمل سمجھی جائے گی۔ ہندوستانی اخبارات بالخصوص اردو اخبارات کو اپنی عظیم ناقابل فراموش اور تاریخ ساز خدمات پر فخر ہے۔

صحافت ایک ابتدائی وکشش ذریعہ روزگار ہے اور صحافی ہم عصر تاریخ نویس ہیں۔ اخبارنویس عوام کی آنکھیں، کان اور اضطرابی ضمیر ہیں۔ سماج میں صحافیوں کا ایک باوقار مقام ہے۔ صحافت ایک ایسا پیشہ ہے جس کا دائرۂ اثر عالمگیر ہے۔ صحافت کی عظمت تسلیم شدہ ہے۔ صحافت ترقی کی نقیب اور مستقبل کی تصویر ہے۔

آزاد خیالی اور بصیرت صحافت کے اہم عناصر مانے جاتے ہیں۔ یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ ہندوستان کی حصولِ آزادی سے قبل صحافت نوجوانوں کے لیے کوئی خاص دلچسپی یا کشش نہیں رکھتی تھی اور یہ پیشہ ازحد خطرناک سمجھا جاتا تھا لیکن آزادی کے بعد صحافیوں کی اقتصادی حالت میں ایک زبردست انقلاب آیا اور اب صحافت کو ادنیٰ نہیں بلکہ اعلیٰ وارفع پیشہ کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ صحافت کی تاریخ نہایت ہی قدیم ہے تو یہ بھی بتانا ضروری سمجھتی ہوں کہ پرانے زمانے میں اگرچہ خبروں میں دلچسپی کا رجحان موجود تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ خبررسانی کے وسائل بہت ہی محدود تھے۔ خبر ایک کان سے دوسرے کان تک اور ایک شہر سے دوسرے شہر تک پہنچتے پہنچتے نہ صرف اس کی خبریت کا عنصر کھو بیٹھتی تھی بلکہ اکثر اوقات اس کا مفہوم ہی تبدیل ہو جاتا تھا۔ اور اس کی صداقت بھی متاثر ہوتی تھی۔ آخرکار خبررسانی کے لیے زبان کے بجائے تحریر کو عمل میں لانے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس کے لیے اخباری خطوط کا راستہ اختیار کیا گیا۔

ہندوستان میں چندرگپت موریہ نے مکتوبات کا یہ سلسلہ خفیہ معلومات جمع کرنے کے لیے استعمال کیا۔ اس قسم کی معلومات مختلف ذرائع سے اکٹھا کی جاتی تھیں

تا کہ صحیح نتیجہ اخذ کرنا آسان ہو جائے۔

ایران میں خبروں کی ترسیل کا نظام اسلام کی آمد سے قبل ہی جاری ہو چکا تھا اور خبریں مرتب کرنے والوں کو اخبار نویس کہا جاتا تھا۔

ہندوستان میں شہنشاہ دہلی نے خبر رسانی کے نظام کو مزید وسعت بخشی اور اس سے نظم وضبط قائم رکھنے کے علاوہ سماجی اور معاشرتی امور کی انجام دہی میں بھی مدد لی۔

عہد مغلیہ میں وقائع نگاری کے علاوہ روزنامچہ نگاری کو بھی استحکام ملا۔ خبروں کے محکمے کی نگرانی خود بادشاہ کیا کرتے تھے اور ہمیشہ بااعتماد لوگوں کو خبر رسانی پر نامزد کیا جاتا تھا۔ اس نظام کو اکبر نے وسعت دی اور یہ نظام عالمگیر کے زمانے تک بڑی کامیابی سے جاری رہا۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ ہندوستان میں ایک مضبوط مغلیہ سلطنت کی تشکیل اور اس کے طویل قیام میں خبر رسانی کے اس پختہ نظام کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔

فرانس کا پہلا اخبار ''گزٹ دی فرانس'' تھا جو 1631 میں نکلا۔

اٹلی کا پہلا اخبار 1646 میں جاری کیا گیا جس کا نام Sincero تھا۔

امریکہ کا سب سے پہلا اخبار Public Occurances تھا جس کا اجرا 1690 میں بوسٹن سے ہوا۔

ہندوستان میں صحافت کا باقاعدہ آغاز اٹھارھویں صدی کی آٹھویں دہائی میں کلکتہ سے 1780 میں بنگال گزٹ کی شکل میں ہوا۔ یہ ہفت روزہ انگریزی اخبار تھا جس کا مدیر جیمس اگسٹس ہکی تھا۔

بعد ازاں اخبارات کا سلسلہ لگاتار جاری رہا۔ چنانچہ بنگال میں بھی صحافت ترقی کرتی رہی۔

ہندی زبان کا سب سے پہلا اخبار کلکتہ میں جاری ہوا تھا جس کے ایڈیٹر منوٹھا گر تھے۔

دورِ جدید کے انکشافات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان کا پہلا اخبار ''جامِ جہاں نما'' تھا۔ اس اخبار کا اجرا 1822 میں ہوا۔ نیز یہ اردو کا پہلا باقاعدہ ہفتہ وار اخبار تھا جس

کے شائع ہوتے ہی اردو صحافت کی راہ اور اردو کے نثری اور شعری ادب کے فروغ کے دروازے کھل گئے۔ اس اخبار کے محض چھ شمارے اردو میں نکلے اور بعد میں اس کی زبان فارسی کر دی گئی۔

''درپن'' مراٹھی زبان کا پہلا اخبار تھا جس کا اجرا 1832 میں پونا میں ہوا۔ اس میں انگریزی اور مراٹھی دونوں زبانوں کے مضامین چھپتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ اخبار حالات کا نہایت غیر جانب دارانہ جائزہ لیتا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی اور انگریزوں کے بڑھتے ہوئے تسلط سے قبل فارسی ہندوستان کی سرکاری زبان تھی۔ یہ زبان صرف مسلمانوں تک محدود نہیں تھی بلکہ پڑھے لکھے ہندو بھی فارسی سمجھتے اور بولتے تھے۔ اسی سبب سے راجہ رام موہن رائے نے اپنی اصلاحی تحریک کے لیے فارسی زبان میں ''مراۃ الاخبار'' جاری کیا تھا۔ یہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ ''مراۃ الاخبار'' برِعظیم میں فارسی زبان کا پہلا مطبوعہ اخبار تھا۔

علاوہ ازیں ہندوستان میں صحافت کو انیسویں صدی ہی سے فروغ حاصل ہونے لگا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس وقت تک ملک میں طباعت و اشاعت کی مشینی سہولتیں دستیاب ہو چکی تھیں۔ پریس درآمد کیا گیا تھا جس سے مختلف قسم کی کتابوں کی اشاعت کا بھی کام لیا گیا تھا۔ اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلا چھاپا خانہ پرتگالیوں نے 1550 میں قائم کیا تھا۔

ہندوستان میں لیتھو طریق طباعت 1822 میں معرضِ وجود میں آیا۔ لہٰذا طباعت و اشاعت کی دنیا میں ایک انقلاب برپا ہوا۔ اب کتابوں کے ساتھ ساتھ مختلف شہروں میں اخبارات و رسائل کی چھپائی میں آسانی ہو گئی۔

انسان فطرتاً دوسروں کے بارے میں جاننا چاہتا ہے اور اپنے قرب و جوار میں درپیش ہونے والے واقعات سے باخبر رہنا چاہتا ہے۔ زمانۂ قدیم میں چونکہ لوگ قافلوں میں سفر کرتے تھے، تو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتے پہنچتے وہ خبروں کا ایک ذخیرہ لیے جاتے تھے جن کو وہ بعد میں دوسروں کے ساتھ بانٹتے۔ اس طرح سفرناموں کا وجود ہوا۔ اس لحاظ سے

یہ کہنا درست ہوگا کہ خبر رسانی کا کام مسافروں اور تاجروں نے بخوبی انجام دیا۔ علاوہ ازیں بہت ممکن ہے کہ اس زمانے میں قلم اور رسم الخط کی ایجاد بھی نہ ہوئی تھی اور لوگوں نے خبر رسانی کو سینہ بسینہ کیا ہو۔ ممکن ہے کہ انھوں نے اسی انداز سے معلومات اور اطلاعات کا تبادلہ کیا ہوگا۔

بعدازاں معاشرے نے رفتہ رفتہ ترقی کی تو تحریری زبان وجود میں آئی اور حالات وواقعات سے آگہی کی ضرورت بڑھتی گئی۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ بہادر اور مضبوط لوگوں نے کمزوروں پر حکم چلانا شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے فاتح اور مفتوح کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ اس بات کی طرف واضح طور پر اشارہ ملتا ہے کہ فاتح قوم کو اپنی ریاست کی پل پل کی خبر ہونی چاہیے۔ اس کے دو اسباب ہو سکتے ہیں:

1- سلطنت کے انتظام وانصرام کے لیے ماتحت علاقوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنی تھی۔

2- ان علاقوں پر بھی کڑی نظر رکھنی تھی جن سے بادشاہ کو خطرہ لاحق ہوتا تھا تاکہ باغیوں کا کوئی گروہ سر نہ اٹھا سکے۔

چنانچہ پرانے زمانے میں نظام اطلاعات میں خبر نویسی اور جاسوس یا مخبر ہی بنیادی ذرائع تھے جن کی مدد سے خبروں کو جمع کرنے، لکھنے اور بھیجنے کا رواج صدیوں تک رہا۔ مزید برآں رعایا تک اپنے احکام اور اعلانات کو پہنچانے کے لیے حکمرانوں نے کتبے کا سہارا لیا جس کی ابتدا مہاراجا اشوک کے زمانے میں ہی ہو چکی تھی۔ البتہ کتبے کی قدیم ترین مثالیں ہمیں فراعنۂ مصر کے یہاں ملتی ہیں۔

مہاراجا اشوک کے عہد میں اطلاعات کی فراہمی کے لیے باضابطہ محکمہ قائم کیا گیا تھا۔ اس محکمہ میں نامہ نگاروں کا باقاعدہ تقرر کیا جاتا تھا۔ یہ دراصل خود جاسوس تھے اور خبروں کو ایک خفیہ رسم الخط میں لکھ کر انھیں تربیت یافتہ کبوتروں کے ذریعہ منزل مقصود تک پہنچاتے تھے نیز خبروں کے حصول کے لیے فاحشہ عورتوں کا بھی استعمال کیا جاتا تھا کیونکہ یہ عورتیں بازاروں میں اڑتی افواہوں سے اچھی طرح واقف تھیں۔ اس طرح سے وہ

حکومت کو باخبر رکھتی تھیں۔

اگر ہم سلاطینِ دہلی کے عہد میں خبر نویسی کا جائزہ لیں تو ہمیں اس بات کا اندازہ ہوگا کہ مسلم فاتحین نے خبروں کی ترسیل کے لیے برید یعنی ڈاک کا نظام متعارف کرایا۔ اسی نظام کے تحت خبر رسانی کا کام برق رفتار گھوڑوں سے لیا جاتا تھا۔ یعنی لوگوں کو اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک اطلاعات پہنچانے میں گھوڑے کس قدر مفید ہو سکتے ہیں۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس نظام کا سنگِ اساس غزنوی خاندان نے 996 میں رکھا تھا۔ نیز برید کے نظام کو علاء الدین محمد خلجی نے مزید وسعت عطا کی۔ بعد ازاں محمد بن تغلق نے اس نظام کو اپنانے کے ساتھ ساتھ اس میدان میں ایک اور جدت پیدا کی تھی۔ مراد یہ کہ انھوں نے نقار خانہ کا ایک سلسلہ قائم کیا جس کے ذریعے خطرے کا ڈنکا دور سے بادشاہ تک پہنچ جاتا تھا۔ اس کے بعد 1538 میں عہد شیر شاہ سوری میں خبر رسانی اور ڈاک کا مکمل نظام قائم کیا گیا۔

مغلوں کے دور میں، جلال الدین محمد اکبر وہ پہلے مغل بادشاہ ہیں جو خبر رسانی کے نظام میں انقلابی تبدیلیاں لائے۔ انھوں نے تیز رفتار گھوڑوں کے ساتھ ساتھ شاہی تنکچی کا تقرر کیا۔ تنکچی سے مراد ہے واقعہ نویس جو دربار کے تمام تر حالات کو قلم بند کرتے تھے اور قدیم ریکارڈ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شہنشاہ اکبر کے عہد میں کم از کم چار ہزار واقعہ نویسوں کا تعین کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ خوش نویس اور تعلیقہ نویس بھی مقرر کیے گئے تھے جو روزنامچوں کو حسن و صحت سے لکھتے تھے۔ البتہ مغل بادشاہوں نے اس میدان میں خاطر خواہ خدمات انجام دیں۔

اس کے بعد یعنی اکبر بادشاہ کے دورِ حکومت کے بعد اخباری تنظیم نے صحیح معنوں میں اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں زبردست ترقی کی۔ اس زمانے میں پہلی مرتبہ واقعہ نویسوں کے تحریر کردہ خبرنامے اخبار کہلانے لگے۔ اس دور کے ایسے اخبارات کا پتہ چلتا ہے جو افواجِ شاہی کو مہیا کیے جاتے تھے نیز اس زمانے میں پورے برِصغیر میں قلمی اخباروں کا

ایک جال سا بچھ گیا جن میں سے کئی آج بھی محفوظ ہیں۔ ان اخباروں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اورنگ زیب نے ان اخباروں کو بڑی آزادی دے رکھی تھی۔ لہٰذا سترھویں صدی کے ان قلمی اخبارات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں وقائع نویسوں کا شعورِ صحافت کس قدر تربیت یافتہ تھا۔

1707 میں جب اورنگ زیب عالمگیر اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے تو مغل سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ انتشار اور بدامنی ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انگریزی اور فرانسیسی کمپنیوں میں ہوسِ ملک گیری پیدا ہو گئی اور وہ سیاسی میدان میں اُتر آئے۔ اس وقت تک ایسٹ انڈیا کمپنی کا چرچا ہو رہا تھا۔ جنگ و جدل کے مابعد چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئیں اور نظامِ خبر رسانی کمزور پڑنے کے باوجود جیسی تیسی حالت میں زندہ رہا۔ اسی زمانے میں چند اخبارات نکلتے تھے جن میں پنجاب اخبار، لاہور اخبار، پیشاور اخبار اور کابل اخبار قابلِ ذکر ہیں۔

میسور میں حیدر علی نے بھی اپنی ریاست میں کئی واقعہ نگار مقرر کیے تھے۔ وہاں سے بھی اخبارات جاری کیے گئے تھے۔ مثال کے طور پر آصف الدولہ اخبار۔ اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ اس زمانے میں برِصغیر ہندو پاک میں تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان فارسی تھی جو دربار میں استعمال کی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اخبارات بھی فارسی ہی میں نکلتے تھے۔ بعد میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور انگریزوں کی مداخلت سے انگریزی زبان میں بھی اخبارات نکالے جانے لگے۔ رفتہ رفتہ ہندوؤں نے بھی ہندی زبان میں اظہارِ خیال کرنا شروع کیا۔

پرانے زمانے میں اخبارات لیتھو پریس یعنی سنگی پریس کے ذریعہ شائع کیے جاتے تھے۔ یہاں لیتھو پریس کی تعریف کی جاتی ہے:

> ''سنگی طباعت یا مختصراً سنگی طباعت (lithography)، طباعت کا ایک طریقہ ہے جس میں چھپائی کے لیے مکمل ہموار سطح والی تال یا پتھر کا استعمال کیا جاتا ہے۔ لیتھوگرافی طریقِ طباعت سنہ 1796 میں ایجاد

ہوا۔ اس نظامِ طباعت کا موجد Alois Senefelder تھا۔ لیتھوگرافی کا باقاعدہ استعمال انیسویں صدی کے اوائل میں ہی شروع ہو گیا تھا اور وہ تمام ممالک جہاں عربی، ترکی اور اس سے ملتے جلتے رسم الخط رائج تھے، وہاں یہ طریقۂ کار جلد مقبول ہو گیا۔"

برِعظیم میں چھاپا خانہ سولھویں صدی کے نصف میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد سے قبل پہنچ چکا تھا۔ پرتگالی عیسائی مبلغین جو گوا (Goa) کے ساحل پر اترے تھے وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ چھاپا خانہ اخبارات کے اجرا کے ذریعے ہندوستان میں دور رس سیاسی، سماجی اور تعلیمی تبدیلیوں کا سبب ہوا۔ چنانچہ بنگال کے شہر کلکتہ میں پہلا چھاپا خانہ جیمس آگسٹس ہکی نے لگایا۔ ہکی ہی کی ادارت کے تحت پہلا اخبار بنگال گزٹ منظرِ عام پر آیا۔ تاریخ کی ورق گردانی سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ہندوستان میں اوّلین اخبارات نکالنے کا خیال ان ہی لوگوں کو آیا جنھیں کمپنی سے کچھ شکایتیں تھیں اور جنھوں نے ان شکایتوں کو منظرِ عام پر لانے کے لیے اپنی ملازمتوں سے استعفیٰ دیا تھا یا جنھیں خود کمپنی نے برطرف کر دیا تھا۔

اس اخبار کی تقلید میں دس ماہ بعد نومبر 1780 میں انڈیا گزٹ جاری ہوا جو چار صفحات پر مشتمل تھا۔ پھر تیسرا اخبار کلکتہ گزٹ حکومت کی مکمل سرپرستی میں مارچ 1784 کو منظرِ عام پر آیا۔

اس کے بعد 1785 میں مدراس سے مدراس کوریئر نکلا جس سے یہ شہر بھی صحافتی سرگرمیوں کا گہوارہ بن گیا۔

1789 میں بمبئی ہیرالڈ کی اشاعت سے بمبئی، ہندوستان کے تیسرے صحافتی مرکز کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آیا۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جریدی صحافت کا آغاز بھی اسی صدی میں ہوا۔ پہلا ماہانہ رسالہ دی اورینٹل میگزین تھا۔ یہ 6 اپریل 1785 میں نکلا۔

اکتوبر 1818 میں کلکتہ جرنل کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔ اس اخبار کا مالک اور ایڈیٹر

جیمز سلک بکنگھم (James Silk Buckingham) تھا جو جہاز کے کمانڈر کی حیثیت سے ہندوستان آیا تھا۔

انیسویں صدی کے اوائل عشرے میں یعنی 1822 میں، کلکتہ میں، ہری ہردت جام جہاں نما اخبار کو منظرِ عام پر لائے۔ یہ پہلا اردو اخبار کہلاتا ہے۔

اس کے بعد دوسرا اخبار ہے آئینۂ سکندری۔ یہ فارسی کا ایک اخبار تھا جس کا ایک ضمیمہ اردو کا تھا۔ نیز یہ ممبئی میں جاری کیا گیا تھا اور اس کی زبان صاف اور سہل تھی۔

دیگر ازاں مولوی محمد باقر دہلی کے نامی گرامی مجتہد تھے۔ انھوں نے 1837 میں دہلی اردو اخبار کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا۔ مولوی محمد باقر اردو کے نہایت ہی گراں قدر صحافی گزرے ہیں جن کی بدولت اردو صحافت آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگی۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ کئی غیر مسلم صحافیوں نے اردو اور فارسی کے اخبارات جاری کیے ہیں یا پھر اردو صحافت کی خاطر خواہ خدمات سرانجام دیں۔ ان میں چند نام ناقابلِ فراموش ہیں۔ مثلاً راجا رام موہن رائے (مراۃ الاخبار)، لالہ لاجپت رائے، منشی دیانرائن نگم (زمانہ)، مہاشہ کرشن وغیرہ نیز منشی محبوب عالم (زمیندار، پیسہ اخبار)، حسرت موہانی اور مولانا ابوالکلام آزاد (الہلال، البلاغ، پیغام) اور سرسید احمد خاں (تہذیب الاخلاق) جیسی قد آور شخصیات، ہندوستان میں صحافت کو قائم کرنے اور اسے برقرار رکھنے میں کوشاں رہی ہیں۔ آج خبر نویسی ایک صنعت کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

1877 میں منشی سجاد حسین نے ایک مزاحیہ اخبار "اودھ پنچ" کا اجرا کیا۔ اودھ پنچ دراصل ظرافت کا سرچشمہ تھا۔ لوگ عام طور پر اس اخبار کے فقروں اور لطیفوں سے لطف اندوز ہوتے رہتے تھے۔ اس اخبار میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، اکبر الہ آبادی، مرزا مچھو بیگ جیسے کالم نگاروں سے عوام واقف ہوئے۔

علاوہ ازیں سرسید احمد خاں نے برِ اعظم میں جس تعلیمی، معاشرتی اور مذہبی تحریک کا آغاز کیا تھا، اس کا خطاب بالخصوص مسلمانوں سے تھا۔ اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا جس میں خبریں نہیں بلکہ بے شمار مضامین چھپتے تھے جن سے قوم

کا انداز فکر بدلنا مقصود تھا۔ اس رسالے نے زندگی کے تمام موضوعات کا احاطہ کیا اور سنجیدہ عملی مباحث کے لیے اردو کو استعمال کر کے اس زبان کی فعالیت کو نمایاں کر دیا۔

یہاں ہندوستان کے دیگر مشہور ترین اخبارات کے نام پیش کیے جاتے ہیں:

- خیر خواہ ہند
- سراج الاخبار
- بنارس گزٹ
- طلسم لکھنؤ
- سحر سامری
- وکٹوریہ پیپر
- فوائد الناظرین
- محب ہند
- اودھ اخبار
- اودھ پنچ
- علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ
- تہذیب الاخلاق

بیسویں صدی کے آغاز سے قبل ہی اردو صحافت میں ہر صنف اور ہر مذاق کے اخبارات و رسائل نکل چکے تھے۔ ان میں سیاسی، مذہبی، علمی، ادبی، ثقافتی، طنزیہ اور مزاحیہ بھی تھے۔ ساتھ ہی ساتھ صنعت و حرفت سے تعلق رکھنے والے جرائد کی بھی کثیر تعداد تھی جو پورے ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔

بیسویں صدی کی صحافت بڑی حد تک انقلابی، مشتعل، جدید اور ہنگامہ خیز تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ غیر ملکی طاقتیں ملک اور عوام کا استحصال کر رہی تھیں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ بیسویں صدی ہندوستان کے لیے عظیم انقلاب لے کر آئی۔ مثلاً مسلم لیگ، تقسیم بنگال، ترکی سلطنت کی تباہی، پہلی جنگِ عظیم، خون ریزی وغیرہ۔ الغرض ان

گنت انقلابات نے اردو صحافت اور صحافیوں کو شدت سے متاثر کیا۔ لہٰذا اردو صحافت پر اس کے نمایاں اور دیرپا اثرات مرتب ہوئے جس نے اردو میں ایک طرح کی جذباتی صحافت کو فروغ دیا۔ اس کے علمبردار ظفر علی خاں، محمد علی جوہر، حسرت موہانی اور مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔

بیسویں صدی کے انقلابی دور کے زیرِ اثر بہت سے جدید اخبارات وجود میں آئے جن میں بطور خاص زمیندار، ہمدرد، الہلال اور اردوئے معلیٰ قابلِ ذکر ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ چند اور ناقابلِ فراموش اخبارات منظرِ عام پر آئے۔ مثال کے طور پر:

- وطن
- ہندوستان
- کشمیری میگزین
- دیپک
- دیش
- مسلم گزٹ لکھنؤ
- علم و عمل
- مدینہ
- ہمدم

پہلی جنگِ عظیم میں اردو صحافت بھی معتوب ہوئی جس کے نتیجے میں جنگِ آزادی کے بعد 35 میں سے صرف 12 اخبارات بچے۔ یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ اس دور کے اخبارات میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں کہ اب خبر رسانی کے ساتھ ساتھ سائنسی معلومات بھی اخبارات میں فراہم کی جانے لگیں۔

بعد ازاں حسرت موہانی کا عہد شروع ہوتا ہے۔ اس عہد میں کئی ممتاز ادبی رسائل منظرِ عام پر آئے جن کی بدولت علم و ادب کی دنیا انقلاب سے آشنا ہوئی۔ علم کی نئی شاخیں ابھرنے لگیں۔ نئی اصنافِ ادب معرضِ وجود میں آئیں اور موضوعات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔

اس دور کو رسائل کا عہدِ زریں کہا جا سکتا ہے۔ عہدِ حسرت میں چند اہم ترین ادبی رسائل کے نام گنائے جا سکتے ہیں:

- مخزن
- زمانہ
- الناظر
- عصرِ جدید
- اردو
- ساقی
- نگار
- بہارستان
- ہمایوں
- شمع
- اورینٹل میگزین
- شاہراہ
- نیا دور
- کارواں
- ادبِ لطیف
- آجکل

حسرت موہانی اردو کے پہلے صحافی تھے جو بغاوت کے الزام میں گرفتار ہوئے تھے۔ ان کی صحافتی زندگی کم و بیش چار دہائیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ ان کا مشہور ترین جاری کردہ رسالہ اردوئے معلیٰ ہے جس نے اردو زبان کو معیاری اور مستند بنانے میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اردوئے معلیٰ میں شعرا کے تذکرے اور کلام کے علاوہ حسرت نے مشاہیر کے علمی، ادبی اور تنقیدی مضامین شائع کر کے اردو ادب کے خزانے میں خاطر خواہ

اضافہ کیا۔ بیسویں صدی اردو صحافت کے انتہائی عروج، انتہائی بیباکی اور انتہائی مقبولیت کا دور تھا۔ اس دور میں جن عظیم شخصیتوں نے اردو صحافت کو انقلاب سے دو چار کیا، ان میں ظفر علی خاں، ابوالکلام آزاد اور حسرت موہانی جیسے نام قابلِ ستائش ہیں۔

علاوہ ازیں صحافتی افق پر ایک روشن اور درخشاں ستارہ ابھرا جسے ہم حیات اللہ انصاری کے نام سے جانتے ہیں۔ ماہانہ رسالے 'اردو دنیا' کے دسمبر 2015 کے شمارے میں محمد یوسف وانی اس سلسلے میں رقمطراز ہیں کہ:

> ''حیات اللہ انصاری نے اردو صحافت میں بے شمار تجربے کر کے اسے انگریزی صحافت کے ہم پلہ بنانے کی غیر معمولی سعی کی۔ حیات اللہ انصاری نے صحافت کو ایک مشن سمجھ کر زبان کی خدمت کا بہترین وسیلہ بنایا۔ حیات اللہ انصاری نے اردو صحافت کو جذباتیت سے نکال کر حقیقت نگاری سے آشنا کیا، انھوں نے اداریہ نویسی کی ایک نئی طرح ڈال کر مختصر ترین اداریے، شخصی اداریے اور قسط وار اداریے لکھ کر صوری اور معنوی اعتبار سے تجربات کر کے اردو صحافت کے میدان کو وسیع کیا۔ انھوں نے کبھی اصولوں کا سودا نہیں کیا۔ حیات اللہ انصاری صحافت کو پیدائشی چیز کہہ کر اس کے لیے زبردست مطالعے اور محنت کو ضروری سمجھتے ہیں۔''

موجودہ دور کا تقریباً ہر اخبار انواع و اقسام کی خبروں، مضامین، تبصروں، فیچروں اور کالموں کا تعجب خیز مجموعہ بن چکا ہے۔ آج اردو اخبارات بڑی تعداد میں شائع ہو رہے ہیں لیکن اس کے باوجود ایسے معیاری اخبارات و جرائد صرف انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں جو صحافت کے روایتی معنی میں موثر کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان میں معدودے چند کا ذکر کرنا چاہوں گی مثلاً:

- اردو نامہ
- اعتماد
- سیاست
- آفتاب

•	دعوت	•	تاثیر
•	انقلاب	•	منصف
•	نئی دنیا	•	اردو دنیا

الغرض صحافت کسی بھی ملک، قوم اور معاشرے کی خدمات کا اہم ذریعہ ہے۔ صحافت معاشرے کی عکاس ہوتی ہے۔ نیز اردو صحافت قومی یکجہتی، باہمی اتحاد اور اخوت و بھائی چارے کے لے وقف ہوتی ہے۔ اردو صحافت آج بھی زندہ و تابندہ ہے۔ حالانکہ اس کی ترقی کی رفتار کچھ کم ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود آج تک ایسے کئی اخبارات و رسائل نکلتے ہیں جو اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔

اردو صحافت کا اجمالی جائزہ

ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری

گذشتہ ایک ہزار برس میں اگر ہندو مسلم فنِ تعمیرات وجود میں آ سکتا ہے اور رنگوں کی آمیزش سے ایرانی اور ہندوستانی مصوری میں وحدت کے پہلو نمایاں ہو سکتے ہیں۔ موسیقی میں راگ اور راگنیوں کے تال میں سے نئے فنی نمونے جنم لے سکتے ہیں اور تصوف و بھکتی کے قریب آنے سے ایک نیا فکری نظام پیدا ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ لسانی سطح پر ایک ایسی زبان کا تصور نہ کیا جا سکے جو اس جذباتی اشتراک کی سب سے نمایاں مظہر ہے۔ ہندوستان کی تمام زبانوں میں اردو نے اس فرض کو سب سے زیادہ حسین انداز میں ادا کیا[1]۔

آج ہماری فرقہ وارانہ سیاست کچھ بھی کہے لیکن عملی صورت یہ ہے کہ اردو زبان و ادب نے ابتدا سے ہی ہمارے مشترکہ تہذیب و تمدن کی خوب سے خوب تر ترجمانی کی۔ اردو شاعری کی شروعات امیر خسرو[2] نے کی۔ انھوں نے قومی یکجہتی اور ہندوستانیت کی ایسی مثالیں پیش کیں کہ جن کی نظیر آج تک کسی بھی دوسرے ہندوستانی زبان کے شاعر کے کلام میں نہیں ملتی ہے۔ آگے بڑھ کر بھی اس زبان نے ہمیشہ قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو بڑھاوا دینے کے لیے اپنا خاص

کردار نبھایا۔ اس زبان کا کردار ہمیشہ سیکولر رہا، جس کی وجہ سے آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ملک کا ہر وہ فرد جو ان چیزوں کا شیدائی ہوتا ہے اور مذہبی یا علاقائی تعصب سے دُور رہتا ہے۔ جہاں بھی وہ جاتا ہے تو اس کی اولین ترجیح (چاہے وہ اردو زبان لکھنا پڑھنا جانتا ہو یا نہیں) اردو زبان ہی ہوتی ہے۔

ہندوستان کا وحدانی تصور اس زمانے میں فاصلوں کی دُوری، رجواڑوں کی باہمی رقابت، آپسی نفاق اور طوائف الملوکی کے باعث ذہن میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن جوں جوں انگریز اس ملک پر اپنا قبضہ و اقتدار بڑھاتے گئے اور ان کے مفاد عوامی مفاد سے ٹکرانے لگے، غلامی اور مظلومیت کا احساس رفتہ رفتہ ہندوستان کے تمام طبقوں میں قدر مشترک کی شکل اختیار کر گیا۔ اس زمانے کی اردو شاعری میں بھی اس کے اثرات جگہ جگہ نظر آتے ہیں[3] ٹھیک یہی حال ہماری صحافت کا بھی ہے۔ ہندوستان میں عوامی بیداری اور سیاسی شعور کو بیدار کرنے میں اردو اخبارات ہمیشہ پیش پیش رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے میں سب سے زیادہ رول اردو زبان اور اردو اخبارات کا رہا۔

یہاں پہلے ایک نظر اردو صحافت کی شروعات پر ڈالی جائے گی۔

دنیا کے باقی ممالک کی طرح مغلیہ دَور میں یہاں قلمی اخبار ہوا کرتے تھے۔ البتہ ہندوستان میں صحافت کی تاریخ یورپیوں کی آمد سے ہی شروع ہوتی ہے۔ پرتگالیوں نے گوا میں 1557 میں پہلا پریس قائم کر کے وہاں سے سب سے پہلے Jesuits of Goa نام کی کتاب چھاپ لی۔ پھر 1684 میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بمبئی میں پرنٹنگ پریس قائم کیا لیکن اس کے باوجود بھی یہاں اخبار نکالنے کی اجازت کسی کو نہ ملی۔ پہلی ناکام کوشش 1776 میں William Bolts نے کی۔ 29 جنوری 1780 میں James Augustus Hickey نے کلکتہ جنرل ایڈورٹائزر Calcutta General Advertiser (ہکیز بنگال گزٹ) کے نام سے ہندوستان میں پہلا مطبوعہ اخبار جاری کیا۔ 1782 میں ہی اس کو ضبط کیا گیا۔ 1785 میں Bengal Journal، 1785 میں ہی The Oriental Magazine، 1786 میں Calcutta Chronicle، 1788 میں The Madras Courier، 1788 میں The Bombay Herald وغیرہ جیسے اخبارات جاری ہوئے۔ ان تمام

اخبارات نے انگی کے تلخ تجربات سے سبق حاصل کیا اور اب حکومت وقت کے ساتھ تعاون کرنا شروع کیا اور یہاں عوام کے مفاد کو کم مدِ نظر رکھا جاتا تھا۔ 1799 میں Lord Welleslay نے یہاں کے اخبارات پر سنسر شپ ایکٹ بھی لگا دیا۔ 1823 میں John Adam (گورنر جنرل) نے Licensing قانون بنایا[4]۔

22 مارچ 1822 کو بروز بدھ اردو کا سب سے پہلا اخبار "جام جہاں نما" کلکتہ سے جاری کیا گیا۔ اس کے مالک ہری ہردت بنگو اور مدیر منشی سدا سکھ لال مرزا پوری تھے۔ 12 اپریل 1822 کو فارسی کا سب سے پہلا اخبار ہفتہ وار "مراۃ الاخبار" کے نام سے راجہ رام موہن رائے نے کلکتہ سے ہی جاری کیا[5]۔

کلکتہ سے شروع ہو کر اردو صحافت کے لیے دروازہ وا ہوا اور جگہ جگہ اب اُردو اخبارات چھپنے لگے۔ ماسٹر رام چندر دہلوی نے 1845 میں "فوائد الناظرین" اور "محب وطن" جاری کیے۔ اس طرح 1850 تک اردو اخباروں کی یہ تعداد 126 تک پہنچ گئی جن کے مالکان اور مدیران ہندو مسلم اور عیسائی تھے۔

غدر کے بعد جو حالات ہندوستان میں رونما ہوئے اور ہندوستانی عوام کو جس صورتحال سے دوچار ہونا پڑا۔ اس دلدل سے نکالنے کے لیے جہاں بڑے بڑے دانشوروں اور سیاسی و سماجی لیڈروں کا خاص رول رہا وہاں تمام ہندوستانیوں کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر لانے کے لیے یا ان کا سیاسی شعور بیدار کرنے کے لیے، ان میں جذبۂ حب وطن پیدا کرنے کے لیے یا ان میں اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کے لیے ہمارے اخبارات و رسائل نے کلیدی رول ادا کیا ہے۔

مختلف محققوں اور تاریخ دانوں کا ماننا ہے کہ 1757 میں جو آزادی کی پہلی لڑائی پلاسی سے شروع ہوئی۔ 1856 میں سلطنت اودھ کا خاتمہ ہوا۔ سنہ 1857 دراصل اس کی سد سالہ برسی تھی اور لارڈ کیننگ کا بھی یہ ماننا تھا کہ ہندوستانیوں کے دلوں میں اس دلیرانہ بغاوت کا جذبہ پیدا کرنے کا کام بڑی چالاکی سے دیسی اخباروں نے ہی سرانجام دیا تھا۔ اردو کے جن اخبارات اور رسائل نے جنگِ آزادی کے دوران قومی شعور کو بیدار کرنے کے لیے اور حریت پسندوں کی ترجمانی کرنے کے لیے اپنے اوراق اس کام کے لیے مختص رکھے ان کی نشاندہی ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی

نے یوں کی:

''اس دور کے اخبارات میں مولانا محمد باقر کا ''دلی اردو اخبار'' 1836، ''سحر سامری'' 1856، منشی نول کشور کا ''اردو اخبار'' 1859، مکند لال کا ''تاریخ بغاوت آگرہ'' 1859، عبدالرحمٰن کاشف کا اخبار ''صبح'' 1859، نصیر الدین آفندی کا ''شمس الاخبار''، مدراس 1859، اجودھیا پرساد کا ''خیر خواہ خلق'' اجمیر 1860، حیدر علی کا ''شعلۂ طور'' کانپور 1860، محمد منظور کا ''منظور الاخبار'' آگرہ 1860، میر فتح اللہ کا ''کوہ نور گزٹ'' 1860، امراؤ علی کا ہفتہ وار ''اخبار عالمتاب'' آگرہ 1861، منشی امان علی کا ہفتہ وار ''کشف الاخبار'' بمبئی 1861، منشی عبدالحکیم کا ''اخبار عالم'' میرٹھ 1861، منشی دھرکا ''آب حیات'' 1862، محمد اکبر کا ''عمدۃ الاخبار'' 1863، اسماعیل خاں کا ''لارنس گزٹ'' میرٹھ 1860، محمد قاسم کا ''قاسم الاخبار'' بنگلور 1865، جمیل الدین کا ''صادق الاخبار''، ''دبدبۂ سکندری'' 1866 وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں[6]۔''

اُس دور کے اخبارات کی یہ فہرست بہت لمبی ہو سکتی ہے اور اس پر وافر مقدار میں مواد دستیاب ہے اور نئے سرے سے سوچنے کی اشد ضرورت ہے۔

خیر متذکرہ بالا اخبارات کا طرز تحریر اکثر انگریزوں کے خلاف براہ راست اور زہر آلود ہوتا تھا۔ انھوں نے عوام کے دلوں میں جذبۂ آزادی کو پیدا کیا، جس کے نتیجے میں انگریزوں کے ہاتھوں ان اخبارات کے مالکوں اور مدیروں کو سخت سزائیں بھگتنی پڑیں۔ یہاں تک کہ کئی لوگوں کو اپنی جان کی بازی بھی لگانی پڑی اور اس میں سب سے پہلے محمد حسین آزاد کے والد مولانا محمد باقر کا نام ذکر کرنا لازمی ہے۔

ان کے بارے میں دلی اردو اکادمی (16 ستمبر 2015) کے ایک سیمنار میں صحافی منصور [illegible] نے کہا:

> محمد باقر صاحب صرف عالم، صرف صحافی اور مظلوم ہی نہیں بلکہ وہ [illegible] قوم پرستی اور وطن پرستی کا''[7]۔

[illegible] محمد باقر (پیدائش 1810) تحریک آزادی ہند کا ایک اہم شہید ہے۔ انھوں نے [illegible] ''دہلی اردو اخبار'' [illegible] اخبار کا نام بھی ''دہلی اردو اخبار'' [illegible]

کبھی ''اخبار الظفر'' بھی رکھا گیا۔ اس اخبار کی ادبی خوبی یہ ہے کہ اس میں بہادر شاہ ظفر، ذوق، غالب جیسے معتبر شعرا کا کلام چھپتا تھا۔ اس کے علاوہ بقول جی ڈی چندن کے:

> ''.....ان کے اخبار میں جیلوں کے دگرگوں حالات، سرکاری حکام اور پولیس کی زیادتیوں، اقتصادی بدحالی، جرائم کے ارتکاب اور عوامی فلاح کی عام خبریں چھپتی رہیں..... مزید ان خبروں میں انسان دوستی اور حب الوطنی کی شعاعیں بھی کوندتی تھیں۔ مولوی محمد باقر کے احباب میں ہندو مسلمان، عیسائی سب تھے۔[8]''

بغاوت کے بعد مولوی محمد باقر نے اپنے اخبار کو اپنے وطن کے حریت پسندوں کے لیے ہی وقف کیا۔ خاص کر 16 مئی 1857 کے شمارے میں وہ اپنی آنکھوں دیکھی ظلم کی تصویر کو جاندار لفظوں میں اُتار کر من وعن منظر عام پر لائے۔ تو اس طرح یہ ہو بہو تصویر ہمارے لیے ایک نادر دستاویز تو بن گئی لیکن اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے انھیں اپنی جان دینی پڑی۔ 6 مئی 1857 کے شمارے میں انھوں نے اپنے 27 سالہ بیٹے محمد حسین آزاد کی ایک معرکہ آرا نظم ''تاریخ انقلاب'' بھی شائع کی۔ 1857 میں ان کا اخبار جنگِ آزادی کے حق میں اور انگریز مخالفت میں پیش پیش رہا اور اس کی شعلہ بیانی آسمان کو پہنچ گئی ملاحظہ فرمایئے ان کا یہ بیان:

> ''ہندو مسلمان متحد ہو کر جان کی بازی لگا دو اور مجاہدانہ شان سے انگریزوں کا خاتمہ کر دو''[9]۔

1857 کی ناکام بغاوت کے بعد جب ہندوستان انگریزوں کے ہاتھوں میں پوری طرح سے آ گیا، تو لارڈ کیننگ (جو پہلے گورنر جنرل تھے اور پھر ہندوستان کے پہلے وائسرائے مقرر ہوئے) نے یہاں کے اخبارات کو کس لیا۔ کسی کا لائسنس منسوخ کیا گیا اور کسی پر سینسر لگا دیا گیا۔ جس کے نتیجے میں کچھ لوگوں نے یہ پیشہ ہی ترک کیا اور کچھ لوگ انگریزوں کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ کہیں ایسا بھی ہوا کہ کچھ اردو اخبارات سیاست کی باتیں لکھنے سے ذرا احتیاط ہی کرتے تھے۔ تو وہ اپنے اخباروں میں علمی و ادبی مضامین، سائنسی معلومات یا یورپی افکار یا ان کے تہذیب و تمدن کی باتیں بھی لکھتے تھے۔ دوسری طرف غدر یا انقلاب کے واقعے نے ہندوستانیوں کو دو طرح کی

فائدے دے دیے: (i) ہندوستانی قوم متحد ہوگئی۔ (ii) انھیں اس بات کا احساس ہوا کہ ان کے لیے اب جدید تعلیم سے آراستہ ہونا ضروری ہے، تو اس غرض کے لیے یہاں کے لوگ انگلستان اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے گئے اور وہاں انھوں نے ان کی تعلیم، طرز زندگی اور ان کی سیاست یا حکومت کا جائزہ لے لیا۔ اس طرح انھیں اپنے پچھڑے پن کا احساس تو ہوا، ساتھ ہیں انھیں لگا اگر قوم کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنا ہے، تو یہ کام اچھے اچھے اخباروں کی ہی مدد سے ہوسکتا ہے۔ یہ پس منظر ہے محسن قوم سرسید احمد خان کی فکر اور عمل کا۔

سرسید احمد خان کے بڑے بھائی سید محمود خان نے ''سید الاخبار'' نام سے اپنا اخبار دہلی سے 1835 میں جاری کیا۔ سرسید بھی ان کا ہاتھ اس کام میں بٹاتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد یہ کام سرسید نے ہی اپنے ذمہ لے لیا۔

1857 کے واقعے اور مسلمانوں کی خستہ حالت نے انھیں اس آگ میں اترنے کے لیے مجبور کیا لیکن ان کے پکے ارادوں اور ان کی نیک نیتی نے انھیں ہر منزل پر کامیابی اور کامرانی عطا کی۔ ان کی تحریک بہت حد تک آگے بڑھی۔ 1869 میں انگلستان کے سفر کے دوران انھوں نے وہاں مختلف شعبوں کا جائزہ لے لیا اور اپنے اصلاحی مقاصد کے تحت بہت سارے کاموں کے لیے ایک خاکہ تیار کیا۔ اس میں خاص بات یہ بھی تھی کہ انگلینڈ میں لوگوں کی خاص تربیت اور اصلاح کے لیے ایڈیسن (اسپکٹیٹر) اور اسٹیل (ٹیٹلر) دو اخبارات نکالتے تھے، جنھوں نے سرسید کو کافی متاثر کیا، تو واپسی پر انھوں نے بھی ''تہذیب الاخلاق'' کے نام سے (24 دسمبر 1870) اپنا رسالہ جاری کیا۔

''تہذیب الاخلاق'' نے واقعی ایک تحریک کا کام دے دیا اور اپنا اثر دکھایا، جس کے نتیجے میں، اس کے رد عمل میں بھی بہت سارے رسالے نکالے گئے، مگر یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ اردو میں بہت سارے اخبارات اور رسائل جاری کیے گئے اور وہ ڈوب بھی گئے، لیکن ''تہذیب الاخلاق'' اردو کا ایک ایسا رسالہ ہے جو آج بھی اسی شان بان معیار اور مقصد سے چھپتا ہے جو اس کا شروع سے ہی تھا۔ کیونکہ علی گڑھ تحریک واحد ایک ایسی تحریک ہے جس کی اہمیت و افادیت ہمیشہ برقرار رہی۔ اسی لیے مظفر حسین سید سرسید کی بے مثل حکمت عملی، ان کے طرز فکر اور

ان کے فلسفے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جو (یہ) آج بھی زندہ ہے، تابندہ اور تاباں ہے، جتنا کہ ابتدا اور اپنے دورِ شباب میں تھا۔ سرسید کا خواب کتنا رنگ برنگ اور ان کا مقصد کتنا ارفع تھا..... سرسید نے اپنا انقلابی نظریہ اُس آب و ہوا میں پیش کیا تھا جہاں روایت کے خلاف ایک لفظ بھی کہنا یا لکھنا کسی بھی فرد و معاشرہ کو راندۂ درگاہ کر سکتا تھا اور آزادیِ فکر کی طلب کو بہ یک زبان و بہ یک قلم فعلِ کفر قرار دیا جا سکتا تھا..... سرسید کے اسی غیر روایتی اندازِ نظر اور طرزِ فکر کو بعض دانشوروں نے روایت سے بغاوت کے مترادف قرار دیا ہے.....[10]''

منشی نول کشور (1836–1895) پہلے وہ منشی ہرسکھ رائے کے اخبار ''کوہ نور'' لاہور سے وابستہ ہوئے۔ ہرسکھ رائے کی قید ہونے کے بعد اخبار کا سارا کام نول کشور نے ہی سنبھالا۔ 1857 کے حالات نے انھیں بھی سخت مشکل میں ڈالا، لیکن انھوں نے ہمت سے کام لے کر 1858 میں لکھنؤ میں اپنا پریس قائم کیا جو بہت ہی کامیاب رہا۔ 26 نومبر 1858 میں ''اودھ اخبار'' کا پہلا شمارہ منظرِ عام پر آیا۔ اس کے بعد 1877 میں یہ روزانہ ہوا۔ یہ اردو کا پہلا ایسا اخبار تھا کہ جس کے نمائندے ملک کے اطراف و اکناف میں موجود تھے اور اپنے دَور کے نامور قلم کار اس اخبار سے وابستہ تھے۔ یہ اخبار چار صفحات سے بڑھ کر اڑتالیس صفحات تک پہنچ گیا اور اپنے دَور کا سب سے ضخیم اخبار پورے ملک میں مانا جاتا تھا۔ اس اخبار کے لکھنے والوں میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، مرزا حیرت دہلوی، شیو پرشاد، یگانہ چنگیزی، مولانا جالب دہلوی، شوکت تھانوی، احمد حسین شوکت وغیرہ جیسے اپنے دَور کے معروف انشا پرداز تھے۔

1877 میں لکھنؤ سے ''اودھ پنچ'' منشی سجاد حسین نے جاری کیا۔ اس کی مقبولیت اس کے ایک مزاحیہ کردار میں تھی۔ اس اخبار کے سیاسی مضامین میں بھی طنز و مزاح بھرا ہوا ہوتا تھا۔ اکبر الٰہ آبادی بھی اس اخبار میں اپنا مزاحیہ کلام چھپواتے تھے۔ دیگر مختلف باتوں کے ساتھ ساتھ اس میں ہندوستانی کلچر اور مختلف رسومات کے بارے میں مضامین اور کچھ ادبی چیزیں شائع کی

جاتی تھیں مثلاً محرم، چہلم، عید، شب برأت، ہولی، دیوالی، بسنت، رقص و سرود کی محفلوں کے بارے میں، غرضیکہ کچھ ایسے موضوعات اس میں دیکھنے کو ملتے تھے کہ جس سے مشترکہ ہندوستانی ثقافت کی عکاسی ہوتی تھی۔

لکھنؤ سے گلبیسر نرائن عیاش اور پنڈت بیج ناتھ نے ''سحر سامری'' نام کا اپنا ایک اخبار جاری کیا تھا۔ اس پر قدامت پرستی کا رنگ چھایا رہتا تھا۔ اس اخبار کی زبان مرصع مسجع ہونے کے باوجود رائٹر اپنی بات بڑی بے تکلفی سے کہہ ہی دیتا تھا۔ یہ اخبار ہندوستان میں ہو رہی نئی تبدیلیوں کو خوش آمدید نہیں کہتا تھا اور حکومتِ وقت کی پالیسیوں پر ہمیشہ تیکھا طنز کرتا تھا۔

1887 میں مولوی محبوب عالم (وفات 1933) نے ''پیسہ'' اخبار پہلے گوجرانوالہ سے جاری کیا پھر اسی اخبار کو لاہور منتقل کیا۔ اگرچہ یہ اخبار تجارتی تھا، مگر حکومت کے کاموں پر بے لاگ نکتہ چینی کرتا تھا۔ یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ محبوب عالم اور منشی نول کشور کو اردو اخباری دنیا میں وہی جگہ حاصل ہے جو انگلستان میں ولیم والٹر اور ہارمس ورتھ کو حاصل تھی [11]۔

منشی دوارکا پرشاد اُفق (پیدائش 13 جولائی 1864-12 ستمبر 1913) کے خاندان کے سبھی بزرگ علم و ادب کے شیدائی تھے اور اردو زبان انھیں وراثت میں ملی۔ اُفق نے اپنی رہائش گاہ واقع لکھنؤ سے 5 اگست 1888 میں اپنا پندرہ روزہ ''نظم'' اخبار جاری کیا۔ یہ بارہ صفحات پر ہوتا تھا۔ اس کے آٹھ صفحات منظوم ہوتے تھے اور چار صفحات نثر میں ہوتے تھے۔

اُفق حب وطنی سے سرشار تھے اور ان کے ایک ایک لفظ سے قومی یکجہتی، رواداری اور قومی شیرازہ بندی جھلکتی ہوئی ہمیں نظر آجاتی ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی پیار محبت، اخوت اور ہندوستان میں رہنے والے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان خیر سگالی کے لیے وقف کی تھی۔

اُفق اپنے معاصر اخبار نویسوں کو بھی ایسی باتیں لکھنے سے منع کرتے تھے کہ جن سے [illegible] پہنچے۔ اُفق کئی دوسرے اخباروں جیسے پنجاب سماچار، دھرم سبھا ون، بھارت پرتاپ، [illegible] زمانہ، شیو شنبھو وغیرہ سے وابستہ رہے۔ چونکہ ان کے دور میں جنگِ آزادی اور [illegible] مخالفت اپنے عروج پر تھی اور اُفق بھی کبھی طنز و مزاح میں، کبھی شاعری میں اور کبھی براہ

راست اپنے مضامین میں عوام کو بیدار کرتے رہے۔ وہ لالہ لاجپت رائے سے بے حد متاثر تھے اور اُنھوں نے اپنی مسدس میں یہ پیغام دے دیا۔ ''مٹاؤ جبیں سے نشانِ غلامی''۔

اُس دَور کے اخبارات کی فہرست بہت لمبی ہے یہاں کچھ اور چھوٹے چھوٹے اخبارات کا ذکر کرنا لازمی ہے۔

1866 میں نواب علی خاں رامپور نے ''دبدبۂ سکندری'' کے نام سے اپنا اخبار جاری کیا۔ اس اخبار میں انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ کے ساتھ ساتھ غیر ملکی خبروں کو بھی جگہ دی جاتی تھی۔

امراؤ علی نے ''آفتابِ عالمتاب'' کے عنوان سے 1861 میں آگرہ سے اپنا ہفتہ وار اخبار جاری کیا۔ یہ اخبار سیاسی خبروں کے ساتھ ساتھ بہادر شاہ ظفر کے حالات بھی بیان کرتا تھا۔

''اخبار عالم'' لاہور سے 1871 میں شائع ہوا۔ اسی طرح ''اتالیق ہند'' ہفتہ وار 1874 میں لاہور سے ہندو مسلم اتحاد پیدا کرنے کے لیے شروع کیا گیا۔

اُس دور کے اور اخباروں جیسے سلطان الاخبار، سحر سامری، کشف الاخبار بمبئی (منشی امان علی) تاریخ بغاوت ہند آگرہ، شعلۂ طور وغیرہ نے ہندوستان کے سیاسی و معاشرتی حالات کے ساتھ ساتھ حکمرانوں کی بدانتظامیوں اور بدعنوانیوں اور یہاں کے امرا طبقے کے ساتھ ہو رہی انگریزوں کی زیادتیوں کا بھرپور پردہ فاش کیا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں ہی پوری دنیا کے حالات بدلنے لگے۔ پہلی جنگ عظیم کے اثرات سے ہماری زندگی کے متعدد شعبے متاثر ہو گئے۔ ہندوستان میں بھی نئی نئی تحریکوں اور مختلف فلاحی اداروں نے جنم لینا شروع کیا۔ مثلاً تقسیم بنگال، مسلم لیگ (1906 آغا خاں خان) اور ہندوؤں کی بہت ساری جماعتوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ انڈین نیشنل کانگریس، ہوم رول لیگ، خلافت تحریک، گاندھی کی آمد اور تحریک آزادی ہند میں ان کی شرکت علی گڑھ کالج سے یونیورسٹی وغیرہ جیسی مختلف تحریکوں اور اداروں کا سیدھے ہماری صحافت پر بھی اثر پڑ گیا[12]۔

حسرت موہانی (1881 - 1951) علی گڑھ میں سیاست سے وابستہ ہوئے۔ اردو کے اس معتبر شاعر اور سیاست داں نے 1903 میں ''اردوئے معلیٰ'' تقریباً چودہ صفحات پر مشتمل رسالہ

رسالہ جاری کیا۔ اس رسالے میں نامور اردو قلم کاروں کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ رسالے کا مقصد مسلمانوں کو کانگریس میں شمولیت کروانا، حکومت کی پالیسیوں پر کڑی نظر رکھ کر ان پر اعتراضات، کسی حد تک یہ رسالہ کمیونسٹ پارٹی کا بھی حمایتی تھا۔ مکمل آزادی کا ریزولیوشن انھوں نے پیش کیا۔ 1908 میں سرکار کے خلاف مضمون لکھنے کے جرم میں دو سال کی قید اور پانچ سو روپیہ انھیں دینا پڑا، جس کے لیے انھیں اپنا قیمتی کتب خانہ نیلام کرنا پڑا۔ 1913 میں حکومت نے ان سے پھر تین ہزار روپے ضمانت کے طور پر مانگے جو وہ ادا نہ کر سکے۔

1904 میں لاہور سے "ہندوستانی" نام کا ایک اخبار شائع ہوا یہ اخبار ہندوستانیوں کا حمایتی، انگریزوں کا دشمن اور افریقہ و امریکہ میں ہندوستانیوں کے ساتھ ہو رہی زیادتیوں کے بارے میں بھی مضامین شائع کرتا تھا۔ 1902 میں "ترقی" کے نام سے لاہور سے ایک اخبار جاری کیا گیا۔ اس میں انڈین نیشنل کانگریس کی کارروائیوں کو شائع کیا جاتا تھا۔

1903 میں مراد آباد سے "مخبر عالم" جاری کیا گیا۔ اس کے کئی خصوصی شمارے شائع کیے گئے۔ اس اخبار کا خاص مقصد تھا ہندوستان میں بڑھتے ہوئے عیسائی مشن کا منہ توڑ جواب دینا۔

1904 میں مولوی انشاء اللہ نے اپنا اخبار "وطن" لاہور سے جاری کیا۔ پہلے پہل یہ اخبار زیادہ تر مسلمانوں کے حقوق کی ہی ترجمانی کرتا تھا لیکن 1907 میں اس نے اپنی پالیسی تبدیل کر کے اس میں تحریک آزادی کے بارے میں مضامین شائع کیے جس کے نتیجے میں 1930 میں اسے بند ہونا پڑا۔

1907 میں الہ آباد سے ایک انقلابی اخبار "سوراجیہ" کے نام سے بابو شانتی نرائن بھٹناگر نے شائع کیا۔ ایک باغیانہ مضمون لکھنے کے جرم میں انھیں دو سال کی قید اور پانچ سو روپیہ جرمانہ دینا پڑا۔ اس کے بعد مدیر بابو ہری داس کا بھی یہی حال ہوا۔ تیسرے ایڈیٹر نند گوپال (جو اس سے پہلے پانچ سال کی قید کاٹ چکے تھے) کو دس سال کی قید ہوئی۔ چوتھے ایڈیٹر لدھا رام کو دس سال کے لیے کالے پانی بھیجا گیا اور اس طرح 1910 میں اس اخبار کو بند ہونا پڑا۔

1907 میں کانپور سے مشہور رسالہ "زمانہ" شائع ہوا۔ اس کے پہلے مدیر شیو برت لال تھے اور اس کے [illegible] میں منشی پریم چند کا نام سب سے اہم ہے۔ یہ ایک سیاسی، معاشی،

مذہبی، اخلاقی، لسانی اور ادبی رسالہ بھی تھا۔ یہ انگریزوں کی پالیسیوں پر کھلم کھلا طنز کرتا تھا۔

1907 میں گوجرانوالہ سے ''انڈیا'' جاری کیا گیا۔ اس کے مدیر دینا ناتھ پر باغی ہونے پر مقدمات چلائے گئے اور اس طرح ان کا پریس ضبط کیا گیا۔

سید حیدر رضا دہلوی نے 1907 میں ''آفتاب'' ایک ہفتہ وار جاری کیا اور صرف ڈیڑھ سال کے بعد یہ اخبار بھی بند کیا گیا۔

1908 میں سودیشی تحریک کی حمایت میں ہفتہ وار ''انقلاب'' نکالا گیا۔ سراج الدین نے 1909 میں ''زمیندار'' نام کا ایک ہفتہ وار لاہور سے جاری کیا لیکن بہت جلد ان کا انتقال ہو گیا تو ان کے ہونہار بیٹے مولانا ظفر علی خاں نے اس اخبار کی ادارت سنبھال لی اور تحریک آزادی ہند کی حمایت میں بڑے بیباک مضامین چھاپتا رہا، جس کی وجہ سے سب سے زیادہ انگریزوں کے عتاب کا شکار یہ اخبار ہوا۔ اس کے باوجود بھی مولانا ظفر علی خاں برطانوی سامراج سے ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے اور اردو صحافت میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا۔ اس اخبار کے ساتھ عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر، چراغ حسن حسرت جیسے ادبا وابستہ رہے۔ برسوں تک یہ اخبار کانگریس کی ترجمانی کرتا رہا۔ یہ اخبار اپنے بلند آہنگ اور خطیبانہ انداز سے مشہور تھا اور ملکی سیاست کو اس نے کافی بڑھاوا دیا۔

1910 میں پن چندر پال نے ''سوراج'' کے نام سے لندن میں بنگالی، ہندی اور اردو میں ایک سہ لسانی اخبار نکالا۔ اس انقلابی شخص نے کلکتے سے بھی ''وندے ماترم'' نام کا ایک پرچہ نکالا۔

مولانا آزاد پہلے اپنے ''گلدستے'' شائع کرتے تھے اور پھر 1900 میں انھوں نے ایک ہفتہ وار رسالہ ''المصباح'' نکالا۔ اس کے بعد ''خدنگ نظر'' اور ایڈورڈ گزٹ سے ان کی وابستگی رہی۔ 1903 میں پندرہ برس کی ہی عمر میں اپنا رسالہ ''لسان الصدق'' کے نام سے جاری کیا۔ ''لسان الصدق'' کے بند ہو جانے کے بعد ابوالکلام کا تعلق 1906 میں ''وکیل'' امرتسر سے، 1907 میں دارالسلطنت کلکتہ سے رہا۔ 1908 میں جب انھیں ترکی، مصر اور عراق جیسے ممالک کا دورہ کرنے کا موقع ملا، تو انھوں نے وہاں کے اخبارات و رسائل کا بڑی سنجیدگی سے جائزہ لیا۔

جس سے ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کیوں نہ اپنے وطن میں بھی ایک معیاری رسالہ جاری کیا جائے، تو اس طرح 13 جولائی 1912 کو انھوں نے بڑی آن بان سے ہفتہ وار ''الہلال'' جاری کیا۔ اس رسالے میں مولانا آزاد عالم اسلام کے بارے میں مضامین مستقل طور پر چھاپتے تھے، کیونکہ ان کا مقصد تھا کہ ہندوستانی (خاص کر مسلمان) بیدار ہو جائیں تاکہ وہ جنگ آزادی اور گرم ہو رہی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ تو اس طرح یہ رسالہ اس حد تک اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوا کہ اس کی اشاعت یکدم چھتیس ہزار کاپیوں تک پہنچ گئی۔

مولانا آزاد نے دسمبر 1912 کے شمارے میں خود لکھا ہے:

> ''ہندوؤں کے لیے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا داخلِ حُبّ الوطنی ہے لیکن مسلمانوں کے لیے ایک فرض دینی ہے اور داخلِ جہاد فی سبیل اللہ۔ اللہ نے اُن کو اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے اور جہاد کے معنی میں ہر وہ کوشش داخل ہے جو حق اور صداقت اور انسانی بند و استبداد، غلامی توڑنے کے لیے کی جائے۔[13]''

رانچی سے رہائی کے بعد عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت اور مولانا آزاد کی نگرانی میں ہفتہ وار ''پیغام'' جاری ہوا۔ اس رسالے کی غرض و غایت وہ یوں بیان کرتے ہیں:

> ''اس رسالے کی اشاعت سے بالفعل صرف یہ مقصود ہے کہ موجودہ تحریک کے لیے تبلیغ و ہدایت کا ایک باقاعدہ سلسلہ قائم ہو جائے، بس اصل موضوع رسالے کا یہی ہے۔ البتہ گاہ گاہ علمی و مذہبی مضامین کے لیے بھی گنجائش نکالی جائے گی، تفسیر قرآن کے بعض مناسب وقت مباحث اور حصے بھی شائع ہوتے رہیں گے۔[14-15]''

اس رسالے کا مقصد مولانا کے سیاسی ذہن کی تشہیر و تعمیر بھی تھی۔

جون 1927 میں مولانا نے ''الہلال'' کو دوبارہ شائع کیا، لیکن اب مولانا کی مصروفیات اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ اس کی اشاعت میں بڑی بے قاعدگی سی آنے لگی۔ اس کے باوجود بھی وہ اپنے مضامین میں انسانی ہمدردی، سیاسی پختگی اور اسلامی رنگ کا خاص خیال وسیع تر

تناظر میں رکھتے تھے۔

''مدینہ'' مردھکان بجنور سے یکم مئی 1912 میں مولوی محمد مجید حسن (وفات 1966) نے جاری کیا۔ اس میں ہندوستانی سیاست کے مختلف گوشوں کے متعلق مضامین چھپتے تھے۔

ہندوستان کی صحافتی اور سیاسی تاریخ میں مولانا محمد علی جوہر (10 دسمبر 1878-4 جنوری 1931) کا نام ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ بہ یک وقت ایک سیاست داں، ایک عالم، دانشور اور اردو انگریزی کے نامور صحافی تھے۔ ان کے انگریزی ہفتہ وار ''کامریڈ'' اور اردو روزنامہ ''ہمدرد'' کی فائلیں آج بھی علم و ادب کے قدر دان اور ریسرچ اسکالرس دیکھتے ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر نے اعلیٰ تعلیم آکسفورڈ سے حاصل کی۔ وہاں وہ لندن ٹائمز، ڈیلی نیوز، کرنیکل مانیٹر جیسے انگریزی اخبارات کا مطالعہ بڑی گہرائی اور تکنیکی طور پر کرتے تھے۔

''کامریڈ'' کی غیر معمولی مقبولیت کے پیش نظر مولانا نے اپنا ایک اردو روزنامہ ''ہمدرد'' کے نام سے 22 فروری 1913 کو کوچہ چیلان دہلی سے جاری کیا۔ ''ہمدرد'' پہلے پہل صرف دو صفحات پر ہی مشتمل ہوتا تھا اور پھر آٹھ صفحات پر شائع ہونے لگا۔ ''ہمدرد'' کے لکھنے والوں میں عبدالحلیم شرر، سید جالب دہلوی، قاضی عبدالغفار، سید ہاشم فرید آبادی، محمد فاروق دیوانہ گورکھپوری، قاری عباس حسین گورکھپوری، قاضی عبدالعزیز منصور پوری، سید محمد جعفری، مولانا عبدالماجد دریابادی وغیرہ خاص طور پر شامل ہیں۔ دیسی خبروں کے ساتھ ساتھ اس کے لیے وہ بین الاقوامی خبر رساں ایجنسیوں اور انگریزی اخبارات سے خبریں لیتے تھے۔ ''ہمدرد'' میں عالمی صورتحال، ہندوستانی سیاست کے مختلف پیچ و خم، مسلمانوں کے مسائل، قومی یکجہتی اور ہندو مسلم اتحاد پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ مولانا کا صحافتی شعور ہمیں ان کی نامکمل سوانح عمری My Life-A Fragment سے واضح ہو جاتا ہے۔

1916 میں سید جالب دہلوی نے ''ہمدم'' لکھنؤ سے جاری کیا۔ یہ خلافت تحریک کا حامی تھا۔ 1918 میں محمد اشفاق حسین صدیقی نے ''رہنما'' مراد آباد سے جاری کیا۔ یہ اخبار برطانوی قوانین کی سخت مخالفت کرتا تھا۔

1919 میں لاہور سے ''سیاست'' تحریک خلافت کی ترجمانی کے لیے جاری کیا گیا۔

اس اخبار پر حکومت نے کڑی نظر رکھی۔ 1921 میں اس کے ایڈیٹر حبیب اللہ کو تین سال کی قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ یہ اخبار عوام و خواص میں کافی مقبولیت حاصل کر گیا۔

کانگریس پارٹی نے اپنی ترجمانی کے لیے 1919 میں دہلی سے اپنا اخبار ''کانگریس'' نکالا، لالہ شنکر اس کے مہتمم تھے۔

مہاشہ خوشحال چند نے 1923 میں اخبار ''ملاپ'' نکالا۔ اس اخبار نے انگریزوں کے خلاف کارٹون بھی شائع کیے اور ملک کی آزادی کے لیے لوگوں کا جذبہ بڑھایا۔

1930 میں ''پیغام'' پشاور سے ایک نڈر صحافی سید میر عالم شاہ نے جاری کیا لیکن اس اخبار کی بیباکی انتہا پسندی تک پہنچ گئی، جس کے نتیجے میں اخبار کے پرچے حکومت نے ضبط کر لیے اور ایڈیٹر کو تین سال کی قید ہو گئی۔

''انتخاب'' لکھنؤ سے سیفی ندوی نے 1934 میں جاری کیا۔ اس کے لکھنے والوں میں نیاز فتح پوری، اثر لکھنوی، جوش ملیح آبادی، شاد عارفی، حجاب اسماعیل (امتیاز علی تاج کی بیوی) شوکت تھانوی، عمر انصاری، حامد اللہ افسر جیسے لوگ خاص طور پر شامل تھے۔

آزادی سے پہلے ہلال احمد زبیری نے ''الجمعیۃ'' سے الگ ہو کر ''انصاری'' ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے نام پر جاری کیا۔ اسی طرح معین الدین حارث جامعی نے حکیم اجمل خاں سے عقیدت رکھنے کے طور پر اپنا پرچہ ''اجمل'' کے نام سے جاری کیا۔ حافظ علی بہادر خان نے بمبئی سے آزادی کے متوالوں کے لیے ''ہلال'' اپنا اخبار نکالا۔ اس دور میں مولانا عبدالوحید صدیقی نے ''نئی دنیا'' دہلی سے جاری کیا۔ آزادی کی لہروں کے ساتھ ہی لاہور سے مہاشہ کرشن نے ''پرتاپ''، لالہ خوشحال چند نے ''ملاپ'' سوامی شردھانند نے ''تیج'' نکالا۔ فرقہ پرستی میں شردھانند کا قتل ہوا اور ان کے اخبار کے ساتھ دیش بندھو گپتا، منشی گوپی ناتھ امن اور جمنا داس اختر جیسے صحافی وابستہ رہے، جو ان کا مشن بہت آگے لے گئے۔ آزادی کے دنوں میں ہی ''قومی آواز'' بڑی شان سے نکلا۔ ''امروز'' میاں افتخار الدین نے نکالا، جو نہرو خاندان کا دوست اور حمایتی تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران دہلی سے ''جنگ'' نکلا پھر وہ پاکستان چلا گیا اور اسی کے ساتھ ''نوائے وقت'' لاہور سے اور ''انقلاب'' (بمبئی) جیسے مختلف اخبارات نکالے گئے، جن کا

مقصد اس دور کے حالات کو بیان کرنے اور اب اچھے اچھے اشتہار لینے کا بھی تھا۔

اُسی دور میں دیانرائن نگم "زمانہ" سا غر نظامی "ایشیا" انیس الرحمٰن "نئی دنیا" جوش ملیح آبادی "کلیم" سیماب اکبرآبادی "شاعر" جیسے ادبا نے اپنے رسالے جاری کیے۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ تحریک آزادی ہند کے دوران اردو کے کئی اخبارات اور رسائل مختلف ممالک میں ہندوستان سے باہر بھی ہندوستانیوں کے ہی ہاتھوں چھپتے رہتے تھے، جو کسی نہ کسی صورت میں ہندوستان کے سیاسی و سماجی مسائل پر بات کرتے تھے۔ ان اخبارات و رسائل کی فہرست بہت لمبی ہے اور یہ موضوع ایک الگ ضخیم مقالے کا تقاضا کرتا ہے لیکن یہاں صرف ان کا خاکہ ہی پیش کیا جائے گا۔

- "ترجمان شوق" قسطنطنیہ ادارہ جاہ باب عالی، 23 مارچ 1878، پندرہ روزہ، مالک اسکندر آفندی۔
- "سلطان الاخبار" ترکی، ہفتہ وار، یکم جنوری 1880، مہتمم منشی سید قادر بخش۔
- "ہندوستان رسالہ" 49 منیر پارک روڈ لندن، اگست 1884، راجہ رائے سنگھ۔
- "العین" 1905 چین، مولانا مقبول الرحمٰن شوکت علی۔
- "انڈین سوشلسٹ" شیاما جی کرشن ورما، برطانیہ 1905۔
- "سرکلر آزادی" لالہ امرناتھ، 1907۔ 1211 مکنڈ یا اسٹریٹ ارک امریکہ۔
- رسالہ "اسلامک فریٹرنٹی" مولانا برکت اللہ بھوپالی، نیویارک، 1910۔
- "سوراج" بابو بین چندر پال، 1910، لندن۔
- ہندوستانی کینڈا 1912۔
- "انقلاب" 1912، چودھری رحمت علی، فرانس۔
- "غدر" 1913، کیلیفورنیا (یگانتر آشرم جماعت کی ادارت میں نکلتا تھا)۔
- "جہان اسلام" 1914، قسطنطنیہ (اردو مدیر ابوسعید)۔
- "الاصلاح" 1925، فرانس پھر جرمنی ہفتہ وار، مدیر مولانا برکت اللہ بھوپالی[16]۔
- 1930 میں سجاد ظہیر نے کمیونزم سے متاثر ہو کر لندن میں اپنی پڑھائی کے دوران اپنے چند

ترقی پسند ساتھیوں سے مل کر ایک اخبار ''بھارت'' کے نام سے نکالا۔ ان کا مقصد تھا ہندوستان میں چل رہی جنگِ آزادی کو بھڑکانا اور یہاں نئے نئے خیالات کے لیے زمین ہموار کرنا۔

مذکورہ بالا اخبارات و رسائل سے تعلق رکھنے والے بیشتر لوگ 1857 کے خونیں واقعات سے متاثر ہوئے تھے اور اب وہ ممالک غیر میں اپنی کئی مجبوریوں سے کام کر رہے تھے لیکن پردیس میں رہ کر بھی وہ اپنے وطن کی محبت سے سرشار تھے اور اپنے ہم وطنوں کے دُکھ درد کو وہ لوگ بڑی شدت کے ساتھ محسوس کر رہے تھے اور اس کے لیے جہاں جہاں وہ لوگ تھے، وہاں وہاں ان کی کوششیں جاری رہیں۔

مجموعی طور پر انھوں نے ملک غیر میں رہنے والے ہندوستانیوں کو متحد کیا، انھیں اپنی قومیت کا احساس دلایا۔ ہندوستان میں چل رہی تحریک آزادی کو فروغ دیا۔ یہاں کی صورتحال سے پوری دنیا کو آگاہ کیا، جس کا براہِ راست اثر (یا کسی حد تک دباؤ بھی ہم کہیں گے) حکومت برطانیہ پر پڑنے لگا اور اس طرح ہم ان کی خدمات کو جنگ آزادی کے تئیں کبھی نہیں بھول سکتے ہیں۔

''الندوہ'' یہ رسالہ ندوۃ العلما لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے اور اس کے ساتھ علامہ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی اور حبیب الرحمٰن خاں شیروانی جیسے لوگ وابستہ رہے۔ یہ ایک اعلیٰ معیاری علمی رسالہ ہے جس میں اسلام اور ہندوستان کی معاشرت کے بارے میں سنجیدہ مضامین لکھے جاتے ہیں۔ مختلف مسلکوں کے مابین فرق کو مٹانے کے لیے کوشش بھی اس میگزین کے ذریعے کی جاتی ہے۔

''الناظر'' یہ ایک علمی و ادبی رسالہ ظفر الملک علوی کی ادارت میں بیسویں صدی کے شروع سے لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے ''سچ'' کے عنوان سے اپنا رسالہ جاری کیا۔ چونکہ مولانا خود مذہبی آدمی تھے۔ اس لیے اس رسالے میں زیادہ تر مذہبی باتیں ہی شائع کی جاتی تھیں لیکن مولانا کا رویہ کچھ لبرل تھا اور وہ اس میں ہمیشہ جدت چاہتے تھے۔ اس میں تحریک خلافت کے

بارے میں مضامین چھپتے تھے اور ہندو مسلم ایکتا کو بڑھانے کے لیے خواجہ حسن نظامی جیسے دانشوروں سے مضامین لکھوائے جاتے تھے۔

علامہ نیاز فتح پوری نے ''نگار'' جاری کیا۔ یہ ایک علمی و ادبی رسالہ تھا جس میں تنقیدی نوعیت کے مضامین شائع کیے جاتے تھے۔ اس کے کئی خصوصی شمارے بھی شائع کیے گئے، جن میں ہندی شاعری نمبر خاص اہمیت رکھتا ہے۔

ہندوستان میں اخبارات کے شروعاتی دور کا جب جائزہ لیا جاتا ہے، تو ہمیں اس بات کا صاف پتہ چلتا ہے کہ ان میں ماسوائے چند انگریزی اخبارات کے سبھی جنگ آزادی کی کسی نہ کسی صورت میں سپورٹ کر رہے تھے۔ اس لیے مہدی حسن نے لکھا ہے:

> ''ہندوستانی اخبارات میں سے بعض اخبارات کا مزاج ابتدا ہی سے باغیانہ تھا۔ انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں مقامی باشندوں نے فارسی، بنگالی، اُردو، ہندی اور انگریزی میں اخبار جاری کرنے شروع کیے تھے۔ ان کا مواد بظاہر بڑا سیدھا سادا ہوتا تھا لیکن اس مواد میں دبے دبے غم و غصے کے جذبات نظر آتے تھے۔ اگر 1857 کی ابتدا سے ہندوستانی اخبارات کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ 1857 کی ابتدا ہی سے ہندوستان میں بے چینی اور بغاوت کے آثار پیدا ہو رہے تھے اور اخبارات کا لہجہ بھی تند اور تیز اور تلخ ہوتا جا رہا تھا۔ ان اخبارات میں خاص طور پر لکھنؤ، دہلی، آگرہ، راجپوتانہ، انبالہ، پھلور، دینا پور اور میرٹھ کے اخبارات شامل تھے۔ البتہ کلکتہ، مدراس، بمبئی اور لاہور کے زیادہ تر اخبار انگریزوں کے وفادار اور حامی تھے۔ [17]''

یہ تو تھی بات اُردو صحافت کی آغاز سے لے کر ہندوستان کے آزاد ہونے تک کی، لیکن آزادی ملنے کے ساتھ ہی بھارت ایک عظیم ملک دو حصّوں میں بٹ گیا اور دونوں اطراف سے پھر ہزاروں طرح کے مسائل بھی پیدا ہوئے، جن میں اردو زبان کا بھی ایک بڑا مسئلہ کھڑا ہوا۔ مگر تب سے لے کر آج تک اردو صحافت اپنا کردار ہمیشہ عصری تقاضوں کے تحت نبھاتی رہی۔ ہزارے

کے ساتھ ہی بہت سارے اخبارات و رسائل نے وہاں سے یہاں اور یہاں سے وہاں ہجرت کی، ان میں ''ملاپ، وندے ماترم، ویر بھارت، پربھات'' اُس خطے سے یہاں آ گئے اور اسی طرح اس خطے کے چند اخبارات بھی وہاں چلے گئے۔

ہندوستان میں اگرچہ اردو سرکاری زبان نہیں رہی، لیکن اس کی عوامی مقبولیت سے کسی کو بھی انکار تو نہیں ہو سکا۔ یہاں بچوں کے رسائل (بچوں کا ہلال، پیام تعلیم، اُمنگ) ادبی رسائل (آجکل، شاعر، سب رس، ایوان اُردو، اردو دنیا، ہماری زبان) نیم ادبی، تہذیبی اور تعلیمی رسائل، خواتین کے رسائل، طب و تکنیکی اور سائنٹفک رسائل (فکر صحت، سائنس کی دنیا) ہفتہ وار، روزنامے وغیرہ لاکھوں کی تعداد میں چھپتے رہتے ہیں۔

اگرچہ برطانوی سامراج سے آزاد ہونے کا مسئلہ تو حل ہوا، لیکن قومی یکجہتی ایک ایسی چیز ہے جس کی ہر دور میں ضرورت رہے گی، تو اس میں کچھ واقعات کو چھوڑ کر اردو کے تمام اخبارات و رسائل ہمیشہ پیش پیش رہے۔ آج ہندوستان میں مختلف سرکاری رسائل جیسے نیا دور، آجکل، اُردو دنیا وغیرہ کے ساتھ ساتھ متعدد اردو کے نجی اخبارات اور رسائل قومی یکجہتی کو فروغ دینے میں کسی بھی طرح پیچھے نہیں ہیں۔ خاص کر سہارا کمیونکیشن سے چھپنے والا راشٹریہ سہارا اور عالمی سہارا مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ البتہ کہیں کہیں اردو میں کچھ ایسا بھی ہوا ہے کہ مجتہد العصر مولانا وحید الدین خاں صاحب یہ لکھنے کے لیے مجبور ہو گئے:

> ''.....اردو صحافت میں عالباً سرسید پہلے قابلِ ذکر شخص ہیں، جنھوں نے یہ بتایا کہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ ان کی اپنی غفلت کا مسئلہ ہے نہ کہ دوسروں کے ظلم اور تعصب کا مسئلہ۔ عام صحافیوں نے مسلمانوں کو یا تو اغیار کے ظلم کی مبالغہ آمیز داستانیں سنائیں، جس کا نتیجہ صرف نفرت تھا۔ یا اُنھوں نے ماضی کی عظمت کے قصیدے پڑھے جس کا واحد ممکن انجام صرف یہ تھا کہ مسلمان جھوٹے فخر میں مبتلا ہو جائیں، جو چیز اپنی نہیں ہے، اس کو ''اپنے اسلاف'' کی لفظی منطق سے اپنی بنا کر فرضی طور پر خوش ہوتے ہیں۔ [18]''

دراصل یہ مسلمانوں کا مسئلہ ہے نہ کہ ہم اس میں پوری صحافت کو دیکھ سکتے ہیں۔ اب کسی حد تک بدلاؤ آ رہا ہے۔ جو اردو اخبار یا رسائل دنیا کی بلندیوں کو چھونا چاہتے ہیں وہ خود بخود اپنے خیالات میں عالمی یکجہتی کو مدنظر رکھ کر آگے بڑھ سکتے ہیں۔

ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق پورے ملک میں 2844 اردو اخبارات و جرائد شائع ہو رہے ہیں جن کی مجموعی سرکولیشن 61 لاکھ کے قریب ہے، جبکہ ہندوستان میں روزانہ 525 اردو روزنامے شائع ہوتے ہیں جن کی سرکولیشن 3614692 ہے۔ اس حساب سے انگریزی اور ہندی کے بعد اردو صحافت کا یہاں تیسرا نمبر آتا ہے[19]۔

اس بات کے مدنظر مرکزی سرکار اور ریاستی سرکاروں کو چاہیے کہ وہ اردو صحافت کو فروغ دینے میں کوئی بھی کوتاہی نہ کریں۔ کیونکہ عوامی ذرائع ابلاغ کا اردو زبان ہی بہترین ذریعہ ہے۔ چونکہ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے اور اردو سے بڑھ کر اس ملک کی کوئی اور زبان ایسی نہیں ہو سکتی ہے جس سے ہم لوگوں میں آپسی بھائی چارے کو بڑھا سکتے ہیں، اب رہی انگریزی زبان وہ تو اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہی اپنے خاص مقاصد یا تعلیم کے لیے استعمال میں لا سکتے ہیں نہ کہ اس کے ذریعہ ہم روزمرہ زندگی کی آپسی کنفلکٹ کر کے قومی یکجہتی کو فروغ دے سکتے ہیں اور قومی یکجہتی ہی ملک کی سلامتی اور ترقی کی ضمانت ہے بقول کشور عثمانی:۔

دشمنی دل سے بھلا دو دوستی پیدا کرو زندگی میں اک شعور زندگی پیدا کرو
چاہتے ہو گر زمانے میں رہے اپنا وقار ہند والو اتحاد باہمی پیدا کرو[20]

حوالے:

1- اُردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر سید مجاور حسین، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ۔ دوسرا ایڈیشن 2004، ص:71

2- بہت سارے لوگ امیر خسرو (متوفی 1324) کے بجائے مسعود سعد سلمان (متوفی 1121) کو اُردو ر ہندی کا پہلا شاعر مانتے ہیں۔ جن میں ڈاکٹر جمیل جالبی (تاریخ ادب اردو ص:23)، حافظ محمود شیرانی (پنجاب میں اردو، ص:60) اور ڈاکٹر انور سدید (اردو ادب کی مختصر تاریخ، اے ایچ پبلشرز لاہور، 1996، ص:61) خاص شامل ہیں۔

3- ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری، گوپی چند نارنگ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2003، ص:285

4- A New look at Modern Indian History. B.L.Grover&Alka Metha. S.Chand & Company Ltd. New Delhi 26th Edition. 2009.p.267-68.

5- نیا دور لکھنؤ، محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش جلد (68) شمارہ 6، (منشی دوارکا پرشاد اُفق نمبر) ستمبر 2014، ص:146

6- تحریک آزادی میں اردو صحافت کا حصہ ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی، اورنگ آباد، مہاراشٹر 2003، ص:5-4

7- ایوان اردو دہلی، اکتوبر 2015، جلد 29، شمارہ 6، ص:72

8- نیا دور (لکھنؤ) انقلاب 1857 نمبر جلد 62 نمبر 2-1 اپریل مئی 2007، محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش، ص:158

9- بحوالہ ایضاً ص:183

10- ''آجکل'' نئی دہلی اکتوبر 2015، جلد 76، شمارہ 3، پبلی کیشنز ڈویژن سوچنا بھون، سی جی او کمپلیکس، لودھی روڈ نئی دہلی، ص:17

11- بحوالہ: اخبار کی کہانی، غلام حیدر۔ ترقی اُردو بیورو نئی دہلی، 1988، ص:128

12- ان مختلف واقعات کو مزید جاننے کے لیے ملاحظہ فرمایئے:

Encyclopedia of Indian Events & Dates. S.B.Bhattacharji Sterling Publishers

Pvt.ltd. Second Edition.1987,p.155 onwards.

13- بحوالہ: مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے، مرتبہ خلیق انجم، اردو اکادمی دہلی، ساتواں ایڈیشن 2003، ص:413

14- ابوالکلام آزاد عبدالقوی دسنوی، ساہتیہ اکادمی، دوسرا ایڈیشن 2002، ص:150

15- سلسلہ ابوالکلام آزاد صدی تقریبات کے دوران اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ نے انتخاب ہفت وار "پیغام" 1988، صفحات 112 پروفیسر محمود الٰہی سے ترتیب دلوا کر شائع کیا۔

16- امداد صابری کے مضمون "غیر ممالک میں اردو کے انقلابی اخبارات و رسائل" سے استفادہ کیا گیا۔ بشمول کتاب: اُردو صحافت مرتب انور علی دہلوی۔ اردو اکادمی دہلی 1987، ص:63 تا 84۔

17- جدید ابلاغ عام۔ مہدی حسن، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد 1990، ص:93

18- اردو صحافت مرتبہ انور علی دہلوی، اردو اکادمی دہلی 1987، ص:71-270

19- اردو اور عوامی ذرائع ابلاغ۔ مرتبین محمد شاہد حسین، اظہار عثمانی، اردو اکادمی دہلی، 2007، ص:70-69

20- بحوالہ: داستان ہند، ڈاکٹر عزیز برنی۔ فرید بک ڈپو، 2003، ص:479

دوسرا باب

اردو صحافت کا منظر

پاکستان میں اردو صحافت: ایک سرسری جائزہ

نصر ملک
کوپن ہیگن۔ ڈنمارک

متحدہ ہندوستان میں اردو اخبار نویسی کی ابتدا چھاپہ خانے کی ایجاد اور اس کے رواج پانے سے ہوئی اور ایک طویل مدت کے بعد، مختلف نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے اردو صحافت نے وہ صورت اختیار کی ہے جسے ہم آج دیکھتے ہیں۔ ہندوستان میں اردو صحافت کی ابتدا کا ذکر کیا جائے تو کلکتہ سے 1822 میں شائع ہونے والے اخبار "جام جہاں نما" کو اردو کا سب سے پہلا اخبار مانا جاتا ہے۔ لیکن "جام جہاں نما" میں اردو کے ساتھ فارسی کے صفحات بھی ہوتے تھے، گویا یہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں ہوتا تھا۔ اس پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو پہلا خالص اردو اخبار "دہلی اخبار" تھا جسے مولوی باقر نے جاری کیا تھا۔ یہ ہندوستانی قوم پرستی کا زبردست حامی تھا اور 1857 کی جنگ آزادی میں اس کا بڑا اہم کردار تھا اور اُس زمانے میں اِس اخبار نے سامراجی حکومت کے خلاف خوب لکھا۔ انگریزی سرکار کے ہاں معتوب ٹھہرا لیکن کبھی بھی اپنی آزاد پالیسی پر آنچ نہ آنے دی اور یہی وجہ تھی مولوی باقر کو گولیوں کا سامنا کرنا پڑا اور اس طرح آزادی کی جدوجہد میں،

اردو صحافت کے پہلے قوم پرست اور محب وطن شہید کا درجہ پایا۔

ہندوستان میں اردو کا دوسرا اخبار "سیدالاخبار" تھا جسے سرسید کے بھائی سید محمد نے دہلی سے جاری کیا اور جس کے ذریعے خود سرسید عوام سے متعارف ہوئے۔ اس کے بعد اردو صحافت کا جو دور شروع ہوا اس میں مولانا ظفر علی خان، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی اور مولانا عبدالمجید سالک جیسے محب وطن، بیباک و نڈر قلم کاروں نے اردو صحافت کو استعماریت سے آزادی کے لیے بطور ہتھیار استعمال کیا اور لاہور، امرتسر، الٰہ آباد، لکھنؤ، آگرہ، بے پور، بمبئی، کانپور، حیدرآباد، کلکتہ اور کشمیر غرضیکہ پورے ملک میں اردو اخبارات کا بول بالا ہوا۔

لاہور کے پیسہ اخبار، زمیندار، پرتاپ اور کوہ نور، امرتسر کا وکیل اور اُدھر نورالانوار، البلال اور البلاغ، ریاست، آصف الاخبار اور دبدبۂ سکندری کا طوطی بولنے لگا اور روزناموں اور ہفتہ وار اخبارات و رسائل نے اردو صحافت میں ایک نیا ولولہ پیدا کر دیا جس نے لوگوں کے دلوں میں آزادی کی لہر دوڑا دی اور اردو صحافت نے ایک منفرد مقام اور لوگوں کا اعتماد حاصل کر لیا۔

اردو اخبارات کے ساتھ، بیسویں صدی کے اردو رسائل و جرائد نے بھی سیاست و علم و ادب کی خوب آبیاری کی۔ سرسید کا تہذیب الاخلاق، سید امتیاز علی کا کہکشاں، مولانا آزاد کا لسان الصدق، حکیم محمد یوسف کا نیرنگ خیال، خواجہ حسن نظامی کا نظام المشائخ، راشد الخیری کا عصمت، سر عبدالقادر کا مخزن، ملک محمد الدین اعوان کا صوفی، شاہد دہلوی کا ساقی اور مولوی عبدالحق کا سائنٹیفک اردو وغیرہ وغیرہ۔ اس مختصر سے وقت میں ان کے نام لیے جا رہے ہیں یہ سب رسائل و جرائد علم و ادب اور سیاست و ثقافت کی تفہیم اشاعت ترویج کرتے رہے اور قوم کی راہبری میں پیش پیش رہے اور قوم کے سیاسی، ثقافتی اور اخلاقی معیار کی تعمیر کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔

ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کے بعد اردو اخبارات بھی ہوا کے دوش پر آ گئے اور وہ ہندوستانی و پاکستانی اخبارات بن گئے۔ ہندوستان کے اردو روزناموں پر اگر ایک [illegible] نگاہ ڈالی جائے تو [illegible] سیاست، انقلاب، سیاست، ہندوستان [illegible] سیاست، [illegible] جیسے [illegible] دکھائی دیتے ہیں اور [illegible] اردو [illegible] ایک [illegible] ہے [illegible] اردو [illegible]

عالمی سہارا، شاعر، انشا، بانگ حرا، تعمیر حیات، معارف، نیا دور، شب خون اور منصف وغیرہ۔

جس طرح میں نے ہندوستان کی موجودہ اردو صحافت کے بارے میں اپنی محدود معلومات کا ذکر کیا ہے، پاکستان کی موجودہ اردو صحافت کے متعلق بھی میرا یہی خیال ہے، لیکن یہ کہنا ہرگز جائز نہیں اور نہ ہی میرا مقصد ہے کہ پاکستان میں صحافت سے منسلک لوگ آزادی اظہار یا حرف کی حرمت سے آگاہ نہیں۔ میرا مقام و مرتبہ یہ نہیں کہ میں پاکستان جیسے ملک کے وسیع شعبۂ صحافت سے وابستہ لوگوں کی دیانت، ذہانت اور پیشہ ورانہ صلاحیت کا جائزہ لوں۔

لیکن یہ دیکھنے اور کہنے کی اجازت ہونی چاہیے کہ پاکستان میں اردو میڈیا اور اردو صحافت سے وابستہ لوگوں کی صورت حال کیا ہے۔ تو آیئے پہلے دیکھتے ہیں کہ اس بارے میں خود پاکستان کے اپنے تجزیہ کار کیا کہتے ہیں۔

شکیل چودھری پاکستان کے بڑے معتبر اور معروف سیاسی تجزیہ کار اور محقق و سیاسی مبصر ہیں ان کے تجزیے عالمی اخبارات و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ پاکستان میں اردو صحافت سے متعلق اُن کے تجزیے کا ایک اقتباس پیش ہے۔ ان کا یہ تجزیہ معروف انگریزی جریدے "View point" میں شائع ہوا ہے۔ شکیل چودھری اپنے اس تجزیے میں اردو صحافت کو درپیش مسائل کا بڑی گہرائی سے تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''پاکستان کا اردو میڈیا، شاید دنیا میں سب سے زیادہ غیر ذمہ دار، لاپروا اور ورغلانے والا میڈیا ہے۔ یہ دن رات سازشی نظریات و تخیلات کو فروغ دیتا ہے۔ علم صحافت کے ماہرین کے بجائے زیادہ تر مقالہ نویس اور کالم نویس خام پروپیگنڈے، جذباتیت اور تعصب اور مفروضات پر انحصار کرتے ہیں اور یہ حقائق ایک غیر جانبدار، بیباک و نڈر صحافت کی راہ میں کنکریٹ کی دیوار ہوتے ہیں۔ حقائق کی تحقیق و تصدیق تو دور کی بات ہے اس کا سرے سے کوئی تصور ہی نہیں اور یہی وجہ ہے کہ کچھ پاکستانی اخبارات جن میں قومی سطح پر شائع ہونے والے اخبارات بھی شامل ہیں، لاپروا اور خود متضاد رویہ رکھتے ہیں۔''

یہ تو تھا محقق و مبصر جناب شکیل چودھری کا تجزیہ۔ برصغیر میں اردو صحافت نے بیسویں صدی میں جو زندہ و بیدار قومی شعور پیدا کیا تھا پاکستان کے قیام کے بعد اردو اخبارات وہ کردار ادا کرنے میں ناکام ہو گئے اور چند ہی سال بعد وہ حکومتی، سیاسی سازشی عناصر کا شکار ہو گئے یہاں تک کہ یہاں دہلی ہی سے پاکستان منتقل ہو جانے والا ایک اخبار جو آج پاکستان کا سب سے بڑا میڈیا گروپ شمار ہوتا ہے وہ بھی خود کو محفوظ نہ رکھ سکا اور یہی وجہ ہے پاکستان کے عوام آج تک اُن وعدوں کے پورا ہونے کے منتظر ہیں جو قیام پاکستان کی تحریک کے دوران ان کے قومی رہنماؤں، سیاستدانوں اور علمائے کرام نے اُن سے کیے تھے اور جس خوش بختی کے لیے انھیں سہانے خواب دکھائے گئے تھے۔ خیر!

پاکستان کے تین بڑے اردو میڈیا گروپوں اور بیشتر دوسرے روزانہ اخبارات اور ہفتہ وار نیم سیاسی و ثقافتی رسائل و جرائد خوب بنا سنوار کر جو "ہفتہ وار خصوصی ایڈیشن" مختلف عنوانات کے تحت مثلاً اسلامی ایڈیشن، ادبی و سیاسی ایڈیشن وغیرہ شائع کرتے ہیں، ان میں بے ضرر سطحی معلومات اور عام طور پر لسانی و مذہبی فرقہ بندی کو ہوا دی جاتی ہے اور سیاسی ایڈیشن تو محض اُن سیاسی حلقوں کو خوش کرنے کے لیے ہوتے ہیں جن سے اخبارات کے مالکان کا مفاد وابستہ ہوتا ہے اور پھر تضاد کی حد ہے کہ ایک طرف تو یہ بڑے بڑے اخبارات ملک میں عریانی و فحاشی بڑھ جانے کے خلاف علمائے کرام کی تقاریر و فتوے شائع کرتے ہیں اور دوسری طرف خود ایسے "فلمی ایڈیشن" شائع کرتے اور خواتین فلمی ستاروں کی ایسی ایسی نیم عریاں رنگین تصاویر شائع کرتے ہیں جو ان کے متضاد رویے کی گواہی دے رہی ہوتی ہیں۔ پاکستان کے اردو اخبارات کا یہ رویہ قیام پاکستان کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔ البتہ نوائے وقت، کوہستان اور چند ایک دوسرے اخبارات کچھ حد تک صحافیانہ ایمانداری کی روش پر قائم رہے۔ لیکن جب صدر جنرل محمد ایوب خان نے مارشل لا لگا کر ڈیڑھ اینٹ کی اپنی مسجد کی بنیاد رکھی تو ہر کسی کو ایک ہی پلڑے میں ڈال دیا گیا۔ اس عہد کی پاکستانی صحافت کی تاریخ بڑی تلخ ہے جب کئی ایک اخبارات کو بحق سرکار ضبط یا بند کر دیا گیا اور ایک نیشنل پریس ٹرسٹ قائم کر کے اخبارات پر حکومتی اجارہ داری ٹھونس دی گئی اور پھر یکے بعد دیگرے مارشل لائی حکومتوں اور خود جمہوری منتخب شدہ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے مختصر دور

حکومت اور اُس کے بعد جنرل محمد ضیاء الحق کے دور میں اخبارات اور صحافیوں کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا گیا، ان پر کوڑے برسائے گئے، کئی ایک اخبارات کو بند کر دیا گیا، یہ ایک بڑی لمبی اور تکلیف دہ کہانی ہے جس کے لیے اس مختصر سے مضمون میں، وقت کی کمی کو مدنظر رکھتے ہوئے میرے لیے تفصیل میں جانا ممکن نہیں۔ جنرل پرویز مشرف کے دور میں صحافت کو آزادی ملی تو ملک میں متعدد ٹیلی ویژن اور ایف ایم ریڈیو اسٹیشن قائم ہو جانے کے ساتھ ساتھ اردو اخبارات بھی بڑی تعداد میں شائع ہونے لگے۔ ڈیکلیریشن جاری ہوئے لیکن اس دور میں بھی آمرانہ سوچ صحافت پر اپنی گرفت رکھنے میں کسی نہ کسی طرح متحرک رہی اور جیو جیسے ٹی وی کی نشریات بند کر دی گئیں وغیرہ وغیرہ۔

اب جو موجودہ صورت حال ہے اس کے متعلق عرض ہے کہ سری لنکا کے عالمی شہرت یافتہ میڈیا ایکسپرٹ شری Ranga kalansooriya (رنگا کلان سوریہ) نے برصغیر کی صحافتی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خطے میں پاکستان، صحافیوں کے لیے ایک خطرناک ملک ہے۔ ان کی اس رائے سے جنیوا میں صحافیوں کی عالمی فیڈریشن بھی متفق ہے۔ شری رنگا کلان سوریہ اپنے تجزیے میں لکھتے ہیں کہ پاکستان میں اب تک جتنے صحافیوں کو مارا جا چکا ہے اگر اُس تعداد کو سامنے رکھا جائے تو ملک میں ہر اڑتیس دن کے بعد ایک صحافی قتل کر دیا جاتا ہے۔ پاکستانی صحافیوں پر مذہبی تنظیموں اور سیاسی پارٹیوں کے ساتھ ساتھ تشدد پسند اور دہشت گرد تنظیموں کا دباؤ تو کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں لیکن اس کے علاوہ صحافی خود اخباری صنعت کے اس شدید دباؤ کا بھی شکار ہیں جو اخبارات کو ایک ''کارپوریٹ'' میں بدل دیے جانے سے ان کے کندھوں پر آن گرا ہے۔ پاکستانی صحافت کو پابندیوں کے ایک طویل دور کے بعد اب جہاں کچھ آزادی نصیب ہوئی ہے اور وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کی کوشش کر رہی ہے وہاں میڈیا مالکان، سرمایہ کار اور مشتہرین کے درمیان ''کاروباری گٹھ جوڑ'' نے ذرائع ابلاغ کی سچ لکھنے اور غیر جانبدارانہ رائے کا اظہار کرنے اور خبریں مرتب کرنے کی صلاحیتوں کو جکڑ رکھا ہے اور انھیں محدود کر دیا ہے، کیونکہ تجارتی مفادات واقدار صحافتی اخلاقیات، اور پیشہ ورانہ رپورٹنگ کو برقرار رکھنے میں رکاوٹ بنی ہوئی ہیں اور پاکستانی صحافی ان زنجیروں کو توڑنے کی سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں اور اس میں بہت

حد تک کامیابی حاصل کر رہے ہیں۔ فی الوقت چالیس نیوز چینلز، ایک سو پینتالیس ریڈیو اسٹیشنوں اور قومی و علاقائی اخباروں کی بہت بڑی تعداد میدان میں ہے لیکن اب اس متحرک صحافت میں خبر کی درجہ بندی کی صورت حال کی عکاسی کے لیے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا میں ایک نیا رجحان در آیا ہے۔ خبروں میں ذریعۂ خبر کا فقدان، سنسنی خیزی کی لامحدود ملاوٹ، پاگل پن کی حد تک چلا چلا کر ٹی وی پر خبریں پڑھنے کا انداز، اردو املا و تلفظ کی غلطیاں اور سنسنی خیزی کے لیے خبروں کی نشریات میں موسیقی اور بے حس گرافکس کا بے انتہا استعمال صحافت کے ڈھانچے کو ایک تھیٹر میں بدل رہا ہے۔ ایڈورٹائزنگ بریک کے طویل دورانیے اور اخبارات کے صفحہ اول پر آدھ آدھ صفحے کے رنگین اشتہارات سامعین و قارئین کی سماعت و اخبار بینی پر بھاری بوجھ ہی نہیں نفسیاتی بوجھ بھی ہیں۔ حکومت اب بھی اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ کو کنٹرول کرنے میں پیچھے نہیں اور سرکاری اشتہارات تک دسترس حاصل کرنے والے حکومتی خواہشات کو پورا کرنے میں کوئی کمی نہیں رہنے دیتے۔ پاکستان میں ذرائع ابلاغ کو کنٹرول کرنے کی کوشش کا ایک نشان "پاکستان الیکٹرانک میڈیا ریگولیٹری" یعنی پیمرا نامی ادارہ بھی ہے۔ قصہ مختصر بظاہر جو آزادی دکھائی دیتی ہے وہ بھی اُس کارپوریٹ کا حصہ ہے جو فی الوقت پاکستانی صحافت پر چھائی ہوئی ہے۔ اب ان حالات میں آگے بڑھنے اور اردو صحافت اور صحافیوں کے لیے کیا راستہ ہے؟

- اردو اخبارات ہی نہیں ہر قسم کے میڈیا سے منسلک صحافیوں کی حفاظت اور سلامتی کو یقینی بنایا جائے۔

- اخبارات و الیکٹرانک میڈیا سے منسلک صحافیوں کو مستقل بنیادوں پر ملازمت مہیا کی جائے اور جدید طریقوں سے اُن کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو مزید بڑھانے کے لیے مختلف کورسوں اور سیمناروں کا، سال میں کم سے کم ایک بار بندوبست کیا جائے۔

- صحافیوں کو صحافت کی کمرشلائزیشن کارپوریٹ اور سرکار کے دباؤ سے محفوظ رکھنے کے لیے کسی فریم ورک کے تحت ایسے اصول و ضوابط بنائے جائیں جنھیں قانونی تحفظ حاصل ہو تاکہ وہ اثر و رسوخ اور دباؤ اور تعصب سے ہٹ کر خبر کو خبر کے طور پر پیش کر سکیں اور تجزیہ نگار کسی ڈر خوف کے بغیر سیاسی تجزیہ نگاری کر سکیں۔

- پاکستان میں ذرائع ابلاغ کے ایڈیٹروں اور صحافیوں کو پیشہ ورانہ آزادی وخود مختاری کا احساس دلایا جائے۔ تاکہ وہ کسی اثر رسوخ یا سیاسی اور اخبار مالکان کے دباؤ سے آزاد ہو کر اپنی خبریں، تبصرے اور تجزیے لکھ سکیں۔

سب سے آخر میں ایک بات جو میں اس پلیٹ فارم سے ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے اخبارات کے مالکان سے کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کے صحافیوں کو اپنے اپنے ہاں مدعو کیا جائے تاکہ انھیں ایک دوسرے کی پیشہ ورانہ کارکردگی کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملے۔ یہ اس طرح بھی کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے کچھ صحافیوں کا گروپ پاکستان میں جاکر وہاں کے اخبارات کے ساتھ ایک آدھ ہفتے کے لیے کام کرے اور اسی طرح پاکستان کے صحافیوں کو یہاں ہندوستان کے کسی اخبار میں ویسا ہی موقع مہیا کرایا جائے۔ اس طرح تعصب وعداوت کی دیوار کو گرانے میں مدد مل سکے گی۔

بنگلہ دیش میں اردو صحافت: ماضی اور حال

ڈاکٹر محمد غلام ربانی

اہل بنگلہ دیش کی مادری زبان بنگلہ ہے۔ وہ بنگلہ زبان ہی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ سولہ کروڑ سے زیادہ لوگوں کی زبان بنگلہ ہے۔ بنگلہ مادری زبان ہونے کے باوجود قرآن و حدیث کی تعلیم کے لیے بنگلہ دیش میں اردو آج تک مقبول ہے۔ بنگال میں اردو مسلمانوں کی تہذیبی اور ثقافتی زبان سمجھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بنگلہ دیش میں تین چار لاکھ عوام کی مادری زبان اردو ہے۔ وہ اپنے تہذیب و تمدن کے بقا کے لیے اردو استعمال کرتے ہیں۔ ادبی کارنامے، مشاعرے اور ثقافتی پروگرام وہ اردو ہی میں کرتے ہیں، جغرافیائی بنگلہ دیش میں اردو داں اہل علموں نے باہمی مراسلت کے لیے، سماجی، ثقافتی اور ادبی کارنامے شائع کرنے کے لیے صحافت نگاری کو بھی اپنایا۔

اردو صحافت میں بنگال کو ہی یہ شرف حاصل ہے کہ یہاں سے اردو صحافت کا آغاز ہوا ہے۔ حامد حسن قادری 'داستان تاریخ اردو' میں لکھتے ہیں ''پہلا اردو اخبار مولوی محمد اکرام علی نے کلکتہ سے 1810 میں نکالا''[1]۔ اگر 'جام جہاں نما' کو بھی اردو کا پہلا اخبار[2] اعتراف کیا جائے تب بھی یہ بنگال کا ہی شرف ہے۔ بنگال میں 1810 سے 1822 میں اردو صحافت کی ابتدا ہوئی۔ لیکن

موجودہ بنگلہ دیش کے صدر مقام ڈھاکہ سے اردو اخبارات جاری ہونے میں کافی دیر ہوگئی۔ انیسویں صدی تک یہاں سے کوئی اخبار شائع نہ ہوا۔

ڈھاکہ سے پہلا شائع ہوا ماہنامہ 'المشرق' ہے۔ یہ آج سے 110 سال پہلے 1906 میں شائع ہوا۔ اس کے مدیر حکیم حبیب الرحمٰن تھے۔ اس زمانہ کے مسلمانوں کی علمی ترقی، سیاسی اور مذہبی بیداری پیدا کرنے کے لیے شائع ہوا تھا 'المشرق'۔ اس کے بارے میں خود حبیب الرحمٰن لکھتے ہیں:

> بنگلہ و آسام میں مسلمانوں کی قومی زبان اور انڈیا کی لنگوا فرینکا (اردو) کی توسیع و اشاعت کے ساتھ مسلمانوں کی دینی و دنیاوی فلاح کی تدبیر کرنا اور رعایا اور گورنمنٹ کے تعلقات میں غلط فہمیوں کے انسداد کی کوشش کرنا اور ہندوستانی برادران مذہب سے تبادلۂ خیالات کے ذریعہ رابطہ اتحاد اور تعلقات اخوت کو مضبوطی سے قائم کرنا، جو بلا اردو کے ناممکن ہے۔ اس کے خاص مقاصد ہیں[3]۔

اس رسالے میں اسلامی، تاریخی، ادبی، علمی اور اخلاقی مضامین شائع ہوتے تھے۔ سیاسی مضامین بھی اس میں شامل کر لیے جاتے تھے۔ موجودہ دور کے مسائل کا حل بھی دیا جاتا تھا۔ مسلمان کس طرح دوبارہ اپنی شان و شوکت حاصل کر سکتے ہیں اس کا بھی مشورہ ملتا تھا۔ عورتوں کی تعلیم پر زور دیا جاتا تھا۔ ادبی معیار سے یہ اخبار بلند پایہ رکھتا تھا۔

'المشرق' کی بعض کاپیاں ڈھاکہ یونیورسٹی میں محفوظ ہیں۔ یہ کلکتہ سے رضوانی پریس سے چھپوایا جاتا تھا اور دار الاشاعت ڈھاکہ سے تقسیم ہوتا تھا۔ بعد میں یہ مطبوعہ سلیمی چھوٹا کٹرہ ڈھاکہ سے چھاپا جاتا تھا۔ یہ پہلے ماہنامہ تھا بعد میں ہفت روزہ کر دیا گیا تھا۔ ڈھائی سال شائع ہونے کے بعد یہ اخبار بند ہو گیا تھا۔

حکیم حبیب الرحمٰن کا دوسرا اخبار 'جاوید' ہے۔ جو 1923 میں ڈھاکہ سے شائع ہوا تھا۔ اس کے مدیر کی حیثیت سے جناب محمد عادل کا نام ملتا ہے اگر چہ سارے انتظامات حکیم حبیب الرحمٰن ہی کے زیر نگرانی ہوتے تھے، یہ 1926 تک باقاعدہ جاری تھا۔ بعض ذرائع سے

معلوم ہوتا ہے کہ یہ ماہنامہ 1930 تک جاری رہا[4]۔ اس رسالے میں لکھنے والوں میں مولوی عبدالوہاب، رضا علی وحشت، مولانا ظفر الدین ندوی، خالد بنگالی، نصیر حسین خیال، حافظ نذیر احمد وغیرہ تھے۔

بنگلہ دیش کے کشور گنج ضلع کے بولائی سے ماہنامہ 'اختر' شائع ہوتا تھا۔ اس کے مدیر تھے محمود الرب صدیقی، جو خالد بنگالی کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے والد مولانا عبدالحی اختر عالم اور صاحب تصانیف تھے، عربی اور فارسی کی 55 کتابیں لکھی تھیں۔ خالد بنگالی نے اپنے والد عبدالحی اختر کے نام پر ماہنامہ 'اختر' جاری کیا۔ یہ 1924 کا واقعہ ہے۔ افسوس کہ اس کا نام صرف ماہنامہ ہی رہ گیا۔ اس کا صرف ایک ہی شمارہ شائع ہوا تھا۔ دراصل اس زمانہ میں اردو اخبار شائع کرنا آسان نہ تھا۔ 'اختر' میں لکھنے والوں میں ناطق لکھنوی، نیاز فتح پوری، مائل ملیح آبادی، دلگیر اکبرآبادی وغیرہ تھے[5]۔ نواکھالی سے 1939 میں شائع ہوا تھا رسالہ 'العلما'۔ اس کے مدیر تھے مصطفیٰ حسین نعمانی اور رشید احمد۔ یہ مذہبی رسالہ تھا[6]۔ 1947 میں قیام پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان میں بہت سے اردو داں حضرات دوسری جگہوں سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ ان میں سے بعض حضرات اردو ادب اور صحافت میں مشغول ہو گئے۔

قیام پاکستان کے بعد ڈھاکہ سے پہلا سہ روزہ اخبار 'مشرقی پاکستان' نام سے نکلا۔ یہ ڈاکٹر عندلیب شادانی کی سرپرستی میں 11 مارچ 1947 سے شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ مولانا ظفر احمد عثمانی اور نہال احمد سہسرامی اس کے انتظامات کی ذمہ داری ادا کرتے تھے۔ چیف ایڈیٹر مولانا ظفر احمد عثمانی کے صاحبزادے قمر احمد عثمانی تھے۔ بعد میں وحید قیصر ندوی کو اس کی ادارت میں شامل کر لیا گیا۔ یہ ہفتہ میں دو مرتبہ شائع ہوتا تھا۔ عوام الناس میں یہ بہت مقبول تھا۔ ایک سال تک اس کی اشاعت جاری تھی۔

ڈھاکہ کے پہلے اردو روزنامہ 'پاسبان' نے 8 جون 1948 سے اشاعت شروع کی۔ اکیس سال تک مسلسل نکلتا رہا۔ اس کے پہلے ایڈیٹر وحید الدین ہنر تھے۔ بعد میں غلام احمد کو ایڈیٹر کی ذمہ داری سپرد کی گئی۔

سہ روزہ 'مشرقی پاکستان' بند ہو جانے کے دو سال بعد عندلیب شادانی نے

اپریل 1952 سے ماہنامہ 'خاور' شائع کرنا شروع کیا۔ 'خاور' اپریل 1952 سے مارچ 1953 تک باقاعدہ جاری رہا۔ اگر چہ صرف ایک سال یہ ماہنامہ نکلا لیکن ادبی اور صحافتی حلقوں میں اس کا درجہ بہت اونچا تھا۔ 'خاور' کو آپریٹو کے زیر اہتمام ڈھاکہ سے یہ شائع ہوتا تھا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے مرکزی کتب خانہ کا ارشد کا کوی کلکشن (AKC) میں اس کی کاپیاں موجود ہیں۔ اس ماہنامہ کے شائع کرنے کا مقصد بتاتے ہوئے عندلیب شادانی پہلے شمارے کے اداریے میں لکھتے ہیں:

> مملکت پاکستان کے مشرقی اور مغربی حصوں کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ ہونے کی بنا پر دونوں خطوں کے باشندوں میں جو ایک قسم کی مغایرت اور بیگانگی پائی جاتی ہے اور جو بدقسمتی سے آہستہ آہستہ بڑھتی جارہی ہے اسے اپنائیت اور یگانگت میں تبدیل کرنے کی خواہش خاور کے اجرا کا باعث ہوئی ہے۔ پاکستان کے دونوں بازو اس بعد المشرقین کے باوجود اگر آپس میں مل سکتے ہیں تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ طرفین کو ذہنی طور پر زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔ ایک دوسرے کے حالات اور خیالات سے ناواقفیت باہمی غیریت کا سب سے بڑا سبب ہے۔ اگر یہ مٹ جائے تو یقین کیجیے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان ایک چہرے کی دو آنکھیں ہوں گی جن کا نقطۂ نظر ازی طور پر ایک ہوتا ہے۔ اپنی بساط بھر خاور کی کوشش یہ ہوگی کہ مشرقی پاکستان کے دامن میں ادب، تاریخ اور کلچر کا جو قیمتی سرمایہ موجود ہے، مغربی پاکستان کو اس سے روشناس کرائے اور مغربی پاکستان کی ہر قابل قدر اور لائق فخر چیز کو مشرقی پاکستان کے سامنے لائے تاکہ طرفین میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ اس طرف اور اُس طرف خدا کی جتنی نعمتیں موجود ہیں، وہ کل کی کل ہم سب کی ہیں[7]۔

1953 میں ڈھاکہ سے ابوالحسنات عبدالقادر نے شائع کیا 'دلربا' کا اردو ایڈیشن۔ جون 1953 تک اس کے سات شمارے اردو میں شائع ہو چکے تھے۔ 1947 سے 1953 تک

ڈھاکہ سے تین مزید ہفتہ وار 'امین'، 'منشور'، 'سرفراز' شائع ہو رہے تھے۔ اس کے علاوہ 'خاتون'، 'مشرق'، 'رفتار'، 'مشعل'، 'نقیب'، 'نشیمن' جیسے جریدے شائع ہوئے ہیں۔ اکثر کا ایک شمارہ شائع ہوا اور بعض کے دو تین شمارے شائع ہوئے تھے[8]۔

ارشاد کاکوی نے 1960 میں رسالہ 'ندیم' نکالا۔ بنگلہ اور اردو زبان کے شاہکار مضامین اس میں شائع ہوتے تھے۔ 1962 کے اپریل تک اس کے کل بارہ شمارے شائع ہو چکے تھے۔ نذرالاسلام پر ایک خصوصی نمبر بھی شائع کیا تھا۔

سید اقبال عظیم اپنی کتاب 'مشرقی بنگلہ میں اردو' میں مزید کچھ اور رسالوں کا تعارف کراتے ہیں۔ ان کے مطابق نسیم بہاری چاٹگام سے شائع کیا تھا۔ ماہنامہ 'شہاب' احمد سعدی سید پور نلفاماری سے شائع کیا تھا۔ ماہنامہ 'رباب' اور سہ ماہی 'مشرق' چاٹگام سے شائع ہوا تھا۔ چاٹگام سے 'المہاجر' بھی شائع ہوتا تھا جس کے مدیر ظفر تبریزی اور رازی تھے۔

غلام احمد کی ادارت میں روزنامہ 'انقلاب' اور یوسف رضوی کی ادارت میں روزنامہ 'انگارہ' شائع ہوئے تھے۔ سید پور سے 'میزان' بھی شائع ہوتا تھا[9]۔

اس کے علاوہ روزناموں میں 'ستارہ' ڈھاکہ سے 1952 میں رفیع احمد قدوائی کی ادارت میں شائع ہوا تھا۔ روزنامہ 'ہنگامہ' روزنامہ 'ہماری آواز'، 'وطن' بھی شائع ہوئے تھے۔

ہفتہ وار رسالوں میں 'سب رنگ'، 'بصارت'، 'حقیقت'، 'قوم'، 'انصاف'، 'روداد'، 'جریدہ' وغیرہ اور ماہناموں میں 'خرام'، 'شہکار'، 'دائرہ'، 'عزم نو'، 'بادبان'، 'دبستان مشرق' وغیرہ وقتاً فوقتاً منظر عام پر آئے ہیں[10]۔

سابق مشرقی پاکستان کا آخری رسالہ 'عقاب' ہے۔ یہ انجمن اصلاح مسلم خواتین، میر پور، ڈھاکہ کا ترجمان تھا۔ اس کا صرف ایک شمارہ 1971 میں شائع ہوا۔ 68 صفحات کے اس رسالے کی مدیر آنسہ اقبال سعدی اور مدیران معاون آنسہ شمس فاطمہ، آنسہ نسرین آفتاب، نجمہ تصدق اور عقیلہ رحمٰن تھیں۔ اس میں ڈاکٹر حنیف فوق، پروین آفتاب، بیگم اختر جہاں خان، نوشاد نوری، عطا آصفی وغیرہ کے مضامین شائع ہوتے تھے[11]۔

قیام بنگلہ دیش کے بعد سب سے پہلے چاٹگام سے شائع ہوا 'مصحف'۔ پھر کھلنا سے

شائع ہوا خلیل الرحمٰن زخمی کی ادارت میں رسالہ 'سنگ میل'۔ 'سنگ میل' کے سرپرستوں میں تھے شام بارکپوری اور ذوالفقار سلطان پوری، ادارہ بزم علم و ادب کھلنا کی نگرانی میں یہ شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ میر پور، ڈھاکہ سے ادبی مجلہ 'فکر نو' شائع ہوتا تھا۔

ڈھاکہ کا ایک اور مجلہ ہے 'نیا آدم' جو مئی جون 1977 میں ڈھاکہ سے شائع ہونا شروع ہوا تھا اس کے ایگزیکٹو ایڈیٹر حبیب اعظم، ایڈیٹر رعنا علی راز اور مینجنگ ایڈیٹر اعزاز احمد تھے۔ اس میں اداریہ اور غزلیات کے سوا اسلامیات، روداد، یادیں، تعارف، کہانی، ممالک کی سیر، جیتی جاگتی زندگی، لطائف، معلومات وغیرہ شامل تھے۔ اشک بنارسی، شمس نوید عثمانی، سرمد علی، نوشاد نوری وغیرہ اس میں لکھتے تھے۔

اس کا دوسرا شمارہ شائع ہوا 1978 میں۔ اس کے گیسٹ ایڈیٹر تھے اصغر راہی۔ 'نیا آدم' کا پہلے شمارے کے اداریے میں رعنا علی راز لکھتی ہیں:

> ''نیا آدم حاضر ہے۔ ہم نے اردو زبان کی خدمت کے لیے یہ سلسلہ شروع کیا ہے۔ بنگلہ دیش میں فروغ زبان و ادب کے لیے ہم نے جس راہ کا تعین کیا ہے، ہمیں احساس ہے کہ اس راہ میں ہمیں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا ہے۔ نیا آدم کے اجرا کے سلسلے میں بھی ہمیں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا ہے۔ ہم اپنے وطن بنگلہ دیش میں اپنی تہذیب اور ثقافتی اقدار کی بقا کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ 12''

ایوب جوہر اور محبوب شیرائی نے اصغر راہی کی نگرانی میں 1977 میں ڈھاکہ سے شائع کیا 'رفتار'۔ اس میں قدوس صدیقی، س۔م۔ ساجد، نوشاد نوری، اصغر راہی وغیرہ کی قلمی خدمات موجود ہیں۔

ماہنامہ 'افشاں' ڈھاکہ سے مارچ 1987 میں شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کا نعرہ تھا ''گھر کے ہر فرد کے لئے مکمل رسالہ''۔ اس کے مدیر کامران اختر شمسی تھے۔ اس کی سرپرست مس ناہید ضیاء تھیں۔

سعید مریدی، ایم۔اے۔ راجہ، محمد یونس چودھری، کرامت غوری، سیما ادریس وغیرہ

کی تصنیف سے مزین ہوتا تھا 'افشاں'۔

اپریل 1987 میں اس کا دوسرا شمارہ شائع ہوا۔ اس کے مضامین اور مضمون نگار دوسرے جریدوں سے کچھ الگ ہوا کرتے تھے۔ اس میں مضامین کے علاوہ گزارش، ڈاکیہ ڈاک لایا، ہنسنا منع ہے، کام کی باتیں، خانہ داری وغیرہ شامل ہوتے تھے۔

'ضیاء' ڈھاکہ سے 1987 میں شائع ہونا شروع ہوا۔ جون/جولائی میں اس کا چوتھا اور پانچواں شمارہ شائع ہوا۔ اس میں اعلان کیا گیا "یہ بنگلہ دیش کا واحد کثیر الاشاعت جریدہ ہے"۔ یہ جریدہ افشاں پبلیکیشنز سے شائع ہوتا تھا۔ اس کا ادارتی بورڈ وہی تھا جو افشاں کا تھا۔ اس کے سرپرست ناہید ضیاء تھے۔ مدیر کامران اختر شمسی اور معاون مدیر سید شمیم تھے۔ اس کے قلم کار تھے شمیم زمانوی، احمد الیاس، بشریٰ رحمٰن، عطیہ پروین، حکیم محمد سعید، عظیم اقبال وغیرہ۔

ہفت روزہ 'اخبار' ڈھاکہ سے 1982 میں شائع ہونا شروع ہوا۔ 8 صفحات کے اس اخبار میں مضامین، رپورٹ، تبصرہ، افسانہ، ادبی خبریں، فلمی خبریں، اضلاع کی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ زین العابدین اس کے ایڈیٹر تھے۔ یہ ہفت روزہ بعد میں مجلّہ کی صورت میں شائع ہوتا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا بنگلہ دیش سے شائع ہونے والا اردو کا سب سے پہلا سیاسی، ثقافتی، علمی و ادبی جریدہ ہے۔ یہ جریدہ 68 صفحات پر چھاپا جاتا تھا۔ مئی 1986، اکتوبر 1986، نومبر 1986 اور اگست 1990 وغیرہ شماروں کی کاپیاں دستیاب ہوئی ہیں۔ یہ عمدہ کاغذ پر باقاعدہ شائع ہوتا تھا۔ یہ مختلف ممالک میں بھیجا جاتا تھا۔ یہ جریدہ مقبول عام بھی تھا۔

'اخبار بنگلہ دیش' نام کا ایک اور مجلّہ ایوب جوہر کی ادارت میں 1988 کے دوران یہ عوامی جریدہ شائع ہوتا تھا۔ اس میں رپورٹ، افسانہ، غزل، ادبی اخبارات شائع ہوتے تھے۔

'اخبار بنگلہ دیش' کے نام سے ایوب جوہر کی ادارت میں اور کلیم احمد کی معاون ادارت میں ایک 8 صفحات والا جریدہ شائع ہوا تھا جس کی مئی 1986، نومبر 1986 کی کاپیاں دستیاب ہوئی ہیں۔

مرکز تخلیق ادب سید پور سے ایک ادبی دستاویز 'انتخاب' شائع ہوتا تھا۔ اس کے مدیر ذاکر عزیزی اور معاون مدیر ایم نعیم تھے۔ احمد سعدی، س۔م۔ ساجد، مناظر عاشق ہرگانوی وغیرہ

مجلس مشاورت میں تھے۔ پہلا شمارہ فروری 1984 میں شائع ہوا تھا۔ یہ بھی یکے بعد دیگرے شائع ہوتا تھا، نومبر 1986 تک باقاعدہ شائع ہوتا رہا۔ اس میں مقالے، رپورتاژ، افسانے، نظمیں، غزلیں، تلخ وترش، قارئین کے خطوط، تبصرہ وغیرہ شائع ہوتے تھے۔ ڈاکٹر یوسف حسن، جگن ناتھ آزاد، مظہر امام، پروفیسر ہارون الرشید، شاہین بدر، شعیب عظیم، احمد سعدی، احمد الیاس، جمال مشرقی، صابر علی صابر، حسن ممتاز، فضل شہاب الدین، نشاط الایمان، خلیل الرحمٰن زخمی، ذاکر عزیزی وغیرہ کے قلم سے اس کو مزین کیا جاتا تھا۔

نلفاماری سید پور سے نکلتا تھا 'قلم کار'۔ اس کے اداریہ بورڈ میں تھے معراج الحق عارفی، شمیم کاشفی، اشرف الحق بابو۔

ڈھاکہ کے افق پبلیکیشنز سے شائع ہوتا تھا 'افق ڈھاکہ'۔ اپریل، مئی 1971 سے شائع ہونا شروع ہوا، اس کے مدیر زاہد مظہر پوری اور مدیر انتظامی قاضی محی الدین تھے۔ اس میں بھی نظمیں، غزلیں، خاکہ، ترجمہ، افسانے اور مضامین شائع ہوتے تھے۔

جولائی 1981 میں سید پور سے منزل ادب سے شائع ہوا 'صدائے آگہی'۔ اس کے مدیر تھے ع ساگر۔ اس سے پہلے سید پور سے شائع ہوا 'صدائے زنداں'۔ 'صدائے بازگشت'۔ ایوب جوہر کی ادارت میں 'محاذ' شائع ہوا تھا 1980 میں۔ چاٹگام سے 30 مئی 1976 میں شائع ہوا 'گلدستہ'۔ جون 1995 میں محمد پور، ڈھاکہ سے شائع ہوا تھا 'The Message'۔

کلیم الرحمٰن شمس کی ادارت میں 'شمس گزٹ' ڈھاکہ سے شائع ہوا دسمبر 1990 میں۔ یہ دراصل گزٹ ہے۔ 1954 میں قائم شدہ ویلفیئر سوسائٹی، ڈھاکہ نے اس کو شائع کیا تھا۔

بنگلہ دیش کی ایک ادبی انجمن ہے حلقۂ فکر ودانش۔ اس انجمن کی پہلی پیشکش ہے 'نجم و شرر'۔ اس میں انجمن کے شعرا کے مختصر حالات، ادبی کارنامے، نمونۂ ادب پیش کیا گیا ہے۔ نوبتاد نوری اور سید یوسف حسن کے مضامین سے بنگلہ دیش کے ادیبوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ یہ فروری 1977 میں شائع ہوا تھا۔

حلقۂ فکر ودانش بنگلہ دیش نے بنگلہ دیش کے قومی شاعر قاضی نذر الاسلام کی وفات کے بعد 4 جون 1977 میں شائع کیا 'صبح امید'۔ اس کے مرتب تھے طارق بنارسی۔ حلقۂ فکر ودانش سے

ادبی ضمیمہ 'شعاع' شائع ہوا تھا فروری 1980 میں۔ اس کے مدیر تھے حلیم صبا۔ حلقۂ فکر و دانش بنگلہ دیش سے ادبی خبر نامہ شائع ہوا تھا 'کرن' نام سے۔ اس کا پہلا شمارہ یکم ستمبر 1985 میں شائع ہوا تھا۔

حلقۂ فکر و دانش بنگلہ دیش، ڈھاکہ کے زیر اہتمام جون 1984 میں ایک اور مجلّہ 'وجود' نام کا وجود میں آیا تھا۔ اس کے مرتب حافظ دہلوی تھے۔ یہ شمارہ 128 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس رسالے میں بنگلہ دیش کے اردو ادب اور ادبا کے تعارف سے روشناس کرایا گیا ہے۔

حلقۂ فکر و دانش بنگلہ دیش کی ذیلی شاخ حالی شہر چاٹگام سے 1980 میں 'ضیائے صبح' شائع ہوا۔ اس کے مدیر طارق بنارسی تھے۔

حلقۂ فکر و دانش کے تحت جو مجلّے شائع ہوئے ہیں۔ میں نے ان میں سے اکثر کے دوسرے شمارے نہیں دیکھے۔ شاید ہر شمارے کو الگ الگ نام دیا جاتا تھا۔ اگر دوسرے الفاظ میں کہوں تو یہ سب ادبی مجموعے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ذیل کے جملوں میں اس کا اعتراف ہوتا ہے:

> یہ انھی رفیقان ادب کی کوشش پیہم کا نتیجہ ہے کہ حلقۂ فکر و دانش نے غزلوں کا مجموعہ 'نجم و شرر'، 'صبح امید'، 'گلدستہ'، 'بوئے شمیم' اور 'شعاع' کھلنا سے 'سنگ میل'، ڈھاکہ (میر پور سکشن 11) سے 'فکر نو'، 'انجمن'، 'تنویر' 'وافق' حلقۂ یاراں چاٹگام سے 'مصحف' اور 'صلیب' اور شام بارکپوری نے 'پدما کی موجیں'، منزل ادب سید پور نے 'صدائے زنداں' اور 'صدائے جرس' جیسے جریدے اور کتابوں سے عوام الناس کو روشناس کرایا اور بنگلہ دیش میں اردو ادب اور اردو معاشرے کی تشکیل نو کی اور اردو جریدے جنھیں دیکھنے کو آنکھیں ترستی تھیں پے در پے عوام تک آنے لگے 13۔

دینی، علمی و ادبی جریدہ ہے 'دین و دانش' ڈھاکہ۔ اختر آنولوی کے زیر اہتمام بنگلہ دیش علمی لائبریری، ڈھاکہ سے شائع ہوتا تھا۔ اکتوبر 1981 سے شاید شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ 1403 ہجری میں اس کا ایک خصوصی نمبر ''سیرت النبی نمبر'' شائع ہوا تھا۔ اس میں مضامین، خاکہ، نعت، سچی کہانی وغیرہ چھپتی تھی۔ 'علم و دانش ڈھاکہ' بھی اختر آنولوی کی ادارت اور محمد افسر کی نگرانی

میں شائع ہوتا تھا۔ اس کا سال اشاعت نامعلوم ہے۔ 'ماحول' چاٹگام سے شائع ہوتا تھا۔ اس کا پہلا شمارہ شائع ہوا ستمبر 1981 میں۔ مدیر اعلیٰ اصغر راہی اور مدیر یوسف راہی تھے۔

بنگلہ دیش بننے کے بعد پہلا سہ ماہی اردو جریدہ ہے 'انکشاف'۔ اس کے مدیر ایوب جوہر ہیں۔ ڈھاکہ کے محاذ پبلیکیشنز سے نکلتا تھا۔ ادبی خبریں، غزلیں، افسانے، مضامین شائع ہوتے تھے۔ تحقیقی مقالے بھی کبھی کبھی اس میں شامل کر لیے جاتے تھے۔

شہکار پبلیکیشنز، ڈھاکہ سے س م ساجد نے شائع کیا تھا 'دستک'۔ اس کا پہلا شمارہ جنوری 1992 میں منظر عام پر آیا۔ اس کے مدیر س م ساجد تھے اور مجلس مشاورت میں احمد سعدی، احمد الیاس، اسد چودھری، شمیم زمانوی تھے۔ اداریہ، جائزے، نظمیں، افسانے، غزلیں اور تبصرے اس مجموعے میں ہوتے تھے۔

''بنگلہ دیش میں اردو زبان و ادب اور ثقافت کا ضامن'' نعرے کے ساتھ اردو مجلس ڈھاکہ نے جنوری 1988 میں شائع کرنا شروع کیا 'مجلس'۔ اس کے مدیر جمال مشرقی اور معاونین صابر علی صابر اور جلال عظیم آبادی تھے۔ اداریہ کے علاوہ اس میں پیغام، انٹرویو، حیات اور ادبی خدمات، تبصرے، ادبی لطیفے، اسلامیات، خط و کتابت، کتاب شناسی وغیرہ مواد شامل ہوتے تھے۔ اس میں بنگلہ دیش کے اردو ادب اور بنگلہ ادب کی مشہور شخصیات کی تصاویر بھی ہوتی تھیں۔ افسانے، غزلیں، نظمیں تو اس میں کثرت سے ہیں۔ بنگلہ زبان کی شاعری کا اردو ترجمہ بھی اس میں شامل ہے۔

قیام بنگلہ دیش کے بعد اردو کو وہ رتبہ حاصل نہیں رہا جو پہلے تھا، حالانکہ بنگلہ دیش سے اتنے رسائل، جریدے شائع ہوئے ہیں؟ یہ ایک سوال ہے۔ اس کا جواب ہم دیں گے طارق بنارسی کے الفاظ میں۔ وہ 'ضیائے صبح' کے اداریے میں لکھتے ہیں:

> ''ہم فروغ زبان و ادب کی کوششوں میں جو دیوانہ وار مصروف ہیں اس میں ہمارے خلوص اور جذبہ ایمانی کے علاوہ اور کوئی چیز بھی محرک نہیں ہے۔ آج بھی اس ملک میں تقریباً تین ہزار مدارس ہیں، آٹھ لاکھ سے اوپر طلبا اردو زبان و ادب ہی کے ساتھ اپنی دینی تعلیمات کی تکمیل کرتے

ہیں۔ اللہ کے کرم سے ہر سال لاکھوں طلبا اردو لکھنا پڑھنا اور بولنا سیکھ رہے ہیں۔ بنگلہ زبان وادب کے ساتھ اردو زبان وادب اس طرح شانہ بشانہ چلتا ہے کہ غلط فہمیوں کی وہ دیوار جو دونوں زبانوں کے درمیان کھنچ گئی ہے مسمار ہو جائے اور دونوں میں تلاش کے باوجود غیریت اور اجنبیت کا کوئی پہلو نہ مل سکے۔ ہم ان کوششوں میں کہاں تک کامیاب ہوں گے یہ کہا نہیں جا سکتا، مگر کہاں تک کامیاب ہیں آپ لوگوں کے سامنے ہے۔ ڈھاکہ، سید پور، کھلنا اور چاٹگام سے بار بار ادبی ضمیموں اور پرچوں کا اجرا روشنی کے منار بن کر سامنے آرہے ہیں[14]۔

یہ 1980 کی بات ہے۔ 36 سال بعد ہم بہت آگے بڑھے ہیں۔ نظریے میں بھی کشادگی آئی ہے۔ ہم اردو کو دیکھتے ہیں مسلمانوں کی تہذیبی اور ثقافتی اور علمی زبان کی حیثیت سے۔ اردو اب بین الاقوامی زبان ہے۔ اردو ادب میں جو ذخیرے ہیں ان سے مستفید ہونے کے لیے اردو ادب کے بکثرت تراجم ہو رہے ہیں۔

بنگلہ دیش میں موجودہ اردو صحافت:

بنگلہ دیش سے فی الحال شائع ہو رہا ہے 'خیال'۔ اس کے مدیر ہیں محمد عنایت اللہ صدیقی۔ نائب مدیر تسنیم نرگس صدیقی، معاون مدیر محمد حسین ہیں۔ جون 2007 میں اس کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا تھا۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا جو مضمون اردو میں ہے اسی کا بنگلہ ترجمہ بھی اس میں شامل ہے اور کچھ بنگلہ مضامین بھی اردو ترجمے کے ساتھ اس میں شائع کیے گئے ہیں۔ اس میں مضامین کے علاوہ نظم، غزل، تحقیقی مقالہ، سفرنامہ، تذکرۂ کتب، تاریخ، اسلامیات، آپ بیتی، لوک کہانی، مختصر افسانہ وغیرہ شامل ہیں۔ اس کا دوسرا شمارہ جنوری 2013 اور تیسرا شمارہ اگست 2013 میں شائع ہوا ہے۔

موجودہ دور میں ملفاماری سید پور سے 'پیغام' نام سے اور ایک پرچہ شائع ہوتا ہے۔ یہ بھی اردو اور بنگلہ دونوں زبانوں میں ہے۔ اس کے ناشر اور مدیر محمد اشرف الحق بابو ہیں۔ یہ

شمس الحق فاؤنڈیشن کے مالی تعاون سے شائع ہوتا ہے۔ اس کا پہلا شمارہ شائع ہوا تھا جولائی 2012 میں۔

سہ ماہی 'ادب' محمد پور ڈھاکہ سے جلال عظیم آبادی نکالتے ہیں۔ اس کے مدیر صابر علی صابر ہیں۔ اور مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے جلال عظیم آبادی کا نام ہے۔ اس کا پہلا شمارہ اکتوبر 1999 میں شائع ہوا۔

ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی و اردو سے سال 2004 میں شائع ہوا تھا تحقیقی جرنل 'ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف پرشین اور اردو'۔ اس شمارے کی مدیر تھیں ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر۔ 2005 میں اس کا دوسرا شمارہ شائع ہوا۔

2006 میں اس کا تیسرا شمارہ شائع ہوا۔ اس شمارے کی مدیر ہوئیں پروفیسر ڈاکٹر ام سلمٰی اور مدیر معاون ہوئے ڈاکٹر کے ایم سیف الاسلام خان۔

2007 میں شعبۂ اردو کے علاحدہ شعبے کی حیثیت سے کام شروع کرنے کے بعد شعبۂ اردو سے ایک اور جرنل 'ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو' نام سے شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کا پہلا شمارہ 2008 میں منظر عام پر آیا۔ اس کے مدیر پروفیسر ڈاکٹر جعفر احمد بھویاں تھے۔ سال 2009 میں بھی اس کا دوسرا شمارہ شائع ہوا۔

ڈاکٹر کنیز بتول کی ادارت میں 'ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو' کا تیسرا شمارہ 2010 شائع ہوا ہے 2012 میں۔ اس میں مذکور بالا کے علاوہ محمد نصیر الدین کا تحقیقی مقالہ شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر کنیز بتول کی ادارت میں 'ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو' کا 2011 کا شمارہ شائع ہوا 2013 میں۔

یہی بنگلہ دیش سے شائع ہونے والا آخری مجلّہ ہے۔ اس کے بعد 2015-2014 میں بنگلہ دیش سے کوئی مجلّہ شائع نہیں ہوا۔ 'ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو' کچھ قانونی اجازت کے لیے اب شائع ہونے کے لیے منتظر ہے۔ انشاءاللہ بہت جلد شائع ہو جائے گا۔

بنگلہ دیش سے جو اخبارات شائع ہوئے ہیں۔ خصوصاً 1977 سے لے کر 1990 تک کے عرصے میں یہ قابل رشک ہے۔ 1999 میں 21 فروری کو بین الاقوامی یوم السنہ اعلان کرنے

کے بعد بنگلہ دیش میں اردو زبان اور اہل اردو کے بارے میں گورنمنٹ کا نظریہ بھی بدل گیا ہے۔ اب مالی تعاون کی کوئی فکر نہیں، صرف سرپرستی کی ضرورت ہے۔ اس سرپرستی کے لیے بہت سی انجمنیں کام کر رہی ہیں۔ بنگلہ اردو ساہتیہ فورم، اردو مجلس، حلقۂ فکر و دانش، انجمن اردو وغیرہ کام انجام دے رہی ہیں[15]۔ پرانے جو اہل قلم تھے اکثر رخصت ہو گئے ہیں۔

حوالہ جات

1- محی الدین قادری، داستان تاریخ اردو، انجمن ترقی اردو، کراچی، ص:97

2- ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، صحافت پاکستان و ہند میں، مجلس ترقی ادب لاہور، طبع اول، جون 1963، ص:35

3- حکیم حبیب الرحمٰن۔ المشرق، ڈھاکہ، اکتوبر 1906، آخری صفحہ بحوالہ پروفیسر ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، بنگلہ دیش میں اردو ادب، ڈھاکہ بنگلہ اردو ساہتیہ فاؤنڈیشن، اشاعت اول اپریل 2015، ص:62

4- پروفیسر ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، بنگلہ دیش میں اردو ادب، ڈھاکہ بنگلہ اردو ساہتیہ فاؤنڈیشن، اشاعت اول، اپریل 2015، ص:64

5- سید اقبال عظیم، مشرقی بنگال میں اردو، مشرقی کوآپریٹو پبلیکیشنز، 1954، ص:98

6- ڈاکٹر لطیف احمد، بنگلہ دیش میں اردو صحافت، ہماری زبان، انجمن ترقی اردو (نئی دہلی) شمارہ 28، جلد:67، 22 تا 28 جولائی 2007، ص:2

7- عندلیب شادانی، اداریہ، ماہنامہ 'خاور'، ڈھاکہ، اپریل 1956۔ کلثوم ابوالبشر بنگلہ دیش میں اردو، ص:70

8- کلثوم ابوالبشر، بنگلہ دیش میں اردو، ص:79

9- سید اقبال عظیم، مشرقی بنگال میں اردو، ص:463

10- ڈاکٹر لطیف احمد، بنگلہ دیش میں اردو صحافت، 'ہماری زبان' ص:3

11- شعیب عظیم، سابق مشرقی پاکستان کا آخری رسالہ عقاب، 'مجلس ڈھاکہ' (مدیر: جمال مشرقی)، ڈھاکہ، جنوری 1988، ص:45

12- رعنا علی راز، حرف آغاز، 'نیا آدم'، ڈھاکہ، مئی 1977ء، ص:8

13- ایم اے قدوس، تبصرہ، 'ضیائے صبح' (مدیر: طارق بنارسی) حلقۂ فکر و دانش بنگلہ دیش، ذیلی شاخ حالی شہر چاٹگام، 1980، ص:138

14- طارق بنارسی، اداریہ، 'ضیائے صبح'، حلقۂ فکر و دانش بنگلہ دیش، چاٹگام، 1980، ص:11

15- ایوب جوہر، بنگلہ دیش میں اردو انجمنوں کا سفر، 'مجلس'، ڈھاکہ خاص نمبر، جنوری 1988، ص:53

ماریشس میں اردو صحافت کا جائزہ

ڈاکٹر علی عادل علی محمد

ماریشس میں صحافت کی ابتدا 1832 میں ہوئی تھی۔ اس زمانے میں یہ جزیرہ انگریز آبادکاروں کے زیرِ حکومت تھا۔ اس عہد میں چونکہ غلامی کا دور دورہ تھا، اسی لیے کسی کو بھی اظہارِ رائے کی اجازت نہ تھی۔ کھیتوں میں کام کرنے کی خاطر ہندوستان سے مزدور لائے گئے تھے۔ جیسے جیسے یہ ملک ترقی کرتا گیا آزادیِ رائے کی ایک لہر پورے ملک میں دوڑنے لگی۔ مقامی باشندے اس لہر سے متاثر ہو گئے اور انھیں یہ خیال آیا کہ اپنی رائے کو دوسروں تک پہنچانا اشد ضروری ہے۔ اس طرح ماریشس میں جو پہلا اخبار منظرِ عام پر آیا وہ ہے فرانسیسی اخبار LeCernéen۔ اس اخبار کا آغاز 1833 میں ہوا اور تقریباً ڈیڑھ سو سال تک جاری رہا۔ اس کو Adrien d'Epinay نے جاری کیا تھا۔

ماریشس میں اردو زبان کا منظرنامہ:

1810 میں جب انگریز ماریشس پر قابض ہوئے تو اس وقت اس جزیرے پر

12- رعنا علی راز، حرف آغاز، 'نیا آدم' ، ڈھاکہ، مئی 1977۔ ص:8

13- ایم اے قدوس، تبصرہ، 'ضیائے صبح' (مدیر: طارق بنارسی) حلقۂ فکر و دانش بنگلہ دیش، ذیلی شاخ حالی شہر چاٹگام، 1980، ص:138

14- طارق بنارسی، اداریہ، 'ضیائے صبح'، حلقۂ فکر و دانش بنگلہ دیش، چاٹگام، 1980، ص:11

15- ایوب جوہر، بنگلہ دیش میں ادبی انجمنوں کا سفر، 'مجلس' ڈھاکہ۔ خاص نمبر، جنوری 1988، ص:53

ماریشس میں اردو صحافت کا جائزہ

ڈاکٹر علی عادل علی محمد

ماریشس میں صحافت کی ابتدا 1832 میں ہوئی تھی۔ اس زمانے میں یہ جزیرہ انگریز آبادکاروں کے زیرِ حکومت تھا۔ اس عہد میں چونکہ غلامی کا دور دورہ تھا، اسی لیے کسی کو بھی اظہارِ رائے کی اجازت نہ تھی۔ کھیتوں میں کام کرنے کی خاطر ہندوستان سے مزدور لائے گئے تھے۔ جیسے جیسے یہ ملک ترقی کرتا گیا آزادیِ رائے کی ایک لہر پورے ملک میں دوڑنے لگی۔ مقامی باشندے اس لہر سے متاثر ہو گئے اور انھیں یہ خیال آیا کہ اپنی رائے کو دوسروں تک پہنچانا اشد ضروری ہے۔ اس طرح ماریشس میں جو پہلا اخبار منظرِ عام پر آیا وہ ہے فرانسیسی اخبار LeCernéen۔ اس اخبار کا آغاز 1833 میں ہوا اور تقریباً ڈیڑھ سو سال تک جاری رہا۔ اس کو Adrien d'Epinay نے جاری کیا تھا۔

ماریشس میں اردو زبان کا منظرنامہ:

1810 میں جب انگریز ماریشس پر قابض ہوئے تو اس وقت اس جزیرے پر

ہندوستانیوں کی کل آبادی چھ ہزار کی تھی اور ان میں زیادہ تر مسلمان تھے۔ وہ اپنے ساتھ اردو کی کتابیں بھی لائے تھے۔ نیز وہ لوگ کھیتوں میں کام کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ 1857 کی جنگِ غدر میں کئی ہندوستانی مزدور ماریشس آئے اور کئی مہینوں تک یہ عمل جاری رہا۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہاں پر ہزار ہا پریشانیاں اور تکلیفیں جھیلنے کے باوجود یہ تارکینِ وطن اپنے مذہب، تہذیب اور رسم ورواج کو برقرار رکھنے میں پوری طرح کوشاں رہے اور اپنی زبان کی حفاظت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ واضح رہے کہ ان کی بول چال کی زبان بھوجپوری تھی لیکن مذہبی امور کے لیے اردو کا استعمال ہوتا تھا۔ اردو زبان کے ذریعہ دینی تبلیغ کا کام سرانجام ہوتا تھا اور اس طرح دینِ اسلام کے ساتھ ساتھ اردو کی بھی ترویج واشاعت ہوتی رہی۔ ابتدا میں یہ لوگ اپنے گھروں میں اردو کی تعلیم دیتے تھے۔ پھر بعد میں اردو کے ذریعہ دینی تعلیم کی رسائی مسجدوں اور مدرسوں تک ہوئی۔ یہ انہی بزرگوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ آج پرائمری اسکولوں اور کالجوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے بلکہ آج ماریشس میں اردو اس قدر ایک توانا اور زبردست زبان کی صورت اختیار کر چکی ہے کہ جامعاتی سطح پر (یعنی ایم اے تک) اس کی تدریس ہوتی ہے۔

ماریشس میں اردو صحافت (1900 سے 1970 تک):

تاریخی کتابوں کی ورق گردانی کرنے سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ زمانۂ قدیم میں جو مسلمان ماریشس آئے تھے ان میں سے کچھ لوگ صحافی بھی بنے۔ کئی سالوں سے ماریشس کے مسلمانوں کا اپنا کوئی اخبار نہیں تھا۔ یہاں پر شروع شروع میں ایک معقول تعداد میں گجراتی تجار کام کر رہے تھے۔ یہ لوگ کسی اخبار کا اجرا کر سکتے تھے لیکن وہ اپنے کام، تہذیب اور مذہب کو فروغ دینے میں اس قدر مصروف تھے کہ صحافت کی جانب ان کی توجہ قطعی مبذول نہیں ہوئی تھی۔ 1901 میں مہاتما گاندھی نے ماریشس کا دورہ کیا تھا۔ انھوں نے اس ملک کا معاشی، سیاسی، مذہبی اور تہذیبی جائزہ لیا۔ پھر انھوں نے کہا کہ ملک

کے حالات کو بہتر بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ تعلیم پر زیادہ توجہ دی جائے۔ ہندوستان سے انھوں نے منیلال ڈاکٹر کو ماریشس بھیجنے کی بات چلائی۔ بالآخر 1907 میں جب منیلال ڈاکٹر ماریشس آئے تو انھوں نے ان تاجروں کو ایک چھاپا خانہ فراہم کیا اور اس طرح ان لوگوں نے سب سے پہلا ہندو ماریشن اخبار بنام دی ہندوستانی (The Hindustani) نکالا اور اس کے ذریعہ ماریشس میں رہنے والے ہندوستانیوں کو ایک ایسا موقع ملا جہاں وہ اپنے اردگرد کے ماحول اور خبروں سے واقف رہ سکیں۔

مسلمانوں نے جو سب سے پہلا اردو مذہبی اخبار نکالا تھا اس کا نام ''روشنی'' تھا۔ اس کے مدیر طیب ایوب تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور اردو اخبار ''البدر'' شائع ہوا تھا جس کے مدیر حافظ جمال احمد تھے۔ غالباً 1950 میں مولانا پندوڑ نے اردو میں ایک مذہبی اخبار شائع کیا تھا جس کا نام ''الہلال'' تھا۔ یہ بات اغلب ہے کہ ایک اچھے نظام کی کمی اور اردو پڑھنے والوں کی قلت سے یہ اخبارات چند ہی سالوں میں سرے سے غائب ہو گئے۔

1985 میں اسلامی محقق پروفیسر ملک حسین جو پاکستان سے تعلیمی کام کی غرض سے ماریشس آئے تھے انھوں نے چند نوجوان مسلمانوں کا ایک گروہ بنایا جو ایک اسلامی ہفتہ وار اخبار نکالنے میں مدد کر سکیں اور اس اخبار کا نام دی مینارٹ (The Minaret) تھا۔ اس میں انگریزی، فرانسیسی اور اردو زبانوں میں خبریں ملتی تھیں۔ اس اخبار کی ایک خوبصورت پیشکش تھی اور اس کو پڑھنے والے بہت تھے، خصوصاً نوجوان طبقوں میں۔ یہ ماریشس کا پہلا اخبار تھا جس کے لیے اردو چھاپ استعمال کی گئی تھی۔ اس سے پہلے اردو اخبارات ہاتھ سے لکھے جاتے تھے۔

1963 تک دی مینارٹ مسلسل طور پر شائع ہوتا تھا لیکن جب اچانک پروفیسر ملک حسین اپنے وطن چلے گئے تو اس دوران یہ اخبار کچھ مشکلوں میں پڑ گیا اور آخرکار 1970 میں اس کی اشاعت بند ہوگئی۔ 1963 میں ایچ آر۔ کے عبدل نے ایک اسلامی ہفتہ وار اخبار بنام الہلال جاری کیا لیکن المناک بات یہ ہے کہ اسی سال میں اس کی اشاعت بند ہوگئی۔

1970 سے 2003 کی اردو صحافت:

یہ قابلِ ذکر ہے کہ 1970 کے بعد ماریشس میں اردو زبان ترقی کرتی گئی اور پورے جزیرے میں سرایت کرتی گئی۔ اس سال نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ (National Urdu Institute) قائم کیا گیا۔ یہ ادارہ دراصل اردو زبان کو فروغ دینے کی غرض سے وجود میں آیا تھا۔ اسی ادارے میں 1973 میں عنایت حسین عیدن صاحب نے ایک ادبی انجمن قائم کی تھی جس کا نام انجمنِ ادبِ اردو رکھا گیا تھا۔ اس انجمن کا مقصد تھا کہ مقامی ادیبوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ وہ تخلیقی کاموں کی جانب مزید متحرک ہو جائیں۔ اکثر نشستیں ایسی ہوتی تھیں جن میں مقامی قلم کاروں کے تخلیقی کاموں کو سنا اور سراہا جاتا تھا۔ انجمنِ ادبِ اردو کے زیرِ ادارت ہر سال ایک رسالہ بنام ''جستجو'' شائع ہوتا تھا جس میں مقامی ادبا و شعرا، صابر گوڈر، سعید میاں جان، فاروق حسنو، طاہر دوسن، فاروق بوچا اور قاسم علی محمد وغیرہ کے تخلیقی کام شائع ہوتے تھے۔ ان میں سے کئی لوگوں کی تخلیق ہندوستانی اور پاکستانی رسائل میں بھی شائع ہوتی تھی مثلاً قومی زبان اور قومی آواز میں۔

ایم جی آئی اور اردو صحافت:

ایم جی آئی یعنی مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ کا سنگِ اساس 1970 رکھا گیا تھا اور 1976 میں اس کا باقاعدہ افتتاح ہوا تھا۔ اس ادارے میں کئی مشرقی زبانوں کی تدریس شروع ہوئی تھی جس میں ہندی، تامل، تلگو، مراٹھی اور اردو شامل تھی۔ 1991 میں قاسم ہیرا صاحب کی کوششوں اور کاوشوں سے ایک ادبی رسالہ بنام دستک ایم جی آئی میں جاری ہوا۔ اس کی قیمت صرف پانچ روپے تھی۔ اس رسالے میں غزلیں، افسانے، قطعات بلکہ دیگر مقامی لوگوں کی تصانیف بھی شائع ہوتی تھیں۔ دستک دراصل اکھیمنو انٹھ صاحب کے ہندی رسالے کا اردو اڈیشن ہے۔

1990 میں نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کی بیسویں سالگرہ منائی گئی تھی اور اس موقع پر نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے ایک یادگار رسالہ شائع ہوا۔ یہ رسالہ انگریزی زبان میں

ہے لیکن اس میں اردو کے کچھ صفحات پیوست ہیں یعنی صابر گوڈر صاحب کی غزلیں اور قاسم ہیرا صاحب کی نظمیں بھی شامل ہیں۔ ایک سال بعد یعنی نو سے بارہ دسمبر 1991 میں ماریشس میں عالمی اردو کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اس تقریب کے لیے ایک یادگار رسالہ شائع ہوا جس کی پیشکش واقعی دیدہ زیب تھی۔ یہ رسالہ بھی انگریزی زبان میں ہے لیکن مندوبین کے خطبات اور مقالات نیز صابر گوڈر کی غزلیں، سعید میاں جان کی مثنوی، محمد شفیع قریشی کا مضمون بعنوان ''عالمی اردو کانفرنس کے نام'' بلکہ دیگر لوگوں کی اردو خدمات بھی شامل ہیں جو ظاہراً اردو میں شائع ہوئیں۔ مذکورہ رسائل ماریشس میں اردو صحافت کے لیے بڑی اہمیت کے حامل ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ان رسالوں نے آئندہ نسلوں کے لیے راستہ ہموار کیا ہے تو غلط نہ ہوگا۔

اردو صحافت اور رسالہ 'مہتاب':

جولائی 1993 میں ماریشس کے ایک اہم شخص بلکہ پرائمری اسکول کے استاد نے اردو زبان کو فروغ دینے کا بیڑا اٹھایا تھا جن کا نام رفیق حسین بخش ہے۔ انھوں نے ایک رسالہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کام کے لیے کئی لوگوں نے ان کی ہمت افزائی کی اور ان کی نیک خواہشات سے کئی لوگوں کو فائدہ بھی پہنچا۔ اصل میں رفیق حسین بخش صاحب اپنے اس رسالے سے اردو اور دین دونوں کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ اس رسالے کا نام مہتاب رکھا گیا اور یہ ایک سہ ماہی رسالہ تھا۔ مہتاب کا پہلا شمارہ جولائی 1993 میں شائع ہوا۔ اس رسالے کے دو پہلے شمارے ہندوستان سے چھپوائے گئے تھے۔ اس میں اسلام کے متعلق احادیث، نصیحت آموز باتیں، حمد و نعت اور قرآنی واقعات بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اردو ادب کے فروغ کے لیے اس میں غزلیں، افسانے، نظمیں بلکہ ہندوستان کے ادیبوں کی تصانیف بھی شامل ہیں۔ نیز اس رسالے میں ماریشس کے مقامی شاعروں کے کلام کی شمولیت بھی ہے۔

''مہتاب'' کے پہلے شمارے کے بارے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس

رسالے کا آخری حصہ طالب علموں اور بچوں کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ اس میں کھیل تماشے، ترجمے، محاورات اور تذکیر و تانیث پر مبنی بحث ملتی ہے۔ علاوہ ازیں، اس میں قارئین سے گزارش کی جاتی ہے کہ وہ اپنے خطوط سے مدیر کو صلاح مشورہ بھی دیں۔ مہتاب کا دوسرا شمارہ جشنِ سرسید پر مبنی تھا۔ تیسرے شمارے کے اداریے میں یہ حقیقت ظہور پذیر ہوئی کہ پہلے اور دوسرے شمارے لوگوں کو بہت پسند آئے۔ مہتاب کے ساتھ وہی سانحہ ہوا جس کا دیگر اخبارات و رسائل شکار ہو گئے تھے۔ یعنی اردو پڑھنے والوں کی قلت پیش آئی۔ نیز اس کی اشاعت کے لیے بہت پیسے لگتے تھے اور رسالے کے فروخت نہ ہونے پر مدیر کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ اسی سبب سے مہتاب کی اشاعت معطل ہو گئی تھی۔

جب بھی ماریشس میں اہم تقریبات اور تاریخ ساز واقعات ہوتے ہیں، ان موقعوں پر مہتاب کا ایک شمارہ ضرور نکلتا ہے۔ مثلاً جشنِ غالب کے موقع پر، جشنِ اردو کے دو موقعوں پر اور 2009 میں جب ایم جی آئی سے بی اے آنرز اردو کا پہلا batch فارغ التحصیل ہوا تو اس یادگار اور تاریخ ساز موقع پر مہتاب کا ساتواں شمارہ شائع ہوا۔ واضح رہے کہ اس کی قیمت پچیس روپے ہے۔ گزشتہ سال ماریشس میں اردو عالمی کانفرنس منعقد ہوئی تھی اور امید ہے کہ جتنے بھی مقالات پڑھے گئے اور جتنی بھی سرگرمیاں ہوئی تھیں ان کا احاطہ اردو اسپیکنگ یونین کے رسالے میں ضرور کیا جائے گا۔

اردو صحافت میں 'صدائے اردو' کا کردار:

2004 میں یو ایس یو اور نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے ایک اخبار جاری کیا گیا تھا جس کا نام صدائے اردو تھا۔ یو ایس یو کے صدر نشین جناب شہزاد عبداللہ احمد اور نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کے اراکین کی یہ ایک اہم کاوش ہے۔ صدائے اردو دو حصوں میں منقسم ہے یعنی نصف حصہ انگریزی زبان میں ہے اور دوسرا حصہ اردو زبان میں۔ اس اخبار میں اردو سے منسلک تقریباً تمام خبریں شائع ہوتی ہیں اور صرف اردو پڑھنے والے ہی اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے ہیں بلکہ دوسرے لوگ بھی اس سے مستفیض ہوتے ہیں۔ یہ اخبار ہر تین مہینوں میں

شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار میں نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کے اراکین لکھتے ہیں بلکہ پہلے پہل صابر گوڈر اور فاروق بوچا صاحبان اداریہ لکھتے تھے لیکن اب اس کی ذمہ داری انور دوست محمد کے سپرد ہے۔ یہ بیک وقت ایک ادبی اور مذہبی اخبار دونوں ہے۔ اس اخبار میں غزلیں، افسانے، قطعات بلکہ دیگر مقامی لوگوں کی تصانیف بھی شائع ہوتی ہیں۔ دیگر ازاں، مقامی ادبا و شعرا صابر گوڈر، سعید میاں جان، فاروق حسنو، فاروق بوچا اور انور دوست محمد صاحبان وغیرہ کے تخلیقی کام شائع ہوتے ہیں۔

واضح رہے کہ اس اخبار میں کالج کے طلبا کی تحریریں بھی شامل ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی اس میں مقالات اور خصوصی مطالعات بھی شامل کیے جاتے ہیں۔ یہ اخبار فروخت نہیں ہوتا ہے بلکہ دنیائے اردو سے وابستہ لوگوں تک یہ رسالہ بذریعہ ڈاک پہنچایا جاتا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ طلبا تک اس کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ کالجوں میں صرف ایک نسخہ فراہم کیا جاتا ہے لیکن یہ عموماً اردو اساتذہ ہی گویا یرغمال کر لیتے ہیں اور اپنے شاگردوں کو اس رسالے سے محروم رکھتے ہیں۔ اب صورت حال یہ ہے کہ سال میں ایک یا مشکل سے دو شمارے نکلتے ہیں۔

ان ساری باتوں کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ماریشس میں اردو صحافت انیسویں صدی سے لے کر آج تک جاری ہے لیکن چونکہ ماریشس میں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کم ہے اسی لیے کئی رسائل اور اخبارات کی اشاعت معطل ہوگئی ہے اور چند طاقِ نسیاں کی زینت ہوگئے ہیں۔ صحافت ایک ایسا موضوع ہے جو باقاعدہ یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہے اور یہ قابلِ اعتنا ہے کہ اس ضمن میں کچھ لوگ ابھی تک سرگرمِ عمل ہیں۔ آج ماریشس میں اردو صحافت کی اگر بات چھیڑی جائے تو بس دو نام سامنے آتے ہیں ایک ہے رسالۂ مہتاب کا اور دوسرا ہے صدائے اردو اخبار کا۔ ہندوستان میں چونکہ اردو پڑھنے والوں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے اسی لیے یہاں اردو صحافت کا دائرۂ اثر مقابلتاً بہت وسیع اور دوررس ہے۔ امید ہے کہ ماریشس میں نئی نسل میں اردو کے لیے بیداری پیدا ہو جائے تاکہ ادب کی ترقی کے ساتھ ساتھ صحافت کی بھی ترویج و اشاعت ہو۔

استفادۂ کتب

کتاب	مصنف	سالِ اشاعت
اردو صحافت اور جنگِ آزادی 1857	معصوم مرادآبادی	2008
Urdu Studies In Mauritius	عنایت حسین عیدن	2006
اردو صحافت، صداقت اور آزادیٔ رائے	عشرت علی صدیقی	1994
History of the Muslims in Mauritius	Moomtaz Emrith	1994
The Making of Mauritius	M.N. Varma	1980
Histoire des Iles Mascareignes	Auguste Toussaint	1973
Histoire de l'océan Indien	Jacques Auber	1955
فنِ صحافت	رحیم علی الہاشمی	1943
رسالہ مہتاب	رفیق حسین بخش	
صدائے اردو	اردو اسپیکنگ یونین	

INTERNET SOURCES:

1. http://en.wikipedia.org/wiki/Journalism
2. http://ur.wikipedia.org/wiki/%D8%AE%D8%A8%D8%B1
3. http://ur.wikipedia.org/wiki/%D8%B3%D9%86%DA%AF%DB%8C_%D8%B7%D8%A8%D8%A7%D8%B9%D8%AA
4. http://en.wikipedia.org/wiki/History_of_journalism#India

5.http://www.salmiakhbar.com/index.php?mod=article&cat=AshoorKazmi&ar
ticle=15353

6.http://www.fikrokhabar.com/index.php/enlightenement-news-article/item/3886-urdu-urdu-akhbarat-aur-urdu-sahafi

7. http://en.wikipedia.org/wiki/Lithography

8. http://m.hamariweb.com/articles/detail.aspx?id=13818

9. http://en.wikipedia.org/wiki/List_of_newspapers_in_Mauritius

10. http://www.pressreference.com/Ky-Ma/Mauritius.html#ixzz3Wn7QYbMM

تیسرا باب

اردو صحافت علاقائی تناظر

(الف) کلکتہ، مغربی بنگال

بنگال میں اردو صحافت: ابتدا تا 1857

امان اللہ محمد

سرزمین بنگال کو اس کا فخر حاصل ہے کہ اس نے اردو صحافت کو جنم دیا۔ جائے پیدائش کے علاوہ اردو نے بنگال کو نئی پہچان عطا کر کے اپنی منفرد تاریخ مرتب کی۔ 27 مارچ 1822 کو اردو صحافت کا آغاز سرزمین بنگال سے ہوا۔ ''جام جہاں نما'' کے علاوہ 1810 میں اردو اخبار کے نام سے کلکتہ سے اردو کے پہلے اخبار کی اشاعت کی بھی تاریخ ملتی ہے جس کو مولوی اکرام نے نکالا تھا۔ ''جام جہاں نما'' کو بہر حال پہلا اردو اخبار ہونے کا شرف حاصل ہے جو مرکزی کلکتہ کے کولوٹولہ سے شائع ہوا تھا۔ بنگال سے اردو صحافت کا آغاز وارتقا ہوا۔ 1857 میں اردو صحافت کا نیا باب شروع ہوا۔

سرزمین بنگال کے اس پہلے اردو اخبار کو کسی مسلمان نے نہیں بلکہ دو غیر مسلم بنگالی بھائیوں ہری ہردت اور منشی سدا سکھ دیو نے شائع کرایا تھا۔ ہری ہردت نامور صحافی اور بنگلہ و انگلی سنگباد کاؤمودی کے بانی تاراچنددت کے بیٹے تھے۔ ''جام جہاں نما'' کے مدیر سدا سکھ لال تھے۔ انگلش کمپنی ولیم ہاپ کنس پیٹرس اینڈ کمپنی نے پہلے اردو اخبار کو شائع کیا۔ اس کی چھپائی مشن پریس

(11 سرکلر روڈ) میں ہوئی اور 2 رکولوٹولہ اسٹریٹ سے جاری ہوا۔ یہ تین صفحات کا کوارٹر سائز ویکلی تھا جو ہر بدھ کو شائع ہوتا تھا۔ ''جام جہاں نما'' ہندوستانی زبان میں شائع ہونے والا دوسرا اخبار تھا۔ اس وقت دو بنگلہ اخبارات سنگباد کاؤمودی اور سماچار چندریکا پہلے ہی سے شائع ہوا کرتے تھے۔ اردو صحافت ان دونوں بنگالی بھائیوں کی ہمیشہ شکر گزار رہے گی۔ انھوں نے نہ صرف سرزمین بنگال بلکہ پورے ہندوستان میں اردو صحافت کی بنیاد ڈالی جس کے سبب دونوں اردو دنیا کی عظیم شخصیت بن گئے۔

17 ویں صدی میں کلکتہ، ہگلی، جہانگیر نگر اور ڈھاکہ کے علاوہ مرشد آباد اردو کا اصل مرکز تھا۔ برطانوی دور حکومت میں بنگال کی راجدھانی کلکتہ ہونے کے سبب یہ اقتدار، صنعت و تجارت کا بھی مرکز بن گیا۔ 10 رجولائی 1800 کو فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا۔ اردو کے سبھی ستارے کلکتہ چلے آئے۔ بنگال کو اردو کی پچاس سالہ شاعری کی تاریخ کے بعد اردو نثر کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔ بنگال کی سرزمین سے اردو نثر کا فروغ ہوا۔ اردو نثر کی ترقی میں اردو صحافت کا بڑا اہم رول ہے۔ انگریزوں نے اردو نثر پر جو احسان کیا ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔ انگریزوں کی آمد سے قبل ادبی و سیاسی حلقے میں فارسی کا غلبہ تھا۔ فارسی چونکہ اعلیٰ طبقے کی زبان تھی جس سے متوسط طبقہ ناواقف تھا۔ انگریزوں کے لیے یہ زبان سیکھنا ضروری ہو گیا۔ بنگال کے متوسط طبقے میں اردو عوامی زبان بن کر ابھر چکی تھی جو تبادلۂ خیال کا واحد ذریعہ بھی بن چکی تھی۔

فورٹ ولیم کالج کے پرنسپل جان گلکرسٹ نے دیسی زبانوں کی کتابوں کو آسان اور عام فہم اردو زبان میں ترجمہ کرانے کے لیے اہم مصنفوں کو طلب کیا۔ کالج کی کوششوں سے اردو نثر کو عام فہم زبان کا درجہ مل گیا۔ میر امن کا سلیس اور عام فہم نثری کارنامہ داستان باغ و بہار ہے جو 1802 میں شائع ہوا۔ اردو نثر کی شاندار مقبولیت نے انگریزوں کو فارسی زبان کو روک کر کے اردو کو تسلیم کرنے پر مجبور کیا۔ 1830 میں فارسی کی جگہ اردو سرکاری زبان بن گئی۔ ''جام جہاں نما'' کے اجرا کے ایک سال بعد لارڈ وارن ہیسٹنگ کی روانگی کے بعد جان ایڈم قائم مقام گورنر جنرل بن گئے جنھوں نے چارج سنبھالتے ہی 4 راپریل 1823 کو اخبارات کے لیے حکومت سے لائسنس حاصل کرنا لازمی قرار دے دیا۔ سر چارلس مٹکاف نے 1835 میں اخبارات پر عائد پابندیوں کو

منسوخ کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیسی زبانوں کے اخبارات زیادہ تعداد میں شائع ہونے لگے جن میں اردو اخبارات پیش پیش تھے، کیونکہ اس وقت اردو سرکاری زبان بن چکی تھی۔ عبدالستار صدیقی نے اپنی کتاب ''ہندوستان کے پرانے اخبار'' میں لکھا ہے کہ ''جام جہاں نما'' 1845 تک شائع ہوا۔ مگر 1857 کے عہد اکبر کے حوالے سے اختر شہنشاہی کے مطابق اشرف نقوی نے اپنی کتاب اردو صحافت کی تاریخ کی پہلی کتاب میں لکھا ہے کہ اردو کا یہ پہلا اخبار 1888 تک شائع ہوا۔ غلام حسین مالک تھے اور مصور حسین مدیر تھے۔

اردو کا پہلا پریس 1801 میں دریائے ہگلی کے کنارے سہرامپور میں مولوی اکرم علی نے قائم کیا اور اس کا نام ہندوستانی پریس رکھا۔ انگریزوں کا دوسرا بڑا تحفہ چھاپہ خانہ تھا جو علم و ادب اور صحافت کی ترقی کا زینہ بنا۔ چھاپے خانے سے قبل فارسی اخبارات ٹائپ میں چھپتے تھے۔ پریس یا چھاپہ خانے میں بھی بنگال کو ہی اولیت حاصل ہے۔ انیسویں صدی میں صرف کلکتہ میں تین درجن پریس تھے مگر لکڑی کے ٹائپ سے چھپائی کا کام ہوتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا صدر دفتر کلکتہ تھا۔ اس دوران کلکتہ میں چھاپے کے اخبارات کا چلن شروع ہو چکا تھا مگر سبھی اخبارات انگریزی کے تھے۔

سرزمین بنگال سے 29 جنوری 1780 کو بنگال گزٹ انگریزی میں شائع ہوا۔ دیسی زبانوں کے اخبارات میں بنگلہ زبان کے اخبار کو اولیت حاصل ہوئی۔ پہلا اور دیسی اخبار 1816 میں ''بنگال گزٹ'' کے نام سے شائع ہوا۔ فارسی زبان کا پہلا ویکلی ''مراۃ الاخبار'' کے نام سے راجا رام موہن رائے کی سرپرستی میں 20 اپریل 1822 میں شائع ہوا۔ اردو زبان کا پہلا ویکلی 27 مارچ 1822 کو پہلے ہی منظر عام پر آ چکا تھا۔ ہندی کا پہلا اخبار بھی 31 مئی 1826 کو شائع ہوا۔

اردو صحافت نگاری میں بنگال کو جو مرتبہ حاصل ہوا وہ ہندوستان کی دیگر ریاستوں میں سے کسی کے حصے میں نہیں آیا۔ بنگال میں صحافت کا آغاز یوں تو اٹھارھویں صدی کی آٹھویں دہائی میں ہی ہو چکا تھا لیکن اردو صحافت کا سفر 1822 میں شروع ہوا جب ملک میں انگریزوں کے جبر و تشدد اور ظلم کا بازار گرم تھا۔ انگریزوں کی غلامی سے نجات پانے کے لیے ہماری قوم 1857 کی جنگ آزادی کی فضا تیار کرنے میں مصروف ہو گئی۔ اردو صحافت نے آزادی کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اردو اخبارات نے قومی یکجہتی سے کبھی بھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ 1857 کی جنگ آزادی

کے بعد انگریزوں نے اردو صحافت کو کچلنا شروع کر دیا۔ بہت سارے اردو اخبارات بند کر دیے گئے۔ دفتروں پر چھاپے پڑے اور مدیروں و مالکان کو گرفتار کیا گیا۔ مسلمانوں پر مظالم ڈھائے گئے۔ 1835 میں اخباروں کے خلاف کالا قانون نافذ ہوا۔ 1857 کی بغاوت سے قبل تک کالا قانون نافذ تھا جس کے ذریعہ اخبارات کی آزادی سلب کر لی گئی تھی۔ چھاپہ خانوں کے لیے لائسنس لازمی قرار دے دیا گیا۔ 1857 میں بنگال سے شائع ہونے والے اخبارات کی تعداد 2950 تھی اور پریس کی تعداد 20 تھی۔ اردو اخبارات سامراجی مظالم کے زیادہ شکار ہوئے۔ 1857 کے بعد اردو صحافت کا نیا باب شروع ہوا۔ کلکتہ سے اردو گائڈ روزنامہ غیر منقسم ہندوستان کا پہلا اردو روزنامہ خان بہادر مولوی کبیر الدین احمد نے نکالا جو برطانیہ نواز تھا۔ آئینۂ نمائش 15 دسمبر 1853 کو شائع ہوا۔ 1823 میں اردو۔فارسی ہفتہ وار شمس الاخبار اور 1869 میں دوربین ہفتہ وار شائع ہوا۔ 1860 میں رفیق الہند شائع ہوا۔ برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت پر اکسانے کے الزام میں ان اردو اخبارات پر جرمانہ کیا گیا۔

ارض بنگالہ کی اردو صحافت: 1858 سے 1900 تک

ابوذر ہاشمی

1858 سے 1900 تک کی اردو صحافت من حیث کل ہیکل تیموریہ کی زمیں بوسی کا نوحہ ہے۔ سنان تیموریہ کے کند ہو جانے کا ماتم ہے۔ ہندوستانی قومیت کے تشخص کے دونیم ہو رہنے پہ اشک فشانی ہے۔ بے کسی اور بے بسی پہ زہر خند طنز ہے۔ اس عہد کی صحافت کا نکتۂ علویا جوہر یہ ہے کہ طنز و ظرافت کو ایک مستقل بالذات صنف بنا کر اردو ادب کی گود میں ڈال دیا گیا ہے۔ صحافت و ادب کی تاریخ شاہد ہے کہ طنز و ظرافت دو نمک ہے جس کے بغیر ادب کا خوان بھی پھیکا رہا کرتا ہے، بلکہ اس نے تو ادبی تنقید جیسے خشک موضوع کو بھی با مزہ کر دکھایا اور مذہبی رسالوں کی ادارت میں مسلمات و فروعات پر گفتگو کے باب میں بھی ظرافت کی آب رکھ گیا۔ یقین جانیے کہ اس جوہر کی تیاری میں ارض بنگالہ کے صحافیوں کا خاص الخاص کردار ہے۔ آیئے اس عقدے کو کھولنے سے پہلے 19ویں صدی کے دوسرے نصف کی صحافت کی کچھ خبر لی جائے اور پھر نظر کی بات کی جائے۔

بنگال اور بالخصوص کلکتہ ہندوستانی صحافت کی جنم بھومی ہے۔ انگریزی صحافت کی ابتدا یہاں سے ہوئی، بنگلہ صحافت کو تو بنگال سے ہی شروع ہونا تھا لیکن فارسی زبان میں صحافت کا آغاز

بھی کلکتے سے ہی ہوا۔ اردو صحافت بھی یہیں سے شروع ہوئی اور ارض بنگالہ کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ اردو روزنامہ کی پہلی اشاعت بھی اسی سرزمین کلکتہ سے ہوئی۔ کلکتے سے نکلنے والا روزنامہ ''اردو گائڈ'' دولسانی اخبار تھا۔ جنوری 1858 سے ہفت روزہ کی شکل میں نکلنا شروع ہوا۔ پھر روزنامہ ہو گیا۔ انگریزی میں بھی خبریں ہوتی تھی اور اردو زبان میں اس کا ترجمہ بھی پیش کیا جاتا تھا۔ اردو صحافت کی تاریخ لکھنے والوں نے اس کے ہفتہ وار ایڈیشن کے روز اشاعت کے بارے میں مختلف آرا پیش کی ہیں۔ کسی نے اشاعت کا دن جمعہ لکھا، کسی نے ہفتہ۔ اس عہد کی صحافت پر نظر کرنے سے پہلے اخباروں کی اشاعت کی خبر دے دی جائے۔ سو لیجیے حاضر ہے فہرست۔ ہم یہاں صحافت کی تاریخ کی کتابوں سے نقل کے سوا اور کر کیا سکتے ہیں۔ اخبارات اور رسالوں کے ناموں کی فہرست کچھ اس طرح ہے:

- اردو گائڈ—1858
- رفیق الہند— جنوری 1860، ایڈیٹر ہریش چندر سکیہ جی۔
- محسنی—1860، مالک محمد حسن
- ملک الاخبار—1862
- انجمن اسلامی—ماہنامہ
- اخبار سلطانی کا اجرا 1865، منیا برج سے ہوا۔
- ہفت روزہ گوہر آصفی —1890 مالک نصیر احمد
- خورشید عالم—1897، بخشی کمپنی کے مالک
- گلدستۂ نیرنگ عالم—1899
- ماہنامہ رسالہ ایسٹ انڈیا ریلوے—1886 کلکتہ
- خادم الاسلام—1900، محمد موسیٰ کی سرپرستی میں
- المصباح—1900

1858 سے 1900 تک کے اخبارات و رسائل کی اس فہرست میں جن نکات پر ہماری نظر ٹھہرتی ہے ان میں سب بڑا نکتہ یہ ہے کہ اردو صحافت گائڈ سے المصباح تک آ پہنچی ہے۔

صحافت اپنے ابتدائی دور سے گزر چکی اور اب ابوالکلام بنا چاہتی ہے، یا یوں کہیے کہ الہلال ہوا چاہتی ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ "جام جہاں نما" کے مدیر اور ناشر ہری ہردت ہیں، تو "اردو گائڈ" کے ناشر کا نام تری لوک ناتھ دت ہے۔ اس عہد سے قبل شائع ہونے والے فارسی اخبار "مراۃ الاخبار" کے مدیر راجہ رام موہن رائے تھے۔ ذرا توقف کیجیے اور بنگال کے باہر سے نکلنے والے اخبارات پر ایک نظر ڈالنے کی اجازت دیجیے۔ اردو اخبارات کے مدیر و ناشر صرف مسلم نہیں، غیر مسلم بھی ہیں۔ بلکہ بعض اخبارات کے ناشر مسلم ہیں تو مدیر غیر مسلم۔ 1857 کے بعد کے زیادہ تر اخبارات کے مدیر تو غیر مسلم ہی ہیں۔ عرض مدعا یہ کہ مختلف مذاہب اور فرقوں کے لوگوں کا شیر و شکر ہو کر جی رہنے اور ہم زیستی کا لطف لینے کا جوہر، بلکہ ہمارے اجزائے ایمان کا ورثہ، اس عہد تک بلا تکلف قائم و دائم ہے۔

ان اخبارات کے کوائف اور مشمولات پر ذرا غائر نظر ڈالیے۔ 1858 تو وہ سال ہے جب ہندوستانی قومیت کا تشخص دو نیم ہو گیا۔ ایسے میں صحافت اپنے تسلسل کی برقراری میں ہی لگی نظر آتی ہے۔ ناکام جنگِ آزادی کے بعد تو صحافت کی بیباکی کے لیے سولی، پھانسی اصل مقام ٹھہرا ہے یا پھر قید و بند کی صعوبتیں۔ لائسنس کا رد کر دیا جانا تو عام سی بات ہے۔ اس سے مفر کی صورت بس یہ ہے کہ قلم گروی رکھ دیا جائے، جان کے لالے پڑے ہیں۔ 1858 میں ایک بار پھر اخباروں کے لیے قانون سخت کر دیے گئے ہیں۔ مگر وقت کے گزران کے ساتھ ذرا دم آتا ہے، تو اخبارات اپنے پر و پنکھ نکالنے لگتے ہیں۔ ذرا اور باریکی سے دیکھیے 1858 سے 1876 تک آتے آتے اخبارات کے موضوعات و مضامین میں بتدریج تنوع آنے لگتا ہے۔ اب تو مضامینِ علیہ کے لیے اخبار مخصوص ہو گئے ہیں۔ شعر و شاعری کی آواز بھی اخبارات کے صفحات پر پھیلنے لگتی ہے۔ تجارت کے نکات بھی اپنی کرنیں بکھیرنے لگتے اور سب سے اہم بات یہ کہ احساس وجود پھر سے ہونے لگتا ہے۔ حکومت کی پالیسیاں پھر سے زد میں آنے لگتی ہیں۔ ایک نیا اسلوب، پردہ داری کا اسلوب، اخبار نویسی کی طرح بن جاتا ہے۔

اس طرح نے احساسِ کمتری کے شکار ہندوستانیوں کو اپنے آقا پر ہنسنا بھی سکھایا، طنز

کرنے کا حوصلہ بھی دیا اور مزے کی بات یہ بھی ہے کہ یہ اسلوب و ہیئت بھی اہلِ مغرب، بلکہ خاص لندن سے لیا گیا۔ اہلِ مغرب کا ہنر ہی ان پر آزمایا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملکِ برطانیہ کی صحافت میں ہفتہ وار London punch کی دھوم مچی تھی۔ اس کی شہرت کے معیار کا اندازہ لگائیے کہ جس ٹیبل کے گرد بیٹھ کر انگریز صحافی لکھا کرتے یا میٹنگیں کیا کرتے تھے۔ اس کا نام ہی پنچ ٹیبل پڑ گیا تھا۔ مگر ایک وقت ایسا بھی آیا پنچ ٹیبل کی شہرت نیلام ہو گئی۔ یہ لندن پنچ ہندوستان بھی پہنچتا تھا۔ سو ہندوستانیوں نے انھیں کے اسلوب میں ان پر ہنسی کے تیر چلانے شروع کر دیے۔ احساسِ کمتری اور نفسانفسی کے اس دور میں شکست خوردہ قوم کی آنکھوں سے ٹپکتے آنسو بھی پونچھے اور ہمارے قومی جذبے کو جگانے کا فریضہ بھی انجام دیا۔ ورنہ گنگا تو ٹیمس ندی کی منھ زور لہروں کے زیرِ اثر الٹی بہنے لگی تھی۔ ایسے میں ارضِ بنگالہ کا ایک نامہ نگار نواب سید محمد آزاد بھی خیالی طور پر اس ٹیمس ندی میں ڈبکی لگاتا ہے۔ ان کا قلم جب اس آب سے دھل کر نکلتا ہے تو طنز کے تیر برساتا ہے اور مزاح کی دھار میں شکست خوردگی کے احساس کو بہا لے جاتا ہے۔ ہاں صحیح ہے کہ آزاد کے مضامین بنگال کے اخبارات میں شامل نہیں ہوئے، لیکن اودھ پنچ کی زینت تو بنے نا! ہم نے بنگال کی اخبار نویسی میں اودھ کے ایک اخبار کا ذکر کر کے کوئی غلطی نہیں کی۔ ہم مانے لیتے ہیں کہ بنگال پنچ اور کلکتہ پنچ جو 1875 اور 1880 میں نکلنا شروع ہوئے، کے مزاح کا معیار اس علو کو نہیں چھوتا کہ اس پر سنجیدہ گفتگو ہو۔ بنگال پنچ ہی کیوں الپنچ، پٹنہ، جس کے آخری مدیر اس خاکسار کے جد امجد مولانا خیر رحمانی تھے اور خود بھی مختلف ناموں سے طنز کے تیر برساتے تھے، اس معیار کو نہ پہنچے۔ صحافی اور قلم کار تو اور بھی تھے جنھوں نے بڑا نام بھی کیا۔ پنچ لگانے والے اخبارات اکثر شہر سے نکل رہے تھے لیکن ''اودھ پنچ'' کی گرد کو کس نے پایا۔ یہ بھی درست ہے۔ دوسرے، یہ کہ آزاد کا پنچ تھا ہی نہیں اور اودھ پنچ کا معیار آزاد کے قلم کے سبب ہی تھا۔ دوسرے تمام پنچ مار اخبار نویس تو نظریاتی کا ماحول بنائے رکھنے کے لیے تھے۔ اودھ پنچ بنگال کا اخبار نہ تھا، لکھنؤ کا تھا۔ مگر اس سے کیسے انکار کیا جائے کہ اودھ پنچ پر بنگال کا رنگ غالب تھا۔ یہ متفق علیہ فیصلہ ہے کہ نواب سید محمد آزاد کی تحریریں ہی اس میں سرِ فہرست کا درجہ رکھتی تھیں۔ شاید سبب اس کا یہ تھا کہ آزاد نے اپنی آنکھوں سے انگریزوں کو، ان کی معاشرت کو دیکھا تھا۔ آزاد کی تحریریں دراصل برائے مزاح نہ تھیں۔ یہ تو ہندوستانیوں کی اپنی فکر و نظر کے تحفظ کا

عنصل تھا۔ آزاد نوکر شاہی میں شامل تھے۔ اس لیے "قلم گوید" کو ملکہ یعنی تاج برطانیہ کا حق نمک ادا کرنا تھا۔ کھل کر کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ سوگنگا اُلٹی بہی۔ خوب بہی اور ادب پر اپنا مستقل نشان اس طرح چھوڑ گئی کہ مزاحیہ اخبارات کا زور جب ٹوٹا تب بھی مزاح کا کالم ہر اخبار میں قائم ٹھہرا۔ خامہ بگوشوں نے اس جوہر کو اپنی تنقید کے لیے اپنایا تو اس کی جگلی ملاؤں کو مسجد سے مے خانے تک کا طواف کراتی رہی۔

اوپر کے صفحات میں ارض بنگالہ کی اردو صحافت کو "المصباح" تک پہنچتا ہوا آپ نے دیکھا۔ یعنی معاملہ ابوالکلام کا ہے، سو ہماری زبان گنگ ہے کہ ہمیں 1900 سے آگے جانے کی اجازت نہیں۔

لیکن ہمیں اتنا بس اور کہنا ہے کہ دو ورقی، چہار ورقی یا آٹھ سے بارہ ورقی بظاہر، بے ضرر سے اخبارات سے متعلق ایک انگریز قلم کار J.Long نے لکھا ہے کہ بظاہر بے ضرر اور معمولی سے اخبارات تھے مگر ان میں لوک گیتوں کی کشش تھی۔ یہ دراصل اخبارات تو تھے ہی نہیں۔ یہ ہندوستان کے دھڑکتے ہوئے دل تھے اور دھڑکتے ہوئے دلوں سے حاکم پر لرزہ طاری تھا۔

مغربی بنگال میں اردو صحافت
1900 سے 1947 تک

محمد وسیم الحق

یہ فخر کلکتہ کو حاصل ہے کہ اردو کا پہلا اخبار اس سرزمین سے نکلا۔ ملک کا پہلا اردو اخبار ہونے کا شرف خواہ "جام جہاں نما" کو حاصل ہو یا کسی اور اخبار کو بہر حال یہ ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے کہ اردو صحافت کی بنیاد اسی شہر نشاط میں پڑی۔

1822 سے 1900 تک اردو صحافت نے لمبا سفر طے کیا اور پورے ملک سے اور مغربی بنگال سے متعدد اردو اخبارات نکلے۔ "جام جہاں نما" کے فارسی حصے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مفادات سے متعلق مواد اور خبریں ہوتی تھیں لیکن اردو والے حصے میں بے لاگ تبصرے اور جاندار خبریں ہوتی تھیں۔ حکومت کے اس وقت کے چیف سکریٹری مسٹر ولیم بٹر ورتھ بیلے نے "جام جہاں نما" کے پہلے چھ مہینے کے شماروں کے مطالعے کے بعد اپنے تبصرے میں کہا تھا کہ یہ اخبار سنگین شر انگیزی کا انجن بن سکتا ہے۔ اس سے بیلے کی مراد یہ تھی کہ یہ اخبار سیاسی بیداری کے جذبات پیدا کرنے والا ہے اور برٹش سامراج کے استحکام کے خلاف خطرے کا باعث ہو سکتا ہے۔ انیسویں

صدی کے پہلے نصف میں جاری ہونے والے اردو کے بیشتر اخبارات نے ''جام جہاں نما'' کی تقلید کی، یہاں تک کہ شمالی ہند کا پہلا اردو اخبار ''دہلی اردو اخبار'' بھی اس سے خاصا متاثر تھا۔ یہاں اس امر کا ذکر بے موقع نہ ہوگا کہ 1907 میں جب 1857 کی پہلی جنگ آزادی کی 50 ویں سالگرہ آئی تو اردو اڈیٹروں اور وقائع نگاروں نے اس جنگ آزادی کے نامکمل کام کو پورا کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس کی تکمیل کے لیے سر دھڑ کی بازی لگادی۔ اسی جذبۂ حریت کے تحت پنجابی زبان کا فریادی گیت ''پگڑی سنبھال او جٹا پگڑی سنبھال'' منظر عام پر آیا۔ اس دوران جتنے بھی اخبارات شائع ہوئے ان میں استعماریت مخالف جذبات نمایاں تھے۔ بیسویں صدی کی پہلی اور دوسری دہائی میں اردو اخبارات کا یہی مزاجی رویہ تھا۔

اردو صحافت کے حوالے سے بیسویں صدی کی دوسری دہائی کو شاہکار عہد قرار دیا جاسکتا ہے جب 13 جولائی 1912 کو مولانا ابوالکلام آزاد نے ملک کا پہلا مصور ہفتہ وار ''البلال'' جاری کیا جس کی تعداد اشاعت دیکھتے ہی دیکھتے 25 ہزار تک پہنچ گئی۔ البلال کئی معنوں میں غیر معمولی امتیاز کا حامل تھا کہ اول تو یہ ملک کا پہلا مصور اردو رسالہ تھا، دوسرے اس کا خبری معیار نہایت بلند و وقیع تھا جو اس وقت کے انگریزی روزناموں کی ہمسری کرتا تھا۔ نظریاتی توانائی کے اس سرچشمہ میں مولانا آزاد کی حب الوطنی انگڑائیاں لیتی ہوئی نظر آتی تھی۔ اس پر سوا مولانا آزاد کا طلسم خیز اسلوب کہ مسلمان تو مسلمان، غیر مسلم بھی ان کے والہ و شیدا تھے۔ مولانا حسرت موہانی نے جو بیک وقت شاعر، صحافی اور مجاہد آزادی بھی تھے اور ''اردوئے معلی'' کے نام سے ایک رسالہ نکالتے تھے۔ اس شعر کے ذریعہ مولانا ابوالکلام کی تحریر کی سحر انگیزی کا اعتراف کیا ہے۔۔

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں وہ مزا نہ رہا

''البلال'' میں مولانا کی سحر انگیز تحریروں نے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو یکساں طور سے سرشار کیا اور لوگوں کی رگ و پے میں آزادی و حریت کا جوش بھر گیا۔ البلال انگریزوں پر بجلی کا ایک کڑکا بن کر ٹوٹا جس سے برٹش سامراجیت دہل کر رہ گئی۔ اس کے پیش نظر حکومت بنگال نے 16 نومبر 1914 کے اپنے حکم سے البلال پریس کی دو ہزار روپے کی ضمانت ضبط کرلی اور اخبار

کے 14 اور 21 اکتوبر 1914 کے شمارے کی تمام کاپیاں بھی اپنے قبضہ میں کرلیں۔ مولانا اس وقت کلکتہ میں موجود نہیں تھے لیکن جب انھیں پیش آمدہ حالات کا علم ہوا تو انھوں نے اپنے معاون کو الہلال کی اشاعت جاری رکھنے کی ہدایت دی۔ مولانا آزاد کے عزم و حوصلے کو دیکھتے ہوئے حکومت نے نئی ضمانت کے طور پر دس ہزار روپے کی خطیر رقم کا مطالبہ کیا جسے ادا کرنا ناممکن تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ شاہ سے زیادہ شاہ پرست کی گماشتگی کے مصداق مولانا آزاد کے الہلال پر حکومت کی نظر تو کم تھی لیکن الٰہ آباد سے شائع ہونے والے انگریزی اخبار ''پائنیئر'' کی خباثت زیادہ تھی۔ پائنیئر الہلال کے پیچھے پڑ گیا تھا اور اس کے مبینہ ''شرارت انگیز مضامین'' کو ''کنایہ آمیز، مخفی استہزا، پوشیدہ تمسخر اور اشارت سے لبریز'' قرار دیتا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ الہلال کے دونوں مبینہ قابل اعتراض مضامین سرکردہ انگریزی اخبارات کی تحریروں پر مبنی تھے اور الہلال نے پائنیئر کو ترکی بہ ترکی جواب بھی دیا لیکن پائنیئر کے اس بغض للّٰہی نے الہلال کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ ملک کے لیے کامل آزادی کا صور سب سے پہلے مولانا حسرت موہانی نے اپنے اخبار ''اردوئے معلّٰی'' سے پھونکا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال نے اس کی پوری شدت سے تائید کی۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو اخبارات کی اس روش سے سرشار ہوکر ہی انڈین نیشنل کانگریس نے 1929 میں ایک باضابطہ قرارداد منظور کر کے ملک کو مکمل طور سے آزاد کرانے کا اعلان کیا۔ الہلال اور البلاغ کی صورت میں مولانا آزاد نے اردو صحافت کو ایک نئے اسلوب اور پیغام سے روشناس کرایا لیکن پائنیئر کی چغل خوری اور برطانوی سامراج کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے یہ دونوں اخبار بند ہو گئے۔

الہلال کے صحافتی مطلع سے غائب ہونے اور طلوع آزادی تک کلکتہ سے اردو کے جو اخبارات نکلے ان میں مولانا آزاد کی تحریروں کا بانکپن اور سوز و گداز تو نہیں تھا تاہم یہ اپنے اپنے طور سے صحافت کا فرض منصبی ادا کر رہے تھے۔ 1930 میں روزانہ ہند جاری ہوا جس کے بانیان کا تعلق کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا سے تھا۔ اس کے ایڈیٹر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی تھے۔ بعد میں بوہرہ فرقہ کے ایک کاروباری طیب بھائی ظریف نے اسے خرید لیا۔ وہ ضلعی سطح پر کانگریس کے لیڈر تھے۔ چنانچہ اخبار کی پالیسی بھی کانگریس کے تابع تھی۔ اس کے بعد عصر جدید کا اجرا ہوا جو

مولانا شائق احمد عثمانی کی ملکیت تھا۔ یہ اخبار مسلم لیگ کی بھرپور ترجمانی کرتا تھا لیکن آزادی کے بعد یہ خان بہادر محمد جان کی ملکیت میں آ گیا اور اسی کے ساتھ اس کی پالیسی بھی بدل گئی۔ بعد میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے روزنامہ ہند سے الگ ہو کر آزاد ہند نکالا جو خاصا مقبول ہوا۔ اپنی حیات ہی میں مولانا نے اخبار کی ذمہ داری اپنے فرزند احمد سعید ملیح آبادی کے حوالے کر دی جنھوں نے بہت محنت اور جوش و خروش کے ساتھ اس کی آبیاری کی۔ اس دوران کلکتہ کے افق پر یکے بعد دیگرے کئی شام ناموں کا ورود ہوا جن میں الحق، انگارہ، آبشار، امروز، اخوت اور غازی قابل ذکر ہیں۔ آبشار جس کے ایڈیٹر ابراہیم ہوش تھے خاصا مقبول تھا اور محنت کش طبقے کا ترجمان سمجھا جاتا تھا۔ اس کا طرۂ امتیاز یہ تھا کہ بیڑی مزدوروں کی چوپال میں ایک شخص بآواز بلند اس کی خبریں اور اداریہ پڑھتا تھا اور سب لوگ سن کر سرشار ہوتے تھے۔ آزادی کے بعد دیگر زبانوں کے اخبارات راتوں رات ان معنوں میں پیشہ ور ہو گئے کہ اخبارات میں مالک اور کارگزار صحافیوں کی شناخت کی جانے لگی لیکن چونکہ اردو اخبارات کے بیشتر مالکان خود ایڈیٹر تھے اس لیے مالک اور مزدور کے رشتے کی بنیاد یہاں نہیں پڑی۔ علاوہ ازیں آزادی کے بعد جس کثرت اور تسلسل کے ساتھ فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہے اس کے پیش نظر بھی اردو اخبارات کی توجہ اپنے وجود کو بچانے اور ملت کی ترجمانی و نمائندگی پر مرکوز رہی۔ آزادی تک روزنامہ ہند، عصر جدید اور آزاد ہند پابندی سے شائع ہوتے رہے۔ ان کے مندرجات خبروں کے علاوہ تازہ مضامین، حالات حاضرہ پر اداریوں اور قارئین کے خطوط پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اپنے مخصوص حالات اور محدود وسائل کے سبب اردو اخبارات اپنے انگریزی یا بنگلہ ہم عصروں کے ہمسر تو نہیں ہیں لیکن اپنے محدود وسائل سے مقدور بھر اپنے قارئین کی خدمت کرتے ہیں اور انھیں نشیب و فراز سے آگاہ کرتے رہتے ہیں۔

اردو صحافت 2015-1948

کریم رضا مونگیری

صحافت سے ارض بنگالہ کا رشتہ بہت زیادہ گہرا اور مضبوط ہے۔ یہ سرزمیں صحافت کے لیے ہمیشہ سے سازگار و مددگار رہی بلکہ کئی کئی زبانوں کی صحافت کی ابتدا بھی یہیں سے ہوئی۔ 3/مئی 1826 کو جگل کشور شکلا نے ہندی کا پہلا اخبار ہفتہ وار ''اودنت مارتنڈ'' 37/امرتلہ گلی، کولوٹولہ اسٹریٹ، کلکتہ سے شائع کیا جو نا مساعد حالات کے سبب 4/دسمبر 1827 کو بند ہو گیا۔ ملک کا پہلا ہفتہ وار اخبار ''بنگال گزٹ'' جو انگریزی میں تھا 29/جنوری 1780 کو کلکتہ سے شائع ہوا جو بعد ازاں اس کے ایڈیٹر جیمس اگسٹن ہکی کے نام پر ''ہکی گزٹ'' کے نام سے مشہور ہو گیا۔ بنگلہ زبان کے پہلے اخبار کے متعلق محققین کی رائے میں اختلاف ہے۔ کوئی ''بنگال گزٹ'' ہی کو بنگلہ زبان کا پہلا اخبار کہتا ہے تو کوئی مارش مین کے ''ڈگ درشن'' کو۔ بہر حال باضابطہ طور سیرام پور سے بنگلہ کا پہلا اخبار مئی 1818 میں ہفتہ وار ''سماچار درپن'' جاری ہوا جو اپریل 1853 تک جاری رہا۔ اسی زمانے میں راجا رام موہن رائے نے ایک بنگلہ ہفتہ وار نکالا تھا۔ راجا رام موہن رائے ہی کی صدارت میں سرزمین بنگالہ سے فارسی زبان کا پہلا ہفتہ وار اخبار ''مراۃ الاخبار'' شائع ہوا

راجا صاحب ہی اس اخبار کے مالک و مدیر تھے۔ یہ فارسی ہفتہ وار ہر جمعہ کو نکلتا تھا۔ اردو کا اولین اخبار "جام جہاں نما" بروز بدھ بتاریخ 27/مارچ 1822 کو بنگال کی سرزمین ہی سے معرض وجود میں آیا۔ "جام جہاں نما" کے مالک ہری ہردت اور مدیر منشی لالہ سدا سکھ تھے۔ یہ اخبار بعد ازاں فارسی زبان میں منتقل ہو گیا۔

بنگال سے صحافت کی وابستگی بہت قدیم ہے۔ اسی سرزمین سے مولانا ابوالکلام آزاد نے 1912 میں "الہلال" جاری کیا جس نے دنیائے اردو صحافت میں ایک عظیم انقلاب برپا کر دیا۔ ہندوستانیوں کو حلقۂ غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لیے ان کے اندر شعوری بیداری پیدا کی اور ان کے دلوں میں جذبۂ حب الوطنی کے چراغ روشن کرنے کا فریضہ سرانجام دیا۔ ابتدا سے آج تک کی اردو صحافت کی تاریخ بہت زیادہ پھیلی ہوئی ہے اور اس تاریخ کو ضبطِ تحریر میں لانے کی کوشش ہمیشہ ہوتی رہی ہے۔ اس تعلق سے کئی اہم تصنیفات و تالیفات منظر عام پر آچکی ہیں۔ اردو زبان اور اردو صحافت ہمیشہ اپنے ان قلم کاروں اور محققوں کی ممنون رہے گی۔

اردو صحافت اپنے اس سفرِ نشیب و فراز میں کئی ادوار سے گزر چکی ہے۔ پہلا دور اپنے آغاز یعنی 1822 سے 1857 تک، دوسرا دور 1858 سے 1900 تک، تیسرا دور 1901 سے 1947 تک اور چوتھا دور 1948 سے 2015 تک۔ واضح ہو کہ تیسرے دور کا ابتدائی حصہ اردو صحافت کے لیے 'انقلابی' تھا مگر اس دور کا آخری حصہ بہت زیادہ 'بحرانی' بھی تھا۔ وہ مصائب و آلام اور سخت امتحانات و آزمائش کا دور رہا ہے۔

تقسیم ملک کے بعد ہندوستان کا پڑھے لکھے مسلمان طبقے کا ایک بڑا حصہ پاکستان میں جا بسا۔ اردو پڑھنے لکھنے اور بولنے والوں کی بھاری تعداد جب ہندوستان سے رخصت پذیر ہوئی تو ایسے میں یہاں اردو زبان کی بقا بھی ایک سنگین مسئلہ بن گیا۔ اس صورت حال میں اردو اخبارات کا مستقبل اندھیروں کے حصار کا اسیر ہو گیا تھا۔ 1948 سے عصر حاضر تک بنگال میں اردو صحافت نے جو سفر طے کیا اس کی تاریخ کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرنے کی سعی کر رہا ہوں۔

ہندوستان کی تقسیم کے بعد سے 1992 تک تقریباً تیس روزنامے بنگال سے جاری

تھے، جن میں سے دو تہائی اخبارات اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ جن میں ''عصر جدید''، ''الحق''، ''امروز''، ''انگارہ''، ''کارواں''، ''اخوت''، ''غازی''، ''سنگم''، ''رہبر''، ''نقاش'' (1951)، ''انصاف'' (1951)، ''پیغام'' (1951)، ''جمہور'' (1961)، ''ستارہ'' (1952)، ''نیو مجاہد'' (1951)، ''رہنما'' (1952)، ''رہبر عالم'' (1970)، ''ہوڑہ ٹائمز'' (1970)، ''محاذ'' (1972)، ''صدائے عالم'' (1974)، ''اقراء'' (1992) کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان مرحومین اخبارات میں سے چند کی مختصر تفصیلات پیش خدمت ہیں۔

عصر جدید: یہ روزنامہ عرض بنگالہ کا سب سے طویل العمر روزنامہ تھا۔ اس کا جرا 1918 میں ہوا۔ اس کے مالک شائق احمد عثمانی تھے جو مسلم لیگ کے بڑے حامی تھے۔ روزنامہ ''عصر جدید'' نے بنگال میں مسلم لیگ کو مضبوط و مستحکم کرنے اور تحریک پاکستان کو تقویت پہنچانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ بقول ابراہیم ہوش ''عصر جدید' مسلم لیگ کا آرگن اور ترجمان تھا''۔

روزنامہ 'عصر جدید' کے خلاف حکومت نے کئی بار مقدمے چلائے اور اس کے مالک کو قید بامشقت کی سزا بھی ہوئی۔ یہ اخبار کئی بار بند ہوا۔ اس کے مدیر ابوالمظفر اور پرنٹر پبلشر چراغ حسن حسرت تھے۔ 1932 میں اس کے پبلشر مولانا عبدالجبار وحیدی تھے۔ اس اخبار کو ہر زمانے میں حکومت کی جانب سے وارننگ کا سامنا کرنا پڑا۔ 1921 میں اس اخبار کی تعداد اشاعت تین ہزار تھی اور قیمت چھ پائی۔ 1941 میں ارشد عظیم اس کے مدیر تھے۔ اس وقت ''عصر جدید'' کا دفتر نمبر 30 رفیئرس لین، کلکتہ میں تھا۔

انگارہ: شام کا روزنامہ ''انگارہ'' تقسیم ملک سے قبل 1939 میں جاری ہوا لیکن صرف چند مہینے کے بعد بند ہو گیا۔ اس زمانے میں انڈین نیشنل پریس، ایڈن ہاسپٹل روڈ، کلکتہ سے چھپ کر 88 رگری بابو لین سے شائع ہوا کرتا تھا۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد یہ اخبار پھر دوبارہ جاری ہوا۔ اس کے مالک و مدیر منشی عبدالوہاب غازی اصلاحی تھے۔ اول اول یہ روزنامہ مسلم لیگ کا زبردست حامی اور ترجمان تھا۔ تقسیم کے بعد یہ مسلم لیگی تو نہیں رہا مگر حکومت کی نظر میں یہ فرقہ پرست اخبار قرار پا چکا تھا۔ حکومت کی جانب سے اس اخبار کے خلاف کئی مقدمات دائر کیے گئے۔ اس کے مدیر و مالک منشی عبدالوہاب غازی اصلاحی نے کئی بار جیل کی مشقتیں جھیلیں۔ 1952

میں انہیں آخری بار گرفتار کیا گیا۔ ان کی اس گرفتاری کا واقعہ شانتی رنجن بھٹا چاریہ اس طرح رقم کرتے ہیں:

> ''1952 میں اس وقت کے وزیر اعلیٰ مغربی بنگال ڈاکٹر بدھان چندر رائے کے ووٹوں کی گنتی مکمل ہونے سے پہلے ہی اس اخبار (انگارہ) نے یہ خبر چھاپ دی تھی کہ مغربی بنگال کی سب سے بڑی توپ لڑھک گئی'' اس خبر کے چھپتے ہی ''انگارہ'' کے دفتر پر چھاپہ پڑا اور غازی اصلاحی صاحب پکڑ لیے گئے۔''

(بنگال میں اردو صحافت کی تاریخ از شانتی رنجن بھٹا چاریہ کلکتہ 2003 رص 255)

کارواں: آزادی کے بعد فروری 1949 میں شام کا روزنامہ ''کارواں'' کلکتہ سے جاری ہوا۔ اس اخبار کے مالک و مدیر اور پرنٹر پبلشر محمد یونس نظری تھے۔ 1950 میں اس پر حکومت نے پابندی لگا دی جس کی وجہ سے ایک سال مسلسل بند رہا۔ بعد ازاں 15 راگست 1950 سے دوبارہ جاری ہوا اور پھر تین سال کی مدت گزار کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس اخبار کے مالک یونس نظری دربھنگہ سے آکر کلکتہ میں بس گئے تھے۔ وہ بنیادی طور پر ایک کہنہ مشق اور نامور خوش نویس تھے۔ انھوں ایک اور اخبار ''نقاش'' جاری کیا تھا جسے کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کے دوستوں میں شمین مظفر پوری اور سید محمود طرزی کے نام شامل ہیں۔

الحق: یہ روزنامہ 1941 کے اختتامی حصے میں جاری ہوا۔ شام کا یہ روزنامہ مندر اسٹریٹ، کلکتہ کے عزیز یہ پریس میں چھپا کرتا تھا اور وہیں سے شائع بھی ہوتا تھا۔ اس کے مالک مولوی سید معز الدین چھلواری اور مدیر کاظمی صاحب تھے۔ شروع میں یہ اخبار فضل الحق کی حمایت میں تھا۔ لیکن بعد ازاں مسلم لیگ کا حامی ہو گیا۔ تقسیم کے بعد جب کاظمی صاحب پاکستان چلے گئے تو مسند ادارت پر ولی اللہ صاحب رونق افروز ہوئے۔ اور جب انھوں نے بھی کلکتہ کو خیر باد کہہ دیا تو ان کی جگہ اسرائیل احمد آئے۔ 1951 میں اس کی تعداد اشاعت دس ہزار پہنچ گئی تھی۔ روزنامہ ''الحق'' مالک اور ملازمین کے درمیان تنازعات کی نذر ہو کر 1958 میں ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

امروز: کلکتہ سے شائع ہونے والے شام کے اس اخبار کا اجرا 16 رنومبر 1951 کو ہوا۔

یہ اخبار 9۔بی ر بولائی دت اسٹریٹ سے شائع ہوا کرتا تھا۔''عصر جدید'' کے مالک خان بہادر الحاج شیخ محمد جان ہی اس اخبار کے بھی مالک تھے۔اس کے اہم مدیران میں اقبال اکرامی، ایچ۔نظام الدین اور ناظر الحسینی کے اسمائے گرامی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔آخری ایام میں سفیان عالم بھی اس کے مدیر رہے ہیں۔یہی سفیان عالم بعد ازاں 'امروز' اور عصر جدید کے منیجر بھی ہوئے۔

اخوت: اس کی تاریخ اجرا یکم اگست 1957 ہے۔ابتدائی دور میں اس کے مدیر اردو کے معروف شاعر ناظر الحسینی تھے جو کم وبیش چار سال تک اس اخبار میں مدیر کے فرائض بخوبی انجام دیتے رہے۔بعد ازاں وقار مشرقی علیگ اس کے مدیر ہوئے۔اس روزنامے کی مدت حیات زیادہ طویل نہیں تھی۔یہ صبح کا اخبار تھا جو چھ صفحات پر مشتمل تھا اس کے بند ہو جانے کے بعد بھی وقار مشرقی نے ''اخوت'' کے نام سے تین شمارے بطور ماہنامہ نکالے۔1959 میں 'اخوت' کا ایک یادگار ''جشن آزادی نمبر'' شائع کیا گیا جس کی حیثیت دستاویز کی ہے۔

غازی: جولائی 1965 میں روزنامہ ''غازی'' کا اجرا ہوا جسے 'انگارہ' کے مالک و مدیر منشی عبدالوہاب غازی اصلاحی نے نکالا تھا۔انہوں نے ''غازی'' کے تقریباً ساٹھ (60) شمارے نکالے۔اس کے بعد وقار مشرقی نے اسے خرید لیا۔یکم مئی 1967 سے یہ روزنامہ ایک نئی انتظامیہ کی نگرانی میں 8 رایڈن ہاسپٹل روڈ سے شائع ہونے لگا۔1979 میں وقار مشرقی نے شام کے اس اخبار کو صبح کا روزنامہ بنا دیا۔ان کا یہ تجربہ ناکام ہو گیا اور پھر ''غازی'' شام کے اخبار کے طور پر نکلنے لگا۔

سنگم: عظیم آباد (پٹنہ) سے شائع ہونے والے روزنامہ ''سنگم'' کے مدیر و سرپرست غلام سرور کو 'متحدہ محاذ' نے دعوت دے کر کلکتہ بلایا تا کہ وہ بنگال میں کمیونسٹوں کی حمایت اور اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔چنانچہ اسی مقصد کے تحت 1970 میں روزنامہ ''سنگم'' کا کلکتہ ایڈیشن جاری کیا گیا۔کلکتہ ایڈیشن کے لیے پٹنہ سے شمیم مظفر پوری اور محمود ایوبی بلائے گئے۔تقریباً دو سال کی مسلسل تگ و دو اور مشقت کے باوجود غلام سرور صاحب کلکتے میں اپنے اور اپنے اخبار کے قدم جمانے میں بری طرح ناکام ہو گئے اور پھر ''سنگم'' کا کلکتہ ایڈیشن اختتام پذیر

ہوا۔ کلکتہ میں یہ اخبار 43 رمیکلوڈ اسٹریٹ سے نکلتا تھا۔

ہوڑہ ٹائمز: نومبر 1970 میں اس روزنامے کا اجرا ہوا۔ ابتدائی دنوں میں معروف شاعر جناب قیصر شمیم اس کے مدیر تھے۔ اول اول یہ ہفتہ وار اور پندرہ روزہ اخبار تھا جو آگے چل کر روزنامہ بن گیا۔ پندرہ روزہ کے زمانے میں اس کے مدیروں میں شمس الدین اور راقم لکھنوی کے نام شامل ہیں۔ یہ اخبار چار صفحات پر مشتمل تھا۔ ستمبر 1979 میں اس کے پرنٹر پبلشر شمس الدین اسے بھارت آرٹ پریس، نور علی لین، کلکتہ۔14 میں چھپوا کر ''ہوڑہ ٹائمز'' کے دفتر 70۔کاویز گھاٹ روڈ، ہوڑہ سے شائع کرواتے تھے۔ اس کے مدیر نور قریشی تھے۔ روزنامے کی حیثیت سے یہ اخبار بہت مختصر مدت تک زندہ رہا۔

شان ملت: ''شان ملت'' شام کا اخبار تھا۔ اس کے مدیر، پرنٹر، پبلشر جناب محمد الیاس اصلاحی ایم اے تھے۔ اس کی چھپائی ملت پریس اینڈ ٹرسٹ کے زیر اہتمام ہوتی تھی۔ یہ چار صفحات پر مشتمل اخبار تھا۔ یہ اخبار عام طور پر پابندی کے ساتھ نہیں نکلتا تھا۔ تاہم اس کے مشمولات بہت عمدہ ہوا کرتے تھے۔ اس میں اکثر و بیشتر پر مغز مضامین اور فکر انگیز تحریریں شائع ہوتی تھیں جن کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔

اقراء: اس روزنامے کی تاریخ ولادت 9 رستمبر 1983 ہے۔ کلکتہ میں یہ روزنامہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ منظر عام پر آیا اور آتے ہی شہر میں اس نے دھوم مچا کر رکھ دی۔ یہ شہر نشاط کا تیسرا روزنامہ تھا جو آفسیٹ مشین پر چھپتا تھا۔ اس کے مالک، مدیر اور پرنٹر پبلشر عمر حیات خان تھے جو مشہور قاضی زمانہ الماس خان (کوہ نور آرٹ پریس) کے فرزند تھے۔ اس اخبار میں اشتہارات نہ ہونے کے برابر تھے تاہم اس نے بنگال کے کئی ممتاز اور نامور فنکاروں کو اپنے ساتھ منسلک کر لیا تھا۔ یہ اخبار کوہ نور آرٹ پریس پرائیویٹ لمیٹڈ، کلکتہ 16 میں زیور طباعت سے آراستہ ہو کر 14/ اے کے ایم صدیقی لین سے شائع ہوتا تھا۔ کچھ ہی عرصے کے بعد یہ روزنامہ حالات کا شکار ہو کر بند ہو گیا۔

آیئے اب بنگال کے ان اخباروں کا جائزہ لیا جائے جو آزادی کے بعد سے لے کر سال 2015 کے درمیان یہاں منظر عام پر آئے، ان میں سے بہت سے اب بھی نکل رہے

ہیں۔ان اخبارات میں ''روزانہ ہند''(1929)، آزاد ہند''(1948)، ''عکاس''(1966)، ''آبشار''(1954)، مشرقی ہند''(1974)، ''اخبار مشرق''(1980)، ''نوائے حال''(1983)، ''روزنامہ راشٹریہ سہارا''(2007)''قومی تنظیم''(2015) ''نوائے بنگال''(2015)، ''عوامی نیوز''(2015)۔ رجسٹرار آف نیوز پیپر کے مطابق اور بازاروں میں نہ دکھائی دینے والے مغربی بنگال کے روزناموں میں ''لبیک''، ''المومن''، ''وقت اور سماج''، اور ''سیاسی پیغام'' کے نام شامل ہیں۔شام کے اخبارات میں ''مدبر''، ''مسلم یوتھ'' اور شام مہانگر، کلکتہ قابل ذکر ہیں۔

روزانہ ہند: اس اخبار کا آغاز 1929 میں ہوا۔''روزانہ ہند'' نے ملک کی تحریک آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔اس روزنامے کی داستان بہت اہمیت کی حامل ہے۔کیونکہ جنگ آزادی میں اس نے ایک مجاہدانہ رول ادا کر کے دکھایا ہے۔حکومت کی رپورٹ میں بھی اس اخبار کے متعلق صاف لفظوں میں لکھ دیا گیا تھا کہ

> ''یہ (اخبار) برطانیہ سے ہندوستان کی علاحدگی کی وکالت کرتا ہے اور اس کو نہ صرف کانگریس بلکہ تمام ہندوستانیوں کا نصب العین قرار دیتا ہے جن کو اپنی عزت وخودداری کا احساس ہے''

اس اخبار کو حکومت برطانیہ کی جانب سے بارہا وارننگ ملی۔1930 سے 1946 کے درمیان متعدد بار اس کی ضمانتیں ضبط ہوئیں۔یہ اخبار خاص طور پر انگریزوں کے ہدف کا شکار رہا۔ 1938 میں اس اخبار کی تعداد اشاعت دو ہزار تین سو تھی اور یہ ہند پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ کی طرف سے شائع ہوا کرتا تھا۔1947 میں اس اخبار سے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی علاحدگی ہو گئی۔مولانا کے بعد غلام سرور فگار مسند ادارت پر فائز ہوئے۔وہ 18 فروری 1975 تک مدیر رہے۔ان کے بعد ایس قمرالدین ایڈیٹر ہو گئے۔''روزانہ ہند'' کے مدیروں میں ایک نہایت ہی محترم رئیس الدین فریدی کا نام ہے جنھوں نے ایک طویل عرصے تک اس اخبار کو سنبھالا۔فریدی صاحب آخری ایام میں دہلی چلے گئے اور وہیں ان کا انتقال بھی ہوا۔

آزاد ہند: مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی جب 'روزانہ ہند' سے الگ ہوئے یا کر دیے گئے تو انھوں نے 15 راگست 1947 کو ہفتہ وار ''اُجالا'' جاری کیا۔اس کے کچھ مہینے بعد 1948 میں

مولانا نے روزنامہ ''آزاد ہند'' کا آغاز کیا۔ ایک طویل مدت تک ''اجالا'' آزاد ہند کے سنڈے ایڈیشن کے طور پر شائع ہوتا رہا۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرکزی وزیر تعلیم، حکومت ہند نے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کو دہلی بلایا اور انھیں عربی رسالہ 'ثقافت الہند' میں مدیر اعلیٰ کی ذمہ داری سونپ دی۔ دہلی منتقل ہو جانے کے بعد مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے روزنامہ ''آزاد ہند'' کی تمام ذمہ داریاں اپنے لائق اور ہونہار فرزند احمد سعید ملیح آبادی کے کاندھوں پر رکھ دیں۔ یہ اخبار خاص طور سے اپنے اداریے کے لیے عوام میں زیادہ مقبول تھا۔ مغربی بنگال کے ممتاز اور بزرگ شاعر پروفیسر اعزاز افضل برسہا برس تک اس اخبار کے لیے روزانہ ایک قطعہ لکھا کرتے تھے۔ جن کے بارے میں خود احمد سعید ملیح آبادی نے کبھی فرمایا تھا کہ ''آزاد ہند'' کے لیے پروفیسر اعزاز افضل صاحب کا قطعہ دراصل منظوم اداریہ ہے۔

بلاشبہ ''آزاد ہند'' کو مغربی بنگال میں جو مقبولیت اور کامیابی و کامرانی ملی وہ یہاں شاید ہی کسی دوسرے اخبار کو ملی ہو۔ اس اخبار نے اس سرزمین پر نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے تک اپنا سکہ جمائے رکھا۔ ماضی قریب میں کچھ سال قبل نامساعد حالات کی بنا پر روزنامہ ''آزاد ہند'' بند ہو گیا۔ احمد سعید ملیح آبادی صاحب نے اسے فروخت کر دیا۔ آج بھی یہ جاری ہے لیکن پہلے کے جیسا اخبار اب نہیں رہا۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ اخبار کسی طرح نکل رہا ہے۔

آبشار: روزنامہ ''آبشار'' کا اجرا 1954 میں ہوا۔ اس کے مالکان میں بزرگ ترقی پسند شاعر سالک لکھنوی اور ان کی اہلیہ تھیں۔ ابراہیم ہوش اس کے مدیر اور پرنٹر پبلشر معین الدین احمد تھے۔ یہ آبشار پبلیکیشن پرائیوٹ لمیٹڈ کے لیے قومی پریس واقع 75 رفیئرس لین۔ کلکتہ 73 میں چھپ کر وہیں سے شائع ہوتا تھا۔ شام کے اس روزنامہ کی تعداد اشاعت کافی تھی۔ ''آبشار'' کا ایک گراں قدر شمارہ 10/مارچ 1959 کا تھا، جس میں ''اردو کانفرنس نمبر 1959'' شامل تھا۔ اس نمبر میں 28/فروری سے 2/مارچ تک کلکتہ کے پارک سرکس میدان میں منعقدہ کانفرنس کی مفصل رپورٹ اور ہندو پاک مشاعرے کی روداد شامل تھی۔ لگاتار 29 برس تک نکلنے کے بعد ''آبشار'' اچانک 22 مئی 1983 کو بند ہو گیا۔

عکاس: اول اول ''عکاس'' سہ روزہ اور کبھی ہفت روزہ کی صورت میں شائع ہوا کرتا

تھا۔اس کا اجرا بروز جمعہ مورخہ ۱۱ رفروری 1966 کو ہوا۔اس کے مالک و مدیر اور پرنٹر پبلشر شہزادہ سلیم صاحب تھے۔انھوں نے مزید کئی اخبارات نکالے ہیں ان میں 'ہلال'، 'محاذ'، 'رہبر عالم' اور 'داؤ' شامل ہیں۔افسوس ان میں کوئی بھی کامیاب نہ ہو سکا۔اس وقت 'عکاس' فلمی ہفت روزہ کے طور پر نکلتا تھا۔ 1972 میں راقم الحروف (کریم رضا مونگیری) نے شہزادہ سلیم صاحب سے ''عکاس'' خرید لیا۔کچھ عرصہ تک ''عکاس'' فلمی ہفت روزہ کے طور پر جاری رہا۔بعد ازاں اسے فلمی سے سیاسی ہفت روزہ بنایا گیا۔اس درمیان راقم الحروف نے ''عکاس'' کو ہفت روزہ سے روزنامہ کرنے کے لیے کافی جدوجہد اور تگ و دو شروع کر دی۔ 16 رفروری 1979 کو آسمان صحافت پر روزنامہ ''عکاس'' کا ستارہ جلوہ افروز ہو گیا۔اس کی ضیا پاش کرنیں آج بھی باب صحافت کو منور و مستفیض کر رہی ہیں۔ارض بنگالہ کے بیشتر مشہور و ممتاز معاصر صحافی اور قلمکار حضرات کسی نہ کسی حیثیت سے روزنامہ ''عکاس'' سے وابستہ رہ چکے ہیں۔موجودہ زمانے کے بہت سے بڑے ادبا و شعرا کی تخلیقات کی اشاعت کا آغاز ''عکاس'' سے ہوا ہے۔کیونکہ راقم الحروف روز اول ہی سے نئے قلمکاروں کی حوصلہ افزائی کو اپنا فریضہ سمجھتا رہا ہے۔

اس اخبار کے اب تک کئی اہم نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ان میں 'دلیپ کمار نمبر' (1967)، 'اندرا گاندھی نمبر' (1972)، 'اقبال نمبر' (26 راکتوبر 1979) وغیرہ شامل ہیں۔''عکاس'' میں وقفے وقفے سے اعلیٰ پائے کے فکر انگیز مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔

اخبار مشرق: ریاست مغربی بنگال میں اردو صحافت کو جدید آفسیٹ پر لانے والا یہ اردو کا پہلا اخبار ہے۔اخبار کی طباعت کے میدان میں اس روزنامے نے ایک انقلاب برپا کر دیا، جس کے اثر سے دوسرے اخبارات بھی آفسیٹ پر خنگ کے راستے پر گامزن ہو گئے۔روزنامہ ''اخبار مشرق'' نے بنگال میں اردو صحافت کو لیتھو یعنی پتھر پر چھپائی سے آزاد کرایا اور ایک نئی سمت و رفتار عطا کی۔''اخبار مشرق'' کا پہلا شمارہ 25 راپریل 1980 کو شائع ہوا۔بہت ہی قلیل مدت میں اس اخبار کو وہ مقبولیت اور شہرت مل گئی جو اردو کے بہت کم روزناموں کے حصے میں آئی ہے۔اس کے مالک و مدیر اور پرنٹر پبلشر جناب محمد وسیم الحق صاحب ہیں۔روزنامہ ''اخبار مشرق'' نہ صرف کولکاتا بلکہ دہلی اور رانچی سے بھی اس کے ایڈیشن شائع ہو رہے ہیں۔یہ اخبار مسلسل کامیابی کی نئی

نئی منزلیں طے کرتا جا رہا ہے۔

راشٹریہ سہارا: یہ روزنامہ ہندوستان کے بیشتر حصوں میں پھیلا ہوا ہے۔ بیک وقت اس کے دس ایڈیشن شائع ہوتے ہیں۔ دہلی، ممبئی، کولکاتا، حیدرآباد، لکھنؤ، بنگلور، پٹنہ، رانچی، گورکھپور اور کانپور سے شائع ہونے والے اس اخبار نے کلکتے میں اپنے صحافتی سفر کا آغاز 5 مئی 2006 کو کیا۔ روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' کولکاتا کے پرنٹر پبلشر ضیا قادری صاحب ہیں۔ بلاشبہ راشٹریہ سہارا ہندوستان میں اردو کا بڑا اخبار ہے۔

''نوائے بنگال'' (2015)، ''عوامی نیوز'' (2015) دونوں اخبار نو وارد روزنامے ہیں۔ ابھی سے ان کے بارے میں کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہوگا۔

کولکاتا میں اردو صحافت

ڈاکٹر امام اعظم

ہندوستان میں صحافت کا آغاز اٹھارھویں صدی کی آٹھویں دہائی میں ہو چکا تھا۔ اس عہد میں اخبارات انگریزوں نے شائع کیے تھے اور ہندوستانیوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں تھا۔ ہندوستانی زبانوں کے اخبارات کی ابتدا بنگلہ زبان سے ہوئی مگر پہلے بنگلہ اخبار اور اس کے مدیر کے متعلق جانکاری نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس اخبار کے متعلق محققین کی رائے میں اختلاف ہے۔ عتیق احمد صدیقی نے اپنی تصنیف ''ہندوستانی اخبار نویسی'' میں لکھا ہے کہ:

> ''پہلا دیسی اخبار گنگا دھر بھٹا چاریہ نے 1816 میں ''بنگال گزٹ'' کے نام سے جاری کیا۔ عبداللہ یوسف مرحوم نے اس اخبار کا نام ''بنگال سماچار'' بتایا ہے۔ قرین قیاس ہے کہ بنگلہ زبان میں اس کا نام ''بنگال سماچار'' ہی رہا ہو اور انگریزی میں ''بنگال گزٹ'' لکھا جاتا رہا ہوگا۔'' (ص:112)

1818 میں بنگلہ کا پہلا اہم ہفت وار اخبار ''بنگلہ درپن'' شائع ہوا۔ 1821 میں راجا رام موہن رائے نے کلکتہ سے ایک ہفت وار اخبار ''سمباد کھودی'' جاری کیا۔ اس عہد میں کئی زبانوں

کے اخبار کلکتہ اور دوسری جگہوں سے شائع ہونے لگے جن میں فارسی کے کئی اخبار شامل تھے۔ ''جام جہاں نما'' (1822) اردو کا اولین اخبار تھا جو بعد میں فارسی زبان میں نکلنے لگا۔ فارسی کے دوسرے اخباروں میں ''شمس الاخبار'' (1823)، ''آئینۂ سکندری'' (1831)، ''ماہ عالم افروز'' (1833)، ''سلطان الاخبار'' (1835)، ''مہر منیر'' (1841)، ''گلشن نوبہار'' (1854) اور ''دوربین'' (1853) شامل تھے۔ جہاں تک ہندوستان میں صحافت کی ابتدا کا تعلق ہے تو تقریباً چالیس سال گزر جانے کے بعد بنگال سے پہلا اردو اخبار ''جام جہاں نما'' کی شکل میں 1822 میں شائع ہوا۔ اس اخبار کے درخواست دہندہ ہری ہردت (ایسٹ انڈیا کمپنی کے شعبۂ مالیات کا ایک بنگالی کلرک)، ایڈیٹر منشی لالہ سدا سکھ تھے۔ اس کے بعد دہلی، لاہور اور دوسرے شہروں سے کئی اخبار اردو میں شائع ہونے لگے۔ بنگال کی صحافت کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ 90 رفیصد سے زائد اخبارات ورسائل کلکتہ سے شائع ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ ہوڑہ، آسنسول اور ڈھاکہ (فی الحال بنگلہ دیش کی راجدھانی) وغیرہ سے بھی اخبارات ورسائل کی اشاعت ہوتی تھی۔ مگر ''جام جہاں نما'' کو اردو صحافت کی اساس کی حیثیت حاصل ہے۔ انگریزوں کے ذریعہ 1823 میں پریس آرڈیننس نافذ کردینے کے بعد اخبارات ورسائل نکالنے کے لیے انگریز سرکار سے اجازت حاصل کرنا ضروری ہوگیا۔ اس کے لیے اخبار کے مالکان کو مختلف طرح کے قیود کا پابند رہنا پڑتا تھا جس کی وجہ سے اس عمل میں سستی آئی۔ چند کو تو انگریزوں نے بند کردیا جبکہ کچھ مدیروں اور مالکان پر مقدمے بھی درج ہوئے اور انھیں حراست میں لے لیا گیا۔ ''جام جہاں نما'' کے بعد فارسی کے کئی اخبارات نے اردو میں ضمیمے شائع کیے مگر باضابطہ اردو رسالے یا اخبار کا اجرا عمل میں نہیں آیا۔

1842 میں اردو اخبار ''تعلیمی'' کلکتہ سے شائع ہوا۔ اس طرح 1845 میں ''طبی'' کا اجرا عمل میں آیا۔ اس اخبار کے مالک مولوی محمد محسن، سید ہلال الدین اور پرنٹر عبداللہ تھے۔ یہ اخبار مکمل طور پر خبریں شائع کرتا تھا۔ اسی سال ایک دوسرا اخبار ''آئینۂ گیتی نما'' شائع ہوا۔ 1851 میں اردو کے دو مزید اخبار منظر عام پر آئے۔ ایک ''مراۃ الخیال'' دوسرا ''انجمن آرا'' جاری ہوا۔ اس طرح دو اخبار ''احمدی'' 1846 اور ''جام جمشید'' 1848 کا بھی ذکر ملتا ہے۔ عتیق احمد صدیقی نے اپنی تصنیف ''ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں)'' کے آخری حصے میں اردو اخبارات و

مطبوعات کے عنوان سے ایک فہرست تیار کی ہے جس میں ان دونوں اخبارات کا ذکر بھی شامل ہے، مگر ان سبھی اخباروں کی اشاعتیں محدود تھیں۔ محدود ہونے کی کئی وجوہات تھیں۔ ان اخبارات در سائل کی قیمتیں زیادہ ہوتی تھیں جو عام قارئین کی قوت خرید سے باہر تھی۔ دوسرے لوگوں میں اخبار بینی کا فقدان تھا۔ ان وجوہات سے ان اخبارات در سائل کو ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا اور یہ وقفے وقفے سے بند ہوتے گئے۔ میٹکاف کے عہدِ حکومت میں صحافت پر لگائی گئی پابندیاں اُٹھالی گئیں جس کے بعد اردو صحافت تیزی کے ساتھ ترقی کی منازل طے کرنے لگی۔ اردو اخبارات نے حب الوطنی کے جذبات کو اُبھارا اور انگریزوں کے خلاف محاذ کھول دیا جس کی پاداش میں کئی اخبار بند کر دیے گئے اور کئی مدیروں پر مقدمے بھی چلائے گئے۔ انگریزوں کے ظلم کے شکار سب سے زیادہ اردو اخبار ہی ہوئے۔ 1857 میں میٹکاف کے ذریعہ اُٹھائی گئی پابندی دوبارہ جاری کر دی گئی۔ اس طرح اخباروں کی آزادی سلب کر لی گئی جسے زبان بندی قانون سے منسوب کیا گیا۔ اس قانون کے نفاذ کے بعد حکومت کو یہ اختیار حاصل ہو گیا کہ وہ جب چاہے کسی بھی اخبار کو بند کر دے، اس کے لائسنس کو منسوخ کر دے نیز مدیروں اور مالکوں پر مقدمہ چلائے۔ اس قانون کے نفاذ اور اس کی سختیوں کے باوجود اخبارات در سائل کا اجرا عمل میں آتا رہا۔ شہر کلکتہ اس میں سب سے آگے رہا۔ انور علی دہلوی نے اپنی کتاب کے مقدمے میں ہندوستان میں اردو صحافت کے ان دنوں کو اس طرح یاد کیا ہے:

> ''1857 سے لے کر 1935 تک ملک گیر پیمانے پر آزادی اور قومی اتحاد کے لیے جدوجہد کا سہرا اردو صحافت ہی کے سر ہے۔ اردو کے اخبارات ہی نے جنگِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اسی کا صحافی اور مدیر مولوی محمد باقر جنگِ آزادی میں شہید ہوا۔ اردو اخبارات ہی کے مالکان اور مدیران سب سے زیادہ سامراج کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے..... اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت ہندی کے اخبار برائے نام شائع ہوتے تھے۔ انگریزی کے اکثر اخبار انگریزوں کے حامی اور ہم نوا تھے۔ دوسری زبانوں میں شائع ہونے والے اخبار اتنے بااثر نہیں تھے۔ لہٰذا اردو

اخبارات اور اردو صحافیوں ہی نے برطانوی سامراج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔
انھوں نے سیاسی بیداری اور تحریکِ آزادی کے ہراول دستے کا کام کیا۔"

("اردو صحافت" ص:20)

بنگال میں اردو روزنامہ اخبار کہلانے کا شرف کلکتہ کے "اردو گائڈ" کو حاصل ہے۔ یہ 1858 میں چار بڑے صفحوں میں چھپتا تھا۔ اس کے مالک کبیر الدین احمد خان بہادر عزیز الباری تھے۔ 1860 میں ہفت روزہ "رفیق الہند" جاری ہوا۔ اسی سال اخبار "محسنی" کا ذکر ملتا ہے۔ 1863 میں بنگال کا پہلا اردو رسالہ ماہنامہ "انجمن" کلکتہ سے جاری ہوا۔ یہ "مجلسِ مذاکرۂ اسلامیہ" کا ترجمان تھا جس کی ضخامت 10 صفحے میں تھی جو بعد میں تجاوز کر گئی۔ اخبار "سلطانی" ٹیابرج سے 1865 میں جاری ہوا۔ 1869 میں "دوربینی" منظرِ عام پر آیا۔ سیالدہ سے اخبار "محمدی" کا اجرا عمل میں آیا۔ اس عہد میں "سراجیہ"، "کوکب ہند" جاری ہوئے۔ اس طرح مختلف اردو کے اخبارات و رسائل شائع ہوتے رہے۔ بہت سے روزنامے اور رسالے جلد ہی بند ہو گئے مگر بعض نے اپنے مشن جاری رکھنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہا۔ 1905 میں تقسیم بنگال کے بعد مغربی بنگال کی راجدھانی کلکتہ ٹھہری۔ پہلے سے ہی بنگال میں اردو صحافت کی سرگرمیاں زیادہ تر کلکتے میں تھیں۔ 1905 میں "المشرق" اور "جادو" دو اخبار خاص طور پر مقبول تھے۔ ایک ماہنامہ "شمسِ بنگالہ" کے نام سے اسی عہد میں جاری ہوا جس کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ 1910 میں پریس ایکٹ کے تحت اخبارات و رسائل پر انگریزی حکومت کا عتاب نازل ہوا جس کی وجہ سے کئی اخبارات و رسائل بند ہو گئے۔ 1913 میں اس ایکٹ کے خلاف محمد علی جوہر، ظفر علی خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد نے زبردست تحریک چلائی۔ مولانا آزاد کے زیرِ ادارت ہفت روزہ "الہلال" (1912) کا اجرا عمل میں آیا۔ اس اخبار نے زبردست پذیرائی حاصل کی۔ خوابیدہ دلوں کو اس اخبار نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ یہ پہلا اخبار تھا جس نے اردو صحافت کو انقلابی آہنگ عطا کیا۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس کی اشاعت 25 ہزار تک پہنچ گئی۔ چونکہ اس اخبار کے ذریعہ پریس ایکٹ کے خلاف آواز بلند کی گئی تھی اس لیے انگریزوں کا قہر اس پر ٹوٹ پڑا اور 1914 میں یہ بند ہو گیا۔ اس کے باوجود اردو اخبارات و رسائل کا سلسلہ چلتا رہا۔ کلکتہ کی ...

1914 میں ''رفعت'' (مدیر: محمد نظام الدین)، ''رفاقت'' (مدیر: منشی محمد ناظم الدین)، روزنامہ ''سفیر'' (مدیر: علی حسین) بڑی جسارت سے صحافتی ذمہ داری نبھاتے رہے۔ 1915 میں ماہنامہ ''الاسلام'' (انجمن علمائے بنگالہ کی طرف سے) جاری ہوا۔ اسی سال مولانا آزاد نے ''البلاغ'' کے نام سے رسالہ جاری کیا۔ اس رسالے نے پھر اسی شان سے ہندوستانیوں کے جذبۂ حب الوطنی کو اُبھارا اور غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کا حوصلہ بخشا۔ اس درمیان مولانا آزاد گرفتار کر لیے گئے اور 1916 میں ''البلاغ'' بھی بند ہو گیا لیکن اس کے بعد رسائل کے اجرا کا سلسلہ چلتا رہا اور ''صداقت''، ''جمہور''، ''نقاش''، ''ترنڈی'' اور روزنامہ ''عصر جدید'' کی شکل میں جاری رہا۔ 1920 میں روزنامہ ''زمانہ'' جاری ہوا۔ اس کے بارے میں شانتی رنجن بھٹاچاریہ اپنے ایک مضمون بعنوان ''بنگال میں اردو کے چند صحافی'' میں لکھتے ہیں:

> ''مولانا اکرام خان روزنامہ 'زمانہ' کے مالک و مدیر تھے۔ آپ کا شمار بیسویں صدی کے نامور صحافیوں میں ہوتا ہے۔ روزنامہ 'زمانہ' کا پہلا شمارہ 14 مئی 1920 کو شائع ہوا اور یہ اخبار چار سال تک نکلتا رہا۔ اس اخبار میں وقت کے نامور اہلِ قلم کی شعری و نثری تخلیقات شائع ہوتی تھیں، جن میں مولانا تمنا عمادی اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی شامل ہیں۔''
>
> (روزنامہ ''آگ'' لکھنؤ 24 ستمبر 2013)

1921 میں مولانا آزاد نے ہفت روزہ ''پیغام'' جاری کیا جس کے مدیر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مقرر ہوئے۔ اس رسالے نے پھر وہی کام کیا جو اس سے قبل ''الہلال'' اور ''البلاغ'' نے کیا تھا۔ نتیجتاً مولانا آزاد اور مولانا ملیح آبادی دونوں گرفتار کر لیے گئے۔ اس کے باوجود یہ سلسلہ چلتا رہا۔ دار و رسن، قید بند اور ہر طرح کے مظالم کا سامنا کرتے ہوئے مالکان اور مدیران قوم کو غفلت سے بیدار کرتے رہے۔ ان کے اندر جذبۂ حب الوطنی پیدا کرتے رہے۔ انگریزوں سے نجات کے راستے بتاتے رہے اور ہر طرح کی معلومات سے ان کو واقف کراتے رہے۔ یہ سلسلہ ملک کی آزادی تک قائم رہا۔ اہلِ کلکتہ نے جو مشن شروع کیا تھا وہ ملک کے طول و عرض میں پھیل گیا۔ ممتاز صحافی احمد سعید ملیح آبادی نے ''مغربی بنگال میں اردو صحافت'' (مصنفہ:

ڈاکٹر فریدہ انور) کے بیک کور پر بجا طور پر لکھا ہے:

''اردو صحافت کا آغاز کلکتے سے 1822 میں ''جام جہاں نما'' سے ہوا تھا اور یہ سلسلہ کسی دور میں بھی رُکا نہیں۔ اخبارات ورسالے برابر نکلتے رہے۔ بڑے بڑے نامور صحافی اور اہلِ قلم پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے اپنے وقت میں قارئین کی ذہنی رہنمائی اور رائے سازی میں اہم کردار ادا کیا۔ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد بھی ملک کے دوسرے علاقوں کی طرح مغربی بنگال کی اردو صحافت، جہدِ مسلسل کا نام اور ایک تابناک تاریخ ہے۔ وطن کی آزادی کے لیے اردو کے صحافی سینہ سپر رہے اور قید و بند سے لے کر ہر طرح کی قربانیاں دیتے رہے۔ آزادی کی لڑائی کو آگے بڑھانے میں جہاں جوشِ آزادی کی ضرورت تھی، وہیں قومی اتحاد کی ضرورت اس سے بھی زیادہ تھی۔ ہر قسم کی فرقہ واریت اور علاحدگی پسندی سے اردو صحافی نبرد آزما رہے۔ آزادی کے بعد اردو صحافت کی راہ اور زیادہ کٹھن ہوگئی۔ تقسیم ملک کے نتیجے میں خوفناک فرقہ پرستی کے طوفان بلاخیز کا مقابلہ ناتواں اردو صحافت نے پامردی سے کر کے قوم و ملک کی ایک ناقابلِ فراموش خدمت انجام دی ہے۔''

آزادی سے قبل کلکتہ اور اس کے مضافات سے شائع ہونے والے دیگر اردو روزناموں میں ''بیکِ صبا''، ''سیاست''، ''مسلم گزٹ''، ''حریت''، ''نئی دنیا''، ''احرار''، ''اقدام''، ''رفعت''، ''زمانہ''، ''صداقت''، ''ترجمان''، ''جمہور''، ''رسالت''، ''شانِ ملت''، ''غازی''، ''ہوڑہ ٹائمز''، ''اتحاد''، ''آئینۂ نمائش''، ''خادم''، ''جنجھٹ''، ''مزدور بلیٹن''، ''داتا کی شہنائی''، ''استقلال''، ''العصر''، ''الکمال''، ''انوار الاخبار''، ''نقاش''، ''رہبر''، ''رفاقت''، ''پیام''، ''صدائے عالم'' وغیرہ شامل ہیں۔ آزادی کے بعد بھی اخبارات و رسائل نے اپنی ذمہ داریوں سے منھ نہیں موڑا بلکہ آج بھی وہ سچائی کو پیش کرنے کے لیے اپنی جانوں کی قربانی دیتے رہتے ہیں۔ کلکتہ کی انقلابی سرزمین سے آزادی کے بعد ''کارواں'' (مدیر: یونس نظری)،

''روزانہ ہند'' (مدیر: رئیس الدین فریدی)، ''عصر جدید''، ''امروز''، ''غازی'' اور ''اقراء'' جیسے روزنامے شائع ہوئے۔ آج بھی کلکتہ سے اردو کے کئی روزنامے ''اخبار مشرق''، ''آزاد ہند''، ''آبشار''، ''عکاس''، ''راشٹریہ سہارا''، ''نوائے بنگال'' اور ''عوامی نیوز'' وغیرہ اپنی ذمہ داریوں کو پوری ایمانداری سے نبھا رہے ہیں۔ ان کے علاوہ ماہنامے، سہ ماہی جریدے، سالنامے اور ادبی و نیم ادبی دوسرے رسالے بڑی تعداد میں کلکتے سے شائع ہو رہے ہیں۔

ہفت روزہ اخباروں میں ''نئی دنیا'' (مدیر: نوشاد مومن)، ''نئی بستی'' (مدیر: عشرت نظیر آزاد)، ''ہند ایکسپریس'' (مدیر: نسیم فائق) اور ''سیکولر آواز'' شائع ہوئے تاہم ابھی ان تمام کی اشاعت موقوف ہے۔ احمد سعید ملیح آبادی کی ادارت میں روزنامہ ''آزاد ہند'' کا ہفتہ وار ایڈیشن ''اجالا'' کے نام سے ہر اتوار کے دن شائع ہوتا تھا۔ دیگر ہفت روزہ اخباروں میں ''گوہر آصفی''، ''رفیق الہند''، ''ابوالبیچ''، ''احسن الاخبار''، ''ٹھوکر''، ''جہازی''، ''المصباح''، ''خادم''، ''دارالحکومت''، ''راستی''، ''رفیق جدید''، ''رہنما''، ''سولہ آنہ''، ''شمشیر ہند''، ''صحافت''، ''عبرت''، ''ماہ تمام''، ''مخدوم''، ''مزدور گزٹ''، ''نظام''، ''نورتن''، ''نئی منزل''، ''ہنٹر پنچ''، ''آرزو''، ''ارمغان''، ''اسپورٹس اسکرین''، ''اسپورٹس ٹوڈے''، ''تحریک ملت'' (مدیر: عبدالعزیز)، ''چیت''، ''کسان مزدور'' (مدیر: کامریڈ محمد امین)، ''کندن''، ''لبیک''، ''محرک''، ''واسطہ''، ''ہلال''، ''تسکین روح'' (مدیرہ: ڈاکٹر روحی قاضی)، ''میرا ملک''، ''اخبار مغرب'' (مدیر: ڈاکٹر اقبال جاوید) وغیرہ شامل ہیں۔

حکومت مغربی بنگال کا پندرہ روزہ جریدہ ''مغربی بنگال'' مصطفیٰ اکبر کی ادارت میں پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ اس نے اپنی اشاعت کے 62 سال مکمل کر لیے ہیں۔ اس نے کئی خاص نمبر شائع کیے جن میں ''وحشت نمبر''، ''پریم چند نمبر''، ''امیر خسرو نمبر''، ''فیض نمبر''، ''ٹیگور نمبر'' وغیرہ کافی مقبول ہوئے۔ دیگر پندرہ روزہ اخباروں میں ''نکہت'' (مدیر: حکیم یوسف بخشی)، ''سرپرست'' (مدیر: محمد محبوب رضا)، ''برحق'' (مدیر: منیر اقبال ہاشمی)، ''استقلال'' (مدیر: سلمان اختر)، اور ''عالمی رفتار'' (مدیر: فضیل احمد) پابندی سے شائع ہو رہے ہیں۔ ''دیار حبیب'' (مدیر: ڈاکٹر نسیم احمد) کی اشاعت فی الحال بند ہے۔ علاوہ ازیں ''قلم و بیکھی'' (مدیر:

محمد وسیم الحق)، ''اسپورٹس اور تفریح''، ''اسپورٹس اور فلم''، ''جام کوثر''، ''شرا نک وارتا''، ''معمار''، ''ایشور اللہ''، ''عالمی رفتار'' وغیرہ بھی یہاں سے شائع ہوئے۔

یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اردو صحافت کی ابتدا بنگال سے ہوئی ہے جسے بعد میں پیشے کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اس میں لکھنے والوں نے استدلالی اور معروضی دونوں طریقۂ کار استعمال کیا اور مختلف النوع معلومات کثیر تعداد میں پڑھنے والوں کو مہیا کرائیں۔ عرق ریزی اور دقت نظر کے ساتھ مواد کی فراہمی کی گئی خواہ موضوع سیاسی ہو، سماجی ہو، مذہبی ہو یا ادبی ہو۔ صحت مند معاشرے اور سماج کے ہر طبقے کے لیے مواد پیش کیا گیا جس کی وجہ سے عوام کی وابستگی اخبار سے بڑھی۔ یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ صحافت کا مقصد کبھی نہایت پاکیزہ اور نصب العین مقدس ہوا کرتا تھا۔ جدوجہد آزادی اور ملک کی تمام تحریکوں کے لیے صحافت کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ جیسا کہ اکبر الٰہ آبادی کا ایک مشہور شعر ہے:

کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو
جب توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو

لیکن کیا آج کی صحافت ان مقاصد کو پورا کرنے میں پوری طرح کامیاب ہے؟ صالح معاشرے کی تشکیل میں جو کردار صحافت کا ہونا چاہیے تھا کیا ایسا ہو رہا ہے؟ اب تو اخبارات و رسائل سود مند تجارت کے زمرے میں آچکے ہیں اور یہیں سے زرد صحافت کا تصور ابھرا ہے۔ تبھی تو شاعر کہتا ہے:

مرغ لڑائے جائیں گے بوٹی کے واسطے
اخبار نکالے جائیں گے روٹی کے واسطے

موجودہ عہد میں دوسری زبانوں نے جس طرح خود کو سائنس سے جوڑ کر ترقی کی ہے، اس ضمن میں ہماری پیاری زبان اردو نے بھی کروٹ بدلی ہے۔ آج اردو صحافت پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے حوالے سے جانی جاتی ہے جس کے مشمولات اور طریقۂ کار عوام تک پہنچانے کی بہتر سے بہتر کوشش کی جاتی ہے۔ طریقۂ کار کے ساتھ موضوعات اور حلقۂ اثر کو بھی سامنے رکھا جاتا ہے۔ صحافت کا کینوس بہت بڑا ہے اور عوام الناس ملکی و بین الاقوامی امور سے دلچسپی رکھتے

ہیں۔ اس لیے اسے جزو لاینفک بنا کر وسیع دائرے میں کم وقت میں تمام معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے پرنٹ میڈیا پر اثر انداز ہو کر اس کی وسعت اور ہمہ گیری میں رخنہ اندازی کی ہے لیکن صحافت کے لیے راستے ہموار ہوتے رہے ہیں اور ہر ذوق کی آبیاری ہوتی رہی ہے جس میں سائنس، ثقافت اور تاریخ کے ساتھ کھیل کود، کارٹون اور دیگر تفریحات سے متعلق مواد پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

کولکاتا سے شائع ہو رہے اخبارات و رسائل کی ست و رفتار سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اردو صحافت میں اہلِ بنگالہ کا اہم رول ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ سلسلہ اور بھی مضبوطی سے قائم و دائم رہے گا۔

تحریک آزادی میں صحافت اور بنگال

ڈاکٹر عاصم شہواز شبلی

اتنی بات تو طے ہے کہ سرزمین بنگالہ میں 19 ویں صدی سے قبل ہی اردو نثر کی ترقی کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ 19 ویں صدی کا آغاز نہایت مفید اور مبارک ثابت ہوا۔ اس عہد میں اردو نثر نے وہ گل کاریاں کیں جس کی نظیر ہندوستان کے کسی خطے میں نہیں ملتی۔

ریاست بنگال یا برصغیر ہندوستان کی صحافتی تاریخ تقریباً دو صدی پر محیط ہے اور اس عرصے میں بنگال کی اردو صحافت کی روایت بہت عظیم رہی ہے۔ ''جام جہاں نما'' سے لے کر ''آزاد ہند'' تک صحافت کا سلسلہ کسی بھی دور میں رُکا نہیں۔ اخبارات اور رسالے برابر نکلتے رہے۔ بڑے بڑے نامور صحافی اور اہل قلم پیدا ہوئے، جنھوں نے اپنے اپنے وقت میں قارئین کی کئی نسلوں کی ذہنی رہنمائی، رائے سازی اور علمی پرورش میں اہم کردار ادا کیا۔ ابتدا سے ہی جدوجہد آزادی کا دور اردو صحافت کی ترقی کا دور رہا ہے۔ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد بھی ملک کے دوسرے علاقوں کی طرح مغربی بنگال کی اردو صحافت ایک جہد مسلسل کا نام ہے لیکن خصوصی طور پر 20 ویں صدی کے دور اول کو اگر دور انقلاب سے تعبیر کیا جائے تو غیر مناسب

نہیں۔اس صدی میں زبردست انقلابات آئے جنھوں نے ہندوستانیوں کے ذہن میں ہلچل پیدا کردی۔ یہی وہ صدی ہے جس میں جنگ آزادی کی جدوجہد بھی کامیاب ہوئی اور جس نے قومی یکجہتی کا پرچم بھی بلند کیا۔ اس صدی کا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس صدی کی عظیم سیاسی ہستیوں نے صحافت کا بیڑا اُٹھایا اور اردو صحافت کو زمین سے آسمان تک پہنچادیا۔ اس دوران بنگال کی صحافت نے ایسے ایسے جاں باز مجاہد آزادی اور صاحب طرز صحافی پیدا کیے، جنھوں نے اپنے قلم کے جوہر سے جنگ آزادی کی لو کو تیز تر کرنے اور فرقہ دارانہ فسادات میں یکجہتی کی شمع کو فروزاں کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ وطن کی آزادی کے لیے بنگال کے اردو صحافی سینہ سپر رہے اور قید و بند سے لے کر ہر طرح کی قربانیاں دیتے رہے۔ ظلم و استبداد کی انتہا ہونے کے باوجود ان کے پائے استقلال میں ذرا بھی لغزش پیدا نہیں ہوئی۔ انھوں نے صحافت کو عبادت کی طرح برت کر ایمانداری اور صداقت کا بین ثبوت فراہم کیا۔ ان صحافیوں کو اس کا علم تھا کہ ان کی ذرا سی لغزش اور کوتاہی عوام کو گمراہ اور ان کے یقین کو متزلزل کرسکتی ہے۔ اس لیے اس دور کے صحافیوں نے قومی ذہن بنا کر ان کے جذبات و احساسات کو مضبوط اور مستحکم کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ آزادی کی لڑائی کو آگے بڑھانے میں جہاں جوش آزادی کی ضرورت تھی، وہیں قومی اتحاد اور یگانگت کی ضرورت اس سے بھی زیادہ تھی۔ ہر قسم کی فرقہ واریت اور علاحدگی پسندی سے اردو صحافت نبرد آزما رہی۔ خصوصی طور پر آزادی کے بعد اردو صحافت کی راہ زیادہ کٹھن اور دشوار ترین ہوگئی تھی۔ ملک کی تقسیم کے نتیجے میں خوفناک فرقہ پرستی کا طوفان بلاخیز پھیل چکا تھا اور فرقہ وارانہ فسادات سے ملک جوجھ رہا تھا۔ اس صورت حال میں اردو صحافت نے امن، ترقی، تعاون اور یکجہتی کی فضا بندی بڑی ہمت، شجاعت اور نیک نیتی کے ساتھ کی اور فرقہ واریت کا مقابلہ پامردی سے کرکے قوم و ملک کی ناقابل فراموش خدمت انجام دی۔

ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی میں اردو زبان اور صحافت کا کردار ہندوستان کی قومی تاریخ کا ایک ولولہ انگیز باب ہے۔ جنگ آزادی کے وقوع نے پوری اردو صحافت کو متاثر کیا۔ اس دور کا شاید ہی کوئی اخبار ہو جس نے اس جنگ کے بارے میں خبریں اور مضامین شائع نہ کیے ہوں۔ بنگال کے اخبارات بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ یہاں کی اردو صحافت قومی تاریخ کے اس

اہم اور نازک موڑ پر ادائے فرض میں کسی بھی طرح پیچھے نہیں رہی۔ یہاں کے اخبارات کے شاندار انقلابی کردار کی وجہ سے اخبارات اور اخبارات کے مدیروں کے خلاف سازشیں رچی گئیں، عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا، جائدادیں ضبط کر لی گئیں اور حتیٰ کہ ان کی جانیں بھی لی گئیں۔ معاملہ تو یہاں تک پہنچا کہ اخبارات کی آزادی سلب کر لی گئی۔ وقفے وقفے سے احتیاطی تدابیر کے تحت ملک میں نئے نئے ایکٹ جاری ہوتے رہے۔ کون سے اخبارات نکلیں گے اور خبروں کی نوعیت کیا ہوگی، اس کا فیصلہ حکومت وقت کرے گی۔

اردو کے پہلے اخبار "جام جہاں نما" سے مغلیہ سلطنت کے خاتمے تک اردو کے کم و بیش 40 اخبارات بنگال سے جاری ہو چکے تھے، جنھوں نے عوام میں وطن پرستی اور ملک کی آزادی کا جذبہ پیدا کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ حتیٰ کہ "جام جہاں نما" جو آغاز میں انگریزوں کی ہم نوائی کر رہا تھا، اس نے بھی انگریزوں کے رویوں، دوہری پالیسیوں اور مظالم کو دیکھتے ہوئے اپنا انداز تحریر بدل دیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی شاطرانہ اور عیارانہ ہوس کو سمجھنے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی۔ گرچہ "جام جہاں نما" کے بانی اور مالک ہری ہردت ایسٹ انڈیا کمپنی میں ایک کلرک تھے لیکن سرکاری ملازم ہونے کے باوجود انھوں نے برطانوی راج کی لغزشوں، شوخیوں، عیاریوں اور کوتاہیوں پر نکتہ چینی کی۔ اس کی پاداش میں اخبار کے مالک اور ایڈیٹر دونوں کو بڑی دشواریوں اور قربانیوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن انھوں نے اپنے اخبار کو کمپنی کے مظالم اور بدعنوانیوں کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کیا اور جنگ آزادی میں بڑی جرأت اور بے خوفی کے ساتھ اپنا کردار ادا کیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اس کی آزادی سے ناخوش تھی، اس لیے رعایتی ڈاک کی امداد جو اسے ملتی تھی، وہ بند کر دی گئی۔ "جام جہاں نما" نے امداد کی بحالی کے لیے کوئی درخواست نہیں دی بلکہ اپنی پیشانی سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی مہر ہٹا دی جو روز اول سے شائع ہو رہی تھی۔

اسی دور میں کلکتہ سے شائع ہونے والے دو اخبار "گلشن نو بہار" اور "دور بین" ہیں۔ ان دو اخبارات نے اپنے طور پر عوام میں آزادی کے لیے جدوجہد کا جذبہ اور حب الوطنی کی لو تیز کرنے کا کام انجام دیا۔ انھوں نے ہندوستانیوں کے خلاف فرنگی حکومت کی پریشان کن پالیسیوں اور حرکتوں کو بے نقاب کیا۔ جذبات کو تیز کرنے والی نظمیں اور ولولہ انگیز مضامین شائع کیے جس

نے انقلاب کی راہ ہموار کی۔ پریس ایکٹ کی خلاف ورزی کرنے کے الزام اور باغیانہ مضامین شائع کرنے کے جرم میں مقدمے دائر ہوئے اور اخبار کا پریس ضبط کر لیا گیا۔

بغاوت سے قبل ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت جبر و ظلم کے ساتھ قائم تھی۔ کھل کر اس کے خلاف آواز اُٹھانے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ بقول گربچن چندن "اس کے عہد میں (ایسٹ انڈیا کمپنی) آزادی کا مطالبہ تو ایک طرف آزادی کے لفظ کا استعمال بھی کارے دارد تھا۔" اس صورت حال کے باوجود یہاں کے چند اخباروں نے بڑی ہمت اور شجاعت سے کام لیا۔ بظاہر یہ اخبارات انگریزوں کی مخالفت کرتے نظر نہیں آتے لیکن انداز بیان، مواد کی گہرائی اور تمثیلی اظہار میں غم و غصے کا ایک دبا ہوا طوفان ہوتا تھا جو ہندوستانی عوام کے دل و دماغ میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کے لیے اُکساتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے اپنے ایک نوٹ میں لکھا:

> "اس بات کو لوگ نہ تو جانتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں کہ گزشتہ چند ہفتوں میں دیسی اخباروں نے خبریں شائع کرنے کی آڑ میں ہندوستانی باشندوں کے دلوں میں دلیرانہ حد تک بغاوت کے جذبات پیدا کر دیے ہیں۔ یہ کام بڑی مستعدی، چالاکی اور عیاری کے ساتھ انجام دیا گیا۔"
>
> (محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی: کمپنی کے عہد میں، ص:375)

اس عہد میں یہاں کے اخبارات نے سیاسی شعور اور ولولہ بیدار کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ گرچہ یہ اخبارات مجاہد اخباروں کی صف میں تو شامل نہیں تھے لیکن تحریک آزادی کے ہم سفر رہے۔ انھوں نے فرنگی حکام کی رعونت، بے انصافی، نسلی امتیازات اور حکومت کی ناگواریوں کے خلاف احتجاجی دلوں کو گرمانے والے مواد شائع کیے اور آزادی کی جدوجہد کو آگے بڑھانے میں مصروف عمل رہے۔

اردو صحافت نے شروع سے ہی اپنا مزاج باغیانہ اور مجاہدانہ رکھا تھا لیکن 20 ویں صدی نے اردو اخباروں کے کرداروں اور حوصلوں پر مجاہدانہ اثر ڈالا اور وطن پرست حلقوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ صحافیوں کے عملی جہاد سے ملک بھر میں سیاسی حرارت و حرکت اور شجاعت

وہمت پیدا ہوگئی۔ اس صدی میں اردو صحافت نے 1857 کے جوش و جذبے کو بحال کرنے اور نئی سیاسی بیداری کو فروغ دینے میں ٹھوس اور تاریخی کام کیے۔ بنگال کے اخبارات بھی انقلاب اور سرفروشی کے جذبات کو آگے بڑھانے میں پیش پیش رہے۔ انھوں نے جذبۂ آزادی سے سرشار ہوکر فرنگی حکومت کو کھلے عام یہ بات بتادی کہ اُصول راستی کے خلاف ان کے کسی بھی قانون کی پابندی نہیں کی جاسکتی ہے۔

جس طرح آزادی کے جذبے کو مضبوط اور قوم کے عزائم کو آہنی بنانے میں ''زمیندار'' اور ''اردوئے معلیٰ'' جیسے اخبارات کے نام آتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح بنگال سے نکلنے والے خصوصی طور پر دو اخبارات ''الہلال'' اور ''روزانہ ہند'' کے نام ہیں۔ یہ اخبارات جدید صحافت کی راہ میں خشت اوّل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان اخبارات نے نہ صرف عوام میں حرکت و حرارت کے جذبے کو فروغ دیا بلکہ ان کے اندر خود اعتمادی اور قومی بیداری کی لہر بھی دوڑادی۔

مولانا ابوالکلام آزاد جیسی عبقری شخصیت صحافتی آزادی کی علمبردار تھی۔ ان کی شخصیت ہمہ صفت و ہمہ جہت تھی۔ وہ بیک وقت شاعر، ادیب، صحافی، سیاست داں، مقرر، عالم، مفسر قرآن، انشاپرداز اور دانشور تھے۔ اس سے بڑھ کر وہ مجاہد آزادی اور محب وطن تھے۔ ابوالکلام آزاد مختلف اخبارات (لسان الصدق، الندوہ، وکیل، دارالسلطنت) سے وابستہ رہے لیکن وہ ان سب سے مطمئن نہیں تھے۔ آزادی کے لیے قوی تحریک کو وہ ایک نئی کروٹ دینا چاہتے تھے اور ایک ایسا اخبار نکالنا چاہتے تھے جو ملک کے عوام کو آزادی کی ضرورت و اہمیت کو سمجھا سکے اور تحریک آزادی جیسے سلگتے مسائل پر اداریے لکھ کر بیرونی حکمرانوں کا ناطقہ بند کرسکے اور پھر جولائی 1912 میں مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ سے پہلے ''الہلال'' اور پھر ''البلاغ'' نامی اخبارات نکالے۔ چونکہ ہندوستانی عوام حکومت برطانیہ سے بیزار تھے۔ ایسے ماحول میں ان دو اخبارات نے تحریک آزادی کے قومی جذبات اور انقلاب کے حوصلوں کو ایک نئی سمت دی۔ مولانا نے فرنگی حکومت کے خلاف ایک محاذ کھول دیا اور ان کی خوب خوب لعنت و ملامت کی۔ ان کے جہاد پرور خیالات اور جرأت اظہار کی بدولت تھوڑے ہی عرصے میں ''الہلال'' نے مقبولیت کی سند حاصل کرلی لیکن باغیانہ خیالات کی وجہ سے ''الہلال'' پر پابندیاں لگنی شروع ہوگئیں۔ ضمانتوں پر ضمانتیں طلب کی گئیں۔

جیل بھی جانا پڑا۔ پھر بھی مولانا کے پائے استقلال میں لرزش نہیں آئی۔ وہ آزادی کے مشن میں لگے رہے۔ نومبر 1915 میں ابوالکلام آزاد نے ''البلاغ'' کا اجرا کیا۔ اس اخبار نے تحریک آزادی میں برطانوی سامراج کے خلاف جرأت اور بیباکی سے شعلے اُگلنا شروع کر دیا۔ ہندوستانی عوام میں آزادی کی لہر اور وطن کی بے پناہ محبت انڈیل دی جس نے مایوس و دل فگار عوام کے اندر عزم و حوصلہ اور جوش و ولولہ کا جذبہ بیدار کرنے کے ساتھ ساتھ آزادی کی جنگ لڑنے اور برطانوی سامراج کے تسلط سے نجات دلانے کا شعور بھی بیدار کیا لیکن فرنگیوں کو مولانا کا یہ انداز بھی پسند نہیں آیا اور ''البلاغ'' بھی برطانوی جبر و استبداد کا شکار ہو گیا۔ مولانا کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا اور اپریل 1916 کو ''البلاغ'' بھی آخر کار بند ہو گیا۔

آزادی کی طلب لیے 1929 میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے کلکتہ سے ''روزانہ ہند'' کا اجرا کیا۔ ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے بعد یہ ایک اہم انقلابی اخبار تھا جس نے اردو صحافت کے باب کی ایک نئی تاریخ رقم کی۔ چونکہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کا شمار مولانا ابوالکلام آزاد کے خاص رفیقوں میں ہوتا ہے، اس لیے وہی بُردباری، وہی بے خوفی اور وہی بیباکی ان کے اندر بھی موجود تھی۔ مولانا ملیح آبادی اپنے وقت کے جاں باز مجاہد آزادی، بلند پایہ ادیب، مصلح قوم، جید عالم، جلیل القدر انشاپرداز اور ممتاز افسانہ نگار تھے۔ آزادی کے کاز کو آگے بڑھانے میں ''روزانہ ہند'' کی خدمات سے انحراف ممکن نہیں۔ اس اخبار نے حصول آزادی کے لیے مجاہدانہ کردار اور بلند پایہ صحافت کا نیا معیار قائم کیا۔ ان کی بے پناہ صلاحیتوں اور وطنی سرگرمیوں نے انھیں اردو تاریخ صحافت میں ایک اعلیٰ مقام عطا کیا۔ انھوں نے اخبار کے ذریعہ سماج میں وقوع پذیر حادثات و واقعات کو جہاں بیان کیا، وہیں جابر و ظالم طاقتوں کے خلاف پوری شدت سے آواز بلند کی اور عوام کے دل و دماغ میں وطن سے محبت کے اس تصور کو گہرا کیا جو دھندلا پڑ گیا تھا۔ ان کے جذبۂ حریت اور تحریک پرور اسلوب تحریر نے 'ہند' کو شعلۂ انقلاب بنا دیا۔ مولانا کی تحریر تحریک آزادی کے ایک نہایت ہی معرکہ خیز اور اتحاد افروز دور کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ انھوں نے فرنگیوں کو یہ بات سمجھا دی تھی کہ قربانی، آزادی کی کلید ہے اور ان کے مظالم سے آزادی کے متوالوں کی تعداد میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ فرنگی مولانا کی تحریروں سے خوف کھانے لگے اور آخر کار انھیں اور ان کے

اخبار کو برطانوی عتاب کا شکار ہونا پڑا۔ ان کا اخبار بند ہوگیا اور انھیں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ کئی بار تو حکومت کے عتاب اور انضباطی کارروائی کے سبب انھیں اپنے اخبار کا نام بھی بدلنا پڑا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بنگال کی صحافت اور صحافیوں نے جنگ آزادی اور قومی یکجہتی کے فروغ میں ہندوستانی صحافت کے شانہ بشانہ اہم رول ادا کیا۔ یہاں کے صحافیوں کو بھی جہ مجاہدین جنگ آزادی تھے اور جن کا اوڑھنا بچھونا اردو اور اس کی صحافت تھی، جلاوطنی، قربانی، قید و بند اور دیگر صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے باوجود یہاں کے صحافیوں نے بیرونی حکمرانوں کا سینہ سپر ہوکر مقابلہ کیا اور تحریک آزادی کے ہراول دستے کا کردار نبھایا۔ ضرورت ہے کہ آزادی کی تحریک اور قومی یکجہتی کے فروغ میں اردو صحافت کے اس کردار کا کھلے دل سے اعتراف و احترام کیا جائے۔

(ب) بہار

بہار میں اردو صحافت اور جذبۂ قومیت

1900 تا 1947

ڈاکٹر سید احمد قادری

بیسویں صدی کی ابتدا سے آزادیٔ ہند یعنی 1900 سے 1947 تک بہار کی اردو صحافت کی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات بہت واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز تک بہار کی اردو صحافت بتدریج سنگلاخ راہوں اور داروگیر کی سخت آزمائشوں سے گزرتی ہوئی اپنے لیے میدان ہموار کرنے کے ساتھ ساتھ ملک بھر کے عوام الناس کے ایک بڑے حلقے کو نہ صرف اپنا ہم خیال اور ہم نوا بنا چکی تھی، بلکہ لوگوں کے دلوں میں انگریزوں کے عطا کردہ طوق غلامی کے خلاف نفرت اور بغاوت کے احساسات و جذبات کو ابھارنے میں بھی اسے خاصی کامیابی مل رہی تھی۔ چونکہ اردو صحافت کا، ابتدائی دور سے ہی مزاج باغیانہ رہا ہے۔ اس لیے جبر و ظلم اور استحصال و استبداد کے خلاف اس نے کبھی بھی مصالحت نہیں کی اور اپنے مشن اور موقف پر ہمیشہ قائم رہی۔ گرچہ اس دوران اردو صحافت اور اردو صحافیوں کو سخت مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا، قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلنا پڑیں لیکن استقامت میں کبھی کمی نہیں آئی اور اس کے قدم اسی جوش، ولولہ، حوصلہ،

جرأت مندی، بیباکی اور یقین کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔

جہاں تک اس دور میں بہار کی اردو صحافت کا تعلق ہے تو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ بہار وہ صوبہ تھا، جہاں انگریزی اور ہندی صحافت سے قبل ہی اردو صحافت کا آغاز ہو چکا تھا۔ بہار میں ''نور الانوار'' نے صحافت کی نیو ڈالی، جو اس وقت کے حالات کے تحت اسے اوّل مقام حاصل ہوا۔ اردو کے بعد بہار میں انگریزی اخبار ''بہار ہیرالڈ'' (Bihar Herald)1872 میں پٹنہ سے بابو گرو پرساد سین (جو کہ پٹنہ کورٹ کے مشہور وکیل تھے) نے اپنے چند خاص دوستوں بابو سالک رام سنگھ اور بابو گووند چرن وغیرہ کے تعاون سے شروع کیا۔ جو مختلف لوگوں کے ذریعہ ایک طویل عرصے تک جاری رہا، اس اخبار کے دو سال بعد یعنی 1874 میں ہندی اخبار ''بہار بندھو'' پٹنہ سے جاری ہوا۔ حالانکہ یہ اخبار بہار میں اجرا سے دو سال قبل کلکتہ سے پنڈت کیشو رام بھٹ اور ان کے بھائی پنڈت مدن موہن بھٹ کی کوششوں سے اور منشی حسن علی جو کہ کیشو رام بھٹ کے بہت جگری دوست تھے، کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ بعد میں کیشو بھٹ نے خود اس کی ادارت سنبھال لی اور اسے پٹنہ لے آئے۔

بیسویں صدی کا ابتدائی دور بہار کی اردو صحافت کے لیے بہت پُر آشوب دور تھا۔ انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہر سطح پر جنگ جاری تھی اور جیسے جیسے جنگ کی لو تیز ہو رہی تھی، ویسے ویسے انگریزوں کا ظلم و ستم بڑھتا جا رہا تھا، جس سے بہار کی اردو صحافت بھی اثر انداز ہو رہی تھی۔ لیکن سپر ڈالنے کے بجائے وہ پوری ہمت، حوصلہ، جنون، جوش، ولولہ اور ایثار و قربانیوں کے ساتھ انگریزوں کی فرعونیت سے نبرد آزما تھی۔

1901 سے 1947 تک بہار میں اردو صحافت کے افق پر جو اخبارات و رسائل نظر آتے ہیں۔ ان پر ایک نظر ڈالی جائے تو 1901 میں گیا سے مشہور شاعر شفق عماد پوری کی ادارت میں شائع ہونے والا گلدستہ ''نسیم سحر'' اور پٹنہ سے 15 ستمبر 1902 میں علامہ فضل حق آزاد کی ادارت میں دوسرا گلدستہ ''تاج'' کے ساتھ ساتھ 1903 میں پٹنہ سے ''رفتار زمانہ'' اور ''بہار اور واسن بہار''، 1903 میں ہی کھجوا سے 'التاج'، اسی سال پٹنہ سے رسالہ 'بہار' (1906 میں کھجوا سے) ''الشمس''، پٹنہ سے ''بہار گزٹ''، 1912 میں پھلواری شریف (پٹنہ) سے ''معارف''

اور بہار شریف سے ہی سہ روزہ ''اتحاد'' جس نے بعد میں کافی شہرت اور مقبولیت حاصل کی، اسی زمانے میں پٹنہ سے ''پٹنہ اخبار''، ''البشر''، ''بیباک'' گجوا (سیوان) سے ''الکلام''، گیا سے ''بزم سخن'' اور ''بہار پنچ'' وغیرہ جیسے اخبارات و رسائل کا ذکر بہار کی اردو صحافت کی تاریخ میں ملتا ہے۔

ان اخبارات و رسائل میں 'آئینہ' (کشن گنج)، 'العدل' (پٹنہ)، ہفتہ وار 'الحق' (سیوان)، 'اقدام' (پٹنہ)، 'الہدیٰ' (دربھنگ)، ''البشر''، ''پیغام''، ''اتحاد''، ''پٹنہ اخبار''، ''دیہات''، ''روشنی'' اور ''صدائے عام'' وغیرہ کے صفحات اس بات کے غماز ہیں کہ ان کی انقلابی تحریروں نے انگریز حکمرانوں کی راتوں کی نیندیں حرام کردیں اور اتنے منظم طریقے سے ملکی مفاد کے لیے صحافتی فریضہ انجام دیا گیا کہ آج ان کی اعلیٰ خدمات کا اعتراف کیے بغیر اردو صحافت کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی ہے۔

بہار کی اردو صحافت نے 1900 سے پہلی جنگ عظیم (1914-1918) تک کے آس پاس بھی قومی مفادات کو پوری ایمانداری، دیانتداری اور ذمہ داری کے ساتھ پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ پھر بھی ان پر 1910 کے پریس ایکٹ کے اثرات باقی تھے۔ اس وقت Defence of india Rules نافذ کر کے سیاسی، عوامی اور تحریک آزادی کو کچلنے کی پوری کوشش کی گئی۔ اس ایکٹ سے متاثر ہونے والے بہار کے دو اخبارات ''مشیر'' اور ''اتحاد'' کا بطور خاص ذکر ملتا ہے۔

دوسری جنگ عظیم نے ہندوستان کے نہ صرف سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات پر اپنے اثرات مرتب کیے بلکہ اس وقت کی صحافت کو بھی متاثر کیا اور اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اس جنگ نے آزادیٔ ہند کے لیے راستہ ہموار کیا۔

ستمبر 1939 سے دوسری جنگ عظیم کی شروعات ہوئی اور بھارت کی انگریز حکومت نے بھارت کے ''ودھان منڈل'' سے مشورہ لیے بغیر ہی بھارت کی طرف سے اعلان جنگ کر دیا۔ جس سے خفا ہو کر کانگریس کی مجلس عاملہ نے 14 ستمبر 1939 کو ایک تجویز پاس کردی کہ بھارت کی جانب سے جنگ اور امن کا فیصلہ بھارت کے لوگ ہی کریں گے، ساتھ ہی انگریز حکومت سے بعض اہم معاہدہ بھی چاہا، جس کے انکار کرنے پر اختلاف بڑھتا گیا۔ اس اختلاف سے مسلم لیگ اور کانگریس نے اپنے اپنے طور پر فائدہ اٹھانا چاہا۔ تقسیم ہند کی بنیاد اسی زمانے میں پڑی۔ انگریز

حکومت، کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان بڑھ رہے اختلافات کو دور کرنے کے لیے 1942 میں سر اسٹیفر ڈ کرپس (Sir Stafford Cripps) بھارت تشریف لائے اور انھوں نے کئی تجاویز پیش کیں لیکن ان سے کوئی متفق نہیں ہوا اور جیسے جیسے دوسری جنگ عظیم میں تیزی آتی گئی، ویسے ویسے بھارت کی تحریک آزادی میں بھی شدت پیدا ہوتی گئی۔ جلسے، جلوس، احتجاج، گرفتاری اور سزا کا سلسلہ چلتا رہا۔

ان حالات کا اثر بہار کے نظام حیات پر بھی پڑا اور یہاں کی اردو صحافت بھی متاثر ہوئی، جس کا اندازہ اس دور کے اردو اخبارات کے مطالعے سے بخوبی ہوتا ہے۔

اس دور میں بہار سے شائع ہونے والے اخبارات ''دیہات'' اور ''روشنی'' چونکہ سرکاری ترجمان تھے، اس لیے یہ دونوں اخبارات کمپنی حکومت کے منشا اور مرضی کے مطابق خبریں اور تبصرے شائع کر رہے تھے۔ چند اقتباسات ''روشنی'' اور ''دیہات'' سے ماخوذ ہیں جو میرے اس خیال کی تائید کرتے ہیں لیکن اس سے پہلے ''روشنی'' پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ اس اخبار کے متعلق نہ جانے کیوں تذکرہ نگار خاموش نظر آتے ہیں۔ بعد کے ایک دوسرے اخبار ''روشنی'' کا ذکر کیا گیا ہے، جسے مطیع الرحمٰن شمیم نے پٹنہ سے 1950 میں نکالا تھا۔

میں جس پندرہ روزہ ''روشنی'' کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، اسے ماس لٹریسی کمیٹی (Mass Literacy Committee) نے شائع کرنا شروع کیا تھا۔ اس کے چیف ایڈیٹر عبدالسنان اور ایڈیٹرز — دھرمندر برہمچاری شاستری، سید حسن اور رگھونندن پرساد سنہا تھے۔ اس اخبار کی خصوصیت یہ تھی کہ ایک ساتھ اردو اور ہندی زبان میں شائع ہوتا تھا۔ پورے صفحے کو درمیان میں ایک لکیر کھینچ کر دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک ہی میٹر کو دائیں جانب اردو اور بائیں جانب ہندی میں تحریر کیا جاتا تھا۔ اس کے یکم اپریل 1939 تا دسمبر 1939، یکم جنوری 1940 تا دسمبر 1940 اور جنوری 1941 سے دسمبر 1941 تک کے (چند شماروں کو چھوڑ کر) شمارے خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں موجود ہیں۔ چونکہ یہ اخبار ماس لٹریسی کمیٹی کا ترجمان تھا، اس لیے تعلیم بالغان سے متعلق خبروں اور تبصروں کو نمایاں طور پر شائع کیا جاتا تھا جن کی تفصیلات کا یہ موقع نہیں۔ میں 1941 کے ان چند شماروں کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں، جن میں دوسری جنگ عظیم کے احوال و کوائف بیان

کیے گئے ہیں۔ درج ذیل اقتباسات نہ صرف جنگ عظیم بلکہ ملکی وصوبائی سطح کی بعض سرگرمیوں کی جانب بھی اشارہ کرتے ہیں:

''لڑائی چھڑ جانے سے چیزوں کے دام جو بڑھے تو بہت سے دکاندار بے جا دام بڑھا کر اپنی چیزوں کو بیچنے لگے۔ اسے روکنے کے لیے سرکار کوشش کر رہی ہے۔ ستمبر 1943ء سے دسمبر 1940 تک بہار میں 490 آدمیوں پر اس بے جا دام بڑھانے پر مقدمہ چلایا گیا اور بہت سے لوگوں کو سزا دی گئی۔'' (روشنی، یکم مئی 1941 صفحہ آخر)

''15/اپریل تک بہار میں 526 ستیا گرہی قید کیے گئے جن میں 23 عورتیں ہیں۔ ستیا گرہیوں سے 16890 روپے جرمانہ بھی وصول کیے گئے۔'' (روشنی، یکم مئی 1941)

''روس دیس میں روسیوں اور جرمنوں میں گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے۔ اس وقت دونوں طرف کے نوے لاکھ آدمی لڑ رہے ہیں۔ جرمنوں نے لینگراڈ، کیو اور روس کی راجدھانی ماسکو کو لے لینے کے لیے سر اور دھڑ کی بازی لگا دی ہے۔ لیکن سور مار روسیوں کے آگے ان کی ایک نہیں چل رہی ہے۔ اب تک جرمنوں کو پندرہ لاکھ اور روسیوں کو چھ لاکھ سپاہیوں سے ہاتھ دھونا پڑا ہے۔ ہٹلر نے جب روس پر چڑھائی کرنے کے لیے حکم دیا تھا تو اس کے دو بڑے بڑے سینا پتیوں نے، جو اس کے ہاتھ پاؤں سمجھے جاتے تھے، اسے بہت منع کیا، لیکن ہٹلر نے کسی کی بات نہ مانی، اس نے ایک کو ایسا ذلیل کیا کہ اس نے اپنی جان دے دی اور دوسرا نظر بند کر لیا گیا۔ لیکن وہ کسی طرح بھاگ کر لاپتہ ہو گیا۔''

(روشنی، 15/اگست 1941)

''ہندوستان کے بڑے لاٹ صاحب لڑائی کے خزانے سے ہندوستان کے

بنے ہوئے ایک لاکھ روپے کے مرہم پٹی کے سامان، اوزار اور دوائیں روس
بھیجنے والے ہیں۔" (روشنی، 15 راگست 1941)

دوسری جنگ عظیم کے متعلق بہار کے بیشتر اردو اخبارات خاموش نظر آتے ہیں، دراصل "Pre censorship" اور "Press Act" کا نفاذ کر کے حکومت نے بیشتر اردو اخبارات کو خوفزدہ یا بند ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ سرکاری ترجمان یا سرکار کے ہمنوا اخبارات ہی سرکار کی پالیسی کے تحت دوسری جنگ عظیم کے حالات اور اس کے اثرات کے مثبت پہلو کو اجاگر کر رہے تھے۔

"روشنی" سے قبل ایک اخبار "دیہات" تھا، جو جنوری 1940 سے ہفتہ وار کی شکل میں جاری ہونے والا حکومت بہار کی جانب سے دیہاتی آبادی کو دنیا کی خبر پہنچانے والا آرگن تھا، جسے مفت میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ اس کی ادارت میں کسی کا نام شامل نہیں ہے، اس کی پرنٹ لائن اس طرح ہے.....

"پٹنہ لاؤ پریس نے گورنمنٹ بہار کے اتھارٹی کی اجازت سے "برقی
پریس" سبزی باغ بانکی پور میں چھپوایا۔"

اس اخبار میں دیہی آبادی سے تعلق رکھنے والی اطلاعات و دلچسپی سے بھرے مواد کو خصوصیت کے ساتھ شائع کیا جاتا تھا۔ فصلوں کے بارے میں معلوماتی مضامین بھی شائع کیے جاتے تھے۔

جس وقت یہ اخبار شروع ہوا، اس وقت دوسری عالمی جنگ کی ابتدا ہو چکی تھی۔ حالانکہ اس دور کو تحریک آزادی کے تناظر میں دیکھا جائے تو بڑا اہم دور تھا اور اس دور میں تحریک آزادی نے بڑی شدت اختیار کر لی تھی، لیکن "دیہات" میں اس نوعیت کی خبریں شاذ و نادر ہی ملتیں۔

"دیہات" کے درج ذیل اقتباسات اور کچھ سُرخیاں دلچسپ اطلاعات فراہم کرتی ہیں:

"بہار کی امداد زخمی سپاہیوں کو

جوائنٹ وار کمیٹی کی صوبائی برانچ نے ہندوستانی فوج کے زخمیوں

اور بیماروں کی مالی امداد کے لیے بہار سے جو اپیل کی تھی، بہار کی طرف سے اس کا جواب بہت فیاضانہ ملا۔ اب تک چونتیس ہزار 12 روپے سات آنے اس فنڈ کو موصول ہو چکے ہیں۔" (دیہات، 19/مارچ 1940 صفحہ-3)

کمپنی سرکار کو بہار کے لوگوں تک اپنی باتیں پہنچانے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، غالباً اسی لیے یہاں ایک ریڈیو اسٹیشن قائم کرنے کا خیال آیا۔ "دیہات" اس خبر کو یوں دیتا ہے۔

"بہار میں ریڈیو کا اسٹیشن

بہاری اس خبر کو بڑی خوشی سے سنیں گے کہ عنقریب پٹنہ میں ایک ریڈیو اسٹیشن کھلنے والا ہے۔ عرصے سے یہ تجویز تھی۔ لیکن اب اس سلسلے میں انتظامی کارروائیاں بھی شروع ہو گئی ہیں وہ دن دور نہیں جبکہ بہار کا صدر مقام بہار کی آبادی سے قریب تر ہو جائے گا"

("دیہات" 19/مارچ 1940 صفحہ 3)

19/مارچ 1940 کے شمارے میں ایک سرخی تھی — "قیدیوں سے نازیوں کی بدسلوکی۔" اس کی تفصیل 9/ملاحوں کی زبانی بیان کی گئی ہے۔

23/اپریل 1940 کے "دیہات" کے صفحہ 6 پر سرخیاں اس طرح ملتی ہیں۔

"نازیوں کی دہشتوں کا مقابلہ ضرور کیا جائے گا۔"

"مہارانی ہتوا کی وفادارانہ پیشکش — جو رعیت لڑائی میں اپنا نام درج کرائے گا اس کے بال بچوں کی کفالت کی جائے گی۔"

30/اپریل 1940 کے شمارے میں "جنگ کی خبروں کا نچوڑ" کی سرخی کے تحت جنگ کی تفصیلات ہیں۔ 7/مئی 1940 کے شمارے میں "خبرنامہ" کے تحت بھی جنگ کے حالات اور "ہٹلر کی گرفتاری کے لیے انعام" کی سرخی کے نیچے اس بات کا اعلان ہے کہ امریکن دولت مندوں کی جانب سے ہٹلر کی گرفتاری پر ایک ملین ڈالر دیا جائے گا:

''اتحادیوں کی فتح کے لیے ہندوستان کی دعائیں'' کے تحت اس خبر کی تفصیل ہے کہ'' ملک معظم کی اپیل کے جواب میں ہندوستان کے طول وعرض میں 28/مئی کو یوم دعا ایک قومی تہوار کی حیثیت سے منایا گیا اور اتحادیوں کی فتح کے لیے تمام ہندوؤں، مسلمانوں اور عیسائیوں نے اپنی اپنی عبادت گاہوں میں دعائیں مانگیں۔''

11/جون 1940 کے شمارے میں،'' مہاتما گاندھی کا مشورہ'' کے تحت مہاتما گاندھی کے بیان کا خلاصہ شائع کیا گیا ہے، جس میں جنگ میں جان و مال کی تباہی و بربادی پر افسوس کا اظہار ہے اور بہادری کی تعریف ہے۔

18/جون کے شمارے میں مہاراجادربھنگہ کے ذریعہ جنگی فنڈ میں ایک لاکھ روپے کے علاوہ 16/ایمبولینس دیے جانے کا ذکر ہے۔22/جولائی 1940 کے شمارے میں بھی جنگ کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ'' بہار کا جنگی کوششوں میں سرگرم حصہ'' کی سرخی کے تحت ضلعی وتھانہ سطح پر جنگی کمیٹیوں کے قیام کا ذکر اور سرمائے کی فراہمی کے لیے ڈیفنس باؤنڈس اور سرٹیفکیٹ کو خریدنے پر زور دیا گیا ہے۔

ہفتہ وار'' دیہات'' اور اس کے بعد پندرہ روزہ'' روشنی'' کی ان تمام خبروں اور تبصروں کے مطالعے سے دوسری عالمی جنگ پر روشنی پڑنے کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ صوبہ بہار کے لوگ بھی اس جنگ میں دانستہ یا نادانستہ طور پر شامل تھے۔افسوس کہ اس دور کی تحریک آزادی کی تفصیلات ان اخبارات میں نہیں ہیں۔

مندرجہ بالا سطور میں، میں اس بات کا اظہار کر چکا ہوں کہ بہار کی اردو صحافت، دوسری جنگ عظیم سے بری طرح متاثر ہوئی۔اس کی وجہ جنگ عظیم کے وقت کا وہ کالا قانون تھا، جس کے نفاذ نے بہار کی پوری صحافت کو خوفزدہ اور ہراساں کر دیا تھا اور غیر سرکاری اخبارات بڑے سہمے سہمے اور سراسیمہ نظر آ رہے تھے۔

''اتحاد'' جیسا اہم اخبار جو پہلی جنگ عظیم کے دوران انگریزوں کے کالے قانون کا شکار ہو چکا تھا، دوسری جنگ عظیم کے آخری ایام میں بھی اس پر خوف اس قدر غالب رہا کہ

انگریزوں کے غلط اقدام اور ان کے ظلم وستم پر چشم پوشی اور خاموشی کو راہ دینے پر مجبور ہو گیا۔

''اتحاد'' اور دوسرے کئی عوامی اخبارات کو پریس ایکٹ کا خوف دلا کر انگریز حکومت نے ان کی آواز، بیباکی، بے خوفی، اور اظہار صداقت کو دبانے اور کچلنے کی کوشش کی، ان پر پہرے بٹھائے، لیکن جیسے ہی پریس ایکٹ ختم ہوا، موافق فضا قائم ہوئی، ان اخبارات کے اندر دبی نظرت کی چنگاری پھوٹ پڑی جس نے انگریز حکومت کو سرنگوں ہونے پر مجبور کر دیا۔

1901 سے 1947 تک بہار سے بڑے پیمانے پر اردو اخبارات و رسائل نکلے۔ لیکن افسوس کہ ان میں سے بیشتر اخبارات و رسائل کی فائلیں وقت کے بے رحم ہاتھوں سے تلف ہو چکی ہیں۔ اس لیے ان اخبارات نے کس طرح جنگ آزادی کے حصول میں حصہ لیا، ان پر کس کس قسم کے مصائب کے پہاڑ توڑے گئے اور ان سے وہ کس طرح سے نبرد آزما رہے، اب صرف ان کے ذکر پر ہی اکتفا کرنا پڑے گا، ان کی صحافت نگاری پر روشنی ڈالنا اب مشکل ہے۔

خدا بخش لائبریری، پٹنہ، جو ایشیا کی اہم ترین لائبریریوں میں سے ایک ہے، اس کے ذخیرۂ اخبار و رسائل میں جو بہار کے اخبارات و رسائل 1901 کے بعد 1947 تک موجود ہیں، ان میں درج ذیل اخبارات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً:

اتحاد (سہ روزہ، بہار شریف)، الاکرام (پندرہ روزہ، بہار شریف)، امارت (پندرہ روزہ، پھلواری شریف)، پیغام (سہ روزہ، پٹنہ)، دیہات (ہفتہ وار، پٹنہ)، روشنی (پندرہ روزہ، پٹنہ)، المبشر (ہفتہ وار، پٹنہ)، نقیب (پندرہ روزہ، پھلواری شریف، پٹنہ)

ویسے ''اتحاد'' کے مالک و مدیر سلطان احمد نے اپنے ایک اہم مقالہ ''جنگ آزادی اور اردو صحافت'' کے سلسلے میں دس اخبارات کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''غرض اس صد سالہ جنگ کی مختلف تحریکوں نے جتنے بھی رخ اختیار کیے ان کی رہنمائی و کارکردگی میں اردو صحافت ہر دور میں شریک حال رہی۔ کیونکہ وہ عوام الناس کی معاون اور وقت کی ترجمان تھی۔ ترک موالات کے دور سے ''ہندوستان چھوڑو'' تحریک تک صرف شہر پٹنہ سے العال، امارت، نقیب، مدبر، المبشر، مسلم، اقدام، پیغام،

الہلال اور اتحاد جاری ہوئے اور جس سے جتنا بھی ہو سکا، ملک کی اس جنگ میں معاون و مددگار رہے۔"

(کتاب "مقالات سلطان احمد" مرتب: ڈاکٹر عبدالخالق۔ صفحہ-161)

سلطان احمد کے اس بیان پر سخت تعجب ہے کہ انھوں نے نہ جانے کس مصلحت کی بنا پر 9/ستمبر 1942 سے اور پٹنہ ہی سے جاری ہونے والا روزنامہ "صدائے عام" کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ اس زمانے میں "اتحاد" اور صدائے عام" یہی دو اخبارات تھے، جو اردو صحافت کے نمائندہ اخبارات تھے۔ مسلم لیگ کے انگریزی ترجمان ویکلی "نیو لائف" سے صوبہ بہار کی کانگریسی حکومت کے ذریعہ ایک ہزار روپے کی ضمانت طلب کیے جانے کے احتجاج میں ایک دن کا اداریہ نہیں شائع کیے جانے کی جو خبر "صدائے عام" نے 22 ستمبر 1946 کے شمارے میں جن (مسلم) اخباروں کا تذکرہ شائع کیا ہے، ان میں "اتحاد" کا بھی ذکر اس طرح ملتا ہے۔

"صدائے عام" کا یقینی طور پر بہار کی تمام تر سیاسی، سماجی، تہذیبی، معاشرتی اور ادبی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ آزادئ ہند میں اہم اور نمایاں رول رہا ہے، اور یہ اخبار اپنی کئی خصوصیات کی وجہ سے بھی منفرد ہے۔

فی الحال ہم جنگ آزادی میں کردار ادا کرنے والے سہ روزہ اخبار "اتحاد" کا جائزہ لیں گے۔ یہ اخبار 1912 میں بہار شریف سے ہفتہ وار کی شکل میں شیخ نور محمد کی ادارت میں نکلا۔ انھوں نے اتحاد، کے نام سے ایک گلدستہ نکالا تھا، جو بعد میں ہفتہ وار ہو گیا۔ 1913 میں مسجد کانپور کی شہادت پر جوشیلی تحریر کے لکھنے کے باعث حکومت نے اس کی ضمانت ضبط کر لی۔

اس "اتحاد" کے معیار صحافت کے متعلق مشہور دانشور اور نقاد ڈاکٹر عبدالمغنی کا خیال تھا کہ:

> "ایک زمانہ تھا، بس چند سال پیشتر، جب "اتحاد" پٹنے کا واحد اردو اخبار تھا اور پورے ملک کے اردو اخباروں میں اپنا ایک مقام رکھتا تھا، خبروں اور تبصروں کے علاوہ اس میں بہار اور ہندوستان بھر کے مشہور ادبا و شعرا کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ 'اتحاد' اپنے وقت کا ایک تاریخی ادارہ تھا اور اس اعتبار سے اس کو بہار کی

موجودہ اردو صحافت کی ماں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ اخبار سالہا سال تسلسل، پابندی اور خوش سلیقگی کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔ اس کے طویل دور حیات میں کئی ایک مدیروں نے اس کی ترتیب میں اپنی ہنرمندیوں کے جوہر دکھائے۔ لیکن 'اتحاد' کے آخری مدیر جناب سلطان احمد صاحب اتنے طویل عرصے تک اور اس ذہنی و عملی یکسوئی اور جاں فشانی کے ساتھ اخبار سے وابستہ رہے کہ بالآخر وہی اس کے مالک ہو گئے اور ان کے چہیتے نے ان ہی کی گود میں زندگی کا آخری سانس لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سلطان صاحب 'اتحاد' کے سب سے اہل، کارگزار، اور نامور مدیر ہوئے اور ان کا ہی زمانہ ادارت اخبار کا عہد زریں کہا جا سکتا ہے۔"

(تعارف، مقالات سلطان احمد، مرتب: ڈاکٹر عبدالخالق، صفحہ-۱)

خود سلطان احمد مدیر "اتحاد" جنگ آزادی میں بہار کی اردو صحافت کے نمایاں رول کا ذکر کرتے ہوئے آزادیٔ ہند اور "اتحاد" کی تحریک آزادی میں شمولیت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

"1942 کے ابتدائی ایام تھے۔ گاندھی جی نے "بھارت چھوڑو" کا نعرہ بلند کیا اور سارے ملک میں ہنگاموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ کانگریسی کارکنوں نے ہند کا چپہ چپہ چھان ڈالا۔ قومی اخبارات نے پورا تعاون کیا۔ پرجوش مضامین و مقالوں کی بھرمار ہوئی۔ خبروں کی وہ اودھم مچی کی داستانوں کا مزہ جاتا رہا۔ اس وقت اردو صحافت کا نمائندہ بہار کا کثیر الاشاعت اخبار "اتحاد" تھا۔ اخبار عوام کی رہنمائی کرتے ہیں اور ترجمانی بھی۔ اتحاد اس تحریک سے وابستہ ہو گیا۔ پھر کیا تھا، ہر جگہ سفر و حضر میں اسی کا ذکر تھا، نئی نئی خبروں، پرزور مقالوں اور مسلسل مضامین نے قوم میں زندگی و حرکت کی لہریں دوڑا دیں۔ چنانچہ تحریک پروان چڑھی، ملک کو آزادی ملی۔"

("جنگ آزادی اور اردو صحافت" مقالات سلطان احمد، صفحہ 161 مرتب: عبدالخالق)

Quit India Movement جو 9 اگست 1942 سے شروع ہوئی، اس تحریک نے، آزادیٔ ہند کے شدید مطالبے کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ جو نہ صرف یہ کہ پورے ملک میں اپنی پہچان بنا چکی تھی، بلکہ انگریزوں کے تفرقہ کے نظریے نے ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا اور مطالبۂ آزادی کے ساتھ ساتھ تقسیم ہند کی آواز تیز ہونے لگی اور اسی تقسیم ہند اور مطالبۂ پاکستان نے ملک کے اندر فرقہ پرستی کو ہوا دی، ایک دوسرے کے تئیں نفرت شدت اختیار کرتی چلی گئی اور اس بات میں کوئی شک کی گنجائش نہیں رہی کہ اس نفرت اور فرقہ پرستی کو ہوا دینے میں ہمارے ملک کے بیشتر رہنماؤں کے ساتھ ساتھ مختلف زبانوں کے اخبارات بھی پیش پیش تھے۔

ان اخبارات نے عوام کی سچی ترجمانی کم کی اور غلط رہنمائی زیادہ کی، اور اپنی پر جوش تحریروں سے اور مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کی ہمنوائی کر کے، کانگریسیوں، ہندوؤں اور مولانا آزاد اور عبدالقیوم انصاری جیسے نیشنلسٹ رہنماؤں کی شدید مخالفت اور مذمت کر کے، پورے صوبے کے مسلمانوں کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو سلب کر دیا، انھیں دماغ کے بجائے دل سے سوچنے پر مجبور کر دیا، اور ایسے مقام پر لا کھڑا کیا جہاں سے ان کے راستے مسدود نظر آنے لگے تھے۔

اس طرح، ہندوستان کے دوسرے کئی شہروں کی طرح صوبہ بہار میں بھی تاریخ کا سب سے ہولناک، المناک اور انسانیت سوز فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا، اشارہ ہو گیا اور چال چل دی گئی اور پھر کلکتہ، بمبئی، الٰہ آباد، آگرہ، نرائن گنج، بنارس اور احمد آباد وغیرہ کے ساتھ ساتھ بہار سے بھی اتحاد، دوستی، بھائی چارہ، یکجہتی، مساوات، پیار، محبت، ایثار و قربانی خاکستر ہونے لگی، ہر طرف سے نفرت، عداوت، ظلم، استبداد، ذلت، رسوائی، بربریت، برہنگی تشدد کے عفریت ایک ساتھ انسانیت، انسانی قدروں، بہار کی شاندار روایتوں پر حملہ آور ہو گئے۔

"پٹنہ کے دیہاتوں میں قتل عام، بچوں، عورتوں، اور بوڑھوں کا سفاکانہ
خون / مال و اسباب لوٹ کر مکانات نذر آتش کر دیے گئے / حکام کے

جانبدارانہ رویے سے فسادیوں کی ہمت افزائی رنوا کھالی کے "انتقام" کی تلقین کے کرشمات"۔ (صدائے عام، ۲ر نومبر کے صفحۂ اول کی خبر کی سرخی)

بہار کے ان خونیں واقعات نے انسانیت کا سر شرم سے جھکا دیا۔ تانڈو کا ننگا ناچ ہوتا رہا، درندہ صفت لوگ گوتم اور مہاویر کو شرمسار کرتے رہے اور ہزاروں ہزار معصوم اور بے گناہ انسان موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ سیکڑوں عورتوں اور معصوم لڑکیوں کی عزت و آبرو لوٹ لی گئی، معصوم بچوں کو نازیوں، ہٹلروں اور ڈائروں کے نام قربان کر دیا گیا— ایسی کریہ اور انسانیت سوز حرکات نے یقینی طور پر مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو اور مولانا آزاد کو خون کے آنسو رُلا دیا۔ جے پرکاش نرائن نے قتل و غارت گری سے متاثرہ علاقوں کا دورہ شروع کیا، تلہاڑہ کے دورے کو ہندی کے ایک سو بیٹر نے اس طرح بیان کیا ہے :

"قریب ایک گھنٹے بعد جے پی لوٹے میں نے لالٹین کی ہلکی روشنی میں دیکھا، ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور رستی ہوئی ناک صاف کرتے جاتے تھے۔ آکر چپ چاپ دری پر بیٹھ گئے۔ جب آنسو تھمے تو بولے— اب چلنا چاہیے۔

ایک بوڑھا ہاتھ جوڑ کر بولا— "سرکار گاؤں کے لوگ آپ کا پروچن سننے آئے ہیں، دو منٹ کہا جائے"۔ "مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔ آپ لوگوں نے یہاں جو رکت پات کیا ہے، اس کے بعد کیا مجھ سے شاباشی لینا چاہتے ہیں؟ پھر اچانک ہی کچھ سوچ کر کھڑے ہو گئے اور بولے۔"

"آپ لوگوں نے بھارت ماتا کے چہرے پر کالکھ پوت دی ہے۔ میں ابھی اپنی آنکھوں سے آپ لوگوں کی بربرتا دیکھ کر آرہا ہوں۔ میں نے اپنے جیون میں ایسا بھینکر درشیہ کبھی نہیں دیکھا۔ شاید آپ نے بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ یہ لوگ آپ کے ساتھ سدا سے رہتے آئے تھے۔ جنھیں آپ کل تک شاید کاکا، ماموں، بھائی، بیٹا، بیٹی کہتے ہوں گے، ان کی کو کاٹ کر رکھ دیا آپ نے! کیسے ہاتھ اٹھا آپ کا ان نردوش نہتھے

بچوں، عورتوں، مردوں، بوڑھوں پر؟ یہ کیسا پاگل پن سوار ہو گیا آپ پر، اچانک، منوشے سے پشو بن گئے۔ مانو سے دانو بن گئے آپ؟ مجھے سپاہی جی نے بتایا، گاؤں میں کوئی بھی مسلمان جیوت نہیں بچا..... انھوں نے بتایا کہ گھروں، گلیوں اور مسجد تک میں لاشیں ہی لاشیں تھیں، جنھیں کل بھی ہٹایا گیا ہے۔ میں نے ایک کنویں میں ٹارچ سے دیکھا، اس میں ابھی تک بہت سی لاشیں دکھائی دیں۔ دُرگندھ اٹھ رہی تھی، اس میں سے۔ میں پوچھتا ہوں 'یہ کیا کیا آپ نے' کیوں کیا آپ نے...''

(مہامانو، جے پرکاش اُسماریکا 28 رجون 1987)

ایسے دلدوز اور خونیں واقعات اور حادثات کے پیش نظر... بہار کو گورنر بہار نے برہم علاقہ قرار دے کر، فوجیوں کے تعاون سے فرقہ وارانہ فسادات کو روکنے کی کامیاب کوشش کی، حالات آہستہ آہستہ معمول پر آنے لگے، روتے بلکتے لوگوں کے آنسوؤں کو پونچھنے کا سلسلہ شروع ہوا، انسانی جسموں اور مکانوں و دکانوں سے اٹھتے دھوئیں کو دیکھنے کے لیے آنے والے، اور صبر و استقلال سے کام لینے کی تلقین کرنے والے بہار کے دورے پر نکل پڑے۔ اور طرح طرح کے بیانات اخبارات کی سرخیاں بننے لگے۔

''مسٹر گاندھی فاقہ کریں گے

پٹنہ-5 نومبر — مسٹر گاندھی نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر 24 گھنٹے میں بہار میں قتل و غارت گری بند نہ ہو گئی تو وہ فاقہ شروع کر دیں گے۔''

(صدائے عام، 7 نومبر 1946 کے صفحہ اول کی خبر کی سرخی)

''مرلی بابو اور جگت بابو کی گرفتاری کا مطالبہ، پناہ گزینوں کے مراکز کے دردناک مناظر، مرکزی حکومت کے ارکان کے دل دہل گئے۔''

(صدائے عام، 6 نومبر 1946 کے صفحہ 2 کی خبر کی سرخی)

''فسادات کا انسداد نہ ہوا تو ملک کا مستقبل تاریک ہے، مرکزی اسمبلی

میں پنڈت نہرو کی تقریر"۔

(صدائے عام، 17 رنومبر 1946 کے صفحہ اوّل کی خبر کی سرخی)

"بہار کی کانگریسی وزارت پر مسلم رہنماؤں کو مطلق اعتماد نہیں رہرچ لائٹ کے ایڈیٹر کو مولوی عبدالمغنی صاحب کھلا چیلنج"۔

(صدائے عام، 14 رنومبر 1946 کے صفحہ اوّل کی خبر کی سرخی)

بہار کا فساد یقینی طور پر بڑا شدید اور المناک تھا۔ جہاں بستی کی بستی صاف ہوگئی، کئی شہر اجڑ گئے، بہار کے مسلمانوں پر ایسی آفت کبھی نہیں آئی، مسلمانوں پر لگے گہرے زخم اور مسلم لیگیوں کی انتہا پسندی نے گاندھی، نہرو اور آزاد جیسے لوگوں کو سپر ڈالنے پر مجبور کر دیا، جناح اور لیاقت علی خاں کی ضد نے آخر کار تقسیم ہند کا مسودہ منظور کرالیا اور اس طرح نہ صرف بھارت کے دو ٹکڑے ہوئے، بلکہ یہاں کے مسلمانوں کے دلوں اور رشتوں کو بھی کئی ٹکڑوں میں تقسیم کرا دیا۔ انتہا یہ ہوگئی کہ ہجرت پاکستان کے وقت ماں باپ پاکستانی ہو گئے، تو بیٹا، ہندوستانی، بیٹا پاکستانی بنا تو ماں، باپ اپنی قدروں، اپنے آبا واجداد کو، اپنی جڑوں کو چھوڑنے پر رضامند نہیں ہوئے۔

آخر کار وہ دن آ گیا، جس کا برسوں سے انتظار تھا، جس دن کی تمنا میں بھارت کے لاکھوں لوگ نہ صرف دار و رسن کی آزمائشوں سے گزرے بلکہ جام شہادت بھی نوش کیا۔ یہ دن یقینی طور پر خوشی اور انبساط کا دن تھا، لیکن بھارت کے تقسیم ہو جانے کا غم اور افسوس بھی تھا 15 راگست 1947 کے "صدائے عام" کی خبروں کی سرخیاں اس طرح تھیں:

"انڈیا اور پاکستان کی دو آزاد ریاستیں عالم وجود میں آ گئیں رقیام پاکستان، تاریخ دنیا کا بے مثال واقعہ ہے رانڈیا کی دستور ساز اسمبلی نے نیا حلف اٹھایا رپاکستان میں مجلس دستور ساز میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تقریر لارڈ ماؤنٹ بیٹن گورنر جنرل مقرر ہوئے۔

(صفحہ اوّل کی سرخی)

"آزاد ہندوستان میں بہار کے پہلے گورنر مسٹر دولت رام نے 12 ربجے

شب میں چارج لے لیا گورنمنٹ ہاؤس میں حلف وفاداری کی شاندار رسم"

(صفحہ اول کی سرخی)

ایک وضاحت: روزنامہ "صدائے عام" سے جو اقتباسات سطور بالا میں پیش کیے گئے ہیں، ان سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ اردو کے سبھی اخباروں نے دوقومی نظریے کو اچھالا اور انتہائی اشتعال انگیز تحریروں سے ملک کی (بالخصوص صوبہ بہار کی) فضا کو مسموم کیا۔ درحقیقت بات یہ نہیں ہے۔ وقت کی عجیب ترین صورت حال یہ تھی کہ بہار سے "صدائے عام" اور "اتحاد" کے علاوہ کوئی دوسرا اردو اخبار شائع نہیں ہوتا تھا کہ مسلمانوں کی صحیح ذہنی رو کی ترجمانی کر سکتا اس لیے ایک اخبار کے مسلک پر پوری اردو صحافت یا صوبے کے تمام مسلمانوں کو مورد الزام ٹھہرانا تاریخ کے حقائق کو جھٹلانے کے مترادف ہوگا۔ تاریخی سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان کی تقسیم سے بہت پہلے مسٹر جناح کے دوقومی نظریے نے اس ملک میں رہنے والے لوگوں کو بانٹ دیا تھا۔ ایک طرف اکھنڈ بھارت اور دوسری طرف پاکستان، مگر یہ بات نہیں تھی کہ تمام ہندو یا تمام مسلمان ایک ہی نہج پر سوچتے تھے۔ دونوں میں ایک بڑا طبقہ ایسا تھا جو یہ سمجھتا تھا کہ اگر آبادیاں متحد نہیں رہیں تو آزادی کے بعد بھی انتشار و فساد باقی رہے گا۔ مسلمانوں کا "نیشنلسٹ" طبقہ تو خود مسلمانوں کی پراگندہ ذہنی کا شکار بنا لیکن اس نے ایک ہندوستان کے علاوہ اور کوئی خواب نہیں دیکھا۔

یہی حالت اخبار کی تھی۔ ہندی اور انگریزی کے کئی اخبارات ایسی ایسی اشتعال انگیز خبریں چھاپتے اور اداریے سپرد قلم کرتے تھے کہ اس کا ردعمل ہونا فطری تھا اور یہی ہوا۔ "صدائے عام" بھی اس سیلاب میں بہ گیا، جب حقیقت سامنے آگئی تو حقیقت بیانی بھی اخبارات کا رویہ بن گئی۔ ایسی "صدائے عام" کے 15/اگست 1947 کا اداریہ اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ اخبار مذکور "قیام پاکستان" کا حامی ضرور تھا لیکن اس اخبار کی خبروں کی سرخیوں کی سنسنی خیزی اور انگریزی اخباروں کی اشتعال انگیزیوں کا ردعمل بھی تھی۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"صبح آزادی

غلامی و محتاجی اور غلام و تاراج ہندوستان کی آزادی کے دیوانے جوش عمل سے سرشار، ایثار و قربانی سے معمور، جذبۂ سرفروشی سے مخمور، جرأت و ہمت کے پتلے

وتفنگ کے سامنے سینہ سپر قریب سو سالوں تک جور و استبداد کے دیوتاؤں سے شہنشاہیت و آمریت کے مجسموں، انگریزی نظام اور آہنی قوانین سے آزادی کی خاطر، عوام کی زبوں حالی کی اصلاح کے لیے اور دنیا کی خود مختار اور باوقار قوموں میں شمار کیے جانے کی غرض سے مسلسل متصادم رہے۔ ان شمع حریت کے پروانوں اور ملک کے جاں نثاروں کے لیے برطانوی دار و رسن سے کھیلنا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ مہینوں قید و بند کی سختیاں جھیلنا، سالہا سال آہنی سلاخوں میں جکڑ بند رہنا، ڈنڈے کھانا، بے گھر بار کر دیے جانا، مال و متاع کا سوخت ہو جانا، ان کو اپنی صدائے آزادی سے دور نہ رکھ سکے۔ ان کے عزائم راسخ نے برطانوی شہنشاہیت کے آہن کو موم کر دیا اور ان کے خلوص قلبی نے آمریت کے نار کو گلنار بنا دیا، ہندوستان کی ان مایۂ ناز ہستیوں کو خاک و خون نے ہندوستان کی بھیانک رات کی سیاسی فضا کے تار و پود کو بکھیرنا شروع کر دیا۔"

(اداریہ "صدائے عام" 15 راگست 1947)

پورے ہندوستان اور پاکستان سے فتح کا جشن منائے جانے کی خبریں آنے لگیں، پاکستان کے مسلمان اور مسلم لیگی خوش تھے کہ ان کی دیرینہ خواہش پوری ہوئی اور ان کے پاکستان کا خواب، حقیقت میں بدل گیا۔ ابھی جشن آزادی کی شمعیں گل بھی نہیں ہوئی تھیں کہ ایک بار پھر دونوں ملکوں کی انسانیت چیخ اٹھی۔ پنجاب، دہلی اور کلکتہ سلگ اٹھا اور اس کے شعلے دونوں ملکوں کے چھوٹے شہروں اور بستیوں میں پہنچنے لگے اور تقسیم ہند کے زخموں سے چور لوگ، بے پناہی اور بربادی میں جائے پناہ ڈھونڈنے لگے۔ لیکن پناہ گاہیں تو مفاد پرست سیاسی رہنماؤں، فرقہ پرست ذہنیت کے مالکوں، مذہبی جنونیوں اور سیکولرزم کے دشمن اردو، ہندی اور انگریزی کے صحافیوں کے ہاتھوں خاکستر ہو چکی تھیں۔ مشہور اور معتبر صحافی دیا نرائن نگم نے 1937 میں جس خدشے کا اظہار کیا تھا، اس میں کوئی کمی نہیں آئی، بلکہ اضافہ ہی ہوتا گیا۔ دیا نرائن نگم نے اپریل 1937 کے "زمانہ" میں لکھا تھا:

''ابھی تک اردو ہندی پریس پر فرقہ وارانہ ذہنیت غالب ہے۔ مگر اب اس تنگ نظری کا کوئی موقع باقی نہیں رہا، اس لیے ہم اخبار نویسوں کو تعصب وتنگ دلی کی پالیسی کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دینا چاہیے۔''

(''اخبارات ورسائل'' صفحہ 80 مطبوعات :26 خدا بخش لائبریری پٹنہ)

وہ مزید لکھتے ہیں :

''اس وقت اخبار نویسوں کو بخوبی سمجھ لینا چاہیے کہ مالی حالت درست ہونے تک جسے ابھی ایک عرصہ درکار ہے۔ ہم کو سختیاں جھیلنا پڑیں گی۔ اس لیے اپنے پیشے کا معیار، اخبارات کی آبرو اور اپنی ذاتی وقعت قائم رکھنے کے لیے ہم کو ضبط نفس اور ایثار سے کام کرنے کے واسطے تیار رہنا چاہیے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ یہ ایثار بالآخر بیکار نہ رہے گا اور خواہ ہم دولت نہ پیدا کر سکیں، لیکن عزت سے زندگی ضرور بسر کر سکتے ہیں اور قومی خدمات ایمانداری سے انجام دینے کا اطمینان ہم کو یقینی حاصل ہو سکتا ہے۔

اخبار نویسی کا پیشہ ایک مقدس اور عظیم القدر پیشہ ہے۔ جو لوگ روپیہ پیدا کرنا چاہتے ہیں، انھیں اس طرف متوجہ نہیں ہونا چاہیے۔''

(اخبارات ورسائل، خدا بخش لائبریری، مطبوعہ (26) صفحہ-89)

اس تناظر میں اگر ہم بہار کی اردو صحافت کا جائزہ لیں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ جہاں 1942 کے بعد بہار کی اردو صحافت نے مسلم لیگ کے افکار وخیالات کی ترجمانی کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے لیے فضا ہموار کی، وہیں، ٹھیک اس کے برعکس 1942 سے قبل بہار کے اردو اخبارات نے پوری طرح حب الوطنی، یکجہتی، اتحاد اور آزادیٔ ہند کے لیے قومی جذبے کو جگانے میں قومی خدمات انجام دی ہیں۔

''پٹنہ اخبار

ایک ہفتہ وار اردو اخبار ہے، جو دار السلطنت صوبہ بہار سے بڑی تقطیع کے

آٹھ صفحوں پر شائع ہوتا ہے۔ ہر صفحے کے تین کالم مفید، دلچسپ وضروری مضامین سے بھرے ہوتے ہیں۔ یوں تو پٹنہ سے بہترین اخبارات نکلے اور بند ہو گئے۔ لیکن اس وقت وہاں ایک ایسے اخبار کی سخت ضرورت تھی جو ہم وطنوں کے حقوق کی نگہداشت کرے۔ ابتدا ہی سے اس کی روش شاندار اور پالیسی قابل تقلید رہی ہے۔ اس نے جو طریقہ اختیار کیا ہے اس سے امید ہوتی ہے کہ اہل وطن میں اتحاد واتفاق کا مادہ بعنوان احسن پیدا کر سکے گا۔ اس کی رفتار رو بہ ترقی ہے اور ہر نمبر گزشتہ نمبر سے بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ اہل بہار کا فرض ہے کہ اس کی قدردانی کر کے گرمجوشی کا عملی ثبوت دیں۔ ولی مسرت کے ساتھ اس ہونہار اخبار کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ لائق ایڈیٹر صاحب کی محنتیں پسندیدہ ثابت ہوں گی۔''

(ایڈیٹر جرنل: مئی 1913ء-7-8، خدا بخش لائبریری۔ پٹنہ، صفحہ:337)

یکجہتی، حب الوطنی اور جذبۂ قومیت سے سرشار اردو اخباروں میں ''پیغام'' کا بھی ذکر ضروری ہے، یہ سہ روزہ اخبار 27/جولائی 1926 (اجرا کی صحیح اطلاع ہفتہ وار اخبار ''البشر'' (پٹنہ) کے 20/اگست 1926 کے شمارے میں موجود ہے) سے پٹنہ سے نکلا، جس کے پرنٹر، پبلشر مولوی عبدالحلیم اور ایڈیٹر سید شاہ عبدالمجید تھے۔ اس کا ایک اقتباس اس امر کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ اس اخبار کا مطمح نظر حصول آزادی تھا، جس کے لیے وہ اتحاد پر زور دیتا تھا۔ ''پیغام'' (دریاپور، پٹنہ) کے 25/ستمبر 1926 کے شمارے میں یہ تحریر ملتی ہے:

''جب تک اتحاد واتفاق باقی تھا۔ ہندوستان کے لیے ایک اور فقط ایک سیاسی مطمح نظر تھا۔ ملک کی ساری طاقتیں حصول آزادی کے لیے متحد تھیں اور پیکار حریت میں مصروف تھیں۔'' (پیغام، جلد-1، شمارہ-15، صفحہ-2)

''پیغام'' کے اجرا سے قبل بہار سے ایک بہت ہی اہم ہفت روزہ اخبار ''البشر'' تھا۔ جس کی اشاعت کب سے شروع ہوئی، اس کے متعلق حتمی طور پر کچھ لکھنا مشکل ہے، ویسے

18 اپریل 1924 کے (خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں موجود) شمارے کی جلد نمبر-2 اور شمارہ نمبر-1 میں جو تحریر ہے، اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ "المبشر" کی ابتدا 18 اپریل 1923 سے ہوتی ہے۔ لیکن "المبشر" کے ایک شمارے میں اس کے سنہ اجرا کے متعلق 1924 کا ذکر ملتا ہے۔ یہ اقتباس توجہ طلب ہے:

"..... المبشر ایک مخلص کی آواز ہے، جو اس پیکر خلوص نے 1924 میں بلند کی تھی، جبکہ بہار میں اخباری دنیا تاریک تھی۔ لیکن آج خوش نصیب ہے ہمارا صوبہ کہ المبشر کی دعوت عمل مقبول ہوئی اور کئی اخبار نکل رہے ہیں۔ ہم پر اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ ہم ادارتی ذوق میں اخبار نکال رہے ہیں تو یہ حد درجہ رکیک ہے۔ (المبشر 20 راگست 1926، صفحہ-2)

"ندیم" 1935 کے بہار نمبر میں "بہار کی صحافت" کے تحت خضر یانو نے "المبشر" کے اجرا کا سنہ 1926 لکھا ہے، وہ یقینی طور پر غلط ہے، اس اخبار کی پرنٹ لائن اس طرح ملتی ہے:

"ولی امام پرنٹر و پبلشر نے برقی پریس میں چھپوا کر دفتر المبشر، مراد پور، بانکی پور سے شائع کیا۔ ایڈیٹر: سید منظر علی ندوی۔"

اس اخبار کے ایک شمارے کا ایک اقتباس پیش ہے۔

"گزشتہ نمبر میں المبشر کے مسلک عملی پر تفصیلی روشنی ڈالی جا چکی ہے اور یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ المبشر حق گوئی کو اہم ترین فرض سمجھتا ہے اور موسمی اخبارات کی طرح مصالح پروری پسند نہیں کرتا"۔

(المبشر، 20 راگست 1926 بروز جمعہ، جلد-6 شمارہ نمبر-صفحہ-1)

"المبشر" نے 20 راگست 1926 کے اداریے میں "حب الوطن من الایمان" پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے وطن کی محبت کو ایمان کا جزو قرار دیا گیا ہے۔

"المبشر" کے اسی شمارے کے صفحہ-11 پر

"مولانا مقبر الحق صاحب کی صدارت سے دست برداری ہندو مسلم اتحاد سب سے زیادہ مقدم اور ضروری شے ہے"۔ عنوان کے تحت مولانا

مظہر الحق کا ایک بیان شائع کیا ہے جس میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ جب تک اتحاد و اتفاق نہ ہوگا، اس وقت تک سوراج کا تصور ممکن نہیں اور اس کے لیے فرقہ پرستی کے زہر کو ختم کرنا ضروری ہے۔"

اقتباس دیکھیے:

"میں نے اپنے آپ کو ہندو مسلم اتحاد کے لیے بالکل وقف کر دیا ہے، جو اس وقت ملک کے سامنے سب سے زیادہ ضروری اور اہم مسئلہ ہے جب تک یہ مسئلہ طے نہ ہو جائے اس وقت تک سوراج کی تمام گفتگو بیکار۔ صوبہ بہار میں ایسے ہندو مسلمان لیڈروں نے جن کا عوام پر کچھ بھی اثر ہے، آپس میں اتحاد کر لیا ہے اور یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ اس صوبے کو فرقہ وارانہ اثر سے قطعی طور پر محفوظ رکھیں گے۔ میں نے بھی بحیثیت ایک ادنیٰ خادم ہونے کے اپنے ان دوستوں کے ساتھ کام کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔" (مولانا مظہر الحق۔ "الہبشر" 20 راگست 1926 صفحہ-11)

اس اخبار کے علاوہ بھی ایسے بہت سارے اخبار و رسائل بہار سے شائع ہوئے، جن میں حصول آزادی کے لیے مر مٹنے کے حالات، حادثات اور واقعات کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی اور معاشرتی تبدیلیوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ بہار کے اردو اخبارات کے لیے اس عہد میں ایک ہی مقصد تھا، طوق غلامی سے نجات، انگریزوں کے خلاف بغاوت اور حصول آزادی! اردو کے ادبی رسائل میں بھی جنگ آزادی کے لیے فضا ہموار کرنے اور نوجوانوں و سپاہیوں کے دل و دماغ میں قوم و ملک سے محبت اور عقیدت کے احساسات و جذبات کی لو تیز کرنے، انگریزوں کے ظلم و ستم کا منھ توڑ جواب دینے کی تحریک و تحریر بھی ملتی ہیں۔ "ندیم" کے بہار نمبر (جولائی 1933) کے خصوصی نمبر میں جہاں "نوجوانوں سے" مخاطب ہو کر رضی عظیم آبادی نے بھارت کے نوجوانوں کو نقش استبداد کو ٹھوکروں سے مٹا دینے اور انقلاب برپا کر دینے کی تلقین کی ہے (صفحہ 242) وہیں "ندیم" (ستمبر 1933 کے صفحہ 42 پر سید محمد اسمٰعیل صاحب رسا ہمدانی گیاوی نے "ایک نوجوان سپاہی کی موت — میدان جنگ میں" کے عنوان سے ملک و قوم پر نثار ہونے والے سپاہی کی

عظمت کے گیت گائے ہیں — اور —

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

(حکایت ہستی، از :(سید شاہ محمد حسن) بسمل عظیم آبادی۔ صفحہ-1)

جیسا شعر بھی 1921 میں اسی بہار سے نکل کر ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گیا اور پھر ایسی نظمیں بھی بہار کے ادبی رسالوں میں شائع ہوئیں، جو داد سخن اور واہ واہی کے لیے نہیں بلکہ قومی سپاہیوں کی جوانمردی اور ہمت و جرأت کی داد اور قوم پرستوں کا خون گرمانے کے لیے تھیں —

شعر میں پڑھتا نہیں ہوں، واہ واہی کے لیے
یہ تو اک توہین ہے قومی سپاہی کے لیے

شاعری کرتا ہوں کہ گرماؤں انسانوں کے خوں
پیشہ ور شاعر نہیں ہوں میں کہ داد شعر لوں

(میری شاعری اور سامعین از :رضی عظیم آبادی رسالہ "ندیم" بہار نمبر 1935 صفحہ-239)

ایسے ہی خون گرما دینے والے اشعار، جوش، حب الوطنی کو بڑھاوا دینے والے بیانات، ہمت و جرأت کی دعوت فکر دینے والے اداریوں اور خبروں کی اشاعت میں بہار کے اردو اخبارات کے مالکوں اور مدیروں کو کئی بار حکومت کے سخت قوانین اور آزمائشوں سے گزرنا پڑا، لیکن جوش و خروش میں کوئی کمی نہیں آئی اور آخر کار سیاسی، سماجی اور صحافتی محاذ پر لڑی جانے والی اس جنگ میں کامیابی ملی اور 15 راگست 1947 کو بھارت آزاد ہو گیا۔

بہار میں اردو صحافت

صفدر امام قادری

اخبارات کے مورخین عام طور سے اردو صحافت کی جب تاریخ مرتب کرتے ہیں تو پہلا دور 1857 سے قبل کا مانا جاتا ہے۔ صوبۂ بہار اس اعتبار سے نہایت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ بہار میں انگریزی اور ہندی صحافت سے قبل اردو صحافت کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ دوسرے صوبوں میں بالعموم پہلے انگریزی صحافت نے اپنی بنیاد رکھی اور تب علاقائی یا دیسی صحافت کا آغاز ہو سکا۔ شاید یہ اس لیے بھی ممکن ہوا کیونکہ بہار میں 1850 میں شاہ کبیر الدین احمد نے سہسرام میں ایک پریس قائم کر لیا تھا۔ شہر آرہ سے اردو کا پہلا اخبار جولائی 1853 میں ''نور الانوار'' نام سے شائع ہوا۔ اس اخبار کے ایڈیٹر سیّد خورشید احمد تھے اور مالک سیّد محمد ہاشم بلگرامی تھے۔ آرہ اُس وقت شاہ آباد ضلعے کا مرکز تھا۔ اس اخبار کے سلسلے سے جن محققین نے بنیادی نوعیت کی اطلاعات فراہم کی ہیں، اُن میں سیّد محمد اشرف (اختر شہنشاہی)، محمد عتیق صدیقی (ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں)، سیّد مظفر اقبال (بہار میں اردو نثر کا ارتقا 1857 سے 1914 تک)، رخشاں ابدالی (مقالۂ مطبوعہ رسالہ 'ندیم' گیا۔ 1940) وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ بہار ڈسٹرکٹ گزیٹیر کے صوبائی مدیر جناب این کمار نے

1971 میں ''جرنلزم اِن بہار'' نام سے جو کتاب شائع کی، اُس میں بھی ''نورالانوار'' کو بہار کی تمام زبانوں کا پہلا اخبار تسلیم کیا گیا ہے۔ این کمار نے اسے ہفتہ وار اخبار تسلیم کیا ہے لیکن دیگر ذرائع سے اس کی معیاد کا ٹھیک طریقے سے پتہ نہیں چلتا۔ بدقسمتی سے ایسا کوئی محقق اب تک سامنے نہیں آسکا جس نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ اُس نے اس اخبار کا مطالعہ کیا ہے۔ اکثر و بیشتر افراد کا ماخذ ''اختر شہنشاہی'' مطبوعہ 1888ء ہی ہے جہاں نہایت ہی مختصر اطلاع ملتی ہے جس کی نقل یا نقل در نقل سے اکثر محققین نے اپنے چراغ جلائے ہیں۔ ''اختر شہنشاہی'' میں ''نورالانوار'' کے بارے میں لکھا ہے: ''نورالانوار: آرہ ضلع شاہ آباد محلہ پھاٹک سادات بلگرام، مالک سیّد محمد ہاشم بلگرامی اثنا عشری مہتمم سیّد خورشید احمد اثنا عشری اجرا جولائی 1853'' (اختر شہنشاہی، ص:275)۔ یہاں یہ بھی معلومات حاصل نہیں ہو پاتیں کہ یہ اخبار کس نقطۂ نظر کا تھا اور اس کا مزاج کیا تھا یا اس کے مشتملات کی نوعیت کیا تھی؟ کسی لائبریری یا ذخیرۂ دستاویز میں اب تک اس کا کوئی شمارہ کسی محقق کو ہاتھ نہیں لگا جس کی وجہ سے خطۂ بہار میں اردو صحافت کی پہلی کڑی اب بھی معلومات کے اعتبار سے تقریباً گم شدہ ہی ہے اور ہم ''نورالانوار'' کے نام سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔

صوبۂ بہار سے دوسرا اردو اخبار ''پٹنہ ہرکارہ'' تین شعبان 1271ھ بمطابق 21 اپریل 1855 کو شائع ہوا۔ یہ مہینے میں تین بار انگریزی کی پہلی، گیارھویں اور اکیسویں تاریخوں کو شائع کیا جاتا تھا۔ اس اخبار کے مالک شاہ ابوتراب تھے جو پریس کے بھی مالک تھے۔ ایڈیٹر کا نام تو کہیں شائع نہیں ہوتا تھا لیکن سیّد مظفر اقبال نے یہ قیاس کیا ہے کہ شاہ ابوتراب ہی اس کے ایڈیٹر تھے۔ 1855 کے 21 اپریل، یکم مئی، 21 مئی، یکم جون، گیارہ جون اور 21 جون کے شمارے خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں موجود ہیں۔ مظفر اقبال کی اطلاع یہ ہے کہ یہ اخبار یکم مارچ 1856 تک نکلتا رہا۔ 12 صفحات کے اس اخبار میں دو کالم ہوتے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور انگریزی حکومت کی طرف داری میں یہ اخبار سرگرم معلوم ہوتا ہے۔ عیسائیت کی تبلیغ کے امور کی مخالفت میں اس اخبار میں مضامین شائع ہوئے ہیں۔ اس اخبار میں معاصر اخبارات سے خبریں اخذ کرنے کا خاص اہتمام ہے۔ کچھ خبریں اپنے مخصوص نمائندوں کی بھی شائع ہوتی تھیں۔ اس اخبار نے اپنے نمائندوں کو مخبر نام سے یاد کیا ہے جو موجودہ مذاق کے اعتبار سے ایک علاحدہ مفہوم کا لفظ ہے اور

عام طور سے منفی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ''پٹنہ ہرکارا'' نے اپنی پالیسی کچھ اس طرح سے پیش کی تھی:

(i) ''جو خبر مثل ہجو کسی شخص کے جس میں تذلیل وہ تحقیر کسی کی ہو، ہرگز طبع نہ ہوگی۔ برخلاف اس کے کہ جو خبر ایسی صحیح کہ وقوع اس واقع کا بلا تشکیل وتمہید ہو، ہر چند وہ محمول ہو او پر قدح یا مدح کے، چارونا چار طبع ہونا اُس کا ضرور ہوگا۔''

(ii) اسی سبب سے حرماں متوسطین مخوف رہے کہ حاکم، اخبار نویس سے پوچھ بیٹھے کہ یہ خبر تم کو کہاں سے ملی جو مندرج اخبار کیا تو اُس وقت ایسا نہ ہو کہ حاکم تصور کریں ہم بچہ شتر یت (؟) وحالاں کہ یہ تصور مخبر کا غلط ہے کیوں کہ جو واقعہ صحیح و بلا تمہید نسبتِ رعایا یا حکام کے ہو، اس کے لکھنے میں کچھ قباحت نہیں ہے مگر ہم کو وہ بات نہیں لکھنا چاہیے جس میں کسی طرح کا نقصان سرکار یا ملک کے حاکم کے برخلاف وقوع کی ہو۔'' (پٹنہ ہرکارا: 21 جون 1855)

اُس وقت کی عام روش کے اعتبار سے یہ پالیسی کچھ زیادہ قابلِ اعتراض نہیں ہے کیونکہ اُس زمانے میں اخباروں کا خاص کام حکومت کی خبروں اور خاص طور پر سرکاری احکامات کی تشہیر تسلیم کیا جاتا تھا۔ قاضی عبدالودود نے اس اخبار کے 14 شماروں کی تلخیص اپنے مضمون مطبوعہ معاصر (عہد جدید حصہ 15) میں پیش کی ہے۔ خبروں کے جو نمونے سامنے آئے ہیں، اُن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس اخبار میں پورے ملک کی خبریں شائع ہوتی تھیں اور مختلف سماجی، سیاسی اور ادبی امور زیرِ بحث رہتے تھے۔ یہ اخبار ٹھیک غدر سے پہلے کی واقعی صورتِ حال کیا تھی، اسے جاننے کے لیے بھی اہم ذریعہ ہے۔

''اختر شہنشاہی'' سے بہار کے تیسرے اخبار ''ویکلی رپورٹ'' گیا کے بارے میں یہ اطلاع ملتی ہے کہ یہ اخبار یکم مئی 1856 کو شروع ہوا تھا۔ اس کی مدت ماہانہ تھی اور 24 اوراق پر مشتمل تھا۔ اس کے مالک جے۔ جے۔ رام تھے۔ ''اختر شہنشاہی'' کی اطلاع کو ہی بنیاد بنا کر عتیق صدیقی اور سید مظفر اقبال نے اپنی کتاب میں اس اخبار کا تذکرہ کیا ہے۔ سید احمد قادری (اردو صحافت بہار میں 2003) نے گیا ضلع کی مختلف لائبریریوں میں اس اخبار کی تلاش کی کوشش

کی لیکن کامیابی نہیں ملی۔ اس اخبار کے اقتباسات یا یادداشتیں بھی کہیں دستیاب نہیں جس کی وجہ سے اس کے طرز تحریر اور صحافتی معیار پر گفتگو کی جا سکے۔

شاہ ابو تراب کے مطبع سے لالہ بندا پرساد حسرتی کی ادارت میں یکم ستمبر 1856 کو ''اخبار بہار'' جاری ہوا۔ اس کے کاتب کا نام فتح بہادر تھا۔ اس کے بیشتر شمارے 8 صفحات پر مشتمل ہیں مگر چند شماروں میں 10 سے لے کر 14 صفحات تک ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ ''پٹنہ ہرکارا'' کی طرح ہی یہ اخبار بھی مہینے میں 3 بار یکم، گیارھویں اور اکیسویں تاریخ کو شائع ہوتا تھا۔ 1856 اور 1857 کے 33 شمارے منیر شریف کی خانقاہ میں محفوظ تھے جن کے مطالعے کے بعد سید مظفر اقبال نے یہ مشاہدہ درج کیا: ''پٹنہ ہرکارا کی طرح یہ اخبار بھی کمپنی کی حکومت کا خیر خواہ تھا۔''

بہار کے قدیم اخبارات میں ''عظیم الاخبار'' پٹنہ بھی خاص اہمیت کا حامل ہے کیونکہ غدر کے فوراً بعد جولائی 1859 مطابق 1275ھ میں یہ شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کی اشاعت عبدالجلیل اور سید محمد اسماعیل کے پریس سے ہوئی۔ مظفر اقبال نے 4 ستمبر 1859 سے 5 مئی 1860 کے درمیان کے 16 شمارے ملاحظہ کیے تھے اور اس پر اپنی کتاب میں تاثرات درج کیے ہیں۔ اس اخبار کے زیادہ تر شمارے 12 صفحات پر مشتمل ہیں۔ یہ ہفتہ وار اخبار تھا اور اتوار کو شائع ہوتا تھا۔ غدر کے بعد بہار سے شائع ہونے والا یہ پہلا اخبار تھا۔ اس کے بارے میں مظفر اقبال نے مزید تفصیلات یوں پیش کی ہیں:

> ''اس اخبار میں زیادہ تر قوانین وضوابط عدالت اور مختلف دیار و امصار کی خبریں درج ہوتی تھیں۔ یہ خبریں ہم عصر اخبارات سے نقل کی جاتی تھیں اور ان کا حوالہ بھی دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اخبار کے نامہ نگار بھی تھے اور ان کی بھیجی ہوئی خبریں بھی چھپتی تھیں۔ خبروں کے علاوہ اخبار میں مختلف موضوعات پر مضامین بھی چھپتے تھے۔''

(سید مظفر اقبال: بہار میں اردو صحافت کا ارتقا، ص:147)

بہار کے قدیم اخبارات میں ''اخبار الاخیار'' مظفر پور کی واضح اہمیت تسلیم کی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ اخبار سرسید کی تحریک سے متعلق تھا اور اس کا ایک قومی تناظر دکھائی دیتا ہے۔ 15 ستمبر

1868 کو مطبع چشمۂ نور، مظفر پور سے یہ جاری ہوا تھا۔ عام طور پر ہر شمارے میں 16 صفحات شامل ہوتے تھے۔ یہ اخبار 15 روزہ تھا اور اس کے صفحات بائیں سے دائیں جانب لکھے جاتے تھے۔ اس سلسلے سے اخبار میں کسی نے سوال کیا تو جواب میں ایڈیٹر نے 15 اپریل 1869 کے شمارے میں یہ وضاحت کی کہ جلد ہی اس اخبار کو انگریزی میں بھی شائع کیا جائے گا۔ اس لیے پہلے سے ہی اس کے صفحات بائیں سے دائیں جانب کھلیں گے۔ اس کے پہلے ایڈیٹر بابو اجودھیا پرشاد منیری تھے۔ آغاز سے 15 ستمبر 1870 تک کے شمارے میں اجودھیا پرشاد کا ہی نام ملتا ہے۔ یکم ستمبر 1870 سے دسمبر 1870 تک جو شمارے ملے، ان پر ایڈیٹر کی حیثیت سے منشی قربان علی خاں صاحب کا نام درج ہے۔

سرورق پر ہی اس اخبار میں یہ درج ہوتا تھا کہ یہ صوبۂ بہار کی سائنٹفک سوسائٹی کا ترجمان ہے۔ 15 جون 1869 کے شمارے میں سائنٹفک سوسائٹی کی سالانہ روداد کی اشاعت سے اس کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے جس کا درج ذیل حصہ تحقیقی جہت سے نہایت کارآمد ہے:

> ''پانچواں منشا اس سوسائٹی کا یہ ہے، بملاحظہ اخبار انگلستان و ہندوستان اور دیگر ممالک و اقالیم کے ایک اخبار جو واسطے ترقی فہم و فراست اہل ہند کے کافی ہو اور جس سے روز بروز اتحاد و محبت فی مابین رعایہ اور گورنمنٹ کے زیادہ ہو، چھاپ کر مشتہر کیا جاوے۔ تاریخ 15 ستمبر 1868 ایک اخبار باسم ''اخبار الاخیار'' اسی صنعت کا مہینے میں دو بار اس سوسائٹی سے نکلتا ہے۔''

اس اخبار کے سلسلے سے قاضی عبدالودود نے دو مضامین 'فکر و نظر، علی گڑھ اور 'مجلس' حیدرآباد میں 1960 میں شائع کرائے تھے۔ ان مضامین میں اس اخبار سے متعلق بے حد اہم اقتباسات درج ہوئے ہیں۔ غالب کی وفات پر یکم جون 1869 کے شمارے میں شاہ محمد یحییٰ ابوالعلائی کا قطعۂ تاریخ شائع ہوا ہے۔ مرزا رجب علی بیگ سرور کی وفات کے سلسلے سے اسی شمارے میں جو خبر شائع ہوئی، وہ کچھ یوں ہے:

> ''مرزا رجب علی بیگ سرور کی وفات سے نہایت رنج ہوا۔ مرزا صاحب

مہاراجہ بنارس کے پاس نوکر تھے اور اس زمانے میں بڑے نامی گرامی شعرائے اردو میں شمار کیے جاتے تھے، جن کی کتاب ''فسانۂ عجائب'' بھی اردو میں شہرۂ آفاق ہے۔''

اس اخبار کے 15 جولائی 1869 کے شمارے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس سال انڈین سول سروس میں چار امیدوار کامیاب ہوئے۔ ان کے نام بھی اخبار میں شائع ہوئے ہیں: رمیش چندر دت، بہاری لال گپتا، سریندر ناتھ بنرجی، شری پد باباجی ٹھاکر۔ انگریزی اخبار پائنیر کے حوالے سے 15 جولائی 1869 کے شمارے میں اس اخبار نے لکھا ہے کہ ''وہابیوں سے جیل خانہ آباد ہوتا جارہا ہے''۔ اسی طرح شمارہ بابت 25 اکتوبر 1869 میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ ''ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر اس امر پر مامور ہوئے تھے کہ ایک کتاب تالیف کریں جس میں..... مشہور و شریف خاندان ہائے اہل اسلام کا احوال بخوبی بیان کیا جائے''۔ 15 اکتوبر کے شمارے میں ایک خبر شائع ہوئی: ''بمبئی میں ایک نیا مذہب معراج پنتھ جاری ہوا۔ ہندو اور مسلمان مت دونوں کی شرکت سے اور معتقدین اس کے شری کرشن جی کو بھی مانتے ہیں اور حضرت محمد کو بھی''۔

''اخبار الاخیار'' چونکہ سائنٹفک سوسائٹی، صوبۂ بہار کا ترجمان تھا، اس لیے اس اخبار کے مشمولات میں سرسید احمد خاں کے امور زیر بحث نہ آئیں، یہ کیسے ممکن تھا؟ قاضی عبدالودود نے اپنے مضمون (اخبار الاخیار، مظفر پور اور سید احمد خاں) میں ایسے اہم نوشتہ جات جمع کرنے کی کوشش کی ہے جس سے سرسید، سائنٹفک سوسائٹی اور دیگر متعلقات واضح ہو جائیں۔ ''اخبار الاخیار'' کی اشاعت کا یہ وہی زمانہ ہے جب سرسید احمد خاں ہندوستان سے انگلینڈ گئے اور پھر واپس ہوئے۔ اس اعتبار سے اس اخبار کے بعض مندرجات قومی اور سماجی معاملات میں ہمیں نئے سرے سے تجزیہ کرنے کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ 15 جولائی 1869 کے شمارے میں سرسید کو حکومتِ برطانیہ کی طرف سے کے ایس آئی کا اعزاز ملنے پر مبارک باد دی گئی ہے اور پھر ولایت کے سفر کے اسباب و علل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

انیسویں صدی کے اخبارات میں بہار سے نکلنے والے ''انڈین کرانیکل'' کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ ہفتہ وار اخبار تھا اور 16 صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ ہر سوموار کو یہ شائع

ہوتا تھا۔ اس کے اوّلین ایڈیٹر منشی رحمت اللہ تھے۔ کچھ زمانے تک یہ ہفتے میں دو بار بھی شائع ہوتا تھا۔ 1885 میں اس کا نام ''اردو انڈین کرانیکل'' ہوا اور اس کے ایڈیٹر عبدالغنی استھانوی ہو گئے تھے۔ اس دوران یہ اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی شائع ہونے لگا تھا۔ 26 فروری 1886 کے بعد کچھ دنوں کے لیے یہ اخبار بند ہو گیا اور پھر ''اردو بہار ہرلڈ و انڈین کرانیکل'' کے بدلے ہوئے نام سے جاری ہوا اور پیر کی جگہ اس کی اشاعت کا دن ہفتہ مقرر ہوا۔ اس اخبار کے مالک پٹنہ کے مشہور بنگالی وکیل بابو گرو پرساد ہوئے۔ یہ آخری طور پر کب بند ہوا، اس کی اطلاع کسی محقق کے پاس نہیں ہے۔

رسالہ معاصر، پٹنہ کے حصہ تین بابت ماہ دسمبر 1959 میں قاضی عبدالودود نے اس اخبار کے متعدد شماروں کا بتفصیل تعارف کرایا تھا۔ معاصر کے حصہ پانچ میں 'اردو بہار ہرلڈ و انڈین کرانیکل' کے چند شماروں کا تعارف قاضی عبدالودود نے اپنے ایک دوسرے مضمون میں کرایا۔ یہ دونوں مضامین رسالہ معاصر کی تقطیع کے اعتبار سے 99 صفحات پر مشتمل ہیں جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ قاضی عبدالودود نے 1884، 1885، 1886 اور 1887 کی اشاعتوں کی معقول تلخیص اپنے اس مضمون میں پیش کر دی ہوگی۔

اس اخبار کے ایڈیٹر کا نام شائع نہیں ہوتا تھا لیکن 13 اپریل 1885 کے شمارے میں اخبار کے مدیر کی ترجمہ شدہ ایک کتاب کا اشتہار چھپا ہے جس میں مدیر اور مترجم کا نام سید عبدالغنی درج ہے۔ قاضی عبدالودود نے یہ بھی قیاس کیا ہے کہ دسمبر 1884 میں شاد عظیم آبادی کی تصنیف ''نوائے وطن'' پر جو تفصیلی تبصرہ شائع ہوا ہے، وہ بھی سید عبدالغنی کا ہی لکھا ہوا ہے۔ قاضی صاحب کا اندازہ ہے کہ ''یہ غالباً وہی بزرگ ہیں جو استھاواں ضلع پٹنہ کے رہنے والے تھے اور بعد کو ریاست حیدرآباد میں ملازم ہو گئے تھے۔ قاضی عبدالودود نے اس اخبار کے مشمولات کی تعریف کی ہے اور اسے صحافت کے معیار پر تولنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خیال ہے:

> ''کرانیکل خبریں بھی دیتا تھا اور جمہور کے خیالات کی ترجمانی اور رہنمائی بھی کرتا تھا۔ عموماً اہم امور کی طرف زیادہ اور غیر اہم کی طرف کم توجہ کی جاتی تھی۔ مگر خبروں کے متعلق اتنی احتیاط نہ ہوتی تھی کہ کوئی غلط بات شائع

ہی نہ ہونے پائے..... مقالات افتتاحی عموماً بصیرت افروز ہوا کرتے تھے اور بڑی بیباکی سے لکھے جاتے تھے۔ میرے نزدیک اس زمانے کے اردو اخباروں میں شاید ہی کسی کے مقالات افتتاحی کرانیکل کے مقالات افتتاحی کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور ان میں متعدد ایسے ہیں کہ اس زمانے میں بھی کسی کے قلم سے نکلیں تو مستحق تحسین قرار پائیں۔ اس اخبار کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ ہندو مسلمان دونوں کا اخبار تھا۔''

اس اخبار نے صحافت اور صحافیوں کے معیار اور مزاج کے بارے میں بھی گفتگو کی۔ 2 مارچ 1885 کے اخبار میں دیسی اخباروں کے بارے میں لفٹیننٹ گورنر، بنگال کی رپورٹ کا تجزیہ کرتے ہوئے مدیر نے دیسی اخباروں کے سلسلے سے سرکار کی لعنت وملامت پر اختلاف درج کرایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انگریزی اور دیسی اخبارات حکومت کے کاموں کے احتساب میں ایک جیسی زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ اس حالت میں صرف دیسی اخباروں کو نشانہ بنانا درست نہیں۔ قاضی عبدالودود نے اس اخبار کے مدیر کے نقطۂ نظر کو پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مدیر کرانیکل کے نزدیک ایڈیٹر کو اعلیٰ اخلاقی صفات کا حامل ہونا چاہیے..... اس کا خیال تھا کہ آزاد اخبار نویسی خطرے سے خالی نہ تھی، اس لیے کہ حکومت نکتہ چینی کو پسند نہیں کرتی۔''

اخبار ''رفیق ہند'' کے مقدمے کے سلسلے سے، جس میں اخبار کے مدیر محرم علی چشتی کو ایک ماہ کی سزا ہوئی تھی، 13 اپریل 1885 کے کرانیکل میں مدیر نے بہت صفائی سے اپنی بات رکھی ہے جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ''اردو کرانیکل'' کیسا سلیقہ شعار اور ہوش مند اخبار تھا۔

''اردو انڈین کرانیکل'' کے 19 جنوری 1884 کے شمارے میں ہندوستان کی نوکر شاہی [illegible] خاصی تنقیدی ''گفتگو کی گئی ہے۔ سول سروس کے عہدے داران کے مزاج پر اس [illegible] ایک احتسابی رویہ قائم کر رکھا ہے۔ یکم جون 1884 کے کرانیکل میں سول سروس کے افراد [illegible] اور ان کی تنخواہوں سے اس کا موازنہ کرتے ہوئے پھر ایک تنقیدی خبر شائع کی گئی تھی۔ یہ

اخبار معاملات کو غور و فکر کے ساتھ پیش کرتا تھا۔ 10 راگست 1884 کی ایک خبر اور جس میں انگریز حاکم کی جانب سے ہندوستانیوں کے بارے میں نامناسب الفاظ استعمال کرنے کا تنازعہ سامنے آتا ہے۔ اس کے مطالعے سے اخبار کے خبر نویس کی سوجھ بوجھ اور صحیح تناظر میں واقعات کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت ظاہر ہوتی ہے۔ اصل اقتباس ملاحظہ ہو:

''سول سروس کے ایک لائق ممبر لیڈ مین کی عادت تھی کہ اُن کی عدالت میں جو ..... دادخواہ ہوا کرتے تو ان سے نہایت مہربانی کے ساتھ لفظ بدمعاش، سور، حرام زادہ وغیرہ سے خطاب فرمایا کرتے ..... کپتان ہیرسے کو ایسے غیر مہذبانہ الفاظ چند مقتدر دیسیوں کے حق میں استعمال کرتے دیکھ کر رنج ہوا، اور انھوں نے ..... گورنمنٹ ..... کو اطلاع دی۔ سر الفرڈ لائل صاحب نے یہ سمجھ کر کہ سول سروس کے ممبر پر ایسے سخت الزام لگانا نہایت معیوب ہے، حکم دیا کہ کپتان پر ہتک عزت کی نالش کریں ..... مگر ..... کپتان نے ثابت کر دیا کہ مسٹر لیڈ مین فی الواقع الفاظ کا استعمال کرتے ہیں اور مقدمہ خارج ہو گیا۔ ہم کپتان ..... کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں ..... دیکھا چاہیے کہ اب گورنمنٹ مسٹر لیڈ مین سے کیا برتاؤ کرتی ہے۔ اگر وہ ..... دیسی ہوتے تو ہم کہہ سکتے کہ گورنمنٹ ..... کیا ..... کرے گی۔''

22 جنوری 1887 کے شمارے میں ایک طویل مراسلہ ہندو مسلمانوں کے سلسلے سے بعض انگریزوں یا طرف داران انگریز کے خیالات سے شدید اختلاف کرتے ہوئے شائع کیا گیا ہے۔ اس میں سید احمد خاں کے اُس نقطۂ نظر سے بھی اختلاف کیا گیا ہے جو بالآخر دو قومی نظریے کی شکل میں آدھی صدی کے بعد اُبھر کر سامنے آیا۔ اخبار نے لکھا:

''اس سے بڑھ کر کوئی جھوٹ نہیں ہے کہ ہندو اور مسلمانوں میں عداوت اس سے بڑھ کر ہے جو انگلستان میں متفرق مذہبوں میں نظر آتی ہے، ہوگی یا ہو سکے گی۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ دس میں نو ہندو مسلمانوں میں کوئی

عداوت نہیں ہے، گو یہ..... چھوٹا سا فرقہ..... ہر ایک کوشش اس کے پیدا کرنے کی کر رہا ہے..... پھر یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ ایک پارلیمنٹ میں سب ہندو ایک جانب ہوں گے اور مسلمان ایک جانب..... میں ایڈیٹر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سے عرض کرتا ہوں کہ وہ لکھ رکھے کہ، نہ تو کسی شخص نے اب تک تجویز کی اور نہ خیال کیا اور نہ جہاں تک مجھ کو واقفیت ہے ہندوستان میں پارلیمنٹری گورنمنٹ کا ذکر کیا ہے۔''

19 ویں صدی کے آخر میں نکلنے والے اُردو اخبارات جو بہار سے شائع ہوئے، اُن میں ''الپنچ'' کی واضح اہمیت ہے۔ یہ اخبار 5 فروری 1885 کو پٹنہ سے نکلنا شروع ہوا اور تھوڑے سے تعطل کے ساتھ 1907 تک شائع ہوتا رہا۔ 1890 سے لے کر 1907 تک کے متعدد شمارے اور اخبار کی فائلیں خدا بخش لائبریری میں بہت حد تک محفوظ ہیں۔ اس کے مالکان اور ایڈیٹر بدلتے رہے اور پریس میں بھی تبدیلی ہوتی رہی۔ تعداد صفحات بھی مختلف اوقات میں چھ، آٹھ، دس اور بارہ ملتی ہے۔

''اودھ پنچ'' کو نگاہ میں رکھ کر ہی یہ اخبار اس عجیب و غریب نام سے نکلنا شروع ہوا ہوگا، اس لیے اس اخبار کی دو باتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس کی عمومی پالیسی میں حب الوطنی اور انگریزی حکومت کی نکتہ چینی شامل تھی۔ اسی کے ساتھ اس اخبار کے بیشتر مشمولات کا اسلوب ظریفانہ ہوتا تھا۔ اس اخبار نے بڑی تعداد میں لکھنے والوں کو متوجہ کیا اور بعض اہل قلم بہت تواتر کے ساتھ یہاں شائع ہوتے تھے۔ اس میں ادبی حصہ بھی اچھا خاصا شامل ہوتا تھا۔ اُس زمانے کے شعرا میں صوفی منیری، اکبر داناپوری، فضلِ حق آزاد، نسیم بلسوی اور عبدالغفور شہباز عظیم آبادی کا کلام اور دیگر تخلیقات کی لگاتار اشاعت ہوتی تھی۔ اس کی زبان اور انداز تحریر کی ایک جھلک 4 فروری 1898 کے شمارے سے ملاحظہ ہو:

''انگلش مین کا نامہ نگار بھی نرا گھامڑ رہا۔ جو دل میں آتا ہے، اُوٹ پٹانگ لکھ مارتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ ڈمراؤں کے آس پاس کے باشندے سورج گرہن کو انگریزی اقبال کے زوال کی نشانی سمجھتے ہیں۔

سبحان اللہ بھلا ہندیوں کا یہ دماغ کہاں کہ ایسی پولیٹکل چٹکیاں لیں۔ ہاں یہ انگریزی سانچے کے ڈھلے ہوئے خیالات البتہ ہو سکتے ہیں۔ ہندوستانیوں کے دماغ میں تو یہ بات گھسی ہوئی ہے کہ ہندوستان ہی میں کامل کسوف ہوا ہے۔ اس لیے ہندوستانیوں کا رہا سہا اقبال آفتاب کی طرح غروب ہو گیا اور انگریزی اقبال کا کیا پوچھنا، اس کی عملداری میں تو آفتاب سرے سے غروب ہی نہیں ہوتا۔ آفتاب دولت و اقبال درخشاں باد۔"

قاضی عبدالودود نے 1902 اور 1903 کے بعض شماروں کا تعارف کراتے ہوئے "معاصر" پٹنہ اور "چراغ راہ" کلکتہ میں دو مضامین شائع کیے تھے جن میں اس اخبار کے اصل اقتباسات موجود ہیں۔ "اردو انڈین کرانیکل" کے حوالے سے قاضی عبدالودود نے وہ عبارت بھی نقل کی ہے جس سے "الیچ" اخبار کی ابتدائی حالت کے بارے میں واضح معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ 2 فروری 1885 کے "اردو انڈین کرانیکل" میں یہ اطلاع شائع ہوئی:

"اس ہفتے میں ایک اور ظریف اخبار "الیچ" کی آمد آمد ہے۔ اشتہار سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی بطور آزمائش چار مہینے کے لیے جاری ہوا ہے۔ مہتمم منشی محمد اعظم ہیں"۔

"الیچ" کے بارے میں یہ بات اکثر و بیشتر کہی جاتی ہے کہ اس اخبار میں شاد عظیم آبادی کے سلسلے سے لگاتار مخالفانہ مضامین، شعری تخلیقات اور طنزیہ شذرات شائع ہوتے رہے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ منشی محمد اعظم، جو اس کے مالک و مختار تھے، اُن سے ناول "صورۃ الخیال" کے سلسلے سے شاد عظیم آبادی سے معرکہ تھا۔ منشی محمد اعظم اور منشی حسن علی (مدیر بہار بندھو۔ ہندی اخبار) نے شاد پر یہ الزام عائد کیا تھا کہ ان دونوں کی مشترکہ کوششوں کو شاد نے اپنے نام سے شائع کرا لیا۔ اس وجہ سے یہ بات غیر فطری معلوم نہیں ہوتی کہ یہ اخبار شاد کی غیر ضروری طور پر بھی مخالفت کرے۔ شاد کی "نوائے وطن" کے سلسلے سے بھی 19 ویں صدی کے آخر میں بعض افراد خفا تھے۔ ان وجوہات سے شاد کی بعض حلقوں میں مخالفت سمجھ میں آتی ہے۔ اس سلسلے میں قاضی

عبدالودود کا کہنا ہے کہ ''1902 میں یا اس سے بھی پیشتر 'الپنچ' اور شاد میں صلح ہو چکی تھی۔'' 2 راگست 1902 کے شمارے میں اس وقت کے مدیر سید رحیم الدین مہجور کی وفات پر شاد کے قطعات تاریخ شائع ہوئے تھے۔ یکم نومبر 1902 کے شمارے میں عظیم آباد کے یادگار مشاعرے کے سلسلے سے جو مراسلے شائع ہوئے ہیں، ان میں شاد کی استادانہ اہمیت ظاہر کی گئی ہے۔ قاضی عبدالودود نے اس اخبار کے بارے میں اپنے اجمالی تاثرات اس طرح رقم کیے ہیں:

> آج کل جو اردو کے اخبار بہار میں جاری ہیں، اُن کی عمر کیا ہوگی، اس بارے میں کچھ کہنا ممکن نہیں۔ مگر یہ مسلّم ہے کہ جو اخبارات اب زندہ نہیں ہیں، ان میں سب سے پہلے طویل عمر ''الپنچ'' نے پائی۔ ''الپنچ'' جیسا کہ اُس کے نام سے ظاہر ہے، ظریفانہ اخبار تھا، لیکن اس کی ظرافت کا پایہ بلند نہ تھا اور یہ بے تکلف ذاتی حملے سوقیانہ انداز میں کیا کرتا تھا۔''
>
> (چند اہم اخبارات اور رسائل، ص:199)

بہار کی اردو صحافت 'الپنچ' کے ساتھ ہی 20ویں صدی میں داخل ہوتی ہے۔ 1910 کے پریس ایکٹ کے سبب ہندوستان کے دوسرے اخبارات کی طرح بہار کے اردو اخبارات بھی مشکل دور میں پہنچ گئے۔ بڑی تعداد میں اخبارات و رسائل بند ہوئے اور صحافیوں نے حکومت کے سامنے سپر ڈال دی۔ اس دوران بہار شریف سے 1912 میں ''اتحاد'' نام سے ایک اخبار جاری ہوا۔ اس کے بانی مدیر شیخ نور محمد تھے۔ ابتدائی عہد میں یہ ہفتہ وار تھا۔ حکومت مخالف رویّے کی وجہ سے اخبار کی ضمانت ضبط ہوئی اور پھر جناب شفیع داؤدی کی کوششوں سے اس کا دفتر بہار شریف سے پٹنہ منتقل ہوا۔ اس اخبار سے عبدالجبار حیدری، پروفیسر اسماعیل وحشی، راغب احمد وغیرہ بطور مدیر اور معاون مدیر وابستہ تھے لیکن 1935 سے 1951 کے دوران تقریباً 16 برس تک اس اخبار کے مدیر سلطان احمد تھے۔ اس اخبار نے بہار میں اپنی خاص جگہ بنالی۔ ڈاکٹر عبدالخالق نے 'مقالاتِ سلطان احمد' ترتیب دے کر شائع کر دیا جس میں ''اتحاد'' کے وہ اہم مضامین جو ایڈیٹر سلطان احمد کے قلم سے نکلے، یکجا ہو گئے۔ ''اتحاد'' کے مزاج کو سمجھنے کے لیے مدیر سلطان احمد کی ایک تحریر کافی ہے:

> ''1942 کے ابتدائی ایام تھے۔ گاندھی جی نے ''بھارت چھوڑو'' کا نعرہ

بلند کیا اور سارے ملک میں ہنگاموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ کانگریسی کارکنوں نے ہند کا چپہ چپہ چھان ڈالا۔ قومی اخبارات نے پورا تعاون کیا۔ پُر جوش مضامین و مقالوں کی بھرمار ہوئی۔ خبروں کی وہ اودھم مچی کہ داستانوں کا مزا جاتا رہا۔ اس وقت اردو صحافت کا نمائندہ بہار کا کثیر الاشاعت اخبار ''اتحاد'' تھا۔ اخبار عوام کی رہنمائی کرتے ہیں اور ترجمانی بھی۔ ''اتحاد'' اس تحریک سے وابستہ ہوگیا۔ پھر کیا تھا، ہر جگہ سفر و حضر میں اسی کا ذکر تھا، نئی نئی خبروں، پُر زور مقالوں اور مسلسل مضامین نے قوم میں زندگی و حرکت کی لہریں دوڑا دیں۔ چنانچہ تحریک پروان چڑھی، ملک کو آزادی ملی۔''

آزادی سے قبل ''دیہات'' نام سے ایک اخبار جنوری 1940 میں شروع ہوا۔ یہ حکومتِ بہار کا ترجمان تھا اور اس کا مطمحِ نظر یہ تھا کہ دیہاتی حلقے میں رہنے والے لوگوں سے دنیا جہان کی خبروں کو متعارف کرانا ضروری ہے۔ برقی پریس، سبزی باغ، بانکی پور، پٹنہ سے یہ اخبار شائع ہوتا تھا۔ حکومتِ بہار اسے مفت تقسیم کرتی تھی۔ یہ اخبار کمپنی حکومت کے لیے اپنی خاص باتیں دیہی عوام تک پہنچانے کے مقصد سے ایک پلیٹ فارم تھا۔ اس اخبار میں دوسری جنگِ عظیم کے سلسلے سے خبروں کی بہتات ہے۔ بہار میں ریڈیو اسٹیشن کے آغاز کے سلسلے میں 19 مارچ 1940 کے شمارے میں یہ اطلاع شائع ہوئی ہے:

''بہاری اس خبر کو بڑی خوشی سے سنیں گے کہ عنقریب پٹنہ میں ایک ریڈیو اسٹیشن کھلنے والا ہے۔ عرصے سے یہ تجویز تھی لیکن اب اس سلسلے میں انتظامی کارروائیاں بھی شروع ہوگئی ہیں۔ وہ دن دور نہیں جبکہ بہار کا صدر مقام بہار کی آبادی سے قریب تر ہو جائے گا۔''

پندرہ روزہ ''روشنی'' اس اعتبار سے ایک تجرباتی اخبار تھا کیونکہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ایک ساتھ شائع ہوتا تھا۔ ماس لٹریسی کمیٹی کے زیرِ اہتمام اس کی اشاعت ہوتی تھی اور اس کے چیف ایڈیٹر عبدالسنان اور مدیران میں دھرمیندر برہمچاری شاستری، سیّد حسن اور رگھونندن

پرساد سنہا شامل تھے۔ یکم اپریل 1940 سے دسمبر 1941 تک کے شمارے کتب خانے میں دستیاب ہیں۔ یہ اخبار بھی ''دیہات'' کی طرح ہی حکومت کا طرف دار تھا۔ اس کے صفحات سے دوسری جنگِ عظیم کی بعض توجہ طلب تفصیلات معلوم ہوتی ہیں۔

آزادی کے آس پاس روزناموں کی بابت غور کریں تو 9 ستمبر 1942 سے شائع ہونے والا اخبار ''صدائے عام'' واضح اہمیت کا حامل ہے۔ ''صدائے عام'' تقسیم ہند سے پہلے مسلم لیگ کی حمایت میں تھا اور بعد میں وہ اخبار کانگریس کی طرف داری میں شامل ہو گیا۔ اس کے اوّلین ایڈیٹر سید نظر حیدر تھے۔ بعد میں سید رضی حیدر نے ادارت کی ذمّے داری سنبھالی اور محمد مرغوب اور شبیر احمد کارکن صحافی کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ''صدائے عام'' کے خصوصی نمبر شائع ہوا کرتے تھے اور اُن کی اچھی خاصی شہرت بھی رہی لیکن تکنیکی ترقی میں یہ اخبار دوسرے اخباروں کی طرح وقت کی گرد بن گیا۔ کانگریس رہنما عبدالقیوم انصاری کے ایما سے معروف افسانہ نگار سہیل عظیم آبادی نے اپریل 1949 میں روزنامہ ''ساتھی'' شائع کیا۔ بعد میں غلام سرور، ولایت علی اصلاحی، نور محمد، خالد رشید صبا، حق ندوی اور شاہد رام نگری اس اخبار سے متعلق ہوئے۔ ''صدائے عام'' کی طرح ''ساتھی'' کے بھی خصوصی نمبر علمی حلقوں میں توجہ کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔ ابتدا میں یہ اخبار متوازن تھا لیکن بعد میں یہ کانگریس حکومت کی ہم نوائی میں گرفتار ہو گیا۔ رفتہ رفتہ یہ اخبار بھی وقت کی تحویل میں سما گیا۔

جناب غلام سرور نے ہفتہ وار کی شکل میں ''منگم'' اخبار نکالا جو بعد میں 1962 سے روزنامہ کی شکل میں شائع ہونے لگا۔ اس اخبار کے صحافیوں میں جناب صدیقی، شاہ مشتاق احمد، سید شہباز حسین (جو بعد میں رسالہ 'آجکل' کے ایڈیٹر ہوئے)، شاہد رام نگری، عبدالمغنی اور معین انصاری جیسے افراد شامل تھے۔ اس اخبار میں غلام سرور نے اپنی صحافتی تحریروں سے ایک بڑے حلقے کو متاثر کیا۔ وہ صحافی کے ساتھ ساتھ سیاست داں بھی ہوئے لیکن قلم پیشگی کو انھوں نے ایک عرصے تک نہیں چھوڑا۔ اس وجہ سے آزادی کے بعد اُبھرنے والے اردو صحافیوں میں وہ سب سے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ دوسرے اخباروں کی طرح صرف نام کے مدیر نہیں تھے بلکہ ملک اور صوبے کی سیاست اور سماجی صورتِ حال پر وہ اپنی واضح رائے دینے میں کوئی عار نہیں محسوس کرتے

تھے۔ سیاست میں اُن کی مشغولیت نے اخبار کی طرف سے توجہ کم کی اور آٹھویں دہائی سے یہ اخبار اپنی کشش کھونے لگا۔

پندرہ روزہ کے طور پر دربھنگہ سے ''قومی تنظیم'' کا آغاز ہوا۔ اس کے بانی ایڈیٹر سید محمد عمر فرید تھے۔ 1965 میں یہ عظیم آباد منتقل ہو گیا اور 1975 تک ہفت روزہ کی شکل میں شائع ہوتا رہا۔ یہ اخبار مارچ 1975 سے روزنامہ کی صورت میں نکلنے لگا، جو اَب تک جاری ہے۔ اب اس کی ادارت سید محمد اشرف فرید اور سید محمد اجمل فرید کے ذمے ہے۔ بہار سے نکلنے والے اخبارات میں یہ پہلا اخبار ہے جس نے مختلف شہروں اور صوبوں کے علاحدہ ایڈیشن شائع کیے۔ اپریل 1981 سے قومی آواز نے پٹنہ ایڈیشن شروع کیا۔ عثمان غنی اور شاہین محسن نے اس اخبار کو صحافتی قیادت بخشی۔ جس طرح ملک گیر پیمانے پر حیات اللہ انصاری اور اُن کے ساتھیوں نے مل کر ''قومی آواز'' کی اشاعت سے ملک میں اردو صحافت کا ایک ذوق پیدا کیا تھا۔ ''قومی آواز'' نے بہار میں صحافت کی یہ نئی روشنی بہم پہنچائی۔ پچھلے تیس پینتیس برسوں میں وہ صحافی جو سوجھ بوجھ کے ساتھ بہار میں سرگرم عمل رہے ہیں، اُن میں بلاشبہ ''قومی آواز'' کے تربیت یافتہ افراد کی ایک بڑی جماعت ہے جو اخبار کے بند ہو جانے کے بعد دوسرے اخباروں سے منسلک ہو گئی۔

1974 میں رضوان احمد نے ہفتہ وار کی شکل میں ''عظیم آباد ایکسپریس'' شائع کیا۔ 1980 سے یہ روزنامہ میں تبدیل ہو گیا۔ ''عظیم آباد ایکسپریس'' اپنی سنسنی خیزی کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا۔ رضوان احمد کے اداریے غیر منطقی اندازِ فکر اور سیاسی کھیل تماشے کا حصہ بننے کی وجہ سے تذکرے میں ہوتے تھے۔ 26 فروری 1985 سے روزنامہ ''ایثار'' شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کے بانی مدیر شاہین محسن تھے اور شاہد رام نگری اس کے پرنٹر پبلشر تھے۔ 8 اپریل 1987 کو یہ اخبار بند ہو گیا۔ طباعت اور پیش کش کے اعتبار سے اُس وقت تک کے سب سے خوب صورت اخباروں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ 1974 میں ہفت روزہ ''پندار'' کا آغاز ہوا۔ جولائی 1988 سے یہ روزنامہ ہو گیا۔ 1984 میں ہفتہ وار فاروقی تنظیم شروع ہوا جو دو برسوں کے بعد روزنامہ کی شکل میں بدل گیا۔ 1992 میں اس اخبار نے رانچی سے اپنا علاحدہ ایڈیشن شروع کیا۔ فی الوقت رانچی اور پٹنہ دونوں جگہوں سے یہ اخبار شائع ہو رہا ہے۔ روزنامہ ''انقلابِ جدید'' 10 ستمبر 1995 سے شروع

ہوا لیکن تھوڑے دنوں میں ہی یہ اخبار اپنی عمومی رفتار قائم نہ رکھ سکا اور اب تو اس کی اشاعت بھی بہت معمولی ہے۔

اس دوران قومی اخبارات میں روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' نے پٹنہ سے اپنی اشاعت شروع کی۔ صحافت کے قومی معیار کے پیش نظر اس اخبار نے اپنی شناخت قائم کی لیکن توسیع اشاعت کے سلسلے سے اس اخبار نے موثر پیش رفت نہیں کی جس کی وجہ سے ایک معیاری اخبار مقبولیت کے معاملے میں وہ جگہ نہیں بنا سکا جو اس کا حق تھا۔ 27 مئی 2013 سے روزنامہ ''انقلاب'' 16 صفحات پر مشتمل مکمل رنگین اخبار کی شکل میں شائع ہونا شروع ہوا جو اپنے انداز پیش کش اور صحافت کے قومی معیار کی پاسداری کی وجہ سے مقبولیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ ملٹی سٹی ایڈیشن کے سبب ہر خطے میں اخبار کے پہنچ جانے سے بھی روزنامہ ''انقلاب'' مختصر مدت کے باوجود بہار میں کامیاب تسلیم کیا جا رہا ہے۔ اخبار کے خصوصی فیچر اور سیاسی و سماجی موضوعات پر خصوصی تبصرے شائع کرنے کی روش نے بھی اس کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔ اس اخبار میں ایڈیٹر سے لے کر عام رپورٹر تک سبھی صحافت پیشہ افراد کام کر رہے ہیں جبکہ بہار کے دوسرے اخبارات کے مدیران حقیقت میں غیر صحافی مالکان ہیں اور اکثر و بیشتر ان کے نام سے شائع شدہ تحریریں حقیقت میں ان اخباروں کے کارکن صحافیوں کی ہوتی ہیں۔

بہار کی ادبی صحافت پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو انجم مانپوری کے ''ندیم''، قاضی عبدالودود کے ''معیار''، کلیم الدین احمد کے ''معاصر'' وفا ملک پوری کے ''صبح نو'' قیوم خضر کے ''اشارہ''، کلام حیدری کے ''آہنگ''، ظفر اوگانوی کے ''اقدار''، بہار اردو اکادمی کے ''زبان و ادب'' عبدالمغنی کے ''مرغ'' اور سہیل عظیم آبادی، عبدالقیوم انصاری کے رسالہ ''تہذیب'' طارق متین کے ''علم و ادب'' اور وہاب اشرفی کے ''مباحثہ'' وغیرہ کا تذکرہ لازم ہے۔ ان رسائل میں تقریباً نصف کی حیثیت علاقائی سے زیادہ نہیں رہی۔ لیکن ان رسائل نے اپنے عہد میں قومی سطح پر لکھنے والوں کو ایک مستحکم پلیٹ فارم عطا کیا۔ ''ندیم''، ''معیار''، ''معاصر''، ''صبح نو''، ''اقدار''، ''آہنگ'' اور ''مباحثہ'' کو قومی سطح پر توجہ سے پڑھا جاتا رہا۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ ملک کے کسی بھی صوبے سے زیادہ ادبی رسائل کی فروخت بہار میں ہوتی ہے لیکن بہار میں تواتر سے نکلنے والا

ایک بھی بہترین ماہانہ ادبی رسالہ ایسا نہیں ہے جسے ملک کے نمائندہ ادبی رسائل میں شامل کیا جا سکے۔

بہار کی اردو صحافت کی ڈیڑھ صدی کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بات بھی افسوسناک ہے کہ آزادانہ طور پر بہار کے اردو صحافیوں نے اپنی قومی پہچان اس اعتبار سے قائم نہ کی جس کے لیے وہ ہر اعتبار سے موزوں تھے۔ اخبارات و رسائل کا یہ مقدر رہے کہ ان کے صفحات پر روز ایک دنیا پیدا ہوتی ہے اور پھر نئے شمارے کی آمد تک وہ دفن ہو جاتی ہے۔ ایسے میں ہمارے بڑے صحافیوں کا یہ دستور رہا ہے کہ اپنے کالم اور مضامین کا انتخاب جلد بند طریقے سے منظر عام پر لائیں۔ بعض اخبارات و رسائل نے بھی اپنے اداریے یا مضامین کتابی شکل میں شائع کیے۔ غلام سرور نے اپنے مضامین کا انتخاب شائع کیا لیکن صحافت سے متعلق ان کے ہزاروں نوشتہ جات اخبار کی گرد ہو کر رہ گئے۔ رضوان احمد کے ابتدائی مضامین تو "مجھے بولنے دو" کے عنوان سے شائع ہوئے لیکن اس سے زیادہ ان کے مضامین اخبار میں ہی پڑے رہ گئے۔ شاہد رام نگری، عبدالرافع، ریاض عظیم آبادی، مشتاق احمد، ریحان غنی، راشد احمد وغیرہ ایسے صحافی ہیں جن کے مضامین جمع کر دیے جائیں تو سب کی کئی جلدیں تیار ہو جائیں گی لیکن اس جانب کسی کی خاص توجہ نہیں ہے۔ کلام حیدری نے اپنے اداریے یکجا کیے تھے لیکن ان کی بھی بعد کی صحافیانہ تحریریں جمع نہ کی جا سکیں۔

[اس مضمون کی تکمیل میں قاضی عبدالودود، پروفیسر سید مظفر اقبال، ڈاکٹر سید احمد قادری اور ڈاکٹر افضل مصباحی کی کتابوں سے خصوصی طور سے رجوع کیا گیا ہے جس کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔]

بہار میں اردو صحافت کے خدوخال

پروفیسر اعجاز علی ارشد

انسان ہی کی طرح صحافت بھی ایک زندہ شے ہے جس کی دوستیاں بھی ہوتی ہیں اور دشمنیاں بھی، پسند بھی اور ناپسند بھی، ترجیحات بھی ہوتی ہیں اور تحفظات بھی اور ان سب کے ساتھ ایک کلچر اور تہذیب بھی۔ میں یہاں صحافت کے دائرہ کار، اس کے اصول وضوابط یا اس کی افادیت پر گفتگو نہیں کروں گا، میں اس الزام کے جواب میں بھی کچھ نہیں کہوں گا کہ اردو صحافت عبادت کے مرحلے سے گزر کر کس طرح تجارت کی منزل تک آ گئی ہے۔ ان موضوعات پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور جو جاننا چاہیں وہ جان سکتے ہیں کہ صحافت کی مبادیات کیا ہیں، دنیا کا پہلا اخبار یا کسی خاص زبان کا پہلا اخبار کون تھا یا کسی خاص نوعیت کی صحافت کا آغاز کب ہوا۔ جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے یہ بات بے حد معروف ہے کہ ''جام جہاں نما'' اردو کا پہلا ہفت روزہ تھا جس کا پہلا شمارہ 17/ مارچ 1922 کو منظر عام پر آیا۔ حالانکہ گاہے گاہے اس دعوے کی تردید بھی ہوتی رہی ہے۔ صرف ایک مثال ملاحظہ ہو۔ جناب معصوم عزیز کاظمی لکھتے ہیں:

''جدید تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ 1810 میں مولوی اکرم علی نے کلکتہ سے ''اردو اخبار'' نامی اخبار جاری کیا تھا جو نامساعد حالات کی بنا پر جلد بند ہو گیا۔''

(مقالہ مطبوعہ اکیسویں صدی میں اردو کا سماجی وثقافتی فروغ

ازقومی کونسل برائے فروغ اردو زبان 2014)

کاظمی صاحب نے نامساعد حالات کی وضاحت نہیں کی ہے مگر یہ بات اب عام ہو چکی ہے کہ جو بھی اخبار جب تک کمپنی کی حکومت کا مدح خواں رہتا، اس کی سرپرستی اور پذیرائی جاری رہتی اور جیسے ہی وہ حکومت پر کسی قسم کی نکتہ چینی کرتا اس کے وجود کو خطرہ لاحق ہو جاتا تھا۔ گویا حق گوئی کا مقدر کل بھی وہی تھا جو آج ہے۔ بہر حال میں ان پہلوؤں کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا مگر مختصراً عرض کردوں کہ اردو صحافت کے ابتدائی دور میں جو 1857 کے آس پاس ختم ہو جاتا ہے، تقریباً سوا سو اخبارات منظر عام پر آئے جو عام طور پر سرکاری اشتہارات اور اعلانات شائع کرنے تک محدود رہے۔ 1857 کی جنگ آزادی کا دائرہ کچھ وسیع ہوا تو بعض اخبارات نے مجاہدین آزادی کی حمایت میں تھوڑا بہت لکھنا شروع کیا لیکن دستور زبان بندی کی قدیم روایت کے مطابق انھیں اس حمایت کی بھاری قیمت چکانی پڑی اور بیسویں صدی کی ابتدا تک پورے ملک میں صرف ایک درجن اردو اخبار اپنے بل بوتے اور اپنی شرطوں پر زندہ رہنے کا ثبوت دیتے رہے۔ ان اخباروں میں صوبۂ بہار کے ایک اخبار ''پٹنہ ہرکارا'' کا بھی نام آتا ہے۔

آزادی سے قبل صوبۂ بہار میں اردو اخبارات کی فہرست سازی کی جائے تو سنہ اشاعت کے اعتبار سے ہفت روزہ ''نورالانوار'' (آرہ، 1853) کے علاوہ اخبار بہار (پٹنہ) اخبار الاخیار (مظفر پور) پندرہ روزہ چشمۂ علم، گلدستۂ نظارہ (گیا) ہفتہ وار ضیاء الابصار (آرہ) انجمن مذاکرہ علمیہ (پٹنہ) سائنٹفک صفیر (آرہ) مجموعہ الفوائد (مونگیر) نسیم سحر (پٹنہ) نسیم سراں (چھپرہ) مشیر بہار صبح وطن (پٹنہ) شرح الاخبار اور گلدستۂ بہار (بہار شریف) مہر منور (مظفر پور) الانتخاب (پٹنہ) پندرہ روزہ ''صدق'' (بہار شریف) ماہنامہ نورالاسلام (پٹنہ) ہفت روزہ آرہ گزٹ، (آرہ) ہفتہ وار انیس (پٹنہ) ہفت دار اتحاد (بہار شریف اور پٹنہ) ہفتہ وار ''نقیب'' (چھلواری

شریف) رسالہ ندیم (گیا) اور روزنامہ "صدائے عام" (پٹنہ) وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔ ان اخبارات و رسائل یا بہار سے نکلنے والے دوسرے جریدوں سے متعلق تفصیلات کے لیے ڈاکٹر سید احمد قادری کی کتاب "اردو صحافت بہار میں" مطبوعہ 2003 دیکھی جا سکتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بیسویں صدی کے اواخر تک بہار میں اردو صحافت کی سمت و رفتار کا علم حاصل کرنے کے لیے یہ ایک بے مثال کتاب ہے۔ مگر میں اس کے مشتملات کے حوالے سے یہاں صرف تین نکتوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ ابتدا سے ہی صرف پٹنہ نہیں بلکہ بہار کے مختلف علاقوں سے اخبارات شائع ہوئے، دوسرے یہ کہ ان اخبارات کی اشاعت میں ہر مذہب اور فرقے کے لوگوں نے حصہ لیا۔ اس سلسلے کا تیسرا اور اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ بہار میں سب سے پہلا اخبار اردو میں منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد ہی دوسری زبانوں میں اخبارات شائع ہوئے۔

اب میرے سامنے دو واضح سوالات ہیں۔ ایک تو یہ کہ بہار میں اردو صحافت کے موجودہ خدوخال کیا ہیں اور دوسرے یہ کہ ان میں کس قدر تبدیلی کے امکانات ہیں۔ ظاہر ہے کہ بات 1947 کے بعد کی اردو صحافت سے شروع ہوگی تو سب سے پہلے روزنامہ "صدائے عام" (مدیر: سید نظیر حیدر۔ اشاعت اول 1942) کا نام آئے گا جو کم و بیش نصف صدی تک شائع ہونے کے بعد اب بند ہو چکا ہے۔ اس کے چند ہی برسوں بعد 1949 میں روزنامہ "ساتھی" معروف افسانہ نگار سہیل عظیم آبادی کی ادارت میں نکلا جس کے مدیر بعد کے دنوں میں ڈاکٹر خالد رشید صبا رہے۔ ایک اور اخبار "سنگم" معروف سیاست داں غلام سرور کی قیادت میں 1954 سے شائع ہوتا رہا۔ پہلے یہ ہفت روزہ تھا مگر بعد میں روزنامہ ہو گیا اور اس نے حق گوئی اور جرأت آموزی کی ایک مثال قائم کی۔ فی الحال یہ جناب مظاہر حسن اور ڈاکٹر اعجاز علی کی ادارت میں نکل رہا ہے۔ اسی زمانے میں جناب قیوم خضر نے گیا سے ماہنامہ "اشارہ" نکالا جو ان کے ساتھ ہی پٹنہ منتقل ہو گیا اور ادبی صحافت کا ایک روشن باب بنا۔ ادبی رسالوں کی فہرست میں اور بھی دو چار نام خاصے نمایاں ہیں۔ ایک تو "صبح نو" جو فاطمہ پوری کی ادارت میں پورنیہ سے نکلا اور پٹنہ منتقل ہوا۔ بعد میں پروفیسر علیم اللہ حالی اس کے مدیر ہوئے تو خال خال نکلتا رہا اور بالآخر بند ہو گیا۔ دوسرے مشہور فکشن نگار کلام حیدری کی ادارت میں نکلنے والا رسالہ "آہنگ" گیا جس نے بعض ادبی مباحث کا آغاز کر کے تاریخ بنائی۔ ان ہی کی ادارت میں شائع ہونے والا ہفت روزہ "مورچہ" بھی ادبی

صحافت کا ایک روشن باب رہا۔ تاج پیامی نے اسے بہت دنوں تک زندہ رکھا مگر اب یہ بھی بند ہو چکا ہے۔ گیا سے معروف طنز و مزاح نگار انجم پانپوری کے رسالہ ''ندیم'' نے بھی خاصی شہرت حاصل کی۔ رسالہ ''صنم'' 1957 میں پروفیسر وہاب اشرفی نے نکالنا شروع کیا تھا اور اس کا بہار نمبر، خاصا جاندار تھا مگر یہ بھی چند شماروں کے بعد بند ہو گیا۔ جب وہ مستقل طور سے پٹنہ منتقل ہو گئے تو اُنھوں نے ''مباحثہ'' کے نام سے ایک معیاری ادبی رسالہ نکالا جو ان کی وفات کے کچھ دنوں بعد ہی دم توڑ گیا۔ ہفت روزہ رسالوں اور اخبارات کی ایک کثیر تعداد ہر زمانے میں موجود رہی جس میں ''صداقت'' (سید محی الدین ندوی) سویرا، روشنی (مطیع الرحمٰن شمیم) زمین (شکیل الرحمٰن) تہذیب (عبدالقیوم انصاری اور سہیل عظیم آبادی) گمدھ پنچ (مدیر: شمشاد جہاں) وغیرہ نے ایک معیار قائم رکھا۔ بعض پندرہ روزہ اخبارات و رسائل بھی شائع ہوئے جس میں بہار کی خبریں (ایڈیٹر ہوش عظیم آبادی) سیکولر محاذ (مدیر ریاض عظیم آبادی) کوہسار بھاگلپور (مناظر عاشق ہرگانوی) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

یہاں بہار اردو اکادمی کے ادبی ترجمان زبان و ادب، کا تذکرہ بے حد ضروری ہے۔ اس کا پہلا شمارہ ''اردوستاں'' کے نام سے اپریل 1975 میں منظر عام پر آیا تھا۔ ایڈیٹر سہیل عظیم آبادی تھے اور مجلس مشاورت میں کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود، جمیل مظہری، سید محمد حسنین، عبدالمغنی جیسے نامی گرامی قلم کار موجود تھے۔ اس کے موجودہ مدیر مشتاق احمد نوری ہیں۔ اسی سلسلے میں ایک اور سرکاری رسالے ''خدا بخش جرنل'' کا ذکر ناگزیر ہے۔ اس رسالے کو بام عروج تک پہنچانے والوں میں ڈاکٹر عابد رضا بیدار اور ڈاکٹر امتیاز احمد کے نام فراموش نہیں کیے جا سکتے۔ شعبۂ اردو مگدھ یونیورسٹی کی جانب سے ایک جرنل ''مشام'' کے نام سے سید محمد حسنین نے شائع کیا تھا مگر وہ چند شماروں کے بعد بند ہو گیا۔ البتہ شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی کی جانب سے ایک ریسرچ جرنل جو عام طور پر موضوعاتی مطالعوں پر مبنی ہوتا ہے، گذشتہ چھ برسوں سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اس کے بانی مدیر پروفیسر اعجاز علی ارشد تھے اور فی الحال شہاب ظفر اعظمی ہیں۔ متھلا یونیورسٹی سے بھی ایک ریسرچ جرنل ڈاکٹر رئیس انور کی ادارت میں نکل رہا ہے۔

ان دنوں صوبۂ بہار کی راجدھانی پٹنہ سے کم و بیش ایک درجن روزنامے نکل رہے ہیں جن میں قومی تنظیم، پندار، ہمارا سماج، انقلاب، راشٹریہ سہارا، ایثار، سنگم، فاروقی تنظیم، پیاری اردو

اور مثلث وغیرہ اہم ہیں۔ ادبی رسائل کی دنیا میں اردو اکادمی کے ترجمان زبان وادب کے علاوہ صدف (مدیر صفدر امام قادری) اور سہ ماہی ابجد (مدیر رضی احمد تنہا) طباعت اور پیش کش کے اعلیٰ معیار سامنے لائے ہیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو آزادی کے بعد عہد حاضر تک جن صحافیوں نے مختلف اردو اخبارات ورسائل کے ذریعہ رجحان سازی یا فضابندی کی کامیاب کوشش کی اور صحافت کے افق پر نمایاں ہوئے ان میں مذکورہ بالا لوگوں کے علاوہ سید سلطان احمد، معین شاہد، سید شہباز، بیتاب صدیقی، شمیم مظفر پوری، خورشید انور عارفی، سید اشرف فرید، سید اجمل فرید، معصوم شرفی اسیر، راشد احمد، ریحان غنی، اسماعیل حسنین نقوی اور ڈاکٹر مشتاق احمد، وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ یہ فہرست مزید طویل ہوسکتی ہے مگر یہ ایک کارلا حاصل ہوگا چونکہ صحافت سے وابستہ بعض نام پھر بھی چھوٹ جائیں گے۔ اس لیے میں مطالعے کے اس دوسرے پہلو کی طرف آتا ہوں جس کا تعلق موجودہ خدوخال کو مزید دلکش بنانے سے ہے۔ یہ پہلو بھی دو نکتوں سے عبارت ہے ایک تو متن اور دوسرے پیش کش۔ جہاں تک پیش کش کا تعلق ہے گذشتہ صدی کے اواخر اور نئی صدی کے آغاز میں ٹکنالوجی کی ترقی نے اخبارات ورسائل کو جو نئے خدوخال عطا کیے ہیں ان کا اثر بہار کی اردو صحافت پر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ زیادہ تر اخبارات اب کمپیوٹر اور پرنٹر کی سہولتوں کے سبب نہ صرف خوب صورت خدوخال کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں بلکہ ان میں تازہ ترین خبروں کی ترسیل بھی ہو رہی ہے۔

بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ اس اعتبار سے سرکاری وغیر سرکاری اشتہارات کی فراہمی نے ریڈرشپ کی کمی کا غم بھی کچھ کم کیا ہے اور خبروں کے علاوہ مختلف نوعیت کے کالم بھی اخباروں کا حصہ بنے ہیں۔ صحافت کی تکنیک جس میں ریڈیو نشریات اور الیکٹرانک صحافت کا بھی شمار ہے کئی کتابوں میں موضوع گفتگو بنی ہے اور حال ہی میں بہار اردو اکادمی نے اردو صحافت سے متعلق ایک تربیتی ورکشاپ بھی منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ ایک خوش آئند صورت حال ہے مگر ایسی بھی نہیں کہ ہم بہتر سے بہترین کی طرف قدم نہ بڑھائیں۔ بقول شاعر۔

یوں تو ہر گام پہ منزل کا گماں ہوتا ہے جستجو ہو تو سفر ختم کہاں ہوتا ہے

بہار میں اردو صحافت کا آغاز وارتقا

1858 تا 1900

ڈاکٹر ریحان غنی

زبان کی ترسیل واشاعت میں اخبارات کو جتنا دخل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ بہار نے اس نکتے کو سب سے پہلے سمجھا۔ 1857 سے قبل اس ریاست سے نکلنے والے چار اخبارات کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں نور الانوار، آرہ، پٹنہ ہرکارہ، اخبار پٹنہ اور دیکھی رپورٹ گیا کے نام شامل ہیں۔ ان میں اول الذکر دو اخبار نور الانوار اور پٹنہ ہرکارہ میں سے کس کو اولیت حاصل ہے اس پر اختلاف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نور الانوار جولائی 1853 میں آرہ سے جاری ہوا۔ یہ ہفتہ وار اخبار تھا اور سید خورشید احمد کی نگرانی میں نکلتا تھا۔ اس کے مالک سید محمد ہاشم بلگرامی تھے۔ اس کے ایڈیٹر کا کچھ پتہ نہیں چلتا ہے اس لیے کچھ محققین اسے اخبار نہیں بلکہ چھاپا خانہ مانتے ہیں۔ اس کا کوئی شمارہ بھی نہیں ملتا۔ ڈاکٹر سید احمد قادری نے اپنی کتاب ''اردو صحافت بہار میں'' میں اس کے ایڈیٹر کا نام سید خورشید احمد تحریر کیا ہے اور لکھا ہے کہ 1853 تک بہار میں سہسرام کے علاوہ کہیں اور پریس نہیں تھا۔ اس لیے قیاس ہے کہ یہ اخبار سہسرام کے شاہ کبیر الدین احمد کے 1850 میں قائم کردہ پریس

میں شائع ہوا ہوگا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے لکھا ہے سید محمد اشرف نقوی کی تصنیف ''سوانح عمری اخبارات'' حصہ اول اور اختر شہنشاہی حصہ اول 1888 میں اس کا ذکر ملتا ہے اس کے بعد مشرقی پٹنہ کے محلہ کٹرہ سے 21 راپریل 1855 میں پٹنہ ہرکارہ منظر عام پر آیا۔ یہ مہینے میں تین مرتبہ شائع ہوتا تھا۔ اس کے چند شمارے خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہیں۔ یہ اخبار ابوتراب کی ملکیت اور نگرانی میں نکلتا تھا۔ چونکہ ''نور الانوار'' کا ایک بھی شمارہ اب تک دستیاب نہیں ہوا ہے اور پٹنہ ہرکارہ کے شمارے موجود ہیں اس لیے محققین کی رائے میں پٹنہ ہرکارہ ہی بہار کا پہلا اردو اخبار ہے۔ اس طرح بہار میں اردو صحافت کا آغاز 1855 سے ہوتا ہے۔ اسی دور میں ایک اور اخبار، اخبار پٹنہ بھی یکم ستمبر 1856 کو پٹنہ سے شائع ہوا۔ اس کے ایڈیٹر لالہ بندا پرساد حسرتی تھے۔ یہ اخبار مہینے میں تین مرتبہ نکلا کرتا تھا۔ اس کے کچھ شمارے خانقاہ منیر شریف میں موجود ہیں۔ ''ویکلی رپورٹ'' ماہانہ رسالہ تھا۔ یہ یکم مئی 1856 کو گیا سے جاری ہوا۔ اس کے سرپرست جے جے رام مختار تھے۔

1857 کا انقلاب شروع ہوا تو ملک کی سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی صورت حال میں زبردست اتھل پتھل مچ گئی۔ اسی سال ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے اخبارات کی آزادی ختم کرنے کا قانون نافذ کیا۔ اس قانون کو صحافت کی تاریخ میں ''قانون زباں بندی'' (Gagging Act) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انگریزوں نے اس قانون کے تحت زیادہ تر کارروائی فارسی اور اردو اخبارات کے خلاف کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی کی اردو صحافت کا بالکل خاتمہ ہوگیا اور مسلمانوں کو اردو صحافت سے بے دخل کر دیا گیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ انقلاب میں پیش پیش تھے۔ مسٹر جے نٹراجن لکھتے ہیں کہ:

> In the northwest provinces most of the Urdu newspapers had ceased publication with break out of the rebellion - other come up in other place edited by hindus.*

---

* ہسٹری آف انڈین جرنلزم۔ جے نٹراجن، ص:134

شمال مغربی صوبہ جات کے متعدد اردو اخبارات کی اشاعت غدر کے سبب بند ہو گئی۔ چند دوسرے اخبارات رہ گئے تھے جو دوسرے مقامات سے نکلے تھے جن کی ادارت ہندوؤں کے ذمے تھی۔

1857 کی پہلی جنگ جسے انگریزوں نے ''غدر'' کا نام دیا تھا دراصل ایسٹ انڈیا کمپنی سے اقتدار اعلیٰ چھیننے کی ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ مسلح جدوجہد تھی جس میں زبردست ناکامی ہوئی۔ 1857 کا انقلاب ختم ہونے کے بعد اردو صحافت کے نئے دور کا آغاز ہوا اور اردو کے کئی اخبارات نئی تیاریوں اور نئی شان وشوکت کے ساتھ منظر عام پر آئے، اس میں تیزی سے اضافہ ہوتا گیا، اس کا حلقہ بھی بڑھتا گیا اور دہلی کے ساتھ ہی لاہور لکھنؤ اور شمالی ہند کے کئی چھوٹے بڑے شہروں سے اردو اخبارات نکلنے لگے۔ مدراس اور بنگال بھی اچھوتا نہیں رہا۔ انقلاب کے فوراً بعد شائع ہونے والا لکھنؤ کا اودھ اخبار تھا جو 1859 میں جاری ہوا اور سب سے زیادہ نوے سال تک زندہ رہا۔ اس دور میں اس کے کئی ایڈیٹر رہے۔ اسے منشی نول کشور نے شائع کیا تھا۔ یہ اپنے زمانے کا عمدہ اور بہترین اخبار تھا۔ اس دور میں اردو اخبارات نے موضوعات کو بہت وسعت دی۔ اسی دوران طنزیہ اور مزاحیہ صحافت، مذہبی صحافت، پیشہ ورانہ صحافت، ادبی صحافت، سائنسی صحافت اور سماجی صحافت کا آغاز ہوا اور خواتین کے اخبارات بھی نکلے۔ بہار بھی اس سے اچھوتا نہیں رہا۔ اس ریاست میں بھی موضوعاتی صحافت شروع ہوئی۔ بہار میں 1858 سے 1900 یعنی انیسویں صدی کے اختتام تک مختلف شہروں سے مختلف موضوعات پر بے شمار اخبارات ورسائل جاری ہوئے اس کی فہرست بہت طویل ہے۔ اس دور میں مشہور شاعر شاد عظیم آبادی نے بھی ''نسیم سحر'' کے نام سے اخبار نکالا۔ یہ پٹنہ سٹی کے محلہ گذری سے جنوری 1877 کو جاری ہوا۔ یہ ہفتہ وار اخبار تھا اور ہر جمعہ کو شائع ہوتا تھا۔ سید محمد اشرف نے اپنی کتاب اختر شہنشاہی میں اس اخبار کا ذکر کیا ہے۔ اسی دور میں پٹنہ سے ''الیچ'' کے نام سے ایک اخبار نکلا اس کا پہلا شمارہ 5 رفروری 1885 کو منظر عام پر آیا۔ یہ مزاحیہ اخبار تھا۔ اس کی خبروں میں مزاح کا رنگ غالب رہتا تھا۔ اس کی ادارت چار مختلف افراد کے ہاتھوں میں رہی۔ اس کے پہلے مدیر سید رحیم الدین استھانوی تھے۔ ان کے علاوہ مولوی مظہر عالم، ابوالخیر خیر دربھنگوی، حکیم سید احسن بہاری اور مولوی

سید حسن استھانوی بھی اس اخبار کے مدیر رہے۔اس مزاحیہ اخبار کے سلسلے میں ڈاکٹر عمر ابدالی نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے بعنوان الیچ کی ادبی خدمات میں لکھا ہے کہ:

''الیچ بند کب ہوا اس کے بارے میں یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔اس کا آخری شمارہ جو اب تک دستیاب ہو سکا ہے 7 مارچ 1912 کا ہے۔ اندازہ ہے کہ یہ 1912 اور 1914 کے درمیان بند ہوا ہوگا اور اس کے بند ہونے کا سبب 1914 میں شروع ہونے والی جنگ عظیم اول کے ہنگامے اور اس سے پیدا شدہ بحران رہا ہوگا۔''

1858 سے 1900 کے درمیان بہار کے مختلف شہروں سے شائع ہونے والے کچھ اہم اخبارات ورسائل درج ذیل ہیں۔

- خورشید عالم (پٹنہ) 21 جنوری 1864، مدیر شمس الدین
- نیر الفوائد (آرہ) 31 مارچ 1867، مدیر خواجہ فخر الدین سخن دہلوی
- اخبار الاخبار (مظفر پور) ستمبر 1868، مدیر بابو اجودھیا پرساد
- چشمۂ علم (پٹنہ) یکم جنوری 1869، مدیر منشی سورج مل
- گلدستۂ نظائر (گیا) 1871
- صبح صادق (پٹنہ) 1871
- نادر الاخبار (مونگیر) x 1872 رشی کمار ایر
- ضیاء الاخبار (آرہ) 1873، مدیر سید فیروز احمد سفیر بلگرامی
- قاصد (پٹنہ) 2 جنوری 1876، مدیر سخاوت حسین
- انیس بہار (پٹنہ) 1876، مدیر سید فضل کریم
- مجمع الفوائد (مونگیر) یکم جولائی 1876
- مجموعۂ نظائر ہند (گیا) 31 جنوری 1878، مدیر بابو سندر بوس
- نسیم سارن (چھپرہ) 1878
- شیر بہار (پٹنہ) 7 جنوری 1880، مدیر بابو گوونند چرن

- صبح وطن (پورنیہ) 1881ء مدیر مولوی سید رحیم الدین
- گلدستۂ بہار (پٹنہ) 1883ء مدیر شاہ عطا حسین
- گلشن بہار (پٹنہ) 1883x مدیر سید محمد علی
- مہر نور (مظفر پور) 10 جون 1884ء مدیر شیخ محمد حسن ضیا
- نوائے عشق (پٹنہ) 1885ء مدیر سید رحیم الدین
- نالۂ عشاق (پٹنہ) 1885۔ گلدستۂ کلام
- گیا پنچ (گیا) 1894ء مدیر مولوی محمد حسن مختار

اس فہرست سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اُس دور میں پٹنہ کے ساتھ ہی مظفر پور، گیا، آرہ، مونگیر، چھپرہ اور پورنیہ جیسے دور دراز علاقے سے بھی اردو اخبارات اور رسائل سامنے آئے۔ ان میں روزناموں کی تعداد بہت ہی کم اور ہفتہ وار، پندرہ روزہ اخبارات اور ماہانہ رسائل کی تعداد زیادہ تھی۔ ان سب اخبارات ورسائل کا مقصد آج کی طرح پیسہ کمانا یا شہرت حاصل کرنا نہیں تھا۔ ہر چند کہ اس وقت یہ لوگوں کا ایک شوق تھا لیکن اس کے پیچھے زبان وادب کی خدمت اور معاشرے کی فلاح کے لیے کام کرنا بھی تھا۔ مختصراً یہ کہ اُس وقت ایک نصب العین اور مشن کے تحت اخبارات ورسائل نکالے جاتے تھے۔ اُس دور کے اخبارات ورسائل کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اُس وقت کی صحافت بہت معتدل تھی۔ اس میں کوئی روانی نہیں تھی۔ بس سپاٹ انداز میں اخبارات ورسائل شائع ہو رہے تھے۔ ان پر 1857 کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں پر ڈھائے گئے مظالم کے اثرات غالب تھے۔ لیکن بیسویں صدی میں داخل ہونے کے ساتھ ہی اردو صحافت نے ایک مرتبہ پھر کروٹ لی اور وہ پوری توانائی کے ساتھ انگریزوں کے خلاف چھیڑی گئی جنگ میں کود پڑی اور اس نے انگریزوں کو ملک سے نکال کر ہی دم لیا۔

بہار میں اردو صحافت: نشیب و فراز

حسن نواب حسن

اردو کی صحافت کی تاریخ جتنی پرانی ہے اُتنی ہی وسیع اور وقیع بھی ہے مگر اس کے تناظر میں جس قدر اس کی تاریخ اہم اور قابل ذکر ہے اس کے لحاظ سے اس پر خاطر خواہ کام کرنے کا آج تک حق ادا نہیں ہو سکا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ جس طرح علمی اور ادبی پیمانے پر بہار کسی صوبے کے مقابلے میں پیچھے نہیں رہا بلکہ یہاں کے ادبا اور شعرا جہاں بھی دوسرے صوبوں میں بلکہ بیرون ملک بھی گئے تو انھوں نے اپنے صوبے کا لوہا منوا کر چھوڑا۔ اسی طرح بہار کی صحافت بھی اپنے معیار اور دیگر اعتبار سے کسی سے پیچھے نہ رہی۔

بہار کی صحافت کی تاریخ دوسرے صوبوں کے مقابلے میں کچھ کم نہیں ہے۔ ذیل میں ان چند رسالوں اور اخباروں کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جو بیسویں صدی کے پہلے ہی سے یعنی انیسویں صدی کے درمیانی حصے سے شائع ہوئے۔ 1853 سے ہی آرہ شہر سے پہلا اخبار ''نورالانوار'' کے نام سے ایک اخبار کا آغاز ہو چکا تھا جس کے مدیر جناب خورشید احمد تھے۔ اس کے بعد بہار کی راجدھانی پٹنہ سے 1856 میں ''اخبار بہار'' جاری ہوا جس کے مدیر لال چند پرشاد

تھے۔ اس کے بعد سے انیسویں صدی میں ہی بہار میں اخباروں اور رسالوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اس کی فہرست طویل ہے مگر ذیل میں انیسویں صدی کے چند اخباروں اور رسالوں کا حوالہ دینا ضروری ہے۔ مثلاً آرا ہی سے 1871 میں اخبار "صبح صادق" مدیر وزیر علی پھر آرہ ہی سے 1873 میں "اسٹار آف انڈیا" مدیر منشی ظہور الحق پھر گیا سے 1871 ہی میں "گلدستۂ نظائر" پھر 1871 میں سارن سے "گلدستہ"، 1885 میں گیا سے "پنچ"، 1874 میں "آرہ گزٹ" مدیر خورشید احمد، جب نام اس اخبار کا آرہ گزٹ تھا تو گیا سے کیوں نکلتا تھا۔ اس کی وضاحت کتاب میں نہیں ہے۔ یہ سارے حوالے سید احمد قادری کی کتاب "اردو صحافت بہار میں" سے لیے گئے ہیں۔ اس کے بعد پٹنہ سے 1886 اخبار انسٹی ٹیوٹ مدیر وزیر محمد حسین پھر پٹنہ سے ہی 1876 "انیس بہار" مدیر فیض کریم و اصغر علی اور پھر انیس 1887 مدیر عابد حسین مظفر پور سے، پٹنہ سے "بہار پنچ" 1886 مدیر نوروز علی خاں و اکبر خاں، پٹنہ ہی سے دار السلام 1886 میں مدیر منشی حسن علی، پٹنہ سے "صبح وطن" 1881 مدیر رحیم الدین، پٹنہ سے "صدق قلموں 1885، آرہ سے عالم آرا 1886 مدیر کا حوالہ کتاب میں نہیں۔ گیا سے "پنچ"، پٹنہ سے گلشن بہار مدیر محمود علی خاں، پٹنہ سے "گلدستۂ بہار" مدیر عطا حسن، مونگیر سے "مرات ہند" 1872 مدیر منشی رام پرشاد، مظفر پور سے "ممتاز تربیت" 1880 مدیر کا حوالہ نہیں ہے۔ مونگیر سے "نادر اخبار" 1872 مدیر ریشی کمار چٹرجی پھر پٹنہ سے "نالۂ عشاق" مدیر کا حوالہ نہیں۔ پٹنہ سے "نوائے عشق" 1885 مدیر رحیم الدین۔ اس طرح آپ دیکھیں گے تو پائیں گے کہ انیسویں صدی کے وسط سے لے کر اخیر تک اخباروں اور رسالوں کا آغاز بہار سے ہو چکا تھا جس میں سبقت آرہ کو حاصل ہے۔ اگر پورے بہار سے نکلنے والے اخبارات و رسائل کا ٹوٹل کیا جائے تو 200 سے کچھ کم یعنی 193 اخبارات اور رسالوں کی تعداد پائی جاتی ہے جس میں گیا سے 52 اخبار و رسائل ملا کر، مظفر پور سے 12، جمشید پور سے 14، رانچی سے 9، پھلواری شریف 10، دربھنگ سے 12، سہسرام سے 8، بہار شریف سے 5، پورنیہ رکشن گنج سے 9، آرہ سے 3، مونگیر سے 5 اس طرح باقی چھوٹے بڑے اضلاع، گاؤں اور قصبہ ملا کر کھجوہ، ڈہری آن سون، سیوان، بھاگلپور، ہزاری باغ، حمزہ پور، شیر گھاٹی، ڈالٹین گنج، نگپورہ، گریڈیہہ وغیرہ سب کو ملا دیا جائے تو انیسویں صدی سے لے کر بیسویں صدی کے وسط تک تقریباً 438 رسائل اور اخبار نکل چکے تھے۔ جس میں

اب تک کہ اندازے کے حساب سے تین چوتھائی سے زیادہ بند ہو چکے ہیں۔ جن کے اعداد و شمار اب تک نکالے جا چکے ہیں وہ تین سو سے زیادہ ہیں۔ حالیہ برسوں میں جن اخبارات اور رسالے کا اضافہ ہوا ان میں ''پندار''، ''پیاری اردو''، ''ہمارا سماج''، ''انقلاب''، ''تاثیر''، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بہار کے موجودہ اخبار پابندی سے ''سنگم''، ''قومی تنظیم''، ''پندار''، ''راشٹریہ سہارا''، فاروقی تنظیم'' وغیرہ جاری ہیں ''قومی تنظیم'' کی شاخیں رانچی، کلکتہ اور لکھنؤ میں قائم ہو چکی ہیں۔ اخبار ''انقلاب'' پٹنہ سے بھی 27 مئی 2003 سے جاری ہو چکا ہے۔ بہت عرصہ قبل ''انقلاب جدید'' اخبار بھی جاری ہوا تھا اور بہت مقبول تھا مگر اس کے مدیر شہباز عالم کے ہٹ جانے سے اس کی اشاعت اور تعداد دونوں متاثر ہو چکی ہیں۔ اگر گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو کوئی بھی اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ زیادہ تر اخبارات مالی نقصان کی وجہ سے ناکام ہوتے رہے اور جب تک صحافت بغرض تجارت جاری رہے گی اس کے ناکام ہونے کا سلسلہ بھی جاری رہے گا۔ کم از کم ایک درجن اخبار صرف سرکاری اشتہار اور کاغذ کے کوٹے کے لیے ہیں جن کا ذکر مناسب نہیں۔

اُردو صحافت اور بہار: ایک جائزہ

ڈاکٹر شمیم قاسمی

بہار کی سرزمین سے اُردو کا پہلا اخبار روزنامہ ''دہلی بہار'' ہے۔ بہار کے ضلع شاہ آباد آرہ کو اس کا فخر حاصل ہے۔ اس روزنامہ کی اشاعت 1876 میں ہوئی۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ بہار میں اردو صحافت کی تاریخ تقریباً ڈیڑھ سو سال پرانی ہے۔ اس درمیان لاتعداد اردو اخبارات اور جرائد نکلے اور گردش زمانہ کا شکار ہوتے چلے گئے۔ بہار کے کئی شہروں سے اردو اخبارات کی اشاعت کا کام بڑے جوش و ولولے سے انجام پاتا رہا ہے۔ ان شہروں میں گیا، آرہ، مونگیر، مظفر پور، سیوان اور دربھنگہ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا لیکن عظیم آباد پٹنہ کو اردو صحافت کے فروغ میں مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ چنانچہ ''عظیم الاخبار'' پٹنہ سنہ اشاعت 1867 اور ''انڈین کرانیکل'' سہ روزہ اخبار کو بہار کی صحافت میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔

بہار کی اردو صحافت میں ''ندیم'' گیا کی بھی صحافتی اور ادبی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ دراصل ''ندیم'' ایک ادبی جریدہ تھا جو 1931 میں شائع ہوا اور تقریباً چودہ برسوں تک اردو کی ادبی صحافت میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ اس کے مدیر کرائے کے قم قم والے انجم مانپوری

تھے۔ ''ندیم'' کے خصوصی بہار نمبر سے ہمارے ریسرچ اسکالر اور نئی ادبی پود استفادہ کرتی رہی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ ''ندیم'' گیا سے بہار میں بطور خاص ادبی صحافت کا آغاز ہوا۔ زبان و بیان کی سطح پر اخباری صحافت اور ادبی صحافت کے تال میل سے فکری اظہارات کے نئے در وا ہوئے اور طباعت سازی کی نئی تکنیک بازار میں متعارف ہوئی تو بہار میں اردو صحافت کا ایک نیا چراغ روشن ہوا۔ اسی چراغ کی روشنی میں بہار میں اردو صحافت کا ہم اگلا پڑاؤ طے کر سکتے ہیں۔ اردو کی ادبی صحافت کی نمائندگی میں قیوم خضر کے ''اشارہ'' پٹنہ، سہیل عظیم آبادی کے ''تہذیب'' پٹنہ، وہاب اشرفی اور محمد رفیع الدین کے ''صنم'' پٹنہ، ''صبح نو'' جس کے مدیر وفا ملک پوری کی ادبی و صحافتی خدمات کون فراموش کر سکتا ہے؟..... بعد میں پروفیسر علیم اللہ حالی کی سرپرستی میں ''صبح نو'' کی اشاعت جاری رہی۔ ان دنوں علیم اللہ حالی پٹنہ سے ادبی میگزین ''انتخاب'' نکال رہے ہیں۔ حلقۂ ادب بہار کے نمائندہ رسالہ ''مریخ'' عبدالمغنی رفخر الدین عارفی کے علاوہ پٹنہ سے وہاب اشرفی کے ''مباحثہ'' نے بھی بہار کی ادبی صحافت کو ایک نیا موڑ دیا۔ حالیہ برسوں میں انور شمیم کے ''کسوٹی جدید'' خورشید اکبر کے ''آمد'' (سہ ماہی) اور بہار اردو اکادمی کے آرگن ''زبان و ادب'' کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

گیا شہر کے ماہنامہ ''سہیل'' کی بھی طویل ادبی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان دنوں سہیل کلکتہ سے شائع ہو رہا ہے۔ کلام حیدری نے ایک زمانے میں ہفتہ وار مورچہ نکالا اور ایک ادبی ماہنامہ آہنگ کا اجرا بھی عمل میں آیا، جس کی ادبی حلقے میں کافی دھوم رہی۔ کلام حیدری کا نام بھی ایک ادبی صحافی کے طور پر ہماری اردو صحافت کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ معین شاہد کے آدرش اور سید احمد قادری کے بودھ دھرتی نے بھی بہار کی اردو صحافت میں اپنی پہچان بنائی۔ دربھنگہ سے قومی تنظیم کے نمائندہ صحافی منصور خوشتر نے دربھنگہ ٹائمس نکال کر اپنی موجودگی درج کرائی ہے۔ بھاگلپور کے کوہسار (مناظر عاشق ہرگانوی) اور دربھنگہ کے سہ ماہی تمثیل نو کے ڈاکٹر امام اعظم اور مشتاق احمد کے جہانِ اردو کی نمایاں صحافتی سرگرمیوں کو نہ سراہنا ادبی کوتاہ نظری ہوگی۔ مشتاق احمد دربھنگہ کے مارواڑی کالج کے پرنسپل ہیں۔ درس و تدریس ان کا پیشہ ضرور ہے لیکن اردو صحافت میں بھی بحیثیت ایک صحافی ان کا مخصوص مقام ہے۔ حالات حاضرہ پر ان کی گہری نظر ہے۔

پٹنہ شہر سے نکلنے والے معروف اخبارات کے درمیان روزنامہ ''اتحاد'' کی حیثیت سنگ میل جیسی ہے۔ یہ 1912 میں پھلواری شریف سے جاری کیا گیا تھا۔ 1935 میں شیر شاہ کی نگری سہسرام کے سپوت سلطان احمد جو اپنے زمانے کے قد آور صحافی اور صاحب طرز قلم کار تھے، اس کے مدیر بنائے گئے۔ لیکن ان کی پہچان اس زمانے کے مشہور نیشنلسٹ صحافی کے طور پر زیادہ رہی۔ سچ ہے کہ سلطان احمد کی ادارت میں ''اتحاد'' کافی نکھرا اور عوام کی آواز بن گیا۔ یہ اخبار 1951 تک جاری رہا اور کہتے ہیں کہ انھیں کی گود میں اس نے دم توڑا۔ ''اتحاد'' اخبار کے حوالے سے پروفیسر عبدالمغنی کی یہ تحریر نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ ''اتحاد پٹنہ کا واحد اردو اخبار تھا۔ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ''اتحاد'' اپنے وقت کا ایک تاریخی ادارہ تھا اور اس اعتبار سے اسے بہار کی موجودہ صحافت کی ماں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔''

بہار میں اپنے زمانے کے مقبول و معروف اخبارات میں ''صدائے عام'' (سنہ اشاعت: 1942، بانی مدیر سید نظیر حیدر۔ بعد کے دنوں میں رضی حیدر) کی نمایاں صحافتی خدمات کو بھولا نہیں جاسکتا۔ تحریک آزادی کے وقت ''صدائے عام'' نے وقتی طور پر مسلم لیگ کی حمایت ضرور کی لیکن یہ مسلم لیگ کا ترجمان نہیں رہا۔ یہ اخبار ملک کے مفادات، اقلیتی مسائل اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہا۔ نامور اور بزرگ صحافی مرحوم محمد مرغوب برسوں اس کی ادارت سے وابستہ رہے اور ''صدائے عام'' میں ان کے لکھے ہوئے فکر انگیز اداریے قارئین اردو کے لیے اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ روزنامہ ''ساتھی'' جو ہندو پاک کے ترقی پسند افسانہ نگار سہیل عظیم آبادی اور قوم و ملت کے رہنما عبدالقیوم انصاری کے عملی تعاون سے 1949 میں شائع ہوا تھا لیکن بعد کے دنوں میں اپنے زمانے کی مشہور سماجی و سیاسی شخصیت نور محمد نے اسے خرید کر بہار کی اردو صحافت کو ایک نیا زاویہ نظر دیا۔ ریاست بہار کے سابق وزیر اور ہر دلعزیز سیاسی رہنما ڈاکٹر خالد رشید صبا کی تحویل میں آنے کے بعد ''ساتھی'' کے قارئین کا حلقہ بھی کافی بڑھا۔ اخبار ''ساتھی'' کے کئی خصوصی نمبر بھی شائع ہوئے، اس کا سالنامہ اور جمہوریت نمبر اردو صحافت کی دنیا میں نہ صرف تاریخی حیثیت کا حامل ہے بلکہ اردو صحافت سے وابستہ افراد کے لیے قابل تقلید بھی۔ ڈاکٹر خالد رشید صبا ایک سلجھے ہوئے روشن خیال صحافی اور سیاست داں ہیں۔ شعر و ادب سے بھی گہری وابستگی

رکھتے ہیں۔ ایک زمانے میں ''ساتھی'' کا دفتر خالد رشید صبا کی موجودگی میں شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کے لیے مرکزی حیثیت رکھتا تھا اور رحمانیہ ہوٹل جیسی چہل پہل اور رونق ہوا کرتی تھی۔

اپنے زمانے کے شعلہ بیان مقرر اور بیباک صحافی غلام سرور کے روزنامہ ''سنگم'' پٹنہ کو کون نہیں جانتا۔ پہلے ''سنگم'' ہفتہ روزہ رہا ہے اور پھر 1962 سے روزنامہ ہو کر مقبول عام ہوا۔ کسی زمانے میں پروفیسر عبدالمغنی نے بھی اس کے اداریے لکھے تھے۔ اس اخبار کے پلیٹ فارم سے غلام سرور نے حق گوئی اور بیباکی کا نہ صرف درس دیا بلکہ بہار کے تازہ اذہان کو اپنی باغیانہ تحریروں سے بے حد متاثر کیا۔ ماضی میں ''سنگم'' کی پہچان ایک باغی اور ہر دلعزیز اردو اخبار کے طور پر ہوتی رہی ہے۔ غلام سرور کی عملی سیاسی سرگرمیوں نے ان کی عہد ساز صحافیانہ شخصیت کو قدرے متاثر کیا۔ غالب کی طرفداری نے بھی کچھ گل کھلائے۔ بہر حال ''سنگم'' غلام سرور کے ہنگامہ خیز تبصروں کی وجہ سے بھی برسوں عوام کے دلوں پر راج کرتا رہا۔ ان دنوں اس کے مدیر پٹنہ کے مشہور سرجن، راجیہ سبھا کے سابق رکن ڈاکٹر اعجاز علی ہیں جو بہار کے پسماندہ مسلمانوں کے حقوق اور مسائل پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ بہر حال اردو صحافت کو روزنامہ ''سنگم'' نے ہر زمانے میں ایک نیا زاویہ نظر دیا۔ یہاں پر روزنامہ ''قومی تنظیم'' کا ذکر بھی اہمیت کا حامل ہے۔ 1959 میں دربھنگہ کے سید محمد عمر فرید نے اس کی شروعات کی۔ اُس زمانے میں وہ اس کے ایڈیٹر و مالک تھے۔ پھر 1965 میں پٹنہ سے ہفت روزہ کے طور پر جاری ہوا۔ لیکن 1975 سے روزنامے کی شکل میں پٹنہ سے ہی جاری و ساری ہے۔ یہ بہار کی اردو آبادی میں حد درجہ مقبول ہے۔ اس کے موجودہ ایڈیٹر ایس ایم اشرف فرید ہیں۔

بہار کی اردو صحافت میں رضوان احمد کا نام بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ ان کی صحافتی اور علمی لیاقت کا سبھی نے لوہا مانا ہے۔ ان کا اخبار ''عظیم آباد ایکسپریس'' پٹنہ، برسوں بہار کی اردو صحافت کی دنیا میں اپنی دھوم مچاتا رہا۔ اس کے معنی خیز اداریے کے چوکھٹے میں رضوان احمد کا مشہب قلم تیزی سے دوڑتا نظر آتا ہے۔ رضوان دراصل ایک بیباک صحافی کے طور پر پہچانے جاتے رہے ہیں۔ شروع میں تو ''عظیم آباد ایکسپریس'' ہفتہ وار رہا۔ سنہ اشاعت 1974 ہے۔ لیکن 1980 سے روزنامے کی شکل میں بازار کی زینت بنا۔ عظیم آباد ایکسپریس کا اجرا کرتے ہوئے اردو کے

مایۂ ناز ناقد کلیم الدین احمد نے یہ اعتراف کیا تھا کہ ''میں ایسے جلسوں میں نہیں جاتا مگر رضوان صاحب سچ بولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے اس جلسے میں چلا آیا ہوں۔'' آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سچ بولنا کوئی آسان نہیں۔ لیکن رضوان احمد تھے کہ جب تک اس روئے زمین پر رہے سچ اور سچ کے سوا کچھ نہیں بولا اور نہ لکھا۔ عظیم آباد میں شائع شدہ ان کے اداریوں کا مجموعہ بعنوان ''مجھے بولنے دو'' 1982 میں شائع ہوا جو بہار کی اردو صحافت کی دنیا میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ بہار کے روزناموں میں ''عظیم آباد ایکسپریس'' نے رضوان احمد کی صحافتی صلاحیت اور بے لاگ اظہار جرأت کے سبب اردو کے بے شمار اخبارات کے درمیان اپنا منفرد شناخت نامہ مرتب کیا۔ ان کی صحافتی زندگی پر اشرف استھانوی نے ایک کتاب بھی قلم بند کی اور مناظر عاشق ہرگانوی کی بھی اسی موقع پر ایک کتاب کا اجرا ہوا جس میں رضوان کی صحافتی زندگی، ان کی نجی زندگی کے شب و روز میں رونما ہونے والے واقعات و حادثات اور ان کی افسانوی کائنات پر بھرپور فوکس کیا گیا۔

اس موقع پر مشہور سیاست داں اور اردو دوست شائل نبی کے روزنامہ ''راہ رو'' کی یاد آرہی ہے جو کاشانہ کوٹھی بھنور پوکھر کے کیمپس سے نکلتا تھا۔ ایک زمانے میں شائل صاحب کا یہاں دفتر ہوا کرتا تھا۔ ''راہ رو'' میں خبروں کے علاوہ اردو شعر و ادب سے وابستہ تحریروں کو بھی خصوصیت سے شائع کیا جاتا تھا۔ عظیم آباد میں اردو کی نئی نسل کو آگے بڑھانے میں شائل نبی پیش پیش رہا کرتے تھے۔ ''امروز ہند'' کی بھی یاد آرہی ہے جو غالباً شاہد رام نگری کی سرپرستی میں نکلتا تھا۔ یہ 1977 کا زمانہ تھا لیکن پھر اس کی اشاعت پھلواری کوٹھی سے ہونے لگی۔ غالباً 1992 میں یہ روزنامہ جاوید محمود کی ادارت میں شائع ہونے لگا۔ ان دنوں اسے آن لائن دیکھا جاسکتا ہے۔

اردو صحافت کی دنیا کے بہار سے موجودہ شائع ہونے والے اردو روزناموں کی ایک طویل فہرست ہے لیکن جو اخبارات بہار کی اردو آبادی کے درمیان دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں، ان میں روزنامہ ''پندار'' کو بھی اہم مقام حاصل ہے۔ اس کا حلقہ بھی وسیع ہے۔ 1974 سے 1988 تک یہ ہفت روزہ کی شکل میں اردو بازار کی زینت بنتا رہا۔ 1988 کے آس پاس ہی یہ روزنامہ

ہو گیا ان دنوں یہ ملٹی کلر میں چھپنے لگا ہے۔ ملکی اور بین الاقوامی خبروں پر بھی اس کی گہری نظر ہے۔ بہار کی سیاسی اتھل پتھل اور انتخابی مسائل کے بیباکانہ اظہار میں یہ دوسروں سے پیچھے نہیں۔ اس کے بانی مدیر اے کے احسانی صاحب ہیں اور مالک جہاں آرا صاحبہ ہیں۔ لیکن اس کی ادارت سے جڑے بہار کے معتبر اردو صحافی ڈاکٹر ریحان غنی نے اس کی خبروں کی اشاعت پر سنجیدہ نظر ڈالتے ہوئے "پندار" کے قارئین کے لیے اسے قابل مطالعہ بنا دیا ہے۔ ادبی و شعری سرگرمیوں کو بھی خوبصورتی سے شائع کیا جاتا ہے۔ اس کے اداریے بھی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ بہار ہی سے اردو روزنامہ "انقلاب" جاری ہوا۔ پہلے یہ اخبار ممبئی کے حوالے سے جانا جاتا تھا لیکن بہت کم وقت میں "انقلاب" نے بہار میں بھی اپنا مقام بنا لیا ہے۔ اس کے بھی قارئین کا ایک بڑا حلقہ ہے اور احمد جاوید کی صحافتی صلاحیتوں کا خوبصورت نمونہ ہے۔ ان سب کے علاوہ "راشٹریہ سہارا" بھی بہار کی اردو آبادی میں تعارف کا محتاج نہیں۔ سیاسی سماجی مسائل کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کی سرگرمیوں کو بھی اس کے صفحات پر نمایاں مقام دیا جاتا ہے۔ سید شہباز اور واحد رحمانی نے اسے بہار کے عوام کی آواز بنانے میں ہمیشہ محنت کی ہے اور کامران گزرے ہیں۔ "فاروقی تنظیم" کا بھی ذکر لازمی ٹھہرا۔ بنیادی طور پر اس کے روزنامے کی اشاعت رانچی سے 1992 میں ہوئی۔ ریاست جھارکھنڈ کا یہ ہر دلعزیز روزنامہ تو ہے ہی ان دنوں پٹنہ سے بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ اس کے موجودہ ایڈیٹر محمد ظفر علی ہیں جنھوں نے اپنے والد فاروق حسینی کی یاد میں 1984 میں ہی اسے جاری کیا۔ اس کے ادارتی بورڈ سے منسلک رہنے والے صحافیوں میں خورشید پرویز صدیقی کا نام بطور خاص لیا جا سکتا ہے۔ بہار سے ایک روزنامہ "ہمارا سماج" بھی اپنی خبروں سے قارئین اردو کو باخبر کرتا رہا ہے۔ بہار میں اردو کے کئی نامور صحافیوں کی خدمات رہی ہیں جن پر تفصیل سے اظہار کرنا یہاں مناسب نہیں۔

[illegible] سرمایہ داروں اور سیاسی بازیگروں کی ملی بھگت سے صحافت کا پیشہ حد درجہ متاثر [illegible] ہے کہ صحافت رائے عامہ تیار کرنے میں اہم رول ادا کرتی رہی ہے۔ [illegible] سب زندہ جاوید [illegible] صحافت [illegible] ہے۔ اس سے خون [illegible] کرتا ہے۔ صحافت [illegible] سے [illegible] ہے [illegible] شاندار صحافتی سرگرمیوں سے موازنہ نہیں کر سکتے۔ ملک کے قوانین اور قارئین کو

بحسن وخوبی سمجھتے اور اس پر عمل کرتے ہوئے خیر وشر کی اس جنگ میں ایک صحافی کا کردار منصفانہ اور حقیقت پسندانہ ہونا چاہیے۔ لاقانونیت اور غیر سماجی عناصر کے خلاف کھل کر قلم اُٹھانا صحافی کی منصبی ذمہ داری ہے۔ ملک کے کشیدہ ماحول کو خوشگوار بنانے میں ایک صحافی اہم خدمت انجام دے سکتا ہے لیکن افسوس اکیسویں صدی کے سرمایہ دارانہ نظام نے حرف و لفظ کی تہذیبی پاسداریوں کے مضبوط ستون کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ اس مقام پر اردو صحافیوں کو اپنا احتساب کرنے کی ضرورت ہے۔ مادی آلائشوں نے ہمارے چند صحافیوں کو Establishment کا بھونپو بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس موضوع پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں تفصیل میں جائے بغیر بھی اپنی بات کہی جا سکتی ہے۔ ہاں! یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ لاشعوری طور پر ہی سہی ہم سب زرد صحافت کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔

اب یہ الگ بات کہ اردو اخبارات معاشی بحران سے دوچار رہے ہیں۔ دوسری زبانوں کے اخبارات کی طرح اشتہارات حاصل کرنے کے لیے اردو اخبارات کے مالکان یا اردو صحافت والے بھی دوڑ بھاگ کرتے رہے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ بہار میں بھی اردو صحافیوں کا اب کوئی واضح تعمیری نقطۂ نظر نہیں رہا ہے۔ اردو صحافت کا وقار اور اس کا معیار بلند ہو یہ صرف صحافیوں کی ہی ذمہ داری نہیں بلکہ اس سے منسلک افراد بھی جواب دہ ہیں۔ اب اردو اخبارات کے مالکان / پروپرائٹر کی بنیادی ترجیحات سے کون واقف نہیں؟

برقی میڈیا کی یلغار اور سیاسی بالادستی کے باوجود بہار میں اردو صحافت کا ماضی و حال آئینے کی طرح چمک رہا ہے۔ اس کا معیار اور گراف بلندیوں کو چھوتا ہوا سا محسوس ہو رہا ہے۔ صحافت کی زبان کوئی بھی ہو ایک بیباک، ایماندار اور حقیقت آشنا صحافی کا ہمارے ملک اور معاشرے میں ہمیشہ اونچا مقام رہا ہے۔ ہر جگہ صحافیوں کو احترام سے دیکھا جا سکتا ہے۔ بہار میں اردو صحافت کے نشیب و فراز اور اس کے باطن کی سیاحی کی داستان کو محض چند سطروں، صفحوں اور [illegible] بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے خاصا وقت درکار ہے۔ مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ صحافت اردو اس بات کی گواہ ہے کہ بہار میں اردو صحافت کے بیشتر خادم سے اردو کے بعض [illegible] ضمیر صحافیوں نے اپنی اعلیٰ علمی صلاحیت، بشری نیکیوں اور اپنی منصبی ذمہ داریوں کا اعلیٰ ترین معیار

وقار پیش کرتے ہوئے اپنی صحافتی شخصیت کو ہماری نگاہ اور پوری اردو آبادی کے درمیان قابل تقلید بنادیا ہے اور یہ ثابت بھی کر دیا ہے۔

دربھنگہ میں اردو صحافت

ڈاکٹر مشتاق احمد

جہاں تک بہار میں اردو صحافت کا تعلق ہے تو پہلے یہ بنگال کا ایک حصہ تھا اور کلکتہ سے قریب ہونے کی وجہ سے وہاں کی سماجی و سیاسی سرگرمیوں سے دوسری ریاستوں کے مقابلے اس کا زیادہ اثر انداز ہونا فطری عمل تھا۔ لہٰذا اردو صحافت کے باب میں بہار کا پہلا اردو اخبار ''نورالانوار'' 1853 میں آرہ سے نکلنا شروع ہوا۔ اس کے مالک محمد ہاشم اور منتظم سید خورشید احمد تھے۔ اس کے بعد ''ہرکارہ پٹنہ'' کی اشاعت 1855 سے ہوئی۔ بہار کا پہلا اردو روزنامہ بھی ''دینی بہار'' آرہ سے ہی 1876 میں شائع ہوا۔ ہم اردو والوں کے لیے ایک قابل فخر بات یہ ہے کہ بہار میں صحافت کا آغاز ہی اردو اخبار کی اشاعت کے ساتھ ہوا ہے۔ ''بہار میں اردو صحافت'' یا ''بہار میں صحافت'' کے موضوعات پر تحقیق کرنے والوں نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ بہار میں صحافت کا آغاز اردو اخباروں کی اشاعت سے ہوا ہے۔

بارھویں صدی سے پہلے جب ''متھلا'' ایک ریاست تھی اس وقت دربھنگہ اس کا دل کہلاتا تھا۔ لسانی اعتبار سے یہ سنسکرت اور میتھلی زبان کا گہوارہ رہا ہے۔ میتھلی زبان کے بابائے آدم

کوی ودیاپتی کی کرم بھومی دربھنگہ ہی تھی۔ لیکن بارھویں صدی سے اس علاقے میں فارسی اور ریختہ کی آواز بھی گونجنے لگی۔ فیروز شاہ تغلق کی آمد کے بعد دربھنگہ فارسی کا ایک اہم مرکز بن جاتا ہے اور پندرھویں صدی میں ''ریختہ'' کی جڑیں اتنی مستحکم ہو جاتی ہیں کہ حضرت قاضی شطاری (1495) اپنے مریدوں کو ریختہ میں ہی درس ہدایت دیتے ہیں۔ سولھویں اور سترھویں صدی میں ''ہندوستانی'' یعنی اردو کا چلن اتنا عام ہو جاتا ہے کہ یہاں کی علاقائی زبان ''میتھلی'' پر اثر انداز ہونے لگتی ہے اور اٹھارھویں صدی کے آتے آتے دربھنگ فارسی و اردو کا ایک اہم مرکز بن جاتا ہے۔ اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ یہاں کے ملا ابوالحسن کو مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے دربار میں شاہی اتالیق کا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ وہی ملا ابوالحسن ہیں جو اورنگ زیب کی دختر زیب النسا مخفی کے استاد خاص تھے اور ''فتاویٰ عالمگیری'' کے مرتبین میں شامل تھے۔ غرض کہ اٹھارھویں صدی میں اردو نہ صرف دربھنگہ بلکہ پورے متھلانچل میں اپنی شناخت قائم کر لیتی ہے اور انیسویں صدی میں تو فارسی و اردو میں تخلیقی ادب فروغ پانے لگتا ہے۔ ایودھیا پرساد بہار کی کتاب ''ریاض ترہت'' (1868)، بہاری لال فطرت کی تاریخ ''آئینہ ترہت'' (1883)، شہزادہ زبیر الدین گورگانی کی ''موج سلطانی'' (1884) اور ''چمنستان سخن'' (1898) اور مرشد حسن کامل کی ''مسدس ثلاثہ'' (1888)، وغیرہ تاریخ اردو ادب کا حصہ بن جاتی ہیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ شہزادہ زبیر الدین گورگانی بہادر شاہ ظفر کے پوتے یعنی مرزا بخت کے بیٹے تھے۔ 1857 کی جنگ آزادی کے بعد جب انگریز مغلیہ خاندان کے چراغوں کو ایک ایک کر کے بجھا رہے تھے تو گورگانی نے دربھنگہ کے مہاراجہ رامیشور سنگھ کے یہاں پناہ لی اور اپنی زندگی کے آخری ایام تک یہیں رہے۔

جس وقت متھلانچل میں اردو فروغ پا رہی تھی اس وقت یہ کسی خاص مذہب یا طبقے تک محدود نہیں تھی۔ مذکورہ مصنفین بہاری لال فطرت اور ایودھیا پرساد بہار کے علاوہ بہت سے ایسے ادبا تھے جو ہندو تھے مگر ان کی مادری زبان اردو تھی۔ مختصر یہ کہ دربھنگہ کی زمین اور یہاں کی تہذیب نے کبھی لسانی تعصب کو قبول نہیں کیا۔ جب ہم دربھنگہ میں اردو صحافت کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہاں اردو صحافت کا چراغ بیسویں صدی کے آغاز کے

ساتھ روشن ہوتا ہے۔ یہاں سے پہلا اردو ہفتہ وار ''مسیحا'' 1902 میں منظر عام پر آتا ہے۔ اس کے مدیر و مالک حکیم ابوالحسنات ناصر دہلوی تھے۔ وہ ایک طبیب تھے۔ 1901 میں دہلی سے دربھنگہ آئے تھے۔ انھوں نے اپنا ایک مطب شکری میں اور دوسرا قلعہ گھاٹ دربھنگہ میں کھولا تھا۔ یہیں سے انھوں نے ''مسیحا'' شروع کیا لیکن دو برس کی اشاعت کے بعد یہ بند ہو گیا۔ اس میں علاقائی خبروں کے ساتھ ساتھ دہلی کی سرگرمیاں اور طبی مضامین جگہ پاتے تھے۔ ''مسیحا'' کے دم توڑنے کے بعد حکیم سید عبدالعظیم نے شکری سے 1907 میں ''ندائے قوم'' ہفتہ وار جاری کیا۔ مگر یہ بھی چار شماروں کے بعد اپنی آواز کھو بیٹھا۔ اس کا پانچواں قلمی شمارہ پریس بھی نہیں جا سکا۔ تقریباً دو دہائی کی خاموشی کے بعد فروری 1928 میں سید محمد عبدالقیوم قتیل دربھنگوی نے ''پروانہ'' جاری کیا۔ اس کے مدیر سید محمد طٰہٰ فکری الٰہی تھے۔ یہ ایک ہفتہ وار اخبار تھا اور اس میں اس وقت کے نامور قلمکاروں کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ ان میں ملا رموزی قابل ذکر ہیں۔ مگر اس اخبار کو بھی دو سال کی زندگی ہی نصیب ہوئی۔ چونکہ اب تک مولانا حسرت موہانی کا رسالہ ''اردوئے معلیٰ''، مولانا ابوالکلام آزاد کا ''لسان الصدق'' اور ہفتہ وار ''الہلال'' و ''البلاغ''، مولوی مجید حسن کا سہ روزہ ''اخبار مدینہ'' اور مولانا ظفر علی خاں کا ''زمیندار'' وغیرہ کی اشاعت ہو چکی تھی اور اردو صحافت کی ایک سمت بھی طے ہو چکی تھی۔ اس لیے اب جو بھی اخبار یا رسالہ جاری ہوتا اس میں ان مذکورہ رسائل و جرائد کے پیٹرن کو اپنانے کی کوشش کی جاتی۔ دربھنگہ سے شائع ہونے والے ''البدر'' اور ''بشریٰ'' میں اس کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ ''البدر'' کی اشاعت 1929 میں شروع ہوئی۔ اس کے مالک و مدیر محمد ہاشم تھے۔ جبکہ ''بشریٰ'' بھی اسی سال شروع ہوا اور اس کے مالک و مدیر سید حفاظت علی فائق رزاقی تھے۔ لیکن یہ دونوں رسالے ایک دو شماروں کے بعد ہی دم توڑ گئے۔ پھر رزاقی نے ہی ماہنامہ ''آفتاب'' جاری کیا اور وہ بھی صرف دو ماہ زندہ رہ سکا۔ اس کے بعد ایک طویل عرصے تک یہاں صحافت کی دنیا ویران نظر آتی ہے۔ پھر 1934 میں دارالعلوم احمدیہ سلفیہ کا مجلہ ''سلفیہ'' شروع ہوتا ہے۔ اس کے مالک و مدیر عبدالحفیظ گیاوی تھے۔ یہ رسالہ کئی برسوں تک جاری رہا۔ اس کے بعد ''[illegible]'' 1941 سے شائع ہوا۔ اس کی مجلس ادارت میں شیخ مظفر پوری، حسین سید اور عبدالعظیم جیسے شامل تھے۔ اس کے مالک اعجاز ستوری تھے۔ اس کے قلیل تین شمارے منظر عام پر آئے۔ پہلا

جون 1941، دوسرا جولائی 1941، اور تیسرا اگست 1941 کے بعد دم توڑ گیا۔ ''ہمالہ'' کو بہت کم وقت میں ہی بڑی شہرت مل گئی تھی کہ اس کے قلمی معاونین میں جوش ملیح آبادی، حسرت موہانی، جمیل مظہری، مولانا آزاد سبحانی، سلام مچھلی شہری اور ثاقب کانپوری شامل تھے۔ سید سلیمان ندوی کا مشہور زمانہ مضمون ''مسلمانوں کی آئندہ تعلیم'' ہمالہ میں ہی تین قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ 1941 میں ہی ایک رسالہ ''حسن و شباب'' منظر عام پر آیا۔ اس کے مالک و مدیر مطیع الرحمٰن غوثی تھے اور اس کی ادارت میں ڈاکٹر وہر ناصری بھی شامل تھے۔ اس کے بعد دارالعلوم سلفیہ نے اپنے جریدہ ''سلفیہ'' کا نام بدل کر 1948 میں ''الہدیٰ'' کر دیا اور اس کے ایڈیٹر عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی بنائے گئے۔ ''الہدیٰ'' اب بھی شائع ہو رہا ہے۔ البتہ اس کی اشاعت میں تسلسل برقرار نہیں رہتا۔ دربھنگہ سے 1949 میں ایک ادبی رسالہ ''نئی کرن'' جاری ہوا۔ اس کی ادارت میں مظہر امام اور منظر شہاب شامل تھے۔ اس کے بھی تین شمارے ہی شائع ہو سکے۔ تیسرا اور آخری شمارہ فروری 1951 کا تھا۔ 1949 میں ہی یہاں سے ایک دوسرا معیاری ادبی رسالہ ''صبح زندگی'' شروع ہوا۔ اس کے مالک محمد ہاشم اور مدیران کے بیٹے سلطان احمد تھے۔ ''صبح زندگی'' کے آٹھ شمارے منظر عام پر آئے اور پھر اس کی بھی شام ہو گئی۔ 1953 میں جسٹس شمیم سیفی نے ''افق'' کا اجرا کیا۔ اس کے بھی صرف تین شمارے ہی شائع ہوئے۔ ایک لمبے وقفے کے بعد جون 1960 میں مجاز نوری نے ''رفتار نو'' جاری کیا جس کی مجلس ادارت میں سید احمد شمیم، منظر امام اور خود مجاز نوری شامل تھے۔ اس کے پانچ شمارے تسلسل کے ساتھ شائع ہوئے اور آخری شمارہ جنوری 1962 میں سالنامہ کی صورت میں شائع ہوا۔ مجاز نوری بعد وقفے وقفے سے اس کا یادگاری شمارہ شائع کرتے رہے۔ اس کا ایک شمارہ اپریل 1972 میں منظر عام پر آیا۔ پھر مجاز نوری اسے ''تحفۂ ادب'' کے نام سے نکالنے لگے۔ مگر اس کے بھی محض چار شمارے ہی منظر عام پر آ سکے۔

سال 1962 دربھنگہ کی صحافت کے لیے تاریخی حیثیت رکھتا ہے کہ آج کا مقبول عام روزنامہ ''قومی تنظیم پٹنہ'' دربھنگہ سے ہی ایک ہفتہ وار کی صورت میں شروع ہوا تھا۔ اس کے مالک و مدیر ایس ایم عمر فرید تھے۔ ایک دہائی کے بعد ''قومی تنظیم''، پٹنہ منتقل ہو گیا اور روزنامہ کی صورت اختیار کر گیا۔ جناب ایس ایم عمر فرید مرحوم کے بعد جناب ایس ایم اشرف فرید، جناب ایس ایم

اجمل فرید مرحوم، جناب ایس ایم طارق فرید برادران نے اپنی محنت و مشقت سے اس اخبار کو ایک جہان نو بخشا جو عصر حاضر میں قومی سطح پر اپنی ایک مستحکم شناخت رکھتا ہے۔ اب پٹنہ کے علاوہ رانچی اور لکھنؤ سے بھی یہ اخبار شائع ہو رہا ہے۔ بہار کی اردو صحافت میں اس اخبار کو ایک غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔

دربھنگہ کی ایک ادبی انجمن ''حلقۂ توازن'' نے 1973 میں ایک مجلّہ ''توازن'' شروع کیا۔ اس کا پہلا اور آخری شمارہ جنوری 1974 میں منظر عام پر آیا۔ اس کے مرتب ڈاکٹر نجیب اختر اور نگراں پروفیسر قمر اعظم ہاشمی تھے۔ مجلس مشاورت میں مرتضیٰ اظہر رضوی، شمیم سیفی، لطف الرحمٰن اور شبیر احمد شامل تھے۔ پھر ایک طویل خاموشی کے بعد 1978 میں شمس شادمانی اور نقی امام نے ''کردار'' شائع کیا۔ یہ ایک ڈائجسٹ تھا اور پانچ شماروں کے بعد اپنی روشنی کھو بیٹھا۔ اسی سال مولانا عبدالحسنان کی ادارت میں ایک مذہبی رسالہ ''اشرف العرفان'' شائع ہوا۔ اچار یہ شوکت خلیل نے 1984 میں پندرہ روزہ ''آگ کا دریا'' جاری کیا۔ اس کا پہلا شمارہ 15 جولائی 1984 کا تھا۔ چار شماروں کے بعد ہی یہ دریا بھی خشک ہو گیا۔ البتہ اسی سال مطیع الرحمٰن نعمانی نے ''جدید سلسلۂ جنگ'' کا آغاز کیا۔ مگر تسلسل برقرار نہیں رکھ سکے اور وقفے وقفے سے تین چار سالوں تک یہ نکلتا رہا، پھر دم توڑ گیا۔ ڈاکٹر نذیر انجم نے 1997 میں لوام، دربھنگہ سے ایک ماہنامہ ''آواز نو'' شروع کیا جو چار برس تک پابندی سے شائع ہوتا رہا، پھر اس کا نکلنا بند ہو گیا۔ 2000 میں راقم الحروف (ڈاکٹر مشتاق احمد) اور نذیر انجم نے مل کر ''آواز نو'' کو ہفتہ وار کی صورت میں شائع کیا۔ اس کا پہلا شمارہ جنوری 2000 کا تھا۔ اس کے بعد 29 شمارے تک اس کا تسلسل برقرار رہا اور قومی سطح پر اس کی آواز سنائی دینے لگی تھی کہ کسی ناگزیر وجہ سے یہ بھی بند ہو گیا۔ کچھ دنوں کے بعد ڈاکٹر نذیر انجم نے ہفتہ وار ''آواز نو'' کو تنہا شروع کیا مگر تین چار شماروں کے بعد یہ پھر بند ہو گیا۔

21 ویں صدی دربھنگہ کی صحافت کے لیے ایک نیا پیغام لے کر آئی۔ 2001 کی ابتدا میں یہاں سے دو معیاری ادبی رسالے ''جہان اردو'' جس کے مالک و مدیر ڈاکٹر مشتاق احمد اور ''تمثیل نو'' مالک و مدیر ڈاکٹر امام اعظم ہیں۔ دربھنگہ کی ادبی صحافتی تاریخ میں یہ دونوں رسائل بایں معنی سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں کہ گذشتہ پندرہ برسوں سے تواتر کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں

اوران کی تابناکی ہنوز برقرار ہے۔ ''جہانِ اردو'' کے اب تک 60 شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں مولانا ابوالکلام آزاد نمبر، بہادر شاہ ظفر نمبر، علامہ اقبال نمبر، فیض احمد فیض نمبر، پروفیسر وہاب اشرفی نمبر اور بہار کے افسانہ نگار نمبر دستاویزی حیثیت کے حامل ہیں۔ اسی طرح ''تمثیل نو'' کے بھی میتھلی نمبر اور صحافت نمبر قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں ادبی رسائل کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے نامور شاعر وادیب مظہر امام اپنی کتاب ''تنقید نما'' میں لکھتے ہیں:

> ''ایک رسالہ 'جہانِ اردو' ڈاکٹر مشتاق احمد کی ادارت میں نکلتا ہے۔ دوسرا رسالہ 'تمثیل نو' جس کے مدیر ڈاکٹر امام اعظم ہیں۔ اس نے اردو کے نمایاں رسالوں میں اپنی جگہ بنالی ہے اور اسے ہندوستان کے علاوہ پاکستان اور اردو کی نئی بستیوں میں ذوق وشوق سے پڑھا جاتا ہے۔''
>
> (ص:246)

سال 2006 میں منصور خوشتر نے دربھنگہ ٹائمس شروع کیا جو وقفے وقفے سے شائع ہوتا رہتا ہے اور اب بھی جاری ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کے تعلیمی اداروں سے بھی وقتاً فوقتاً رسائل و جرائد شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان میں شفیع مسلم ہائی اسکول، صغریٰ گرلس ہائی اسکول، ملت کالج، ڈاکٹر ذاکر حسین ٹیچرس ٹریننگ کالج، شعبۂ اردو متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ کے مجلّے قابل ذکر ہیں۔

غرض کہ دربھنگہ کی اردو صحافت ایک صدی کا سفر طے کر چکی ہے اور اس سفر طویل میں دربھنگہ کی اردو صحافت نے نہ صرف اردو زبان وادب بلکہ دیگر علوم کے فروغ میں بھی اپنا کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ عہد حاضر میں دربھنگہ اردو کا ایک اہم مرکز بن گیا ہے۔ یہاں سے نہ صرف دو معیاری ادبی رسالے ''جہانِ اردو'' اور ''تمثیل نو'' تواتر کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں بلکہ نئی نسل کی ایک اچھی تعداد میدان صحافت میں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی ہے۔

مختصر یہ کہ اردو صحافت کی تاریخ کو جامع اور وقیع بنانے کے لیے یہ لازمی ہے کہ علاقائی صحافت کی تاریخی اہمیت کو تسلیم کیا جائے، کیونکہ علاقائی رسائل و جرائد میں نہ صرف زبان و ادب کے خزانے دستیاب ہیں بلکہ سماجی، سیاسی، مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی مطالعے کے لیے اہم سراغ کا پتہ دیتے ہیں۔ ہم قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند نئی دہلی کے ارباب حل

وعقد، بالخصوص کونسل کے ڈائریکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کے تئیں اظہار تشکر پیش کرتے ہیں کہ کونسل ان کی سرپرستی میں علاقائی صحافت کی گمشدہ کڑیوں کی تلاش کے لیے ملک کی مختلف ریاستوں میں اردو صحافت کے موضوع پر سمینار اور مذاکرے کا انعقاد کررہی ہے، جس سے اردو صحافت میں گراں قدر اضافے کے امکانات روشن ہوئے ہیں۔

(ج) مہاراشٹر

مہاراشٹر میں اردو صحافت

1948 تا 2015

جاوید جمال الدین

ممبئی شہر 14ویں صدی تک ہندو راجاؤں کے قبضے میں رہا اور پھر اس پر مسلمانوں کا تسلط ہوگیا۔ انھوں نے ممبئی کو پرتگال کے حوالے کر دیا تھا۔ مسلم حکمرانوں کے دور میں اردو کو فروغ حاصل ہوا۔ اردو زبان نے ممبئی کی سرزمین پر جنم نہیں لیا ہے تاہم اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ جس زمانے میں شمالی ہند کے علاحدہ علاحدہ علاقوں اور شہروں میں اردو زبان اور ادب اپنی ارتقائی منزلیں طے کر رہے تھے، ممبئی میں بھی زبان وادب کے لیے کام شروع ہو چکا تھا۔ ممبئی میں متعدد ایسے نثر نگار اور شاعروں کے نام سامنے آئے اور کئی تصانیف، تالیف اور اخبارات دستیاب ہوئے ہیں جن سے ادبی دنیا لاعلم تھی۔ انیسویں صدی کے آغاز سے اردو کی ادبی سرگرمیوں کے عروج پر ہونے کے نشانات ملے ہیں۔ اسی زمانے میں اردو صحافت کی ہلچل نظر آتی ہے۔

ممبئی اور مہاراشٹر میں سب سے پہلے کس اردو اخبار کا اجرا کب ہوا، اس بارے میں سردست کچھ کہنا مشکل ہے۔ برطانوی دور میں فارسی کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل تھی، اس

لیے ممبئی میں بھی فارسی کے تین اخبارات آئینۂ سکندر، احسن الاخبار، اور مجمع الاخبار شائع ہوتے تھے اور ان ہفت روزہ اخبارات نے 'اردو ضمیمہ' بھی شائع کرنے شروع کر دیے تھے۔ 'جنوبی ہند میں اردو صحافت' نامی کتاب میں ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال رقمطراز ہیں کہ 'آئینۂ سکندر اگرچہ فارسی اخبار تھا، لیکن اس کا اردو ضمیمہ شائع کیا گیا۔ اخبار ہر جمعرات کو شائع ہوتا تھا۔

مشہور خاتون محقق ڈاکٹر میمونہ دلوی نے 'بمبئی میں اردو' نامی اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ممبئی کا سب سے قدیم اردو اخبار جو دستیاب ہوا وہ 'کشف الاخبار' ہے۔ 1855 میں اس کا اجرا ہوا۔ ممبئی میں کتب خانہ محمدیہ جامع مسجد اور کریمی لائبریری انجمن اسلام میں اس اخبار کی کئی جلدیں 1960 تک محفوظ تھیں، لیکن اب دیمک کی نذر ہو چکی ہیں۔ البتہ چند پرچے اب بھی دستیاب ہیں اور انھیں دیکھا جا سکتا ہے۔ ماہنامہ 'آجکل' نئی دہلی کے مئی 1993 کے شمارے میں محمد شعائر اللہ خان نے 'اردو صحافت کی گمنام تاریخ' میں لکھا ہے کہ کلکتہ کے ایک ماہنامہ شعری گلدستہ 'نتیجۂ سخن' نے فروری 1883 کے شمارے میں اخبارات و رسائل کی ایک فہرست مدیر، مالک، مہتمم اور مقامات اشاعت کے ساتھ شائع کی ہے۔ اس فہرست کو اردو صحافت کی مختصر ابتدائی تاریخ کہا جا سکتا ہے۔ اس فہرست میں شامل 107 / اردو اخبارات میں سے سات اخبار ممبئی کے ہیں۔ ان میں کشف الاخبار (1855)، ارمغان (1881)، خادم ہند (1883)، سرپنچ (1883)، ابوالنظر نما (1883)، سراج خلوت اور خیر خواہ اسلام (1888) شامل ہیں۔ ان میں دو اخبارات سراج خلوت اور خادم ہند ڈاکٹر میمونہ دلوی کی کتاب کی فہرست میں شامل نہیں ہیں۔

'برصغیر میں اردو صحافت' پر اپنے ایک جائزے میں مشہور صحافی اور محقق جناب جے پی بھٹناگر رقمطراز ہیں:

> "1857 کے بعد دہلی، آگرہ، بریلی، لاہور، میرٹھ، سیالکوٹ، کلکتہ، بنارس، ملتان، شملہ، اور بمبئی سے بھی ماہنامہ ہفتہ روزہ اور روزناموں کی شکل میں اخبارات شائع ہونے لگے۔ 'مجمع الاخبار' اور 'کشف الاخبار' بمبئی کے قدیم اخبار کہے جا سکتے ہیں۔"

ممبئی میں اولیت کا سہرا کس اخبار کے سر ہے، اس بارے میں کوئی تفصیل نہیں ملتی

ہے۔ اختر شہنشاہی میں ممبئی کے اردو اخبارات کی فہرست میں 1834 میں محمدی نامی اخبار کا ذکر ملتا ہے۔ جناب ناخدا محمد علی روگھے اس کے مالک تھے۔ عبدالملک محمد صادق کی ادارت میں نکلنے والے اس اخبار کے پرنٹر عبدالوہاب اور پبلشر شیخ محمد بتائے گئے ہیں۔ گارساں دتاسی نے 2 دسمبر 1854 کو اردو اخبارات کی تاریخی ترقی پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ 'بمبئی میں تین یا چار ہندوستانی اخبار ہیں جو عام طور پر سب ہندیوں کے لیے ہیں۔ وہ خاص کر مسلمانوں کے لیے اردو میں شائع ہوتے ہیں۔ ان میں 'بمبئی کا ہرکارہ' اور 'تازہ بہار' شامل ہیں۔

ان حقائق کی روشنی میں ثابت ہوتا ہے کہ ممبئی میں اردو صحافت کو پونے دو سو سال ہو چکے ہیں لیکن اگر انیسویں صدی کے آغاز میں شائع ہونے والے فارسی اور عربی اخبارات کے اردو ضمیموں کو شامل کر لیا جائے تو اردو صحافت کی عمر 190 سال سے تجاوز کر گئی ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ایک بڑی تعداد میں اردو اخبارات منظر عام پر آئے۔ انیسویں صدی کے آخر میں شائع ہونے والے چند ایک ہفت روزہ اخبارات نے اپنا چولا بدل لیا اور روزناموں میں تبدیل ہو گئے۔

مشہور مجاہد آزادی جناب نصرت اللہ عباسی نے ممبئی کی اردو صحافت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

> ''پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں بیسویں صدی کا پہلا اردو روزنامہ 'نصرت' منظر عام پر آیا۔ زمانہ جنگ اور سنسنی خیز جنگی خبروں نے اس روزنامے کو فروغ دیا، لیکن اس ننھے منے اخبار نے کل ہند مرکزی خلافت کمیٹی کے ترجمان 'روزنامہ خلافت' کے اجرا کے بعد دم توڑ دیا۔ مدت تک صرف روزنامہ خلافت کا پرچم بمبئی پر لہراتا رہا مگر نہرو رپورٹ کے شائع ہونے کے بعد رپورٹ کے حامیوں نے کانگریس کی پالیسی اور نقطۂ نظر کی نشر و اشاعت کے لیے کئی اخبار نکالے۔ جناب معین الدین حارث جو کہ مجاہد آزادی بھی تھے، نے روزنامہ 'اجمل' اور حافظ بہادر خان نے روزنامہ 'بلال' کا اجرا کیا۔ دونوں اخبارات اس دور میں عوام کے خیالات کے

ٹکراؤ کی بنا پر مقبولیت حاصل کرنے میں ناکام رہے۔"

مولانا امداد صابری اور میمونہ دلوی نے بیسویں صدی کے آغاز میں شائع ہونے والے چند اخبارات امیر الاخبار (1901)، مولانا پنچ (1902)، دکن ریویو (1906)، اردو ڈیلی (1907)، اقبال (1910)، ڈیلی میل اور اجمل وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیانی عرصے میں اور جنگ کے دوران ممبئی میں متعدد نئے اخبارات کا اجرا عمل میں آیا۔ ان میں روزنامہ آفتاب، جمہوریت، اقبال، ہندوستان، اجمل، ہلال، الہلال اور انقلاب شامل ہیں۔ خلافت تحریک کے دوران روزنامہ خلافت کا اجرا ہوا۔ خلافت کی مقبولیت کے سامنے بہت سے اہم اخبارات سر نہ اٹھا سکے۔

روزنامہ خلافت: راقم الحروف نے خلافت ہاؤس واقع جنوبی ممبئی کے بائیکلہ ممبئی 27 میں روزنامہ خلافت کی 1926 اور اس کے بعد کے دور کی فائلوں کا مطالعہ کیا جو نہایت خستہ حالت میں ہیں۔ 1926 میں جناب قمر احمد بی اے ایل ایل بی اخبار کے ایڈیٹر اور محمد عبدالرحمان پرنٹر پبلشر تھے۔ خلافت پریس میں چھپ کر دفتر روزنامہ خلافت، سلطان مینشن، ڈونگری ممبئی سے شائع کیا جاتا تھا۔ اس شمارے میں جلد نمبر 5 تحریر تھا۔ صفحہ اول پر ترکی میں بدمعاشوں کی کارروائی، سوتمر حجاز بوجہ ملتوی اور فساد کے بعد لکھنؤ کی صورتحال پر تفصیلی خبریں شائع کی گئی تھیں۔ خلافت کے 13 اگست 1939 کے شمارے میں صفحہ اول پر 'بیادگار جشنِ اسلام' مولانا شوکت علی اور مجلس ادارت میں جناب رئیس احمد جعفری ندوی اور جناب قطب الدین صدیقی علیگ کے نام تحریر نظر آئے۔ اخبار میں مقامی خبروں پر بھی کافی توجہ دی گئی تھی۔

جناب رئیس احمد جعفری کو مولانا شوکت علی ممبئی لائے اور خلافت کی ادارت سونپ دی۔ اخبار سے علاحدگی کے بعد جعفری نے روزنامہ ہندوستان کا اجرا کیا۔ ملک کی آزادی اور تقسیم کے دور میں موصوف روزنامہ انقلاب کی مجلس ادارت میں شامل رہے، لیکن بعد میں پاکستان ہجرت کر گئے۔ روزنامہ خلافت 1970 کی دہائی تک شائع ہوتا رہا۔ اس کی چند فائلیں خلافت ہاؤس میں موجود تھیں اور نئی عمارت کی تعمیر کے دوران ان فائلوں کو عمارت کی چھت پر پھینک دیا گیا جہاں میں نے ان کا مطالعہ کیا تھا۔ اس بارے میں مرحوم ڈاکٹر رفیق زکریا سے بھی گفتگو ہوئی تھی اور ان

کی ہدایت کے باوجود عہدیداران نے توجہ نہیں دی۔ ایک اور اخبار روزنامہ آفتاب ایک پیسے کے اخبار کے نام سے مشہور تھا۔ اس یک ورقی اخبار کو ایک ٹیکسی ڈرائیور قیصر احمد نے اپنے استاد شرف دہلوی کی سرپرستی میں شائع کیا۔ عوام کی صحیح ترجمانی پر ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ لیکن پھر اپنی مقبولیت کھو بیٹھا اور بند ہو گیا۔ روزنامہ اقبال اور مسلم ڈیلی نے بھی اسی زمانے میں آنکھیں کھولیں، لیکن کچھ عرصہ مقبولیت حاصل کرنے کے بعد بند ہو گئے۔ جہاں تک روزنامہ ہندوستان اور جمہوریت کی بات ہے، وہ حال تک شائع ہو رہے ہیں جن کا بعد میں ذکر کروں گا، لیکن جمہوریت نے چند سال میں دم توڑ دیا۔ اس سے قبل عبدالحمید انصاری اور احسن مراد آبادی نے تاج پریس سے روزنامہ الہلال شروع کیا اور معروف مصنف وصحافی رئیس احمد جعفری نے ادارہ خلافت سے علاحدگی کے بعد شامنامہ ہندوستان کا اجرا کیا۔ ان کے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد غلام احمد خان آرزو نے روزنامہ ہندوستان خرید لیا، ان کے صاحبزادے سرفراز آرزو ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ روزنامہ آفتاب اور روزنامہ جمہوریت وافر سرمایہ اور اچھے قلمکاروں کے باوجود خود کو زندہ نہ رکھ سکے۔

روزنامہ خلافت کے علاوہ غالباً روزنامہ اقبال کے مالکان کے پاس اخبار کے اجرا سے قبل ہی اپنا پریس تھا۔ پریس میں روزنامہ بلال بھی چھپا کرتا تھا، لیکن جب بلال سے حکومت نے ضمانت طلب کی تو اقبال پریس کچھ عرصے کے لیے بند کر دیا گیا۔ اقبال کی دوبارہ اشاعت غالباً مئی 1937 میں شروع ہوئی اور اقبال نے کافی مقبولیت حاصل کر لی۔ اس کا سب مسلم لیگ کی آنکھ بند کر کے حمایت کرنا تھا۔ ان دنوں کوئی اخبار مسلم لیگ کی حمایت کرنے سے کتراتا تھا لیکن اس حمایت کے نتیجے میں روزنامہ اقبال اپنے تمام پرانے معاصرین سے زیادہ ترقی کر گیا۔

خلافت 1920 میں جاری ہوا تھا، لیکن اس کے دس بارہ سال بعد جب روزنامہ اجمل کا اجرا ہوا تو اس کا اپنا ایک پریس اور باقاعدہ دفتر تھا۔ جناب معین الدین حارث نے حکیم اجمل خان کی یاد میں اخبار نکالا۔ اس کے سال دو سال بعد جناب حافظ علی بہادر خان نے ہفت روزہ اتحاد اور ایک ماہنامہ جریدہ عالم نسواں شروع کیا۔ روزنامہ اتحاد بعد میں سابق کارپوریٹر خواجہ غلام جیلانی کی سرپرستی میں آ گیا۔ حافظ صاحب نے اس کے بعد روزنامہ نکالنا شروع کیا تو اس کا دفتر بھی

حافظ علی بہادر خان کی رہائش گاہ کے ایک حصے میں واقع تھا۔ لیکن اخبار کی طباعت کے لیے اقبال برسوں دوسروں کا محتاج رہا۔

1963 تک ممبئی کے کسی بھی اردو روزنامے میں خبروں کے حصول کے لیے ملکی اور غیر ملکی کسی طرح کی خبر رساں ایجنسی کا انتظام نہیں تھا۔ اس طرح ان اردو اخبارات کو دوسری زبانوں کے اخبارات کا سہارا لینا پڑتا اور ان زبانوں کو جاننے والے مترجمین ملازمت پر رکھنے پڑتے تھے۔

7 مارچ 1972 کو عبدالحمید انصاری کے انتقال کے بعد انقلاب کے ساتھ ساتھ خالد انصاری نے انگریزی کھیل رسالہ 'اسپورٹس ویک' اور 1970 کی دہائی کے اواخر 1979 میں شامنامہ 'نڈر' شروع کیا اور ان کی حمایت اور مالی بہتری نے انقلاب کا رنگ ڈھنگ بھی بدل دیا۔

میں 1998 میں روزنامہ انقلاب سے وابستہ ہوا اور اس دور میں اخبار میں ایک بھرپور عملہ موجود تھا، کتابت کا دور تھا، لیکن اخبار کے لیے خبریں پریس ٹرسٹ آف انڈیا (پی ٹی آئی) اور یونائیٹڈ نیوز آف انڈیا (یو این آئی) کی مشینوں کے ساتھ ٹیلیکس کی سہولت بھی دستیاب تھی، جس کی مدد سے دہلی اور لکھنؤ کے نمائندے رپورٹیں روانہ کرتے تھے، لیکن اچانک 1990 کے عشرے کی ابتدا میں دوسروں کی طرح اردو اخبارات کی بھی کایا پلٹ گئی اور 1993 میں انقلاب میں دو کمپیوٹر نصب کیے گئے اور ان میں ان پیج کے اردو ڈی ٹی پی کا پروگرام بھی نصب تھا۔ کاتب حضرات اس کے لیے تیار نہیں تھے اور احتجاج کا دور شروع ہوا۔ چند سب ایڈیٹرس کے ساتھ ساتھ میں نے اور خود خاتون رپورٹر ریحانہ شیخ نے اردو ٹائپنگ سیکھ لی اور بعد کے دنوں میں ہم دونوں اپنی رپورٹ خود ٹائپ کرتے اور اسی دوران میں نے پیج میکنگ بھی سیکھ لی جو مستقبل میں کافی کارآمد ثابت ہوئی۔

انقلاب میں 1980 کی دہائی میں خالد انصاری کے اداریے خوب پڑھے جاتے تھے اور دو جلدوں میں بھی شائع ہوتے رہے، اس سے پہلے وہ 1950 میں بھی انقلاب میں مدیر تھے اور میں نے خود اداریوں کے آخر میں ان کے دستخط پرانی فائلوں میں دیکھے ہیں۔ انقلاب کی اصل ترقی کا

دور 1991 تا 2000 رہا، اس عرصے میں اس کی سرکولیشن آسمان کو چھوتی رہی، پہلا دور مشہور نقاد اور صحافی فضیل جعفری اور دوسرا دور ہارون رشید (علیگ) کا تھا، فضیل جعفری اپنے سنجیدہ اور بیباک اداریوں کے لیے مشہور تھے تو ہارون رشید نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کو اپنا مشن بنایا اور اخبار دن دونی رات چوگنی ترقی کر گیا۔ مقامی خبروں، ادبی اور فلمی صفحات کے ساتھ ساتھ جمعہ میگزین اور سنڈے میگزین نے انقلاب کی مقبولیت میں چار چاند لگائے تھے اور پھر اسی دور میں چہار رنگی صفحات میں تبدیلی نے اسے مزید دیدہ زیب بنا دیا تھا۔

روزنامہ انقلاب نے ہمیشہ جدید ٹکنالوجی کو اپنانے میں دیر نہیں کی، چاہے آفسیٹ پریس ہو یا کمپیوٹر اور اردو ڈی ٹی پی کا سسٹم اختیار کرنے میں دیر نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ اخبار نے اپنا انداز برقرار رکھا ہے، جانبداری اور غیر جانبداری کے جو مسائل ہیں، ان پر فی الحال گفتگو ممکن نہیں ہے۔

انقلاب سے قبل تقریباً ایک سال میں نے روزنامہ اردو ٹائمز میں بھی خدمت انجام دی تھی۔ یہاں بھی پی ٹی آئی اور یو این آئی جیسی خبر رساں ایجنسیوں کی مشینیں نصب تھیں، ایک روز میں نے حنیف اعجاز کو پی ٹی آئی پر ریلیز کی جانی والی ایک خبر کی طرف اشارہ کیا تو انھوں نے ترجمہ کی ہدایت کی جس نے مجھے صحافت کے زینہ پر پہلا قدم رکھنے کا موقعہ مل گیا۔ اردو ٹائمز اپنی بے باکی اور ملت کے مسائل پر آواز اٹھانے کے لیے مشہور تھا اور ممبئی، تھانے کے ساتھ ساتھ بھیونڈی، مالیگاؤں اور دور بھ میں اس کی طوطی بولتی تھی، غالباً 30 سال تک اردو ٹائمز اور انقلاب کے علاوہ تیسرا کوئی اخبار ممبئی اور مہاراشٹر کے افق پر نہیں چمک سکا۔ اس عرصے میں قومی آواز اور اخبار عالم جلوہ افروز ہوئے، لیکن کسی نہ کسی سبب انھیں بند کرنا پڑا۔ لیکن 2000 کی دہائی کے نصف میں پہلے روزنامہ راشٹریہ سہارا اور پھر صحافت دادوہ نامہ منظر پر آئے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ انقلاب اور اردو ٹائمز کے درمیان روزنامہ سہارا کی شکل میں ایک تیسرے اخبار نے اپنی جگہ بنائی، لیکن بعد کے دنوں میں معاشی بحران اور وسائل کی کمی نے اس کا علاقہ محدود رکھا، لیکن یہ بھی سچائی ہے کہ ان دونوں اخبارات کے درمیان سہارا کو بھی پسند کیے جانے لگا۔

اردو زبان و ادب کی ترقی وارتقا میں اورنگ آباد کا اہم مقام ہے۔ جہاں اس شہر نے

دکنی اور اہل شمال کی کھڑی بولی کے اشتراک سے اردو زبان کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا وہیں دبستان اورنگ آباد نے اردو زبان کو ولی اورنگ آبادی کے ذریعے اردو غزل جیسی مقبول ترین صنف سخن بھی عطا کی۔ اردو شاعری کے اولین تذکرے بھی اسی شہر کے شاعروں نے لکھے، جن میں حمید اورنگ آبادی کا 'گلشن گفتار' قابل ذکر ہے۔ اردو تذکرہ نگاری کے اصول وقواعد کے تعین کا سہرا بھی اسی شہر کے فرزند لالہ بھی نارائن شفیق کے سر ہے جن کے تذکرے 'چمنستان شعرا' کی طرز پر بعد میں تذکرہ نگاری کی صنف کو فروغ حاصل ہوا۔

اردو کا پہلا خالص ادبی رسالہ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے یہیں سے 1921 میں شروع کیا۔ اس سے پہلے شائع ہونے والے رسالے خالص ادبی نہیں ہوا کرتے تھے۔ اسی شہر میں انجمن ترقی اردو کے چھاپہ خانے کے ذریعے مولوی عبدالحق نے اردو کو عظیم علمی سرمائے اور کتب کے خزانے سے نوازا۔ اسی شہر کے فرزندان حمایت علی شاعر اور قمر اقبال نے تین مصرعوں کی ایک صنف سخن ثلاثی یا تثلیث اردو ادب میں متعارف کروائی۔ غرض اردو زبان وادب کے میدان میں اورنگ آباد نے بڑی عظیم خدمات انجام دیں۔

مراٹھواڑہ میں اردو صحافت کے فروغ میں بھی اورنگ آباد کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ اگرچہ یہاں مطبوعہ اردو صحافت کی ابتدا قدرے تاخیر سے ہوئی۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ علاقہ مراٹھواڑہ میں صحافت کے فروغ میں اورنگ آباد شہر اور یہاں سے شائع ہونے والے اخبارات ورسائل کا ایک اہم کردار ہے۔

اورنگ آباد میں اردو صحافت کا باضابطہ آغاز 1960 کی دہائی کے اواخر میں ہوا۔ یہاں سے شائع ہونے والا پہلا ہفت روزہ اخبار مرحوم اثر فاروقی کا قومی محاذ ہے۔ اثر فاروقی نے اپنے قومی محاذ اور بعد میں شروع ہونے والے دیگر اخباروں (جن میں اورنگ آباد ٹائمز اور آج شامل ہیں) کے ذریعے اورنگ آباد اور مراٹھواڑہ میں اردو صحافت کو مضبوط بنیادیں فراہم کیں۔ اثر فاروقی نے اپنے قومی محاذ کے ذریعے ناسازگار حالات میں نہایت بلند ہمتی اور جرأت مندی کے ساتھ مسلم اقلیت کے مسائل پر آواز اٹھائی۔ اثر فاروقی ایک اہل نظر صحافی تھے۔ قومی آواز کے پہلے ایڈیٹر حیات اللہ انصاری اور الجمعیۃ کے مولانا عثمان فارقلیط کے بعد اگر کوئی بہترین

اداریہ نگار کی تلاش کی جائے تو سوائے اثر فاروقی کے کوئی دوسرا نام نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اداریے ملک کے سرکردہ اور معروف اخبارات میں اکثر نقل ہوا کرتے تھے۔ خود مولانا عثمان فارقلیط نے کئی مرتبہ الجمعیۃ میں ان کے اداریوں کو بڑے اہتمام سے نقل کیا ہے۔ بی بی سی اور آکاشوانی سے کئی مرتبہ اثر فاروقی کے اداریے نہ صرف نشر ہوئے بلکہ سربرآوردہ صحافیوں نے اپنے تبصروں میں ان کی ستائش بھی کی ہے۔

1960 کی دہائی کے اواخر ہی میں عزیز خسرو نے ہفت روزہ اورنگ آباد ٹائمز جاری کیا جو آگے چل کر چند سال بعد روزنامہ ہوگیا۔ لیکن اورنگ آباد ٹائمز کے روزنامہ ہونے سے پہلے بمبئی سے شائع ہونے والے خلیل شیخ کے روزنامہ آج کا اورنگ آباد ایڈیشن ان کے فرزند شکیل احمد نے جاری کیا۔

یکم اگست 1967 میں جاری ہونے والا ہفت روزہ 'اورنگ آباد ٹائمز' 1972 میں روزنامہ کی شکل میں شائع ہوکر دوبارہ ہفت روزہ ہوگیا تھا۔ 1975 سے باقاعدہ پابندی سے روزنامہ کی شکل میں شائع ہونے لگا اور آج بھی شائع ہو رہا ہے۔ اورنگ آباد ٹائمز نے اورنگ آباد شہر ہی نہیں پورے علاقہ مراٹھواڑہ میں اخبار بینی کے ذوق کی نشوونما میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کی ترقی اور مقبولیت میں اس کے خبروں کے انتخاب اور مضامین کے علاوہ ہفتہ واری صفحات کا بڑا اہم کردار ہے جن میں سب سے زیادہ اہمیت ادبی صفحہ 'رفتار ادب' کی ہے۔

اردو ادب کے معروف محقق و ناقد انور سدید نے اورنگ آباد میں اردو صحافت کے بارے میں اپنی روداد سفر میں لکھا جو 17 مارچ 1989 کے 'حریت' لاہور میں شائع ہوئی ہے۔ صحافت کے افق پر عزیز خسرو جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ ان کا اورنگ آباد ٹائمز اس شہر کا سب سے موثر اخبار ہے۔ دوسرے اخبارات میں مفسر، انقلاب نوجواں، نمایاں اخبار ہیں۔

رفتار ادب کے علاوہ اس کے دیگر ہفتہ واری صفحات میں ضیائے اسلام، خواتین کا صفحہ، جھومر اور بچوں کا صفحہ تتلیاں بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ خصوصاً اورنگ آباد ٹائمز کا سنڈے ایڈیشن ابتدا سے ہی بڑا رنگا رنگ انوکھا اور معلومات افزا مواد سے بھرپور رہا ہے۔ اسی طرح اس کے طب و صحت اور نوجوانوں کے صفحے نے بھی اس کی اہمیت میں کافی اضافہ کیا ہے۔ یہ اخبار آج

آٹھ رنگین صفحات پر شائع ہوتا ہے۔ اس کی ترتیب و انتخاب بہت خوب ہے۔ علاقہ مراٹھواڑہ میں صحافتی اقدار کی نشو ونما اور پاسداری اسی اخبار سے عبارت ہے۔

آج اس کے مدیر شعیب خسرو ہیں اور ان کے ساتھ ان کے برادران بھی اس اخبار کی ترقی میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ عزیز خسرو کے انتقال کے بعد شعیب خسرو نے اس کی ادارتی و انتظامی ذمہ داریاں سنبھالیں تب ان کے سامنے بڑے چیلنجز تھے لیکن کم عمری ہی سے اخبار کے دفتر میں اپنے والد گرامی کے ساتھ وہ آیا کرتے تھے۔ سرخیوں اور تصویروں کی فلمیں بناتے، کاتبوں اور عملے سے کام لینے کے طور طریقے انھوں نے اپنے والد سے سیکھے تھے۔ اس لیے اپنے والد کے انتقال کے بعد بڑی عمدگی سے ادارتی ذمہ داریوں کو سنبھالا، اور ان کے برادر خرد شکیب خسرو نے اخبار کے انتظامی اور تجارتی امور کو بحسن و خوبی نبھایا۔ ذہیب خسرو تو بہت کم عمر تھے اس وقت یہ بچوں کے صفحوں کے ترتیب کار تھے لیکن تینوں بھائیوں نے اپنے والد کے جاری کردہ اس اخبار میں چار چاند لگا دیے اور اسے جدید ترین وسائل سے مزین کر کے ترقیوں سے ہمکنار کر دیا۔ آج اس کا شمار مہاراشٹر سے نکلنے والے بڑے اور اہم اخباروں میں ہوتا ہے۔ اس اخبار نے مختلف موضوعات اور شخصیات پر کئی اہم نمبر شائع کیے ہیں۔ یہ خصوصی شمارے دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کئی اہم ادیبوں و شاعروں، فنکاروں اور اہل علم پر یہ خصوصی شمارے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے تعلیمی موضوعات پر شائع ہونے والے شمارے بہت عمدہ ہیں۔

مراٹھواڑہ اور دیگر علاقوں سے اورنگ آباد میں تعلیم کے لیے آنے والے کئی طلبا نے جز وقتی طور پر اورنگ آباد ٹائمز میں صحافتی تربیت حاصل کی اور اپنے شہروں میں جا کر اپنے اخبار شروع کیے۔ ایسے ہی افراد میں ناندیڑ کے معروف صحافی محمد تقی بھی شامل ہیں، جنھوں نے اپنا روزنامہ ورق تازہ جاری کیا۔ مالیگاؤں کے ڈاکٹر احمد ریاض، رشید قادری بھی ایسے ہی افراد میں شامل ہیں۔ اسی طرح پربھنی، بیڑ اور دور بھ کے کئی اور صحافی ہیں جنھوں نے اورنگ آباد میں تربیت پا کر صحافت میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔ کئی افراد ایسے ہیں جنھوں نے اپنے اپنے مقامات سے اورنگ آباد ٹائمز میں نامہ نگاری کرتے ہوئے صحافت کی تربیت حاصل کی اور اپنے مقامات سے اپنے ہفت روزہ اخبارات شروع کیے یا پھر کسی بڑے معروف روزنامہ ریڈیو یا ٹی وی کے

مقبول نمائندے ہو گئے۔ اورنگ آباد ٹائمز نے مراٹھواڑہ کی کم از کم تین نسلوں کی صحافتی تربیت کی ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ خود اورنگ آباد میں کئی روزناموں کے مدیران نے اسی اخبار میں پہلے پہل صحافتی تربیت حاصل کی اور آج اپنے روزناموں کو کامیابی سے چلا رہے ہیں۔

روزنامہ 'آج' اورنگ آباد کا پہلا اردو روزنامہ اخبار ہے۔ اس سے پہلے یہاں سے کوئی اردو روزنامہ جاری نہیں ہو سکا تھا۔ یہ اخبار اورنگ آباد اور ممبئی سے بیک وقت شکیل احمد کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اس کا ادبی صفحہ جھروکے، بچوں کا صفحہ کلیاں، خواتین کا صفحہ بنت حوا، دینی اور اسلامی صفحہ خضر راہ ہفتہ کے مختلف دنوں میں شائع ہوتے تھے۔ روزنامہ 'آج' نے اورنگ آباد میں اردو صحافت کی مضبوط اور عمدہ بنیاد رکھی۔ اسی اخبار نے پہلے پہل صحافیوں کی تربیت کا فریضہ انجام دیا، جنھوں نے اورنگ آباد میں اردو صحافت کے کارواں کو آگے بڑھانے کا کارنامہ انجام دیا۔ اسی اخبار میں صحافتی تربیت پانے والے علیم باحشوان نے صرف اورنگ آباد ہی نہیں مراٹھواڑہ کو صحافیوں کی ایک بڑی تعداد فراہم کی ہے۔ علیم باحشوان نے اورنگ آباد میں صحافیوں کی تربیت پر خصوصی توجہ دی اور کئی عمدہ صحافی تیار کیے۔ آج مراٹھواڑہ میں صحافیوں کی اکثریت ان ہی کے شاگردوں پر مشتمل ہے۔

روزنامہ آج کے ایڈیٹر و مالک شکیل احمد ایک دیدہ ور صحافی تھے۔ بمبئی میں روزنامہ خلافت، روزنامہ اجمل، روزنامہ ہلال، روزنامہ ہندوستان، روزنامہ انقلاب اور روزنامہ اردو ٹائمز جیسے اخباروں کے ماحول میں انھوں نے صحافتی تربیت حاصل کی۔ جب اورنگ آباد سے انھوں نے روزنامہ آج جاری کیا تو اردو صحافت کی ایک روشن روایت ان کے ساتھ تھی۔ انہی اخباروں کی اعلیٰ روایت اور اقدار کی روشنی میں انھوں نے یومیہ صحافت کی اورنگ آباد میں بنیاد رکھی اور روزنامہ آج کے ذریعے اورنگ آباد اور مراٹھواڑہ کے علاقے کو انہی روشن روایات سے منور کیا۔

روزنامہ 'آج' نے اورنگ آباد اور علاقہ مراٹھواڑہ کے قارئین کو خبروں کے ساتھ عمدہ مضامین اور تبصروں و تجزیوں پر مشتمل مواد فراہم کیا۔ اورنگ آباد شہر اور مراٹھواڑہ کے قلمکاروں کی تخلیقات اپنے اخبار میں شائع کر کے ان کی ذہنی و ادبی نشوونما کا فریضہ انجام دیا۔ کئی اہل قلم کو اسی

اخبار کے ذریعے جلا ملی۔ کئی ایک اہل قلم اسی اخبار کے ذریعے متعارف ہوئے اور روزنامہ ''آج'' ہی کے ذریعے میدان صحافت میں آئے۔ کتنے ہی اہل قلم کی تربیت ونشوونما اس اخبار نے کی۔ اورنگ آباد کی تاریخ میں روزنامہ آج پہلے روزنامہ کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا جس نے اورنگ آباد شہر کو اردو یومیہ صحافت سے سرفراز کیا ہے۔ ان دونوں اخباروں کے ذریعے تربیت پانے والے صحافیوں نے اپنے اپنے ہفت روزہ اخبارات اور روزنامے جاری کیے۔

ابھی تک جالنہ سے کئی ہفت روزہ اخبار جاری ہوئے ہیں لیکن یہاں کے اخباروں میں قابل ذکر روزنامہ منزل ہی ہے۔ اسی طرح لاتور سے شائع ہونے والے اردو اخباروں میں ہفت روزہ اوصاف قابل ذکر ہے۔ امید ہے کہ روزنامہ آج، روزنامہ اورنگ آباد ٹائمز اور قومی محاذ کے بعد شائع ہونے والے اخبارات خواہ وہ ہفت روزہ ہوں یا روزنامے اپنے پیش رو اخبارات کی طرح اپنی عمدہ اور معیاری صحافت سے مراٹھواڑہ کی صحافت پر اپنے مثبت اور دیرپا اثرات مرتب کر کے نئی تاریخ بنائیں گے اور صرف مراٹھواڑہ ہی نہیں بلکہ پوری اردو صحافت میں اپنا اور اورنگ آباد کا نام روشن کریں گے۔

آخر میں آر کے کرنجیا کے اردو بلٹز کا ذکر کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں، جس نے ہندوستان کے طول وعرض میں اپنا مقام بنایا تھا، اس کے مدیروں میں انور عظیم، حسن کمال اور ہارون رشید کے نام قابل ذکر ہیں۔ لیکن نامساعد حالات اور مالکان کی پالیسی کے سبب 1995 میں اس کی اشاعت بند ہوگئی، اور اردو کا پرچم سرنگوں ہوگیا۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ اردو ذریعۂ تعلیم میں مہاراشٹر اور ممبئی اوّل مقام پر ہیں، اگر اردو صحافت کو نئے وجدید وسائل اور ٹکنالوجی کے ذریعے آگے بڑھایا جائے تو پھر پیچھے دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

مہاراشٹر کے اردو اخبارات

احمد عثمانی

ہماری زبان اردو دنیا کے ایک بڑے خطے میں بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہے۔ اس زبان نے سرحدوں کو بھی پار کیا ہے گو وہ وہاں مہاجر ہے لیکن اپنی بستی بسانے میں کامیاب ہے۔ اردو زبان کا شمار دنیا میں بولی اور سمجھی جانے والی دس بڑی زبانوں میں سے ایک ہے۔

اردو کے اخباروں نے نئی تکنیک کے ساتھ سفر شروع کر دیا ہے۔ اس سفر میں وہ دوسری بڑی زبانوں کی طرح کامیاب ہیں یا نہیں اس کا جائزہ ماہرین لیں گے لیکن ہم برملا یہ کہہ سکتے ہیں کہ الیکٹرانک میڈیا کو بھی ہماری زبان نے سمو لیا ہے۔ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ الیکٹرانک میڈیا صرف کیمرے کے کمالات تک محدود ہے لیکن یہ خیال غلط نکلا کیونکہ ٹیلی ویژن کی وجہ سے اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کی آمد سے اس میں ایک لامحدود دنیا سما گئی ہے۔

اگر ہم الیکٹرانک میڈیا کے جو وسائل ہیں ان کا جائزہ لیں تو ان میں ریڈیو، ٹی وی، آڈیو، ویڈیو اور ریڈیو کانفرنسنگ اور فلم کا شمار ہوتا ہے۔ اردو زبان بھی اپنی شیرینی کی وجہ سے ترسیل و ابلاغ پر اپنا سکہ جمائے ہوئے ہے۔ اردو زبان کے محاورے الفاظ آج سیریل، فلم، اور اشتہار

کے لیے ناگزیر بن گئے ہیں۔

موجودہ دور تیز رفتار ہے۔ یہ تیزی الیکٹرانک میڈیا نے دی ہے۔ اس میں سوشل نیٹ ورکنگ میڈیا نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس میں ٹوئیٹر، یو ٹیوب اور فیس بک کا اعلیٰ مقام ہے۔ ان پلیٹ فارمس کی آج کے الیکٹرانک دور میں بڑی افادیت ہے۔

دنیا کی ترقی کو اپنانے میں اور تحقیقات میں ہندوستان بھی پیچھے نہیں رہا۔ مسلمان بادشاہ جب ہندوستان میں آئے اور مغلوں نے یہاں مستقل حکومت قائم کی تو انھوں نے ملک کا حال احوال جاننے کے لیے وقائع نویس، جو کہ آج کی ترقی یافتہ شکل نامہ نگار کی ہے یا ہم اسے رپورٹر بھی کہہ سکتے ہیں، ان کا ایک نظام قائم کیا اور ملک کے طول وعرض میں وقائع نویس یعنی رپورٹر مقرر کیے۔

دنیا میں جب بادشاہت قائم ہوئی تو اس کی ضرورتوں میں ایک ضرورت اپنی بادشاہت کی عمر بڑھانے کے طریقوں پر غور کیا گیا تو بادشاہ کو معلوم ہوا کہ مضبوط فوج کے علاوہ ملک کے حالات جاننا بھی ضروری ہیں۔ اس لیے انھوں نے ملک کی وسعت کے مطابق وقائع نگار مقرر کیے اور محکمۂ جاسوسی بھی قائم کیا۔

مغل بادشاہ اکبر نے چینی بادشاہ تانگ کی طرح ایک درباری اخبار بھی جاری کیا جسے ''اخبار دربار معلیٰ'' کہا جاتا تھا۔ اخبار مختلف شکلیں اختیار کرتا رہا۔ شاہ جہاں نے اس کے نام میں تبدیلی کی اور اس کا نام ''اخبار معلیٰ دارالخلافہ شاہ جہاں آباد'' رکھا۔ یہ اخبار آخری مغل بادشاہ، بہادر شاہ ظفر کے دور تک جاری رہا لیکن ہم اس کو عوامی اخبار نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ اخبار صرف محلات اور سرکاری درباری افسروں تک محدود تھا۔

ہمارے یہاں صحافت کے دو بڑے مرکز رہے ہیں۔ ایک دہلی اور دوسرا ممبئی۔ اگر ہم مہاراشٹر کی صحافت پر نظر ڈالیں تو یہاں صحافت کی ابتدا بنگال کے بعد میں اور دہلی سے پہلے ہوئی۔

ممبئی

''واضح ہو کہ وہ مخاصمت اور تنازع جو درمیان راجہ کیکواڑ اور گورنمنٹ کے
ہو رہی ہے بالفعل واسطے دفع کرنے اس کے صاحب والا مناقب گورنر

بمبئی طرف بڑودہ کے تشریف لے گئے ہیں تا کہ مقام مذکور میں پہنچ کر
آتش فتنہ فساد کو باب تدبیر فرو کریں۔ سنا جاتا ہے کہ ارادہ گورنمنٹ کا یہ
ہے کہ دریائے گر کی پر واسطے عبور و مرور رعایا اور سپاہ انگریزی کے ایک پل
لوہے کا بعنایت استحکام باندھا جاوے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ اس باب میں
دیار بمبئی کے کارپردازوں کے نام حکم احکام جاری ہوئے ہیں۔"

("دہلی اردو اخبار" نمبر 211 جلد 4-7 / مارچ 1841 یوم یکشنبہ صفحہ نمبر-57-

ترتیب و تہذیب پروفیسر ارتضیٰ کریم)

پروفیسر ارتضیٰ کریم کی تحقیق سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مہاراشٹر جو اس وقت مہاراشٹر نہیں تھا، صوبہ بمبئی کہلاتا تھا اس کے کئی مقامات سے اخبار نکلتے رہے ہیں جن کے حوالے سے دوسرے اخباروں میں خبریں شائع ہوتی رہی ہیں۔

22 / مارچ 1822 میں اردو کا پہلا اخبار "جام جہاں نما" کلکتے سے جاری ہوا۔ نادر علی خاں نے اپنی کتاب ہندوستانی پریس 1856 تا 1900 ۔ اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ 1991 میں آئینۂ سکندری کے اردو ضمیمے سے خبریں بھی نقل کی ہیں۔

نادر علی خاں نے آئینۂ سکندری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

"اخبار آئینۂ سکندری گویا نیم سرکاری اخبار تھا جو گورنر کی ایما سے جاری کیا
گیا تھا۔ اس کے علاوہ اس دور کے اخبارات پر اس کی امتیازی خصوصیت
یہ بھی تھی کہ بجائے لیتھو کے ٹائپ میں طبع ہو کر شائع کیا جاتا تھا۔"

(ممبئی کے اردو اخبارات (1835 تا 2005)

(ماجد قاضی۔ بزم جہان اردو کلیان صفحہ نمبر 34)

مہاراشٹر کے قدیم ترین اخبارات میں کئی نام ہیں۔ قدوسی، صالحی اور عمدۃ الاخبار۔ ان اخبارات کا 1849 سے 1854 کے درمیان اجرا ہوا۔

مہاراشٹر سے بہت سارے اخبارات شائع ہوتے رہے ہیں۔ بمبئی سے پرانے اخباروں کے علاوہ جدید اخبارات کی ایک طویل فہرست ہے، جن میں صحافت، ہندوستان

انقلاب، اتحاد، اخبار عالم، جسارت، اردو رپورٹر، قومی جنگ وغیرہ۔ اورنگ آباد سے بھی آزادی کے بعد 1950 میں "آزاد" نامی اخبار شائع ہوتا رہا ہے اس کے بعد رہبر، اورنگ آباد ٹائمز، جزیرہ اورنگ آباد ایکسپریس، ایشیا ایکسپریس آج بھی جاری ہیں۔ آزادی کے بعد اورنگ آباد سے پہلے اور بمبئی کے بعد مالیگاؤں میں صحافت پر کام جاری تھا۔ یہاں بھی ایک طویل فہرست ہے۔ یہاں کا قدیم اخبار، بیداری ہے جسے 1935 میں مولانا عبدالحمید نعمانی نے جاری کیا تھا۔ اس کے بعد یہاں سے نکلنے اور بند ہونے والے اخبارات کی طویل فہرست ہے آج بھی یہاں پر کئی روزنامے اور ہفتہ وار اخبار شائع ہوتے رہتے ہیں۔

ہم جب مہاراشٹر کی صحافت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ممبئی، مالیگاؤں اور اورنگ آباد صحافت کے بڑے مراکز معلوم ہوتے ہیں۔ مہاراشٹر کی تاریخ میں بہت سے اخبار نکلتے اور بند ہوتے رہے۔ اسی طرح ناگپور سے بھی اخبارات جاری ہوتے رہے اور بند ہوتے رہے یا وقفے وقفے سے نکلتے رہے ہیں۔ ان میں المیزان، ہمہ گیر، آر ایم سٹی، وغیرہ ہیں۔ کامٹی جو ناگپور سے قریب ہے وہاں سے بھی اخبار نکلتے رہے ہیں۔ ہفتہ وار اخوت، رقیب اور تاج و یکلی وغیرہ۔ دھولیہ سے بھی اخبار جاری ہوئے اور بند ہو گئے۔ آج بھی وہاں سے سچا ہتھیار، شاہین جاری ہیں۔ 1834 سے ممبئی میں اخبار جاری ہوا جس کی تفصیل آ چکی ہے۔ ممبئی میں آج جو بڑے اخبار ہیں جو مسلسل نکل رہے ہیں ان میں "انقلاب، راشٹریہ سہارا، اردو ٹائمز، ہندوستان اور صحافت" ہیں۔ ان کے علاوہ چھوٹے موٹے اخبار نکلتے رہتے ہیں اور بند ہوتے رہتے ہیں۔

اس کے بعد مالیگاؤں تعلقہ کا مقام ہے یہاں صحافت کی ابتدا 1920 میں "خیالات" نامی رسالے یا کتابچے سے ہوئی جو اخباری شکل میں تھا، جس میں عارف کے فرضی نام سے مولانا عبدالحمید نعمانی مضامین لکھا کرتے تھے۔ مالیگاؤں کے بزرگ بتاتے ہیں کہ کئی دن تک یہ روزنامہ بھی رہا۔ مالیگاؤں میں اردو نثر کے مصنف ڈاکٹر الیاس صدیقی نے لکھا:

> "اجمل" ممبئی کا شاید ہی کوئی شمارہ ہوگا جو مولانا کے رشحات قلم سے خالی ہوگا۔ انھوں نے بے شمار طبع زاد مضامین لکھے۔ 1935 میں مالیگاؤں میں "بیداری" نام کا ایک ہفت روزہ جاری کیا جو ممبئی میں چھپتا تھا اور

مالیگاؤں سے شائع ہوتا تھا۔اس اخبار کے ذریعے مولانا نعمانی نے
مالیگاؤں میں صحافت کی بنیاد رکھی۔"

اس صحافت کی بنیاد کو مضبوط بنانے کے لیے یہاں سے بہت سارے اخبار شائع ہوئے لیکن اب صرف شام نامہ، روزنامہ، ترجمان اردو، زبان خلق، بنکر ایکسپریس اور ڈسپلین مالیگاؤں ایکسپریس، روزنامے جاری ہیں۔ ہفت روزہ اخبارات رہنمائے بنکر، شہریار، بنکر، اتحاد ٹائمز، عوامی آواز، بیباک، البیان، تحفظ ملت ہیں۔ جو تواتر سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔

کتابیات

1- اخبار کی کہانی۔ غلام حیدر۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی۔

2- دہلی اردو اخبار 1841۔ ترتیب وتہذیب پروفیسر ارتضیٰ کریم۔ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی۔ دہلی۔

3- ممبئی کے اردو اخبارات (1834 تا 1905) ماجد قاضی۔ بزم عجبان اردو مکیان (مہاراشٹر)

4- اردو زبان کے نئے تکنیکی وسائل اور امکانات (کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے حوالے سے) ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین ایسوسی ایٹ پروفیسر ہندوستانی زبانوں کا مرکز جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی انڈیا۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔

5- "مالیگاؤں کل اور آج"۔ محمد خان لاویلار تکمیل ہدایٰ۔ کمہاروا ڑہ، مالیگاؤں، ضلع ناسک، مہاراشٹر

مہاراشٹر میں اردو صحافت اور اشتہارات

نذیر فتح پوری

صحافت سے اشتہارات کا رشتہ جسم اور روح کے رشتے جیسا ہے۔ جب تک صحافت کی شریانوں میں اشتہارات کا خون نہیں دوڑے گا تب تک کسی بھی زبان کا کوئی بھی اخبار زندہ نہیں رہے گا۔ کسی زمانے میں تشہیر کی اتنی اہمیت نہیں رہی ہوگی جتنی آج ہے۔ آج نئی نئی ایجادات کی تشہیر کے لیے اشتہارات کی اشاعت بہت ضروری ہے۔ آج ذرائع ابلاغ پر تشہیر و ترسیلات کا غلبہ ہے۔ بطور خاص ٹی وی کے جتنے چینل ہیں ان کے عکس اور تصاویر محض اشتہارات کی فراہمی کے سبب ہی زندہ ہیں۔ اخبارات تو روز اوّل ہی سے اشتہارات کے مرہونِ منت رہے ہیں۔ اب موبائل کی کمپنیاں بھی اس تشہیری بخار میں بُری طرح مبتلا ہو چکی ہیں۔ جہاں صارفین کو ایک ایک سیکنڈ کے لحاظ سے خواب دکھایا جاتا ہے اور سہانے کھلونے دے کر بہلایا جاتا ہے۔

مہاراشٹر کی اردو صحافت میں روز اوّل ہی سے ممبئی کو اوّلیت حاصل رہی ہے۔ آئینۂ سکندر جو فارسی کا اخبار تھا 1832 میں ممبئی سے جاری ہوا تھا۔ کالی داس گپتا رضا نے لکھا ہے:

''آئینۂ سکندر اگرچہ فارسی اخبار تھا۔ مگر 1834 میں اس کا ضمیمہ اردو میں

شائع ہونے لگا۔" (حوالہ اہم غیر اہم مضامین۔صفحہ نمبر 59)

کالی داس گپتا رضا نے نصیر الدین ہاشمی کے حوالے سے یہ بات لکھی ہے اس موضوع پر نصیر الدین ہاشمی کا مضمون سہ ماہی نوائے ادب بمبئی بابت اپریل 1962 میں شائع ہوا تھا۔ گویا آئینۂ سکندر مہاراشٹر کا پہلا اردو اخبار تھا جو فارسی اخبار کے ساتھ بصورت ضمیمہ شائع ہوا تھا۔ اس طرح مہاراشٹر میں اردو صحافت کی عمر 182 سال ہو چکی ہے۔ آئینۂ سکندر کے سرورق پر ایک شعر شائع ہوتا تھا:

آئینۂ سکندر جام جہاں نما ہے
ملکوں کی کیفیت ہے اور طرفہ ماجرا ہے

کالی داس گپتا رضا نے فارسی اخبار کے ایک شمارے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ایک اشتہار (بمبئی) دیا جاتا ہے کہ 28 مئی کو ڈبلیو، ایچ ہارٹ صاحب کا سامان آرائش مکان جس میں تین گھوڑے وغیرہ شامل ہیں نسبت لین دین میں نیلام کیا جائے گا۔ مفصل فہرست ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ یہ اشتہار "کارکنان فریٹ و بہمن جی" کی طرف سے ہے (اس کے بعد نیلامی کے کئی اور اشتہار درج ہیں)"۔ (حوالہ۔ اہم۔ غیر اہم۔ صفحہ نمبر 66)

یہ حوالہ اس بات کا شاہد ہے کہ ابتدا ہی سے فارسی اور اردو اخبارات کو اشتہارات فراہم ہوتے رہے ہیں۔ کیونکہ اشتہارات کی عدم فراہمی سے اخبار کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

مولانا آزاد کے حوالے سے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

"اخبار نویس کو ہر طرح کے دباؤ سے آزاد ہونا چاہیے اور چاندی اور سونے کا سایہ بھی اس کے لیے سم قاتل ہے، جو اخبار نویس رئیسوں کی ضیافتوں اور امیروں کے عطیوں کو قومی امانت، قومی عطیوں اور اسی طرح کے فرضی ناموں سے قبول کر لیتے ہیں وہ بہ نسبت اس کے کہ اپنے ضمیر اور

نور ایمان کو بیچیں بہتر ہے۔ دریوزہ گری کی جھولی گلے میں ڈال کر رئیسوں کی ڈیوڑھیوں پر گشت لگائیں اور ہر گلی کوچے میں "کام ایڈیٹری کا" کی صدا لگا کر خود اپنے تئیں فروخت کریں۔"

مولانا ابوالکلام آزاد کی حقیقت کشا تحریر کے بعد ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اس کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اکیسویں صدی کی اردو صحافت میں فروخت کرنے کا یہ سلسلہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ کیونکہ صحافت کی دکان سجانے والے اپنے منافع کو اوّلیت دیتے ہیں۔"

(حوالہ۔ ہندوستان میں اردو صحافت آزادی کے بعد۔ مرتب۔ عثمان انجم۔ صفحہ نمبر 15)

مہاراشٹر میں ممبئی ایک خالص تجارتی شہر ہے۔ یہاں کے اردو اخبار بھی امیر ہیں اور ان کے مالک و مدیران بھی کسی رئیس سے کم نہیں۔ ممبئی سے جو اردو روزنامے شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں اردو انقلاب، اردو ٹائمز، راشٹریہ سہارا اور روزنامہ صحافت کے نام نمایاں ہیں۔ یہ اخبارات پوری تاب و توانائی اور خوش منظری کے ساتھ اپنے صحافتی فریضے کی ادائیگی میں منہمک ہیں۔

ان تینوں اخبارات میں تجارتی اشتہارات کثرت سے شائع ہوتے ہیں بطور خاص سال بھر میں جتنے سرکاری اشتہارات جاری کیے جاتے ہیں وہ سارے کے سارے ان اخبارات کو فراہم ہوتے ہیں۔ یہ اشتہارات خاصے قیمتی ہوتے ہیں۔ ان کی خوش منظری قابلِ دید ہوتی ہے۔ دھنک رنگوں سے سجے یہ اشتہار قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیاب نظر آتے ہیں اور اخبارات کے خزانوں میں تسلی بخش اضافہ بھی کرتے ہیں۔ انقلاب اور اردو ٹائمز نے اشتہارات کی فراہمی کے لیے ایک اور طریقہ ڈھونڈ نکالا ہے جو بہت مفید ہے۔ یہ اخبارات موقع محل کی مناسبت سے خصوصی ضمیمے شائع کرتے ہیں جن میں کثرت سے اشتہار شامل کیے جاتے ہیں۔ یہ اشتہارات خالص تجارتی بھی ہوتے ہیں اور شخصی بھی۔ سیاسی اور سماجی کارکنان کی جانب سے مبارکبادی کے اشتہار ان ضمیموں میں خوب نظر آتے ہیں۔

ان اخبارات کے لیے اشتہارات کی فراہمی کا ایک اور موثر ذریعہ عید نمبروں کی

اشاعت کا بھی ہے۔ عید نمبروں کی اشاعت دیکھ کر ایک قسم کی تسلی ہوتی ہے کہ آج بھی اردو کے لیے زر کثیر خرچ کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ ایسے لوگ کم از کم اردو کے روزانہ اخبارات کو زندہ رکھنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ملکی اور ریاستی سطح کے الکشن کے زمانے میں بھی ان اخبارات کے صفحات امیدواروں کے اشتہارات اور اپیلوں سے لدے پھندے نظر آتے ہیں۔

ممبئی کے اردو اخبارات کے لیے اشتہارات کی فراہمی کا ایک اور خاصا سود مند طریقہ ہے۔ جب سعودی، کویت اور قطر کے بادشاہوں کی تاج پوشی کا جشن منایا جاتا ہے یا ان ملکوں کے قومی دن کا جشن برپا ہوتا ہے تب عرب امارات کی جانب سے پورے پورے صفحات کے رنگین اشتہارات ان اخبارات میں تتلیوں کی طرح رنگوں کی بوچھار کرتے نظر آتے ہیں۔ ایسے مسرت آمیز موقعوں پر اشتہارات کی فراہمی میں وہ ایجنسیاں بھی پیش پیش نظر آتی ہیں جو ویزوں کی فراہمی اور پاسپورٹ کے اجرا کا کام کرتی ہیں۔ ان اخبارات کو ممبئی کی وجہ سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ نئی ریلیز ہونے والی فلموں کے اشتہارات بھی انھیں آسانی کے ساتھ فراہم ہو جاتے ہیں۔ یہ اشتہارات بھی خاصے قیمتی ہوتے ہیں۔ ان اخبارات میں بے شمار عوامی اشتہارات ایسے بھی ہوتے ہیں جو تین تین چار چار انچ کی صورت میں شائع ہوتے ہیں۔ چونکہ ہر اخبار کلر میں شائع ہوتا ہے اس لیے یہ اشتہار بھی رنگین ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ سیاسی پارٹیوں کے سرکردہ لیڈروں کی سالگرہ پر مبارکباد دینے والوں کے اشتہار بھی کثرت سے شائع ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ سلسلہ سال بھر جاری رہتا ہے اور اخبارات کے لیے منافع کا باعث بنتا ہے۔

ممبئی کے بعد مہاراشٹر میں سب سے زیادہ اردو اخبار مالیگاؤں سے شائع ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں مالیگاؤں ایک ایسا شہر ہے جس کا نام ثقافتی اور صحافتی میدان میں سنہری حرفوں سے لکھا جانا چاہیے کیونکہ مالیگاؤں کی ہر گلی سے ایک اخبار شائع ہوتا ہے۔ ان میں اکثریت ہفت روزہ اخبارات کی ہوتی ہے، مالیگاؤں میں اردو کا عام قاری ابھی زندہ ہے اور پوری طاقت و توانائی کے ساتھ زندہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے اخبارات کو سو سو اور دو دو سو روپے کے اشتہارات فراہم کر کے زندہ رکھا جاتا ہے۔ چند ایک تعلیمی اداروں کو چھوڑ کر باقی اشتہارات ایسے ہوتے ہیں جو شاذ و نادر ہی نظر آتے، چائے کے ٹھیلے کا اشتہار، بیڑی کی دکان کا اشتہار، پان فروش کا

اشتہار ،صابن کی ٹکیہ کا اشتہار، چکن اور انڈوں کی دکان کا اشتہار ،چھوٹی چھوٹی دواؤں کا اشتہار۔عموماً یہاں اخبار کی قیمت ایک روپیہ اور دو روپیہ ہوتی ہے اس لیے غریب عوام کے لیے اخبار خریدنا کوئی مشکل کام نہیں۔ یہاں کا ہاتھ گاڑی اور سائیکل رکشہ کھینچنے والا بھی اردو پڑھتا ہے اور ایک روپے کا اخبار خرید کر پڑھنے میں کوئی نقصان محسوس نہیں کرتا۔

اردو اخبارات کی اشاعت میں اورنگ آباد کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ بلکہ دیکھا جائے تو اورنگ آباد سے شائع ہونے والے روزانہ اخبارات تعداد میں ممبئی کے برابر ہیں لیکن ان کی اشاعت مراٹھواڑہ تک ہی محدود ہے۔ یہ اخبارات اپنے مقامی مشتہرین کے تعاون سے اپنے اخراجات پورے کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔اور اپنے قارئین کی تسلی اور تشفی کے لیے بھی اطمینان بخش ثابت ہوتے ہیں۔

مہاراشٹر کے ضلع پربھنی سے بھی دو ایک اخبار پابندی سے شائع ہوتے ہیں، جو مقامی مشتہرین کے تعاون سے اپنا وجود قائم رکھے ہوئے ہیں، افسوس ہے کہ ودربھ جیسے علاقے سے اردو کا کوئی معقول اخبار شائع نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی کچھ جاں بازوں نے اس ضمن میں کوشش بھی کی لیکن مقامی تاجروں اور دکانداروں کی جانب سے خاطر خواہ اشتہار نہ ملنے کی وجہ سے بہت جلد یہ اخبار بند کردیے گئے۔ ناگپور شہر ممبئی کے بعد مہاراشٹر کی دوسری راجدھانی ہے۔ یہ شہر تجارتی اعتبار سے بھی اہم اور ثقافتی لحاظ سے قابل ذکر ہے۔ افسوس کہ یہاں کی فضا آج بھی اردو روزانہ اخبار کے لیے سازگار نہیں ہے۔ وجہ وہی اشتہارات کی عدم فراہمی ہے۔

اخبار کسی بھی زبان کا ہو۔ زندگی چاہتا ہے۔ مضبوط بنیاد چاہتا ہے۔ باوقار وجود چاہتا ہے۔ جس اخبار کے پاس یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ اس کی آواز بلند ہوتی ہے۔ سیاسی ایوانوں کے کنگورے اس کی آواز سے لرز جاتے ہیں۔

(د) تمل ناڈو

تمل ناڈو میں اردو صحافت

ڈاکٹر سید سجاد حسین

تمل ناڈو میں اردو صحافت کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی ہندوستان کی دیسی زبانوں میں صحافت کی تاریخ۔ اس وقت صرف شہر مدراس سے بیسیوں اخبار و رسائل آسمانِ صحافت پر نمودار ہوئے اور کئی سال تک اپنے وجود سے مدراس اور بیرون مدراس کے ماحول کو منور کرتے رہے۔ تمل ناڈو میں آغاز ہی سے اخبار و رسائل ایک خاص مقصد کے تحت نکلے اور وہ اپنے مقصد پر آخر تک کاربند رہے۔ ''جامع الاخبار'' کے بعد 1841 سے 1850 تک دس سالوں کے اندر شہر مدراس سے حسب ذیل اخبار جاری ہوئے:

- مرآۃ الاخبار 1845
- قاصد الاخبار 1845
- اعظم الاخبار 1848
- رئیس الاخبار 1849
- تیسیر الاخبار 1849

- آفتاب عالم تاب 1849
- محمڈن الاخبار 1849
- مخزن الاخبار 1850

ان تمام اخباروں نے اپنی شناخت صرف تمل ناڈو کی سرحد تک محدود نہیں رکھی بلکہ یہ سب کے سب تمل ناڈو سے باہر بھی دور دور تک پہچانے جاتے تھے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ تمل ناڈو کے ان اخباروں کی خبریں دلی، رام پور، آگرہ سے نکلنے والے اخباروں میں نقل کی جاتی تھیں۔ یہ اخبار نہ صرف دور دراز علاقوں میں مقبول تھے بلکہ خود کفیل بھی تھے۔ انھیں کافی تعداد میں خریدار بھی میسر تھے۔

1848 میں جاری ہوئے ''اعظم الاخبار'' کو مدراس کے ایک بہت ہی اہم اخبار کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ اس میں اس زمانے کے تعلیمی، تمدنی اور سیاسی حالات پر مبنی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ اس اخبار کی سب سے بڑی خوبی یہ بتائی جاتی ہے کہ اس نے ذات پات کے فرق کو مٹانے اور مختلف مذاہب کو ماننے والوں میں اتحاد کو بڑھانے کے لیے بحسن وخوبی اپنا کردار نبھایا۔

1851 سے 1860 کے دوران مدراس کے صحافتی افق پر مزید سات اخبار نمودار ہوئے:

- نعیم الاخبار 1851
- صبح صادق 1855
- طلسم حیرت 1856
- مدراس پنچ 1856
- مظہر الاخبار 1856
- خلاصۃ الاخبار 1857
- شمس الاخبار 1859

ان میں ''طلسم حیرت''، ''مدراس پنچ''، اور ''شمس الاخبار'' نے ہندوستان گیر شہرت پائی۔ ان اخباروں نے پچاس سال سے بھی زیادہ عمریں پائیں۔ اس طویل مدت تک تمل ناڈو میں ان اخباروں کی اشاعت نے ایک ایسا تاثر قائم کیا کہ یہاں صحافت کی تاریخ ایک نئی کروٹ لیتی

نظر آتی ہے۔ ماہناموں کے بجائے اب یہ تمام اخبار ہفتہ وار یا عشرہ وار ہو گئے تھے۔ مہینے میں تین یا چار بار بڑے تزک و احتشام کے ساتھ چھپتے تھے۔ ان کی زبان بھی صاف، شستہ اور رواں ہوتی تھی۔ ہر طرح کی خبریں ان میں جگہ پاتی تھیں۔ خبروں کے علاوہ دلچسپ مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔

مدراس سے نکلنے والے اخباروں میں ''شمس الاخبار'' کو سب سے زیادہ اہمیت اس لیے بھی حاصل تھی کہ یہ وہ مایۂ ناز قدیم اخبار ہے جس نے پچاس برس سے بھی زیادہ کی عمر پائی اور دور دور تک اپنی پہچان بنائی تھی۔ 1878 میں روم اور روس کی جنگ کے زمانے میں اس اخبار نے حکومتِ ترکی کی امداد کی ترغیب دلائی، جس کے نتیجے میں ملک کے گوشے گوشے سے ہزار ہا روپے چندہ جمع ہوا جسے اس اخبار کے وسیلے سے سلطنت عثمانیہ کی خدمت میں روانہ کیا گیا۔ یہاں پر یہ بات بھی واضح کرتا چلوں کہ روم اور روس کی جنگ کے زمانے میں ''شمس الاخبار'' روزانہ چھپتا رہا۔ اس طرح تمل ناڈو کی سرزمین سے نکلنے والا پہلا روزنامہ ہونے کا شرف بھی اسے حاصل ہے۔

1861 سے 1870 کے درمیان نکلنے والے اخباروں میں ''نیر اعظم'' 1864 اور ''عمدۃ الاخبار'' 1863 بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ دونوں اخبار ہفتہ وار تھے۔ پرانے اخباروں میں ''صادق الاخبار''، ''طلسمِ حیرت'' اور ''شمس الاخبار'' اس دہائی میں بھی جاری تھے۔ ''نیر اعظم'' کے تعلق سے یہ بات مشہور ہے کہ یہ اخبار کتابت و طباعت کے لحاظ سے اپنے عہد کا ایک نفیس اخبار مانا جاتا تھا۔ اس میں نثر و نظم دونوں حصے بڑے ہی دلکش ہوتے تھے۔ اخبار ''صبح صادق'' سے اس کی معاصرانہ چشمک رہتی تھی۔ کبھی کبھی یہ چشمک اس قدر تلخی اختیار کر جاتی تھی کہ ''نیر اعظم'' تہذیب و اخلاق کا جامہ اُتار پھینکنے پر آمادہ ہو جاتا۔ ''ماونو'' 1864، ''ریاض الاخبار'' 1866 اور ''مفید عام'' 1869 اس دہائی کے دوسرے اخبار ہیں۔ ان میں ''مفید عام'' خواتین کے لیے مخصوص تھا۔ اس کا واحد مقصد عورتوں کی تعلیم و تربیت تھا۔

1870 کے بعد جاری ہونے والے اخبارات کی فہرست میں ''یادگارِ زمانہ'' 1871، ''صفیرِ مدراس'' 1874، ''جریدۂ روزگار'' 1875، اور ''مظہر العجائب'' 1878 شامل ہیں۔ ان میں سے صرف ''جریدۂ روزگار'' اور ''مظہر العجائب'' زیادہ دور دور تک مشہور ہوئے۔ جنگ عظیم کے

دوران ''جریدۂ روزگار'' روزانہ چھپنے لگا اور ساتھ ہی ساتھ اس میں حیدر آباد کی خبریں بھی زیادہ سے زیادہ جگہ پاتی تھیں۔ 1881 سے 1890 کے درمیان تقریباً بارہ نئے اخباروں کا اضافہ ہوا لیکن بقول ڈاکٹر عبدالحق مدراسی:

> ''1880 کے بعد شائع ہونے والے اخبارات زیادہ مدت تک جاری نہ رہ سکے اور میدانِ صحافت میں یہ جدید اخبارات پرانے اخبارات کے مقابلے کی تاب نہ لاکر اکثر و بیشتر سال یا دو سال کے عرصے میں بند ہو گئے۔''

1883 میں ایک اور ہفتہ وار اخبار ''حاکم'' جتنی آب و تاب کے ساتھ جاری ہوا تھا اتنی ہی تیزی سے بند بھی ہو گیا۔ اس اخبار کی کوئی کاپی دستیاب نہ ہو سکی کہ مزید معلومات حاصل کی جا سکے۔

1884 میں ''اتفاق'' جاری ہوا۔ یہ ہفتہ میں دو مرتبہ چھپتا تھا۔ اس اخبار کے بانی میر ہمایوں جاہ، انجمنِ اسلام کے میر مجلس تھے۔ اس اخبار کی مانگ کے پیش نظر ایک سال بعد 1885 میں یہ روزانہ چھپنے لگا۔ اس طرح اسے تمل ناڈو کا دوسرا روزنامہ ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔

1884 میں مدراس سے کئی اور اخبار نکلے جن میں ''اتحاد''، ''دبیر مدراس'' اور ''تحفہ'' کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ''اتحاد'' سے متعلق ڈاکٹر عبدالحق مدراسی لکھتے ہیں:

> ''جنوری 1884 میں ترمللکھوری سوجودہ نام ٹرپلی کین، میں ایک مجلس احباب قائم ہوئی تھی جس کے سکریٹری عبدالوہاب صاحب تھے۔ ان کی سعی و کوشش سے مجلس کی جانب سے ''اتحاد'' نامی ہفتہ وار نکلنے لگا جو ہر دوشنبہ کو شائع ہوتا تھا۔''

اس اخبار نے سیاسی خبروں کے ساتھ ادبی و تنقیدی مضامین کی اشاعت سے قارئین میں اپنی ایک علاحدہ شناخت قائم کر لی تھی۔ ''دبیر مدراس'' مدراس سے نکلنے والے اخباروں میں ''طلسم حیرت'' اور ''مدراس پنچ'' کے بعد دوسرا اہم اخبار ہے جو اپنے اندر طنز و مزاح اور ظرافت کی چاشنی لیے ہوتا تھا۔ منشی محی الدین خاں تسنیم اس اخبار سے منسلک تھے۔ ڈاکٹر عبدالحق لکھتے ہیں کہ

ان کی ادارت میں ''دبیر مدراس'' کو ادبی حلقوں میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی لیکن تسنیم صاحب کی اس اخبار سے علاحدگی کے بعد یہ اخبار بند ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ تسنیم صاحب بعد میں اخبار ''دبیر ہند'' سے منسلک ہوگئے اور 1885 میں ''دکن پنچ'' کے عنوان سے اس اخبار سے ایک ضمیمہ جاری کر کے علمی اور ادبی مضامین لکھتے رہے۔

مدراس سے شائع ہونے والے پندرہ روزہ رسائل میں ''نور جنوب'' بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ رسالہ علیم صبا نویدی کی ادارت میں 2000 میں جاری ہوا اور تقریباً تین سال تک شائع ہوتا رہا۔ 2005 سے ''نور جنوب'' سہ ماہی میں تبدیل ہوگیا اور 2007 تک اس کے صرف سات شمارے منظر عام پر آسکے۔

تمل ناڈو کے دیگر شہروں سے بھی اخبار و رسائل جاری ہوئے جن کے تذکرے کے بغیر تمل ناڈو میں اردو صحافت کی تاریخ نامکمل سمجھی جائے گی۔ اگر چہ مدراس میں اردو صحافت کی ابتدا 1841 میں ''جامع الاخبار'' کی اشاعت کے ساتھ ہو چکی تھی مگر اسے مدراس سے وانمباڑی تک کا راستہ طے کرنے کے لیے تقریباً سولہ سترہ سال کی مزید مدت درکار ہوئی۔ مولوی خطیب عبدالجمیل کا کہنا ہے کہ وانمباڑی کا اولین مطبوعہ رسالہ ''الیتامیٰ'' ہے جسے یتیم خانہ اہل اسلام، وانمباڑی نے 1857 میں جاری کیا تھا۔ اس رسالے کی اشاعت کے تقریباً بیس سال تک وانمباڑی کے آسمانِ صحافت پر کوئی اخبار یا رسالہ نمودار نہیں ہوا۔ البتہ 1886 میں حکیم سید عقیل علی نے ''گلزار سخن'' کے نام سے ایک رسالہ مرتب کیا جس میں وانمباڑی میں منعقدہ چھ مشاعروں کی روداد اور کلام شامل ہے۔ اس مطبوعہ رسالے میں حکیم سید عقیل علی کے پیش لفظ کے علاوہ خطیب قادر باشاہ اور مولوی شاہ ولی اللہ کی تقاریظ بھی شامل ہیں۔

رسائل و جرائد کی اشاعت سے قطع نظر وانمباڑی میں صحافت کا باقاعدہ آغاز اخبار ''ظہیر'' کے اجرا سے ہوا۔ یہ اخبار 1900 میں محمدیہ پریس وانمباڑی میں طبع ہو کر شائع ہوتا تھا۔ پروفیسر جلال کڑپوی کا بیان ہے کہ یہ اخبار ٹائپ میں چھپتا تھا اس اخبار کے مدیر کا نام کیا تھا، یہ اخبار کب تک جاری رہا؟ اس کے بارے میں نہ کوئی معلومات حاصل ہوسکیں اور نہ اس اخبار کا کوئی شمارہ دستیاب ہے۔

وانمباڑی کا دوسرا اخبار ہفت روزہ ''نصیر'' ہے جو 6 راگست 1906 کو ظہور پذیر ہوا۔ یہ اخبار بڑی پابندی سے ہر دوشنبہ کو حکیم صابر بنگلوری کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار کے مالک سودہ محمد ابراہیم تھے۔ اخبار ''نصیر'' سیاسی، معاشرتی، اخلاقی اور مذہبی موضوعات پر محیط ایک مکمل اخبار تھا۔ دنیا بھر کی خبریں، مقامی خبریں، صنعت و حرفت اور تجارتی معلومات وغیرہ اس کے مستقل کالم تھے۔ معاصر اخبارات میں ''آفتاب دکن'' (مدراس)، ''وکیل ہند'' (دلی)، ''مخبر'' (امرتسر)، ''نیر اعظم'' (مراد آباد)، ''برق سخن'' (بنگلور) اور ''مفید عام'' (آگرہ) نے اخبار ''نصیر'' کے بارے میں نہ صرف اچھی رائے کا اظہار کیا ہے بلکہ اس کے معیار اور مضامین کی پیش کش کو سراہا بھی ہے۔

اخبار ''نصیر'' کے مفید اور مثبت کردار کے پیش نظر وانمباڑی میں اس کے بعد بھی ایک عرصے تک اچھے اخبار کی طلب باقی رہی اس کے نتیجے میں 21 سال کے طویل انتظار کے بعد 25 راپریل 1927 کو ہفت روزہ ''رہبر'' جلوہ نما ہوا۔ اس کے مدیر و مالک وانمباڑی کے مشہور شاعر مولانا عبدالقادر خالص تھے۔ یہ اخبار مدیر موصوف کے ذاتی پریس میں چھپ کر دفتر رہبر محمد علی بازار وانمباڑی سے ہر ہفتہ دوشنبے کے دن شائع ہوتا تھا۔

آزادی کے بعد وانمباڑی سے نکلنے والے رسائل و جرائد میں ماہنامہ ''حنا'' ڈائجسٹ 1973، ہفت روزہ ''زحل'' 1974، ماہنامہ ''صداقت'' 1977، پندرہ روزہ ''شمشیر'' 1991، پندرہ روزہ ''جواہر ہند'' 1995، ماہنامہ ''صدف'' 1996، اور ہفت روزہ ''آمادہ'' 1977، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ 1977 میں وانمباڑی سے ایک ماہنامہ ''آشیاں کے تنکے'' بھی جاری ہوا۔ سی۔ محمد یعقوب اس کے مدیر و مالک تھے۔ اس ماہنامہ کو یعقوب اسلم عمری اور انور کمال کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ اگرچہ ہندوستان کے اہم ترین شعرا اور ادبا کی تخلیقات اس میں جگہ پاتی رہیں لیکن بعض نامساعد حالات کے سبب یہ زیادہ مدت تک جاری نہ رہ سکا۔ آج سے بارہ سال قبل وانمباڑی سے ماہنامہ ''نشان منزل'' جو بڑی پابندی سے پی عبدالباری کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا تھا آج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ جاری ہے۔ محدود وسائل کے باوجود عبدالباری صاحب اپنی ہمت مردانہ سے اس ماہنامے کو جلا بخش رہے ہیں۔ اس میں دینی و مذہبی

موضوعات کے ساتھ ساتھ اردو دنیا کی خبریں اور ادبی مضامین بھی شائع ہوتے ہیں۔ اردو رائٹرس گلڈ کے زیر اہتمام سہ ماہی ''چراغ اردو'' پہلی بار ستمبر 2011 میں دانمباڑی سے جاری ہوا۔ اس کے مدیر و مالک محمد یعقوب اسلم عمری تھے۔ ان کی ادارت میں صرف دو ہی شمارے نکلے تھے کہ آپ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد آپ کے فرزند محمد جاوید اکرم نے ادارت کی ذمہ داری سنبھالی اور اپنے والد محترم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس سہ ماہی رسالے کو پابندی سے شائع کر رہے ہیں۔

ریاست تمل ناڈو میں دانمباڑی کی مانند اردو کے چند جزیرے اور ہیں جو تمل آبادی کے سمندر میں گھرے ہوئے ہیں۔ ایسا ہی ایک جزیرہ عمر آباد بھی ہے جہاں کی مشہور و معروف دینی علوم کی درسگاہ ''جامعہ دار السلام'' تشنگان علم دین کو سیراب کر رہی ہے۔ اس درسگاہ کے سابق شیخ الجامعہ مولانا شاکر نائطی نے 1935 میں ماہنامہ ''مصحف'' جاری کیا تھا۔ ابتدا میں یہ ماہنامہ جامعہ دار السلام عمر آباد کے اہل قلم طلبا اور اساتذہ کے مضامین کی اشاعت تک محدود تھا۔ بعد ازاں اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر علامہ شاکر نائطی نے اسے نہ صرف قومی صحافت کے معیار پر لا کھڑا کیا بلکہ ہندوستان کے چوٹی کے فنکاروں مثلاً مولانا ماہر القادری، سرشار کسنڈوی، نوح ناروی، کوثر چاندپوری، الطاف مشہدی، ملا رموزی، عرش ملسیانی، مولوی نصیر الدین ہاشمی اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی تازہ ترین تخلیقات کو شائع کر کے اسے ایک دستاویز کی شکل دے دی۔ جامعہ دار السلام عمر آباد کی درسگاہ سے نکلنے والا دوسرا رسالہ ماہنامہ ''راہ اعتدال'' ہے جو 1981 سے بلا ناغہ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس درسگاہ سے ایک سالنامہ ''دار السلام'' بھی بڑی پابندی سے شائع ہوتا ہے۔

اردو کا ایک اور جزیرہ میل دشارم آرکاٹ سے متصل ایک چھوٹا سا قدیم شہر ہے یہاں کے اردو داں طبقہ کے باذوق قارئین کی تشنگی منانے کے لیے 1952 میں علامہ محوی صدیقی نے دو ماہنامے ''معیار ادب'' اور ''الارشاد'' جاری کیے۔ ان میں اول الذکر خالص ادبی اور ثانی الذکر مذہبی و دینی افکار پر مشتمل تھا۔ 1960 میں محمد زکریا ذکی کے زیر ادارت یہاں سے ایک اور ماہنامہ ''گلستان'' بچوں کے لیے جاری ہوا جو تقریباً ایک سال تک جاری رہا۔ اس کے کل گیارہ شمارے ہی منظر عام پر آ سکے۔ 1963 کے لگ بھگ محمد عمر فاروق نے ایک ماہنامہ ''باغ و بہار'' بچوں کے

لیے جاری کیا یہ بھی تقریباً ایک سال تک جاری رہا پھر نامساعد حالات کے سبب اس کی اشاعت موقوف ہوگئی۔ اب صرف ایک ماہنامہ ''ندائے نیر'' اپنی سخت جانی کا ثبوت دیتے ہوئے میل وشارم میں اردو کی ترجمانی کررہا ہے۔ اس کے مدیر کنیار عزیز باشاہ ہیں۔ یہ خالص اسلامی اخبار ہے لیکن اس میں وقتِ ضرورت اردو اداروں کی سرگرمیوں سے متعلق خبریں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔

ضلع ویلور کے صنعتی شہر آمبور کی مجلس جامع الخیر کا دینی، علمی و اصلاحی ترجمان ماہنامہ ''الخیر'' مفتی محمد صلاح الدین قاسمی کی ادارت میں گزشتہ دس سال سے بلا ناغہ نکل رہا ہے۔ اس میں اگر چہ ادبی مضامین کم ہوتے ہیں مگر جو بھی علمی و اصلاحی مضامین شائع ہوتے ہیں وہ معلوماتی ہونے کے ساتھ زبان و بیان کے اعتبار سے معیاری و نکسالی ہوتے ہیں۔ ضلع ویلور کے ایک مردم خیز شہر پرنامبٹ سے ''اذانِ حرم'' 1994 میں سہیل راشد کی ادارت میں جاری ہوا۔ یہ پندرہ روزہ علمی، ادبی و اصلاحی رسالہ تھا۔ اس میں مقامی اہل قلم جوش و خروش سے شریک ہوتے تھے۔ ''اذانِ حرم'' میں قرآن، حدیث، فقہ اور اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ علمی، سیاسی، ادبی اور اصلاحی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ نو سالہ صحافتی سفر کے دوران ''اذانِ حرم'' نے شہر پرنامبٹ کی نئی نسل میں شعر و ادب کا ذوق پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ افسوس کہ یہ رسالہ نو سال تک اپنی گراں قدر خدمات انجام دے کر بعض ناگزیر حالات کے سبب بند ہوگیا۔ ایک اور ماہنامہ ''دعوۃ الحق'' پرنامبٹ سے مئی 2005 کو مجلسِ دعوۃ الحق کی سرپرستی میں جاری ہوا۔ اس کے نگراں مولانا قاضی محمد اسد اور مدیر مسئول مولانا قاری محمد عارف ہیں۔ یہ رسالہ نہایت عمدہ ٹائٹل، نفیس کاغذ، کمپیوٹر کمپوزنگ کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ شاید پورے ملک میں اپنی نوعیت کا واحد رسالہ ہے جو مفت تقسیم ہوتا ہے۔ یہ خالص دینی و اصلاحی رسالہ ہے۔ اس کا واحد مقصد تبلیغ دین ہے۔

ویلور دار السرور تمل ناڈو کا ایک تاریخی شہر ہے جو اپنے بطن میں اردو زبان و ادب کی ڈھائی سو سالہ تاریخ رکھتا ہے۔ شہر ویلور میں واقع دار العلوم لطیفیہ تمل ناڈو کی سب سے قدیم درسگاہ ہے۔ سال نامہ ''اللطیف'' اسی دار العلوم لطیفیہ کا ترجمان ہے جو 1960 میں جاری ہوا۔ اس کے سرپرست حضرت مولانا سید شاہ محمد باقر قادری تھے۔ اب یہ رسالہ بڑی پابندی کے ساتھ ڈاکٹر سید

عثمان قادری کی سرپرستی میں شائع ہو رہا ہے۔ اس کے مدیران مسئول محمد ابوبکر ملیباری اور مولانا ڈاکٹر بشیر الحق قریشی ہیں۔

شہر ویلور کی ایک اور دینی درسگاہ باقیات صالحات سے دو سالنامے جاری ہوئے۔ سالنامہ ''صفیر'' 1970 میں ڈاکٹر راہی فدائی کی ادارت میں جاری ہوا اور 1988 تک شائع ہوتا رہا۔ سالنامہ ''نفیر'' 1989 سے جاری ہوا۔ اسے انجمن ابنائے قدیم مدرسہ باقیات صالحات اپنی سرپرستی میں شائع کرتی رہی۔ یہ دونوں رسالے مواد و معیار کے اعتبار سے دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں تمل ناڈو کے برگزیدہ ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات اور تنقیدی و تحقیقی مضامین شائع ہوتے تھے۔ یہ دونوں رسالے کئی سال تک اپنی صحافتی خدمات انجام دینے کے بعد بند ہو گئے۔

مدراس سے مارچ 2011 میں روزنامہ ''پیس وائس'' (امن کی آواز) جاری ہوا۔ یہ سہ لسانی اخبار ہے جو انگریزی تمل اور اردو تینوں زبانوں میں بڑی پابندی سے فاطمہ مظفر کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ اردو انجمنوں اور تعلیمی اداروں کی سرگرمیوں کے ساتھ سیاسی خبریں بھی اس میں شائع ہوتی ہیں۔ ابتدا میں ایک سال تک یہ پندرہ روزہ اخبار تھا جب قارئین میں اس کی مانگ بڑھنے لگی تو اسے روزنامہ میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

تمل ناڈو میں اردو صحافت کے اس شاندار ماضی کو دیکھنے کے بعد جب ہم موجودہ صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ ایک صدی قبل جہاں سے اردو کے 10 ماہنامے اور اخبار نکلا کرتے تھے وہاں اب ان کی اشاعت صرف دو چار ماہنامے اور روزناموں تک محدود ہو گئی ہے۔ صرف روزنامہ ''مسلمان'' وہ واحد اخبار ہے جو پورے تمل ناڈو میں اردو صحافت کی نمائندگی کر رہا ہے۔ 1927 میں صدر کانگریس ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے ہاتھوں روزنامہ ''مسلمان'' کا اجرا عمل میں آیا تھا اور آج تک یہ پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ سید فضل اللہ اس کے مدیر اعلیٰ اور مالک تھے۔ اب ان کے فرزند سید عارف اللہ بحیثیت مدیر و پبلشر روزنامہ ''مسلمان'' کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہیں۔ صوبائی حکومت روزنامہ ''مسلمان'' کو تمل ناڈو کے مسلمانوں کا ترجمان سمجھتی ہے اور اسے قدر کی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ 1964 میں شری چھاگلہ

نے جو اس وقت مرکزی وزیر تعلیم تھے یو این او (UNO) میں ہندوستانی وفد کے لیڈر کی حیثیت سے تقریر کرتے ہوئے ہندوستانی رائے عامہ کے نمائندے کے طور پر اس اخبار کا ذکر کیا اور اپنی تقریر کی تائید میں روزنامہ ''مسلمان'' کے اداریے کو پیش کیا تھا۔ اس وقت روزنامہ ''مسلمان'' کے اداریے بڑے جاندار و شاندار ہوا کرتے تھے۔ روزنامہ ''مسلمان'' سے وابستہ سابق مدیروں میں ابوالجلال ندوی، مولانا سید سلطان محی الدین بہمنی، عبداللطیف فاروقی، ایس ایم فاضل اور علی حسین بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے علاوہ روزنامہ ''مسلمان'' سے کئی ایک نامہ نگار مثلاً ابوالحسنات، عبدالوہاب صوفی، احمد الدین، عثمان غنی، حیات افتخار، سید سجاد حسین، احمد ندیم اور قاضی حبیب احمد بھی وابستہ رہے۔ ان میں احمد الدین اور عثمان غنی ہنوز اس اخبار سے جڑے ہوئے ہیں۔

بحیثیت مجموعی تمل ناڈو کی گذشتہ ڈیڑھ سو سالہ علمی، مذہبی، تہذیبی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا اندازہ لگانے کے لیے یہاں سے شائع ہونے والے اخبار و رسائل ہی ہماری صحیح رہنمائی کر سکتے ہیں۔ یہاں کے اہل قلم نے جہاں شعر و ادب کی آبیاری کی وہاں صحافتی میدان میں بھی ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں جن کو اردو صحافت کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

مراجع و مصادر:

1- ہسٹری آف انڈین جرنلزم — سجے نند اجن
2- خطبات گارساں دتاسی — مطبوعہ: انجمن ترقی اردو
3- مدراس میں اردو — نصیر الدین ہاشمی
4- مدراس میں اردو ادب کی نشو و نما — فضل الدین اقبال
5- تمل ناڈو میں اردو صحافت — ڈاکٹر سید صفی اللہ
6- اردو اخبارات ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں — عتیق صدیقی
7- رسالہ اردو — اپریل 1941
8- فہرست اخبارات ہند — منشی محبوب عالم

(ر) آندھرا

آندھرا و تلنگانہ میں اردو صحافت

رؤف خیر

ادب و صحافت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اچھا ادیب اچھا صحافی ہو سکتا ہے جیسے مولانا ابوالکلام آزاد (مدیر الہلال و البلاغ)، مولانا ظفر علی خان (مدیر زمیندار)، مولانا محمد علی جوہر (مدیر ہمدرد و کامریڈ)، شاہد احمد دہلوی (مدیر ساقی)، احمد ندیم قاسمی (مدیر فنون) وغیرہ وغیرہ۔

ایک اچھا صحافی ایک اچھا ادیب بھی ہو جاتا ہے جیسے محمد طفیل نے اپنے رسالے ''نقوش'' کی ادارت سنبھالنے کے بعد کئی بے مثال خاکے لکھے جو ادبی شاہکار ٹھہرے۔ ان کے خاکوں پر مشتمل کتابیں ہیں جناب، صاحب، محترمی، مکرمی وغیرہ وغیرہ۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے رسالے ''اوراق'' کے نکالنے کے بعد کئی تجربے کیے۔ تنقید اور انشائیے کی ترویج و اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ایسی اور بھی کئی مثالیں ہیں۔

بعض سربراہانِ مملکت اخبارات کی سرپرستی بھی کرتے رہے ہیں۔ سدا سکھ لال کی ادارت میں اردو کا پہلا اخبار ''جام جہاں نما'' 1822 میں کلکتے سے نکلتا تھا جس پر باضابطہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی مہر ثبت ہوتی تھی۔ اس کے برخلاف حکومتِ وقت کے خلاف آواز اُٹھانے والے

اخبار بھی ہمیشہ نکلتے رہے ہیں۔ اس سلسلے کا پہلا اخبار "دہلی اخبار" 1836 میں شاہجہاں آباد دہلی سے محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نکالتے تھے جنھیں حق گوئی و بیباکی کے نتیجے میں جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ گویا صحافی محمد باقر پہلے "شہیدِ صحافت" ہیں۔

حیدرآباد سے ایک روزنامہ "نظام گزٹ" والیِ سلطنت حضور نظام سابع میر عثمان علی خاں بہادر کے نام پر 1927 سے نکلا کرتا تھا جس میں نظام دکن کے فرمان اور تخلیقات بڑے اہتمام سے شائع ہوا کرتی تھیں۔ مذکورہ "نظام گزٹ" نے میر عثمان علی خاں کا سالگرہ نمبر بھی شائع کیا تھا۔ 3 رجب 1350ھ مطابق 14 نومبر 1931 کو اس اخبار نے جلی حروف میں یہ خبر بھی شائع کی تھی:

> "شہزادہ اعظم جاہ بہادر کا عقد ترکی کے خلیفہ عبدالمجید خان کی صاحبزادی دُرِ شہوار سے اور معظم جاہ کا عقد مذکورہ خلیفہ کی بھانجی نیلوفر سے یکم رجب 1350ھ کو ہو گیا۔"

یہ دونوں شادیاں آخر کار نام کام ثابت ہوئیں۔ دونوں خوبصورت شہزادیاں حیدرآباد چھوڑ کر چلی گئیں۔

یہ "نظام گزٹ" پولیس ایکشن کے ہاتھوں نظام کی حکومت کے خاتمے کے باوجود جاری رہا اور نظام دکن میر عثمان علی خاں بہادر کے انتقال پُر ملال 24 فروری 1967 کے بعد یہ اخبار بھی بند ہو گیا۔

"لیلیٰ کے خطوط" اور "مجنوں کی ڈائری" کے شہرت یافتہ ممتاز ادیب قاضی عبدالغفار نے 1935 میں روزنامہ "پیام" جاری کیا۔ بعد میں اسے اختر حسن کو سونپ دیا جو حسرت موہانی کے بھتیجے ہوا کرتے تھے۔ اختر حسن کمیونسٹ تھے اور انڈین نیشنل کانگریس کے ہم نوا تھے۔ وہ چونکہ نظام سابع کی حکومت کی برقراری کے خلاف تھے اس لیے انھیں رضا کاروں کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔ قاضی عبدالغفار بھی ترقی پسند تھے۔ اختر حسن کے احباب مخدوم محی الدین، سلیمان اریب، راج بہادر گوڑ تھے۔ ادبی حلقوں میں "پیام" کافی مقبول تھا۔ نظام دکن کے خلاف پولیس ایکشن کے بعد کئی اخبار بند ہو گئے ان میں "پیام" بھی تھا۔ اختر حسن نے عملاً سیاست میں قدم رکھا۔ اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیا مگر جیت نہ سکے۔ آخری زمانے میں اختر حسن اردو اکادمی آندھرا پردیش کے چیئرمین

بھی کچھ دن رہے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ انھوں نے غالب کی فارسی مثنوی ''چراغ دیر'' کا منظوم اردو ترجمہ بھی کیا تھا۔

آزادی کے بعد حیدرآباد سے 1949 میں دو روزنامے نکلے۔ رہنمائے دکن (جولائی 1949) اور سیاست (15/اگست 1949)۔

روزنامہ ''رہنمائے دکن'' اپنے اسلامی مزاج کی وجہ سے مسلمانوں میں خوب چلتا تھا۔ ہر سال میلاد النبی نمبر، شب برأت نمبر، شب معراج نمبر، یوم عاشورہ نمبر وغیرہ وغیرہ کے ذریعے وہ سنّیوں اور شیعوں میں کافی مقبول تھا۔ فسادات کے موقعوں پر بھی لوگ اس کی خبروں پر زیادہ یقین کرتے تھے۔ اس لیے اخبار ہاتھوں ہاتھ بک جایا کرتا تھا۔ پہلے اس کے ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر محمود وحیدالدین تھے پھر لطیف الدین اور وقار الدین ہوئے۔ آج بھی یہ وقار الدین صاحب ہی کی سرپرستی میں نکل رہا ہے۔ اب حیدرآباد سے زیادہ اضلاع میں مقبول ہے۔ ''رہنمائے دکن'' شروع میں روزنامہ ''رہبر دکن'' تھا۔ اس میں شعر و ادب کا خاص خیال رکھا جاتا رہا ہے۔ خاص طور پر اس نے اپنے اخبار کے ذریعے بچوں کو ادب سے جوڑا۔ یہ واحد اخبار تھا جس میں بچوں کا صفحہ ہر ہفتے شائع ہوا کرتا تھا جس میں بچوں کے لکھے ہوئے مختصر مضامین اور کہانیاں شائع ہوا کرتی تھیں۔ بچوں کے لیے لکھنے والے آگے چل کر بڑوں میں بھی جانے پہچانے لگے۔ اُن میں ایک خاکسار رؤف خیر بھی ہے جس نے اپنے طالب علمی کے دور میں 64-1963 میں بچوں کے لیے جو کہانیاں لکھیں وہ رہنمائے دکن میں اکثر شائع ہوتی تھیں۔ پھر رؤف خیر کی نظمیں ماہ نامہ ''کھلونا'' اور ''پیام تعلیم'' دہلی میں بھی شائع ہونے لگیں۔

روزنامہ ''رہنمائے دکن'' میں ہر جمعرات شعری صفحہ شائع ہوتا تھا جس میں کسی ایک عنوان کے تحت مشہور اشعار کے علاوہ مختلف نئے پرانے شاعروں کی غزلیں بھی شائع کی جاتی تھیں۔ خاکسار رؤف خیر کی بے شمار ابتدائی غزلیں بھی اسی اخبار میں چھپتی رہیں اس طرح رؤف خیر کی ادبی تربیت میں روزنامہ ''رہنمائے دکن'' کا غالب حصہ ہے۔

15/اگست 1949 کو محبوب حسین جگر اور عابد علی خان صاحبان کی مشترکہ کوششوں سے روزنامہ ''سیاست'' جاری ہوا۔ یہ ایک سیکولر مزاج کا اخبار رہا۔ ترقی پسند نظریات کے حامل محبوب

حسین جگر کے دوستوں میں ہندو مسلم سب شامل تھے۔ مسلمانوں کے تمام فرقے سنی، شیعہ، مہدوی، پارسی وغیرہ سب "سیاست" میں لکھا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ کمیونسٹ فکر کے ادیب مخدوم، سلیمان اریب، راج بہادر گوڑ، امجد بافی، منوہر راج سکسینہ، زینت ساجدہ، شاہد صدیقی، شہریار کاؤس جی، ہرمز، ظفر الحسن جیسے لکھنے والوں کا تعاون سیاست کو حاصل رہا۔ یہ اخبار ہندو مسلم یکجہتی کا علمبردار تھا۔ اس لیے ہر مذہب و ہر مسلک کا آدمی اس کا قاری تھا۔ یوں سیاست نے گنگا جمنی تہذیب کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ محبوب حسین جگر اسے صرف مسلمانوں میں محدود کر کے نہیں رکھ دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ اسے سرکاری سرپرستی بھی حاصل ہوئی۔ سرکاری خبریں، سرکاری اشتہارات سے بھی یہ بہرہ یاب ہونے لگا۔

روزنامہ "منصف" جب شائع ہونا شروع ہوا تو اس نے ہر جمعہ مذہبی ایڈیشن، ہر جمعرات ادبی صفحہ، ہر چہار شنبہ خواتین کا صفحہ وغیرہ شائع کرنا شروع کیا۔ چنانچہ روزنامہ سیاست کو بھی مسابقت میں اپنا سیکولر رویہ بدل کر مذہبی صفحہ شائع کرنا پڑا۔ اب تو جشنِ میلاد النبی کے موقع پر "سیاست" میں بے شمار مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ رمضان کے زمانے میں بلکہ ہر جمعہ قرآن و حدیث کے وسیلے سے علمی مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ حمد و نعت بھی اب شائع کی جاتی ہیں۔ خواتین کے لیے بھی مفید مضامین سیاست کی زینت بنتے ہیں۔ ہر ہفتہ سیاست کا ادبی صفحہ بھی مرکز نگاہ بنتا ہے۔ ہر اتوار سیاسی و سماجی مسائل پر لمحۂ فکر دینے والے مضامین اور تراجم بھی قارئین کے فکر کو جھنجھوڑتے ہیں۔ سرکاری سرپرستی سیاست کو اب بھی حاصل ہے، سرکاری اشتہارات بھی اسے ملتے ہیں۔ ضرورتِ رشتہ کے بے شمار اشتہارات کے علاوہ خرید و فروخت کے کلاسیفائیڈ اشتہارات سے اخبار بھرا رہتا ہے۔

"سیاست" میں کریئر گائیڈنس کا سلسلہ نوجوانوں کی رہنمائی کے لیے شروع کیا گیا اور انھیں اپنا مستقبل سنوارنے کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔ اردو دانی کی کلاسس چلائی جاتی ہیں اور اردو سکھانے کے لیے سلسلہ وار کتابیں چھاپ کر طلبہ و طالبات کو مفت فراہم کی جاتی ہیں۔ امتحانات کامیاب کرنے والوں کو اسناد کے ساتھ ترغیبی انعامات بھی دیے جاتے ہیں۔

یوں تو روزنامہ "ملاپ" بھی 1949ء میں جاری ہوا مگر جب یہ دہلی سے نکلتا تھا تو سہ

روزہ تھا۔ مگر 1951 میں حیدرآباد منتقل ہوا تو روزنامہ ہوگیا۔ ''ملاپ'' بھی سیکولر اخبار تھا۔ یدھ ویر جی اس کے مدیر تھے۔ اس میں ہندی الفاظ بکثرت استعمال ہوا کرتے تھے۔ اس کا خاص کالم ''پیاز کے چھلکے'' فکر تونسوی لکھا کرتے تھے۔ اس کا ادبی صفحہ علاء الدین حبیب ترتیب دیا کرتے تھے۔ مشہور و ممتاز ادیبوں کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کی خوب پذیرائی کی جاتی تھی۔ خاکسار رؤف خیر کی تخلیقات بھی 1970 کے آس پاس ''ملاپ'' میں خوب چھپتی رہی ہیں۔ حیدرآباد کا یہ واحد اخبار تھا جس میں شاعروں، ادیبوں کی تخلیقات چھٹی ساتویں دہائی ہی سے ان کی تصویروں کے ساتھ بڑے اہتمام سے ہر چہارشنبہ کو شائع کی جاتی تھیں۔ علمی ادبی مسائل بھی موضوع بحث آتے تھے۔ ادبی حلقوں میں روزنامہ ''ملاپ'' کافی مقبول رہا۔ ہر سال دیوالی نمبر، جشن آزادی نمبر، سری کرشن نمبر، یوم جمہوریہ نمبر بھی نکالا کرتا تھا اور بے حد معلوماتی ہوا کرتا تھا۔ 1948 میں اردو روزنامہ ''ملاپ'' بند کر دیا گیا مگر ہندی ملاپ آج تک جاری ہے اور کافی پڑھا جاتا ہے۔

نواب محبوب عالم خان صاحب کو بھی اخبار نکالنے کا شوق چرایا۔ چنانچہ 1976 میں اُنھوں نے روزنامہ ''نوید دکن'' نکالا۔ یہ جماعتِ اسلامی فکر سے قریب تھا۔ یہ 1978 میں بند ہوگیا۔

1977 میں روزنامہ ''منصف'' کے منظرِ عام پر آنے کی روداد بڑی دلچسپ ہے۔ جناب محمود انصاری روزنامہ سیاست میں سب ایڈیٹر تھے۔ مگر وہ خود اپنا اخبار نکالنا چاہتے تھے۔ ان کی ایک بہن ڈاکٹر عطیہ انصاری سعودی عرب کی شاہی معالج تھیں۔ محمود انصاری نے مالکانِ سیاست سے کہا کہ انھیں ملازمت سے سبک دوش کر دیا جائے تا کہ وہ اپنی بہن کے پاس سعودی عرب چلے جائیں۔ چنانچہ روزنامہ سیاست سے انھیں سبک دوش کر کے ان کے تمام بقایاجات ادا کر دیے گئے۔ ایک وداعی جلسہ بھی رکھا گیا جس میں ''سیاست'' کے ذمہ دار اور صحافی برادری کے ہمدردوں نے تقاریر کیں اور ایک اچھے صحافی سے جُدا ہونے کو صحافت کا بہت بڑا نقصان قرار دیا۔ بس کیا تھا۔ محمود انصاری کو موقع ہی مل گیا۔ انصاری نے بہی خواہوں کے جذبات کے احترام میں کہا کہ سعودی عرب جانے کا اپنا ارادہ انھوں نے بدل دیا ہے اور اخبار نکالنے کی کوئی سبیل نکالیں گے۔ اسی دوران یہ ''منصف'' کا ڈیکلریشن لے چکے تھے۔ ظاہر ہے تجربہ کار صحافی محمود

انصاری کسی اخبار کے کل پُرزے ہو کر رہ جانا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے روزنامہ سیاست میں ان کے جو بقایاجات تھے بڑی مصلحت سے وصول کر لیے اور فوراً اپنا اخبار ''منصف'' نکالنا شروع کر دیا۔ اتفاق سے شہر حیدرآباد میں 1977 میں فسادات پھوٹ پڑے اور ''منصف'' کے نمائندے شہر بھر میں گھوم پھر کے خوب خبریں جمع کرنے لگے اور بڑی تفصیلی خبریں اس میں چھپنے لگیں۔ چنانچہ ''منصف'' کی مقبولیت میں کافی اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ ادیبوں شاعروں کے جامع تعارف کے ساتھ ان کے بڑے فوٹو بھی (شاہ علی فوٹو گرافر کے ذریعے) شائع کرنے کا اہتمام بھی ''منصف'' میں ہونے لگا۔ محمود انصاری حیدرآباد کے ادیبوں شاعروں کو دوست رکھتے تھے اور ادیب شاعر محمود انصاری کو دوست رکھتے تھے۔ یوں ادبی جلسوں کی تفصیلی رپورٹ تصویر کے ساتھ ''منصف'' میں شائع ہونے لگی۔ محمود انصاری کے اچانک انتقال کے بعد ان کے بھائی مسعود انصاری نے اسے کچھ دن سنبھالا۔ ''منصف'' کو عطا محمد خان جیسے بیباک صحافی کا بھرپور تعاون شروع ہی سے حاصل رہا، ان کا کالم طرفہ تماشا بہت مقبول تھا۔ عطا محمد خان اور منصف لازم وملزوم تھے۔ بہت ہی کم عمری میں عطا محمد خان کا انتقال بھی اچانک ہو گیا۔ پھر مسعود انصاری سے جناب خان لطیف خان صاحب نے روزنامہ منصف حاصل کر لیا اور اسے بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ ABC کی رپورٹ کے مطابق ہندوستان کا سب سے زیادہ چھپنے والا روزنامہ ''منصف'' کئی سال سے سرفہرست ہے۔ اس کے ہفتہ واری ضمیمے (سپلیمنٹ) بھی بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں جیسے گھر آنگن، آئینۂ ادب، آئینۂ شہر، مینارۂ نور اس کے علاوہ سائنس اور ٹکنالوجی پر کافی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ''منصف'' کے ادبی ایڈیشن میں ہند و پاک کے مشاہیر ادیبوں شاعروں پر تصویروں کے ساتھ بھرپور مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ شاعر و مضمون نگار کی تصویر بھی شائع کی جاتی ہے۔ دیگر لکھنے والوں کی تخلیقات بھلے ہی ردّی کی ٹوکری کی نذر بھی کر دی جائیں مگر ادبی صفحے کے مرتب مضطر مجاز صاحب کے کیے ہوئے اقبال کی فارسی تخلیقات و قطعات کے منظوم اردو تراجم بلاناغہ ہر ہفتہ ضرور شائع ہوتے ہیں۔ بہرحال ادبی صفحہ بہت اچھا نکلتا ہے۔

کے ایم عارف الدین نے مدینہ ایجوکیشن سینٹر نام پلی حیدرآباد سے اپنا اخبار ''ہمارا عوام'' 1995 میں جاری کیا مگر یہ چل نہیں سکا چند ہی سال میں بند ہو گیا۔ مجلس اتحاد المسلمین کا

نمائندہ روزنامہ ''اعتماد'' نئی جاپانی مشین پر 2005 سے بڑا خوب صورت شائع ہونے لگا۔ عالمی خبروں کے ساتھ شہر اور اضلاع کی خبریں بھی تفصیل سے شائع کی جاتیں۔ اس کے علاوہ کئی ادبی، سائنسی، طبّی ضمیمے بھی شائع کیے جاتے ہیں جو کافی معلوماتی ہوتے ہیں۔

روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے شہروں سے جاری کیا گیا ہے جیسے دہلی، کلکتہ، پٹنہ، رانچی، بنگلور، گورکھپور وغیرہ اسی طرح 2006 میں حیدرآباد سے بھی جاری کیا گیا۔ اس اخبار میں شمالی ہند و جنوبی ہند کی خبروں کے ساتھ ساتھ حیدرآباد و اضلاع کی تفصیلی خبریں تصویروں کے ساتھ شائع کی جاتی ہیں۔ اس لیے اس کے قارئین کی تعداد بھی قابلِ لحاظ ہے۔

پانچویں دہائی سے معین فاروقی کی ادارت میں روزنامہ ''انگارے'' بھی نکلا کرتا تھا مگر عوام میں یہ مقبولیت حاصل نہ کر سکا۔ لگتا تھا بعض ہفتہ واروں کی طرح سرکاری مسل کی تکمیل کے لیے نکالا جاتا تھا۔ معین فاروقی کے انتقال کے بعد 1990 کے آس پاس ''انگارے'' پر بھی اوس پڑ گئی۔

حیدرآباد اور اطراف و اکناف سے کئی ہفتہ وار اور پندرہ روزہ اخبارات نکلے اور نکلتے رہتے ہیں جن میں سے بہت سارے ایسے ہیں جو سرکاری خانہ پُری اور سرکاری اشتہارات کے حصول کے لیے نہایت ہی محدود تعداد میں شائع ہوتے ہیں جو سرکاری فائل میں جگہ پاتے ہیں تاکہ ان کی سرکاری مراعات برقرار رہیں۔ اردو اکادمی بھی ایسے ہفت وار اور پندرہ روزہ رسائل و جرائد کو ہر ماہ ایک مقررہ رقم بطور امداد دیتی ہے۔ یوں ان غریب صحافیوں کی روزی روٹی کا کچھ نہ کچھ بندوبست ہو جاتا ہے۔ ایسے اخباروں میں البتہ کچھ ایسے ضرور رہے ہیں جنھوں نے اپنی پہچان بنائی ہے جن کا ذکر آگے آئے گا۔

مشہور و ممتاز ترقی پسند شاعر مخدوم محی الدین نے 1951 میں اپنا ہفت روزہ ''نیا دور'' نکالا جو کمیونسٹ پارٹی کا ترجمان تھا۔ مگر یہ اخبار بے ضابطہ بھی تھا اور عوام سے اس کا رابطہ کم کم ہی تھا۔ یہ کب نکلتا تھا کسی کو پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ ڈاکٹر محبوب فرید کی تحقیق کی وجہ سے خود ہمیں پتہ چلا کہ اس نام کا کوئی ہفت وار مخدوم بھی نکالا کرتے تھے۔ حیدرآباد کے بہت کم لوگ اس کے بارے میں جانتے ہوں گے۔ مخدوم کی حیات ہی میں یہ چپکے سے بند ہو گیا۔

مشہور و ممتاز سماجی و سیاسی رہنما غوث خاموشی نے 1954 میں اپنا ہفت روزہ ''معمار'' جاری کیا جس میں قرآن و حدیث، سیاست، ادب سے متعلق سب کچھ ہوتا تھا مگر اس کے بارے میں عوام الناس کو کم کم ہی خبر ہوتی تھی۔ ایک دن خاموشی کے ساتھ یہ بھی بند ہو گیا۔

ترقی پسند ادیب نجم الثاقب شحنہ رہتے تو یادگیر (کرناٹک) میں تھے لیکن 1955 میں حیدرآباد سے ادبی رسالہ ''گجر'' جاری کیا جو ترقی پسند ادب کا ترجمان تھا۔ چند سال بعد ہی اس کی شام ہو گئی۔

1956 میں شیعت کی ترجمانی کے لیے انور ہاشمی نے ''شاہکار'' اور کرار کاظمی نے ''بانگِ درا'' جاری کیا۔ ان کے مدیروں کی وفات کے ساتھ ہی یہ پرچے بھی بے نام و نشان ہو گئے۔

کمیونسٹ پارٹی کے وفادار اور مخدوم کے قریبی دوست امجد باغی نے 1960 سے ماہنامہ ''نیا آدم'' جاری کیا۔ مخدوم کی وفات کے فوری بعد 1970 میں ''نیا آدم'' کا مخدوم نمبر جناب امجد باغی نے نکالا جو دستاویزی حیثیت کا حامل تھا۔ امجد باغی کے ساتھ ہی 1980 میں ''نیا آدم'' بھی ختم ہو گیا۔

عبدالرحیم قریشی نے 1964 میں اپنا ہفت وار ''شعور'' جاری کیا اور مسلمانوں کے مسائل پر خود بھی کھل کر لکھا اور دیگر دانشوروں سے لکھوایا۔ قریشی صاحب ادارہ تعمیر ملت سے بھی وابستہ تھے۔ اللہ عبدالرحیم قریشی کو سلامت رکھے مگر ''شعور'' سلامت نہیں رہا۔ افسوس کہ 13 رجنوری 2016 کو عبدالرحیم قریشی صاحب بھی دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

شفیع اقبال نے پنڈت نہرو کی پہلی برسی کے موقع پر اپنا ہفت وار ''ہماری منزل'' جاری کیا۔ ابھی پچھلے سال مئی 2015 میں اس کی پچاسویں سالگرہ کا جشن منایا گیا تھا۔ ''ہماری منزل'' میں نئے ادیبوں شاعروں کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ چنانچہ خود خاکسار رؤف خیر اس کی زندہ مثال ہے۔ یہ پرچہ اب بھی نکلا کرتا ہے۔ شفیع صاحب ماہنامہ ''پروانۂ دکن'' بھی نکالتے ہیں۔

حیدرآباد کے نئے لب و لہجہ کے مقبول و ممتاز شاعر خورشید احمد جامی کی یاد میں ان کے چہیتے شاگرد محمود خاور نے 1970 میں ہفت روزہ ''برگِ آوارہ'' جاری کیا جس کے سرنامے کے طور

پر اپنے مربی جامی صاحب کا شعر درج رہتا تھا۔

لے کے پھرتی ہیں آندھیاں جس کو زندگی ہے وہ برگِ آوارہ

''برگ آوارہ'' جامی صاحب کے شعری مجموعے کا نام بھی ہے۔ ویسے 1966 میں پاکستان کے باغی شاعر حبیب جالب کا مجموعہ بھی اسی نام سے شائع ہو چکا تھا۔

محمود خاور نے ''برگ آوارہ'' میں اس دور کے نئے پُرانے تمام قلم کاروں کو جمع کر رکھا تھا۔ ہر ہفتہ اس ہفتہ وار کا قاری کو انتظار رہتا تھا۔ ان کے پاکستان ہجرت کر جانے کے بعد ان کے بھائی انور مسعود نے اسے کچھ دن سنبھالا۔ آخر کار وہ بے ادب آندھی کی نذر ہو گیا۔

حیدرآباد کے استاد شاعر اوج یعقوبی ایک ادبی ہفت وار ''رابطہ'' ساتویں دہائی میں حیدرآباد سے نکالا کرتے تھے جس میں رؤف خیر نے مختلف کتابوں پر تبصرے کیے۔ اس طرح رؤف خیر میں تنقیدی بصیرت پیدا کرنے میں اوج صاحب کے رابطے کا دخل ہے۔ ایک آدھ سال سے زیادہ یہ برقرار نہیں رہا۔

ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز پہلے روزنامہ ''رہنمائے دکن'' سے وابستہ تھے۔ اُنھوں نے خود اپنا پرچہ نکالنا طے کیا اور 1999 میں ہفت روزہ ''گواہ'' جاری کیا جو ہر ہفتے پابندی سے آج بھی شائع ہوتا ہے اور انٹرنیٹ پر دستیاب ہونے کی وجہ سے امریکہ، یورپ، سعودی عرب اور پاکستان وغیرہ میں شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ اس میں فاضل کا بیباک اداریہ شمارے کی جان ہوا کرتا ہے۔ ''گواہ'' میں ہر موضوع پر کھل کر لکھا جاتا ہے۔ مذہب، ادب، سیاست اور کھیل وغیرہ پر کافی معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ شہر میں ہونے والے اہم اہم جلسوں کی تفصیلی رپورٹ بھی شائع کی جاتی ہے۔ یہ ایسا ہفت دار ہے جس میں ہر مکتب فکر کی پذیرائی کی جاتی ہے۔

ساتویں دہائی میں فارسی و اردو کے استاد شاعر برق موسوی اپنا ایک پندرہ روزہ ''آب و تاب'' نکالا کرتے تھے جس میں وہ مختلف شاعروں کے کلام کا سخت تنقیدی جائزہ لے کر عروض و زبان و بیان کی غلطیوں کی نشاندہی کیا کرتے تھے۔ ایک آدھ سال کے اندر ہی یہ پرچہ ان کی شدت پسندی کا شکار ہو کر اپنی آب و تاب کھو چکا۔

حیدرآباد تو ہر اعتبار سے مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ آس پاس کے علاقوں سے بھی

کچھ پرچے نکلے۔ جیسے کرنول سے عالم مولانا عبدالعزیز رحمانی چھٹی ساتویں دہائی میں ''العزیز'' ہفت وار نکالا کرتے تھے۔ کاتبوں کے ہاتھوں پریشان ہوکر بعض اوقات وہ اپنے پرچے کی کتابت بھی خود کرلیا کرتے تھے۔ اس لیے پرچہ کبھی وقت پر نہیں نکلتا تھا۔ پرچہ خالص قرآن وسنت کا ترجمان تھا۔ ان کی وفات کے ساتھ یہ پرچہ بھی ختم ہوگیا۔

یسیر کرنولی بھی اپنا ہفتہ وار نکالا کرتے تھے اور غالب کی زمینوں میں غزلیں کہا کرتے تھے۔ ڈاکٹر قیسی قمر نگری نے 2001 میں ماہنامہ ''بزم آئینہ'' جاری کیا جس میں عرسوں میلوں کے ساتھ ادب سے متعلق تخلیقات بھی شائع ہوا کرتی ہیں۔ علمی و مذہبی مضامین بھی شائع ہوتے ہیں۔ یہ پرچہ اب ڈاکٹر وحید کوثر کی ادارت میں نکل رہا ہے۔

2010 میں ورنگل سے جاری کردہ ہفتہ وار ''اردو ہماری زبان'' وحید گلشن کی ادارت میں پابندی سے نکل رہا ہے۔ اس میں بھی عرسوں میلوں اور ادبی محفلوں کی تفصیلی روداد شائع ہوتی رہتی ہے۔ تجارتی نوعیت کا یہ ہفت وار ورنگل سے باہر بھی شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ وحید گلشن نے اسے اپنا آرگن بنالیا ہے۔

ساتویں دہائی میں ہنمکنڈہ (ورنگل) سے پندرہ روزہ ''شرارے'' جلیل صاحب نکالا کرتے تھے۔ آٹھویں دہائی میں وہ کچھ دن اردو اکاڈی اے پی کے چیئرمین بھی رہے۔ ان کی وفات کے ساتھ ''شرارے'' بھی بجھ گیا۔

کڑپہ (رائل سیما۔ آندھرا) سے ڈاکٹر خسرو قادری نے ایک سہ ماہی ادبی رسالہ ''دبستان'' 2009 میں جاری کیا جو جدید مکتب فکر کا نمائندہ رسالہ ہے۔

نظام آباد سے جمیل نظام آبادی نے ساتویں دہائی میں ماہنامہ ''گونج'' جاری کیا جو آج کل بھی نکل رہا ہے اور اصلاح میں خوب پڑھا جاتا ہے۔ اصلاح کے ادیبوں شاعروں کی ''گونج'' میں خوب پذیرائی ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ لوگ بھی ''گونج'' کی مدارات میں تن من دھن سے کام لیتے ہیں۔

نظام آباد ہی سے ڈاکٹر عبدالقدیر مقدر نے ماہنامہ ''تمہید'' 2010 میں جاری کیا جس میں ادب کے ساتھ ساتھ مذہبی معلومات بھی پیش کی جاتی ہیں۔ راجہ مہدی علی خان کی کلیات شائع

کر کے ادب میں ان کو زندہ رکھنے کے جتن کرنے والے ڈاکٹر عبدالقدیر مقدر ہند و پاک میں اپنی تحقیقی صلاحیتوں کی وجہ سے پسند کیے جاتے ہیں۔ ماہ نامہ ''تمہید'' آج بھی پابندی سے شائع ہوتا ہے۔ حال ہی میں اس کا اقبال نمبر نکلا۔

مشہور و ممتاز افسانہ نگار و ناول نویس بدنام رفیعی، شاعر مسعود جاوید ہاشمی اور ماہر اقبالیات جناب مصلح الدین سعدی جیسے ارباب قلم کی مشترکہ ادارت میں ماہ نامہ ''افق'' حیدرآباد سے چھٹی دہائی میں نکلا کرتا تھا۔ یہ رسالہ ترقی پسندوں، دہریوں اور جدیدیوں کے جواب میں اسلامی ادب پیش کیا کرتا تھا کہ اسلامی اقدار ہی عالمی اقدار ہیں۔ افسوس کہ یہ جلد ہی بند ہو گیا۔

چھٹی دہائی میں اردو کے مجاہد کمال کریم نگری — کریم نگر سے گزرنے والی ندی ''مانیر'' کے نام پر اردو ماہنامہ نکالا کرتے تھے جس میں آس پاس کے اضلاع کے تخلیق کاروں کا کلام شائع ہوتا تھا۔ کریم نگر کے تجارتی مرکزی مقام پر عدالت کے قریب بہت بڑی جائداد کسی اردو نواز نے اردو کے لیے وقف کی تھی جس میں ایک بہت بڑی لائبریری قائم کی گئی تھی۔ اس جائداد کی رکھوالی کمال صاحب نے اپنی زندگی میں تو کی اب پتہ نہیں اس کا کیا حشر ہوا۔ ''مانیر'' تو چند ہی سال میں بند ہو گیا۔

ماہنامہ ''معمار'' ساتویں دہائی میں آرمور (نظام آباد، اے پی) سے عبدالحمید کی ادارت میں بڑی پابندی سے نکلا کرتا تھا جس میں سارے ملک کے ادیبوں شاعروں کی تخلیقات بڑے اہتمام سے شائع کی جاتی تھیں۔ تقریباً دس سال تک اس کا شہرہ تھا۔ مدیر ''معمار'' کے انتقال کے بعد یہ بھی بند ہو گیا۔

جماعت اسلامی سے وابستہ دینی فکر کے مدیر جناب یعقوب سروش اپنے گاؤں آرمور سے ایک رسالہ ''بساط ذکر و فکر'' نکالا کرتے تھے جس میں ادبی تخلیقات کے ساتھ ساتھ اسلامی فکر پر مشتمل مضامین کو ترجیح دی جاتی تھی۔ ان کے انتقال کے ساتھ یہ بساط بھی اُلٹ گئی۔

ادارۂ ادبیات اردو کے بانی مشہور ماہر دکنیات محقق و ناقد و شاعر ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ایوان اردو حیدرآباد سے جنوری 1938 میں ماہنامہ ''سب رس'' جاری کیا جس میں تحقیقی و تنقیدی مضامین کے ساتھ ساتھ شعر و ادب پیش کیا جاتا تھا۔ ہر دور کے تمام اچھے لکھنے والوں کا

تعاون ''سب رس'' کو حاصل رہا ہے۔ صاحب زادہ محمد علی میکش، سلیمان اریب، خواجہ حمید الدین شاہد، اکبر الدین صدیقی، غلام جیلانی نے بھی اس کی ادارت کی۔ مگر سب سے زیادہ پروفیسر مغنی تبسم نے ''سب رس'' کے لیے تن من دھن کی بازی لگادی۔ آج کل پروفیسر بیگ احساس اس کے مدیر ہیں اور اس کا رنگ و روپ نکھر کر ادبی دنیا کو چکا چوند کر رہا ہے۔

ڈاکٹر زور کے شاگرد رشید اور عقیدت مند خواجہ حمید الدین شاہد کراچی منتقل ہو گئے تھے۔ وہاں سے بھی وہ ہر ماہ ''سب رس'' نکالا کرتے تھے۔ ان کی وفات کے ساتھ یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ حیدرآباد کے خاموش طبع شاعر وقار خلیل نے بھی ''سب رس'' کے لیے بڑی خدمات انجام دی ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ وہ زندگی بھر ادارۂ ادبیات اردو سے وابستہ رہے۔

سلیمان اریب اور ماہنامہ ''صبا'' ایک دوسرے سے پہچانے جاتے تھے۔ 1955 میں سلیمان اریب نے ''صبا'' کی بنیاد ڈالی۔ ہندو پاک کے تقریباً تمام اچھے تخلیق کار و تنقید نگار ''صبا'' میں شائع ہونا اعزاز سمجھتے تھے۔ اس کے کئی دستاویزی حیثیت کے نمبر بھی نکلے جیسے مخدوم نمبر وغیرہ۔ ''صبا'' شروع ہی سے مالی پریشانیوں کا شکار رہا۔ آخر کار 1970 میں کینسر کے شکار اریب کی موت کے ساتھ ہی یہ بھی زندگی و موت کی کشمکش میں رہا۔ کچھ دن مغنی تبسم نے اسے زندگی بخشنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہاتھ لگی۔

لسانی بنیادوں پر 1956 میں آندھرا پردیش کی تشکیل کے بعد محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ (Dept. of Information & Public Relations) کے تحت ماہنامہ ''آندھرا پردیش'' سرکاری ترجمان کی صورت میں منظر عام پر آیا جس میں شائع ہونے والی تخلیقات کا معاوضہ بھی ادا کیا جاتا تھا۔ ابتدا میں اس کے ایڈیٹر کنول پرشاد کنول رہے۔ کچھ دن اختر حسن بھی تھے۔ سید شاہ حبیب الدین قادری بھی اس کے مدیر رہے ہیں۔ تلنگانہ اسٹیٹ (2014) کے قیام کے بعد اس کا نام ماہنامہ ''تلنگانہ'' ہو گیا ہے اور مدیر حبیب صاحب ہی ہیں۔

مارچ 1958 میں اعظم راہی نے ماہنامہ ''پیکر'' جاری کیا جس میں شامل جدید تخلیق کاروں کی تخلیقات نے اردو ادب کو نئی زندگی بخشی۔ ترقی پسندوں کے چل چلاؤ کے دن تھے۔ ''پیکر'' میں ہر مکتب فکر کے لکھنے والوں کی پذیرائی کی جاتی تھی۔ چنانچہ مجروح، اختر الایمان،

جاں نثار اختر، ندا فاضلی، شمس الرحمٰن فاروقی، محمد علوی، کمار پاشی، جوگندر پال، جگدیش بمل، مخدوم، جامی، سلیمان اریب، شاذ تمکنت، اقبال متین وغیرہ کے ساتھ ساتھ تاج مہجور، رؤف خلش، مجتبیٰ حسین، حسن فرخ، رؤف خیر، علی الدین نوید، غیاث متین، اسلم عمادی وغیرہ کی پذیرائی ہوتی تھی۔ اعظم راہی اور "پیکر" ایک ہی سکّے کے دو رُخ شمار ہوا کرتے تھے۔ "پیکر" جیسا رسالہ بھی افسوس کہ بند ہو گیا۔ الحمد للہ اعظم راہی سلامت ہیں اور ان دنوں امریکہ میں اپنے بیٹے کے پاس ہیں۔

1965 میں ناصر کرنولی نے ماہ نامہ "پونم" جاری کیا۔ یہ رسالہ بھی ہندوستان بھر میں شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ ناصر صاحب کو خیر بہوروی اور جرم محمد آبادی سے خاص عقیدت تھی۔ وہ ان کی تخلیقات بڑے اہتمام سے بلا ناغہ شائع کیا کرتے تھے۔ راقم الحروف رؤف خیر کی نظمیں غزلیں بھی "پونم" میں چھپتی رہی ہیں۔ ناصر کرنولی اردو کے لکچرر تھے۔ وظیفے کے بعد وہ اپنے آبائی مقام کرنول منتقل ہو گئے اور "پونم" اماوس کا شکار ہو گیا۔

حیدرآباد میں طوائفوں کے علاقے محبوب کی مہندی سے ایک پردہ نشین شریف خاتون احمدی بیگم 1963 سے رسالہ "قلم کار" نکالا کرتی تھیں جس کے خاص نمبر دستاویزی حیثیت کے حامل ہوا کرتے تھے۔ یہ رسالہ شروع ہی سے بے ضابطگی کا شکار رہا اور تین سال سے زیادہ جی نہ سکا۔

1968 میں زندہ دلانِ حیدرآباد کے ترجمان کے طور پر ڈاکٹر مصطفےٰ کمال کے زیر ادارت "شگوفہ" منظر عام پر آیا۔ پہلے یہ ڈیڑھ ماہی ہوا کرتا تھا پھر ماہانہ ہو گیا۔ طنز و مزاح کے تمام لکھنے والوں کے لیے یہ ایک خوانِ یغما ثابت ہوا۔ ہندو پاک میں اس کی دھوم مچی اور سب کا تعاون اسے حاصل ہوا۔ اس کے کئی خاص نمبر نکلے۔ جیسے ڈراما نمبر۔۔۔ اہم مزاح نگاروں پر خاص گوشے بھی مرتب ہوئے جیسے گوشۂ مجتبیٰ حسین، طالب خوندمیری، پرویز یداللہ مہدی، خواجہ عبدالغفور، برق آشیانوی وغیرہ۔ مصطفےٰ کمال بڑی سنجیدگی سے طنز و مزاح کے اس رسالہ "شگوفہ" کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ آج بھی یہ خاصی تعداد میں چھپتا ہے۔ انھوں نے اوور سیز مدیر بھی "شگوفہ" کے بنا رکھے ہیں جو رسالے کے لیے بیرونی ممالک سے سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔ تلنگانہ اردو

اکادمی نے انھیں 2015 میں ایک لاکھ روپے اور سند پر مشتمل مخدوم ایوارڈ سے سرفراز فرمایا۔

ساتویں دہائی میں 1970 کے پاس انور نظامی ادبی ماہنامہ ''گل نو'' چھتہ بازار حیدرآباد سے نکالتے تھے جس کا شعری حصہ خاکسار رؤف خیر دیکھا کرتا تھا۔ شعر معمے کے حل بھی اس میں سمجھائے جاتے تھے۔ اس طرح سارے ہندوستان میں ''گل نو'' اپنی بہار دکھا کر مرجھا گیا۔ انور نظامی بجائے خود بڑے اچھے خوش نویس تھے۔ رؤف خیر کے ابتدائی دو شعری مجموعے اقرا(1977) اور ایلاف(1982) انور نظامی کی خوش نویسی کی یادگار ہیں۔

1943 سے اردو املا کو آسان بنانے کی مہم چلانے والے جی ایم خان کا رسالہ ''ہندوستانی ادب'' ساتویں دہائی سے نکلا کرتا تھا۔ مگر ان کے تجویز کردہ املے کی طرح ان کا رسالہ بھی ناکام ثابت ہوا۔

اسی سلسلے کے ایک اور مبلغ املا جعفر حسن بھی تھے جو رسالے میں اپنا نام ''جافر حسن'' لکھا کرتے تھے۔ یہ بھی بے نام و نشان ٹھہرے۔

1977 میں نظام اردو ٹرسٹ لائبریری کے زیر اہتمام ''مبصر'' جاری کیا گیا۔ نظام ٹرسٹ میں حلقۂ ارباب ذوق کے تحت اردو کی معیاری کتابوں پر تبصروں کی محفل سجائی جاتی تھی۔ بعد میں یہی تبصرے ''مبصر'' کی زینت بن کر دستاویزی حیثیت اختیار کر جاتے تھے۔ ایسی ہی ایک محفل میں رؤف خیر کے ترائیلوں کے مجموعے ''ایلاف'' پر جناب مضطر مجاز نے مدلل تبصرہ کیا تھا جو بعد میں ''مبصر'' میں شائع بھی ہوا۔ مبصر کے مدیر مشہور شاعر منظور احمد منظور تھے۔

1980 ہی کے آس پاس انکم ٹیکس کنسلٹنٹ(Income Tax Consultant) جناب بشیر وارثی چھتہ بازار حیدرآباد میں واقع اپنے آفس سے ایک ادبی رسالہ ''ذوقِ نظر'' نکالا کرتے تھے جس کے پس منظر میں دراصل ڈاکٹر یعقوب عمر تھے جو عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی سے وابستہ تھے۔ ڈاکٹر یعقوب عمر نے پروفیسر گیان چند جین کی زعفرانی فکر کو نشانہ بناتے ہوئے سخت تنقیدی کتاب لکھی۔ این میری شمیل کی صلاحیتوں کا بھی حق گوئی و بیباکی سے جائزہ لیا۔ ڈاکٹر یعقوب عمر نے بے شمار مضامین تو لکھے مگر ان کو چھپواتے ہوئے انھیں تامل ہوا کرتا تھا۔ خاکسار راقم الحروف انھیں چھپوانے پر اُکساتا تھا مگر انھیں یہ وہم تھا کہ ان کی تحقیقی و تنقیدی کاوشیں کہیں ایڈیٹر

اپنے نام سے نہ چھاپ لے یا ضائع نہ کردے۔ اس زمانے میں زیرا کس کا چلن اتنا عام نہیں تھا۔ وہ بہت کامل بھی واقع ہوئے تھے۔ اسی لیے انھوں نے بشیر وارثی کو پرچہ جاری کرنے پر آمادہ کیا۔ ان کے بیشتر مضامین اسی ماہنامہ ''ذوقِ نظر'' میں بلا ناغہ شائع ہوا کرتے تھے۔ ڈاکٹر یعقوب عمر بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ غزل نظم کے علاوہ انھوں نے ہجویں بھی لکھیں جو بہت دلچسپ ہوا کرتی تھیں۔ بشیر وارثی بھی شاعر تھے۔ ان کا شعری مجموعہ ''بصارت و بصیرت'' (تاریخی نام جس سے 1401ھ برآمد ہوتا ہے) آج تک شائع نہ ہو سکا جس کی کتابت انور نظامی نے کی تھی۔ اسی زمانے میں ترائیلوں پر مشتمل میرے مجموعہ ''ایلاف'' کی بھی کتابت انور نظامی ہی نے کی تھی جو 1982 میں شائع ہوا۔ بشیر وارثی کو اللہ نے دولت اور دل دونوں سے سرفراز فرمایا تھا۔ وہ ضرورت مندوں، شاعروں ادیبوں کی مدد کرنے میں پیش پیش رہتے تھے۔ ان کی وفات کے ساتھ ''ذوقِ نظر'' بھی ختم ہو گیا۔ ڈاکٹر یعقوب عمر بھی بے نام و نشان ٹھہرے۔

ادارہ ادب اسلامی کے دیرینہ رکن جناب مسعود جاوید ہاشمی امریکہ میں مقیم رفیقِ دیرینہ مقبول رضوی کے اشتراک سے دینی فکر پر مشتمل بچوں کا ماہنامہ ''فن کار نو'' 2000 سے نکال رہے ہیں جو آدھا اردو اور آدھا انگریزی میں ہوتا ہے۔ اس سے پہلے آٹھویں دہائی میں وہ ادبی ماہنامہ ''فن کار'' نکالا کرتے تھے جو چند ہی سال میں دم توڑ گیا۔

ڈاکٹر م ق سلیم شروع ہی سے ادب سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان کے مضامین اور مراسلے ان کی خوش ذوقی کے مظہر ہوا کرتے ہیں۔ آج کل وہ روزنامہ ''صحافی دکن'' کا ادبی ایڈیشن ترتیب دے رہے ہیں اور کتابوں پر تبصرے کر رہے ہیں۔

انھوں نے 1987 میں بچوں کا رسالہ ''شعاعِ اردو'' جاری کیا جس میں بچوں کی ذہنی تربیت سے متعلق تخلیقات ہوا کرتی ہیں جن میں ان کے دین و دنیا کا خیال رکھا جاتا ہے۔

حیدرآباد سے آندھرا پردیش اردو اکادمی کا ترجمان ماہنامہ ''قومی زبان'' 1981 سے شائع ہونے لگا۔ یہ چونکہ سرکاری نوعیت کا رسالہ ہے۔ اس لیے اس میں شائع ہونے والی ادبی تخلیقات کا معاوضہ بھی دیا جاتا ہے۔ پروفیسر ایس اے شکور ڈائرکٹر سکریٹری اردو اکادمی کی نگرانی میں یہ پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔

1983 میں جناب قمر الدین صابری ایڈووکیٹ نے ڈیمائی سائز پر ادبی ماہنامہ ''شاداب'' جاری کیا۔ اس کے تحت کئی خاص نمبر بھی شائع کیے گئے جیسے آصف جاہی عہد نمبر، حیدرآباد کے اردو شعرا نمبر وغیرہ۔ قمر الدین صابری صاحب نے مکتبۂ شاداب کی بنیاد بھی رکھی تھی اور ادبی کتابیں پچاس فی صد ڈسکاؤنٹ پر فقط خریدا کرتے تھے۔ ان کے انتقال سے نہ صرف حیدرآباد کی ادبی صورت حال متاثر ہوئی بلکہ ''شاداب'' پر بھی بُرے دن آئے۔ ان دنوں ڈاکٹر محبوب فرید اسے ''شاداب انڈیا'' کے نام سے زندہ رکھے ہوئے ہیں اور اس میں اردو انگریزی ادبی تخلیقات جمع کر کے اسے اپنے عصر سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔

مشہور شاعر میر محمد علی خاں میکش کے صاحب زادے مجتبیٰ فہیم نے اپنے والد کی یادگار قائم رکھنے کے لیے ماہنامہ ''رنگ و بو'' 1994 میں جاری کیا جس میں ہند و پاک کے لکھنے والوں کی تخلیقات شائع ہوا کرتی ہیں۔ آج بھی ''رنگ و بو'' ہر ماہ پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔

1996 میں جناب سعادت احمد نے ماہنامہ ''پیام اردو'' جاری کیا۔ وہ مخلص اردو نواز تھے۔ وہ نہ شاعر تھے نہ افسانہ نگار۔ ہر ماہ پابندی سے شائع ہونے والا ''پیام اردو'' اچانک منظرِ عام سے ہٹ گیا۔ مدیر کی بھی کوئی خبر نہیں۔

1996 ہی میں حیدرآباد کے مشہور شاعر جناب صلاح الدین نیر نے ماہنامہ ''خوشبو کا سفر'' جاری کیا۔ مختلف اخبارات و جرائد میں شائع ہونے والی بے بحر تخلیقات پر سخت تنقید بھی کیا کرتے ہیں۔ یوں وہ اصلاح کا فریضہ انجام دیتے ہیں تاکہ نئی نسل کی رہنمائی ہو۔

میر فاروق علی محکمۂ آب کاری (اکسائیز ڈیپارٹمنٹ) میں بڑے عہدے پر تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد اپنا رسالہ ماہنامہ ''عدسہ'' 2006 میں جاری کیا اور کئی خاص نمبر شائع کیے جو دستاویزی نوعیت کے ہیں جیسے علامہ اقبال نمبر، عزیز احمد نمبر، میلاد نمبر، مصطفےٰ رسا نمبر، قرۃ العین حیدر نمبر، اقبال سہیل نمبر، مضطر مجاز نمبر وغیرہ۔ اس کے علاوہ کچھ انوکھے نمبر نکال کر ادبی دنیا کو چونکایا جیسے بکری نمبر، کتا نمبر، جوتا نمبر وغیرہ۔

بیشتر ہفت وار، پندرہ روزہ، ماہنامے وغیرہ ملی جلی نوعیت کے نکلتے ہیں۔ یعنی ادب کے ساتھ ساتھ کھیل، سیاست، سماجی مسائل وغیرہ پر معلومات بہم پہنچاتے ہیں مگر بعض پرچے صرف

مذہب سے سروکار رکھتے ہیں جیسے حیدرآباد میں مسلکِ اہلِ حدیث کے بے غرض، بے لوث مبلغ مولانا ابو تمیم محمدی کی ادارت میں 1960 کے آس پاس ماہنامہ ''البیان'' نکلتا تھا جس میں شرک و بدعات کے خلاف لکھا جاتا تھا۔ مولانا کی وفات (1973) کے بعد ان کے دستِ راست مولوی محمد مشیر الدین (ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب (لندن) کے والد) نے ''البیان'' جاری رکھا۔ یہ رسالہ عموماً پابندی سے شائع نہیں ہوتا تھا۔ آخر کار بند ہی ہو گیا۔

مولوی صفوۃ الرحمٰن صابر صاحب سلطان شاہی حیدرآباد سے پانچویں دہائی سے ماہنامہ ''الحق'' نکالا کرتے تھے جس میں مذہب اسلام کی جدید توضیح و تعبیر کی جاتی تھی جو مسلمات سے ٹکراتی تھی۔ ''الحق'' ہی کے نام سے ان کے بعد ان کے شاگرد مولوی حبیب الرحمٰن پان منڈی سے یہ رسالہ نکالتے تھے جس میں بعض صحیح احادیث پر اعتراض کیے جاتے تھے۔ شب قدر اور عذاب قبر کا انکار کیا جاتا تھا۔ راسخ العقیدہ اصحاب الحدیث ایسے ''الحق'' کو باطل کا ترجمان سمجھتے رہے ہیں۔

ان دنوں سابق صوبائی امیر جمعیت اہل حدیث مولانا صفی احمد مدنی کے زیر ادارت ماہنامہ ''گلستانِ حدیث'' اور مولانا ساجد اُسید ندوی کی کوششوں سے ماہنامہ ''صدائے سلف'' نکل رہا ہے۔ مگر یہ رسالے وقت پر نہیں نکلتے۔

جماعتِ اسلامی کا ترجمان ہفت وار ''گیلورائی'' تلگو زبان میں دین اسلام کی ترویج و اشاعت میں ساتویں دہائی سے تن من دھن کی بازی لگائے ہوئے ہے۔ اس کے مدیر ایس ایم ملک تلگو زبان پر عبور رکھتے ہیں اور تلگو داں لوگوں سے دین اسلام کا تعارف کرانے میں کئی کتابچے چھاپتے رہتے ہیں۔

دار السلام سبیل السلام حیدرآباد کا ترجمان ''صفا'' 2004 سے نکل رہا ہے جس میں دینی مضامین چھپتے ہیں۔ مولوی حمید الدین عاقل کے قائم کردہ دار العلوم حیدرآباد سے 2005 سے ''حسامی'' نکل کر دین و اخلاق پھیلا رہا ہے۔ 1977 سے اقبال اکاڈمی حیدرآباد سے ششماہی ''اقبال ریویو'' نکلتا ہے جس میں مختلف ماہرینِ اقبالیات کے اقبال سے متعلق تحقیقی و تنقیدی مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔

قاضی اسد ثنائی ''الانصار'' نکالتے ہیں جس میں ہندو پاک کے لکھنے والوں کی تخلیقات شائع ہوتی ہیں۔ پروفیسر مغنی تبسم کا رسالہ ''شعر و حکمت'' کافی ضخیم نکلتا تھا اور چونکہ یہ رجسٹرڈ نہیں تھا، اس لیے شعر و حکمت کتاب 1، شعر و حکمت 2، 3، 4، جیسے نام سے نکالا کرتا تھا۔ اس کے کئی خاص نمبر نکلے جیسے ن۔ م راشد نمبر، میراجی نمبر وغیرہ۔ اور کئی ادیبوں شاعروں کے بھرپور گوشے بھی نکلے جو الگ سے کتابی شکل میں بھی شائع کیے گئے۔ کئی تحقیقی و تنقیدی مضامین پر مشتمل ضخیم ''شعر و حکمت'' ادبی دنیا میں اپنی انفرادیت کے لیے پہچانا جاتا تھا۔ پروفیسر مغنی تبسم کے گزر جانے کے ساتھ ہی یہ بھی دم توڑ گیا۔

عثمانیہ یونیورسٹی کا مجلہ ''عثمانیہ'' 1927 سے نکلتا رہا جس میں تحقیقی و تنقیدی مضامین بار پاتے تھے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کے بعد یہ بھی ختم ہو گیا۔

بیشتر کالجوں سے سالانہ مجلے نکلتے رہے ہیں مگر ان کی ادبی حیثیت غیر مسلمہ ہوا کرتی تھی۔ اب کسی کالج میں اردو دوسری زبان کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے تو یہ بھی غنیمت ہے۔ لہٰذا اب کسی کالج کے اردو مجلے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

(ز) کشمیر

کشمیر میں اردو صحافت
معیار و مشکلات، مسائل اور امکانات

غلام نبی خیال

کشمیر میں اردو صحافت کا باقاعدہ آغاز پچھلی صدی کی چوتھی دہائی میں ہوا جب مہاتما گاندھی کی رہبری میں عدم تعاون کی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا اور کشمیر میں بھی جموں کے مہاراجہ ہری سنگھ کے شخصی راج کے خلاف تحریکِ حریت "کشمیر چھوڑ دو" کے زوردار نعرے کی گھن گرج میں پرتول رہی تھی۔ 13 جولائی 1931 کو جو خونیں واقعہ سری نگر کی سینٹرل جیل کے باہر پیش آیا جب سرکاری سپاہیوں کے ہاتھوں دو درجن کے قریب نہتے کشمیری گولیوں سے بھون ڈالے گئے تو وہ اس تحریک کا سنگ میل قرار پایا اور اس کی گونج سارے برصغیر میں سنائی دی۔

اُن دنوں لاہور کشمیر کے عوام کے بہی خواہوں اور ہمدردوں کے ساتھ ساتھ اردو صحافت کا بھی اہم ترین مرکز تھا جہاں تحریک حریت کشمیر کے علمبردار مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر، محمد دین فوق، چراغ حسن حسرت اور شورش کشمیری، زمیندار، سیاست، انقلاب، کشمیری میگزین اور چٹان جیسے عہد ساز اخبارات کے صفحات پر برصغیر

کی تحریک آزادی کے حق میں پُر جوش اور بااثر مضامین، مقالات اور منظومات سے ہر ایک کا فکر و ذہن گرما رہے تھے۔ ان اخباروں کے مدیران نے کشمیر کا درد محسوس کیا اور اپنے قلم کی آواز سے یہاں کے جبر و استبداد تلے کراہتے عوام کا حال زار ہر ایک کو سنایا۔ اگر چہ ان اخبارات کی جائے اشاعت لاہور ہی رہی لیکن ان میں تقریباً ہر صفحے پر درد کشمیر جھلک رہا تھا۔

تحریک آزادیٔ کشمیر کے ان بہی خواہوں اور محبان نے اپنے اخبارات کو کشمیر کے لیے اس شدت سے وقف کیا تھا کہ ان میں سے ہر اخبار پر کشمیر نامہ کا گمان ہوتا تھا۔ بالخصوص مولانا ظفر علی خان ''زمیندار'' میں وقتاً فوقتاً کشمیر میں شخصی راج کے ظلم و جبر اور استبداد کے خلاف جو پُر جوش اور ولولہ انگیز منظومات تحریر کرتے رہے وہ سارے کشمیر میں دیر تک زبان زد خاص و عام تھیں۔ یہ تینوں اخبارات ہر روز راولپنڈی کے راستے سیکڑوں کی تعداد میں کشمیر بھیجے جاتے تھے، ان کے شوقین اخبار بیں ان پر ٹوٹ پڑتے تھے اور دن بھر ذوق و شوق کے ساتھ ان کے مطالعے سے محظوظ ہوتے تھے۔ مقامی طور پر کوئی قابل ذکر اردو اخبار موجود نہ ہونے کی وجہ سے یہی لاہوری اخبارات یہاں کی صحافتی دنیا میں روزمرہ کے مطالعے کا ایک مقبول ذریعہ بن گئے تھے۔

13 جولائی 1931 کا دن، جو اَب یوم شہدائے کشمیر کہلاتا ہے، چند کشمیری اہل دانش اور اصحاب قلم کے لیے اردو صحافت کی طرف بھی متوجہ ہونے کا باعث بن گیا۔ چند سال بعد مولانا محمد سعید مسعودی اور پریم ناتھ بزاز نے یہ ضرورت وقت ہاتھ میں لی اور اس طرح سے ہندوستان کی تقسیم کے آس پاس سرزمین کشمیر سے دو شاندار اور معیاری اخبار ''خدمت'' اور ''ہمدرد'' کے نام سے منظر عام پر آ گئے۔ ان اخباروں کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ان کے مدیران پڑھے لکھے اور اردو زبان سے کما حقہٗ واقف تھے۔ ملکی کوائف پر بھی ان کی گہری نظر تھی اور ان کی سیاسی سوجھ بوجھ اور معاملہ فہمی نے ان دونوں شخصیات کو مقامی طور پر ثقافتی اور صحافتی لحاظ سے نابغۂ روزگار بنایا تھا۔ 1946 میں شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں کشمیر چھوڑ دو کی تحریک کے ساتھ یہ دونوں اخبارات بعد میں سیاسی لحاظ سے الگ راستوں پر چل پڑے۔ ''خدمت'' جہاں باضابطہ طور پر شیخ صاحب کی نیشنل کانفرنس کا ترجمان اور تحریک کا پُر زور مبلغ بن گیا وہیں پریم ناتھ بزاز نے راہ دگر اختیار کر کے کشمیر چھوڑ دو تحریک کی مخالفت میں یہاں کے چند قلم کاروں عبدالاحد آزاد اور میر عبدالعزیز کی قلمی

خدمات بھی حاصل کیں جنھوں نے شیخ صاحب کی ذات تک کو نہیں بخشا اور ان کی مخالفت میں ایسی مزاحیہ اور طنزیہ نظمیں تحریر کیں جو شیخ مخالف حلقوں میں نہایت مقبول ہوئیں۔ بزاز کے خیال میں شیخ صاحب کی تحریک نامعقول اور مبنی بر حقائق نہیں تھی۔ کیونکہ مہاراجہ ہری سنگھ خود ریاست کا پشتینی باشندہ تھا اور اُسے کشمیر چھوڑ دو کی دھمکی دینا ایک ناقابل فہم بات تھی۔ ''خدمت'' اور ''ہمدرد'' کے لیے اس وقت کے چیدہ چیدہ قلم کار اور ادیب بھی شذرات، سیاسی تبصرے اور مختصر مضامین لکھتے رہے جس سے ان کی معنوی حیثیت کو وقار ملا۔ اس طرح سے ''خدمت'' اور ''ہمدرد'' کا دور گذشتہ آج بھی ہماری یادوں میں محفوظ ہے۔

1947 کے بعد کشمیر میں اردو صحافت محض چند بے قاعدہ اور غیر معیاری روزناموں یا نام نہاد ہفت روزوں تک ہی محدود رہی جن کا کوئی مثبت اثر قارئین کے ذہنوں نے قبول نہیں کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان جرائد نے اپنے آپ کو برسرِ اقتدار سیاسی تنظیم کے ساتھ وابستہ کیا تھا جس کے عوض انھیں چند روپے بھی ملتے تھے لیکن ان کے صفحات پر غیر جانبدار اور مبنی بر حقیقت خبریں اور تبصرے نہ ہونے کی بنا پر ان کی افادیت کو زبردست نقصان پہنچا تھا۔ اس طرح یہاں کی صحافت مقصدیت کی راہ سے ہٹ کر مکمل طور پر ایک ایسی عامیانہ اور بے رنگ سیاست میں ڈھل گئی جس میں حریفوں کی پگڑی اچھالنا، حکومت کی قصیدہ خوانی اور ذاتی مفادات کی تکمیل کے لیے ہر غلط قدم کو حق بجانب قرار دینا شامل تھا۔

اُن دنوں مقامی سطح پر غلام رسول عارف کے ''ہمدرد''، کشیپ بندھو کے ''دیش''، غلام رسول عرفانی کے ''نیا سنسار''، یوک سبھا کے ''مارتنڈ'' اور مرزائیوں کے ترجمان ''اصلاح'' کا نام بھی چند برس تک سنا گیا لیکن وقت کی باد مخالف کے تھپیڑے کھا کھا کر یہ شجر بھی مُرجھا گئے۔

کشمیر میں بدقسمتی سے یہ غیر صحت مند سلسلہ سالہا سال سے جاری ہے کہ اردو کی صحافتی دنیا سے متعلق اکثر صحافی کسی درس گاہ یا دانش گاہ سے اردو زبان کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے سے محروم ہی رہے ہیں اور اُنھوں نے ذاتی طور پر اسے لسانی تناظر میں ذہن نشین کرنے کی کوشش بھی نہیں کی ہے۔ البتہ مولانا مسعودی، میر غلام احمد کشفی، غلام رسول نازکی اور شمیم احمد شمیم جیسے اردو شناسوں کو یہ ودیعتِ خداوندی فطری طور پر عطا ہوئی تھی۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں ایسا کوئی

سرکاری تدریسی ادارہ بھی کبھی موجود نہیں رہا جہاں صحافت کے طلبا یا اس اہم پیشے سے وابستہ اشخاص کو اردو زبان کی ایسی تربیت دی جائے کہ وہ لسانیات، محاورات، تراکیب، املا، تذکیر و تانیث اور گرامر کے حوالے سے صحیح زبان کا استعمال کر سکیں۔ پچھلی صدی کے وسط میں شہر میں اورینٹل کالج کے نام سے ایک ایسا تعلیمی ادارہ سرگرم عمل تھا جو نامعلوم وجوہ سے جلد ہی بند ہو گیا۔

کشمیر میں چونکہ اردو زبان میں ہی سب سے زیادہ اخبارات شائع ہوتے ہیں لہٰذا طلبا کے لیے یہاں کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے شعبۂ اردو سے منسلک ایک ایسا ہی تدریسی سلسلہ شروع کیا جا سکتا ہے جہاں سرکردہ اور پختہ مشق صحافی شوقین طلبا کو صحافت کے مختلف تقاضوں کی برآوری سے آگاہ کر سکتے ہیں۔ آج تک اس اہم ضرورت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی ہے۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ (1885-1925) نے اردو کی اہمیت کو پیش نظر رکھ کر اسے 1889 میں ریاست جموں و کشمیر کی سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ 1956 میں جب ریاست کا آئین منظور کیا گیا تو قانون ساز اسمبلی نے اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کی توثیق کر لی۔

1947 کے کچھ سال بعد خواجہ ثناء اللہ بٹ نے ''آفتاب'' کا اجرا کیا اور اس کے بعد ''سری نگر ٹائمز'' کی اشاعت کے ساتھ مقامی طور پر عوام میں اخبار بینی کا شوق دوبارہ پیدا ہوا۔ یہ ان اخبارات کے مالکان اور مدیران کی انتھک مساعی ہی کا نتیجہ ہے کہ یہی دو روزنامے آج بھی اشاعت اور مقبولیت کے لحاظ سے کشمیر میں سرفہرست ہیں۔ ''سری نگر ٹائمز'' میں مسلسل چھپنے والے برمحل اور پُرمعنی کارٹون اس اخبار کی شہرت کو واقعی چار چاند لگا رہے ہیں۔

کشمیر یونیورسٹی میں شعبۂ صحافت قائم ہونے سے کئی نوجوان طالب علم اس میدان میں ضروری تربیت حاصل کر کے اخبارات، ٹیلی ویژن، مقامی، ملکی اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ کے اداروں سے منسلک ہو کر اپنی روٹی روزی عزت کے ساتھ کما رہے ہیں۔ مگر یہ شعبہ صرف انگریزی کی تعلیم و تدریس تک ہی محدود رہا اور اردو صحافت اس سے کوئی استفادہ کرنے سے محروم ہی رہی۔

گزشتہ تقریباً تین دہائیوں سے کشمیر میں اردو صحافت کو خاصا فروغ ملا۔ لوگوں میں ہر صبح اخبار بینی روزمرہ کی عادت بن گئی اور یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ اخباروں کی تعداد بھی ضرورت سے زیادہ رفتار سے بڑھتی گئی اور بڑھ رہی ہے۔

اب تو خبروں پر اشتہاروں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اشتہار اخبار کی بقا کے لیے خاصی اہمیت رکھتا ہے لیکن یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اخبار کا ماخذ خبر ہے اور اگر اس میں ضروری اور اہم خبریں نہ ہوں تو اسے کون سا نام دیا جا سکتا ہے؟ اکثر نئے اردو اخباروں کی تعداد اشاعت بھی نہایت محدود ہے۔ اسی لیے یہ کسی اخبار فروش کے یہاں نظر نہیں آتے البتہ اشتہارات کے قواعد پورے کرنے کی خاطر محکمۂ اطلاعات کے لیے چند پرچے اور بچے کھچے شمارے مفت بانٹنے کے لیے چھاپے جاتے ہیں۔

وادیٔ کشمیر سے اس وقت اردو زبان میں 114 اخبارات شائع ہوتے ہیں جن میں روزناموں کی تعداد 75 ہے اور 39 جریدے ہفت روزوں کی شکل میں منظر عام پر آتے ہیں۔ ان کی باقاعدہ آمدنی کا زیادہ تر انحصار سرکاری محکمہ جات کے اشتہارات پر ہی ہے۔ سرکاری ذرائع کے مطابق ان میں سے فقط 67 کو حکومتی اشتہاروں کے لیے منظور کیا گیا ہے۔ باقی 47 اخبارات، جن میں سے کئی ایک سے لوگ واقف بھی نہیں، کس طرح اپنے آپ کو زندہ رکھے ہوئے ہیں؟ اس سوال کا جواب ان کے مالکان یا مدیران ہی دے سکتے ہیں۔

کشمیر میں اردو صحافت کی آبیاری کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس شعبے میں اردو زبان پر عبور رکھنے والے سامنے آئیں جو اس عمل کو تجارت سے زیادہ ایک مشن کی صورت میں تقویت بخشیں۔ خبروں سے کسی نوع کی جانبداری نمایاں نہ ہو اور پڑھنے والا اسے ایک حق پر مبنی بے لاگ چھپنے کی صورت میں قبول کرے۔ نئے اخباروں کے تئیں سرکار قواعد اور ضوابط کی خود کردہ جس خلاف ورزی پر ناقابل فہم خاموشی اختیار کیے ہوئے ہے اس کی نشان دہی کرنا اور مناسب اقدامات کرنا بجائے خود اخباروں کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ مجموعی طور پر صحت مند روایات کے ساتھ صحافت کے احیا کی ضرورت ہے تاکہ سرکاری سطح پر تغافل کی شکار اردو زبان کو بھی اس شعبے کی بدولت زندگی کا سانس لینے کا موقع حاصل ہوتا رہے۔ یہ صحیح ہے کہ یوپی، بہار اور دہلی کی طرح کشمیر میں اردو کا گلا گھونٹنے کی کوششیں نہیں کی گئیں مگر اس زبان کے تئیں حکومتی غفلت شعاری اس کی ترقی میں ہمیشہ مانع رہی ہے۔

کشمیر میں موجودہ اردو صحافت کی بہر حال یہ ایک مثبت دین ہے کہ پڑھنے والوں کی

تعداد میں روز افزوں اضافہ دیکھنے میں آیا ہے جس کی توقع آج سے نصف صدی قبل مشکل سے کی جاسکتی تھی۔ اس مضمون میں جموں کی اردو صحافت کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، اسی طرح ہفت روزہ جریدوں اور برقیاتی صحافت یعنی ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو بھی زیر بحث نہیں لایا گیا ہے۔

اُردو صحافت اور جموں و کشمیر

بلراج بخشی

جموں و کشمیر ہندوستان کی اکلوتی مسلم اکثریتی ریاست ہے لیکن محض اسی وجہ سے اردو یہاں کی سرکاری زبان نہیں بنی، بلکہ وہ کچھ مخصوص تاریخی حالات تھے۔ 1707 میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغل سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور دہلی میں فارسی کی جگہ اردو نے لے لی۔ کشمیر میں 1587 سے 1819 کے مغل۔ افغان عہد کے 231 برسوں میں درباری زبان فارسی تھی۔ 1819 سے 1846 کے سکھ عہد اور 1846 کے بعد ڈوگرہ عہد میں بھی جموں کشمیر میں فارسی ہی تھی۔ 9 مارچ 1846 میں معاہدۂ لاہور کے تحت لاہور دربار نے انگریزی افواج سے شکست کھا کر تاوان کے طور پر کشمیر کو انگریزوں کی عملداری میں دے دیا۔ 16 مارچ 1846 کو معاہدہ امرتسر کے تحت انگریزوں نے کشمیر گلاب سنگھ کو دے کر اسے مہاراجا بنا دیا۔ واضح رہے کہ جموں، لداخ اور گلگت پہلے ہی راجا گلاب سنگھ کے پاس تھے۔ 1857 میں مہاراجا گلاب سنگھ نے ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کے خلاف انگریزوں کی حمایت میں فوجی دستے دہلی روانہ کیے اور اس طرح ریاستی عوام کی اردو کے ساتھ پہلی ملاقات ریاست سے باہر دہلی میں ہوئی۔ انگریزی نظام تعلیم اور انتظامی امور کے لیے کشمیر کی

زبان کشمیری کو مغل۔افغان دور میں نظر انداز کر دیا گیا تھا اور جموں کی زبان ڈوگری میں عصری علوم کو برتنے کی صلاحیت نہیں تھی۔

مغل سلطنت کا شیرازہ بکھرنے کے بعد جب دہلی میں فارسی کی جگہ اردو نے لے لی تو جموں و کشمیر میں بھی یہی ہوا۔1587 سے 1819 کے مغل۔افغان عہد کے 231 برسوں میں کشمیر میں درباری زبان فارسی ہی رہی۔1819 سے 1846 کے سکھ عہد اور 1846 کے بعد ڈوگرا عہد میں بھی جموں کشمیر میں فارسی ہی چھائی رہی لیکن 1899 میں جموں کشمیر کے مہاراجا پرتاپ سنگھ نے اردو کو یہاں کی سرکاری زبان کا درجہ دے دیا جو آج تک قائم ہے اور اس طرح ہندوستان بھر میں، جموں و کشمیر ہی ایک واحد ریاست ہے جہاں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے، باوجود اس کے کہ اردو یہاں کسی کی بھی مادری زبان نہیں ہے۔دراصل مہاراجا گلاب سنگھ کے عہد میں متحدہ جموں و کشمیر میں فارسی ہی غالب رہی گو کہ اردو عام بول چال کی زبان بننے لگی تھی۔1847 میں مہاراجا گلاب سنگھ نے 'ودیا پرکاش پریس' کے نام سے ایک مطبع قائم کیا، جس میں ڈاک ٹکٹ، اسٹامپ پیپر اور سرکاری احکام چھاپے جانے لگے جو عموماً ڈوگری یا فارسی میں ہوتے تھے لیکن 1856 اور 1857 کے درمیان تحریر شدہ جموں میں اولین مخطوطے کی دستیابی سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں اردو کا محدود استعمال شروع ہو چکا تھا۔مہاراجا گلاب سنگھ نے کانگڑہ میں مقرر کیے گئے ریاست کے وکیل لالہ بوٹا مل کو چائے کی کاشت سے متعلق معلومات کی فراہمی کا ذمہ سونپا تھا اور انہی معلومات پر بعد کو جموں میں چائے کی کاشت بھی کی گئی۔لالہ بوٹا مل نے کانگڑہ کے ڈپٹی کمشنر کو اس بارے میں حسب ذیل رپورٹ پیش کی:

> ''غریب پرور! سلامت ــــ حسب الحکم پروانہ ہذا سے مطلع ہو کر عرض پرداز ہوں کہ جو چائے بوٹہ ہائے جموں میں لگائے گئے ہیں وہ بخوبی کاشت ہو گئے ہیں اور جو تخم چائے سرکار سے عنایت ہوا تھا اور باغبان بھی سرکار سے ملے تھے وہ بوٹہ ہائے کو لگانے میں اور کاشت کرنے تخم چاہ میں تندہی نہیں کرتے اور پیش گاہ مہاراجا صاحب بہادر سے بھی پروانہ بنام کمترین بدیں مضمون صادر ہوا ہے کہ باغبانان مذکور کاشت کرنے تخم

چاہئے کے تندہی نہیں کرتے۔ لہٰذا اوس کے عوض اور باغبانان آنے چاہئیں۔''

(یہ مخطوطہ سابق صدر ریاست ڈاکٹر کرن سنگھ کی تحویل میں ہے)

نہ صرف یہ کہ 1899 میں مہاراجا پرتاپ سنگھ نے فارسی کی جگہ اردو کو ریاست جموں و کشمیر کی سرکاری زبان کا درجہ دیا تھا بلکہ آزادی کے بعد بھی ریاستی آئین کی دفعہ 146 کے تحت اردو کی سرکاری زبان کی حیثیت برقرار رکھی گئی۔

ریاست جموں و کشمیر میں مہاراجا کے دور میں صحافیانہ سرگرمیوں پر پابندی تھی۔ کشمیر کا ایک نامور مورخ محمد دین فوق کشمیریوں کی اقتصادی اور سماجی اور سیاسی زبوں حالی کے خلاف آواز بلند کرنے کے لیے لاہور سے اپنا اخبار ''کشمیر گزٹ'' نکالتا تھا اور یہی ریاست کی ابتدائی صحافیانہ سرگرمی تھی۔ مختلف حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ ڈوگرہ حکمرانوں کے خلاف کشمیر چھوڑ تحریک کے دور ہی میں ریاست میں صحافیانہ سرگرمیوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ تحریک کی قیادت شیخ محمد عبداللہ کر رہے تھے۔ تحریک کو پھیلانے کے لیے اخباروں کی اشد ضرورت تھی۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ مہاراجا کے زمانے ہی میں ریاستی صحافت کا آغاز ہوا لیکن وہ شخصی حکومت کا دور تھا اور مہاراجا کے خلاف لکھنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ 1924 میں جموں سے لالہ مُلک راج صراف نے جموں کا پہلا اردو اخبار ''رنبیر'' نکالا۔ یہ اخبار 29-1928 تک چلا۔ اسی دوران مُلک راج صراف نے اردو رسالے ''رتن'' کی ادارت بھی کی۔ چراغ حسن حسرت اور محمد دین فوق نے تحریک کی حمایت میں اخبار نکالے لیکن صحافیانہ سرگرمیوں کا مرکز لاہور ہی رہا۔ دریں اثنا مسلم کانفرنس نے اپنا اخبار ''صداقت'' شائع کیا۔ محمد مقبول اس کے مدیر تھے۔ 1932 میں ایک اور اخبار ''وتستا'' نکلا۔ مزید ایک اور اخبار شائع ہونے لگا ''حقیقت'' جو 1935 تک چلا۔ 1935 میں پریم ناتھ بامزئی نے شیخ عبداللہ کے ساتھ مل کر اخبار ''ہمدرد'' نکالا جو شروع میں تو ہفت روزہ تھا لیکن بعد میں روزنامہ کر دیا گیا۔ شیخ عبداللہ کی مسلم کانفرنس اب نیشنل کانفرنس بن چکی تھی۔ دہلی اور جموں کے اخبار شیخ کی تحریک کے خلاف تھے، اس لیے اپنا موقف عوام کے روبرو رکھنے کے لیے ''خدمت'' نکالا گیا جس کی ادارت نیشنل کانفرنس کے جنرل سکریٹری مولانا محمد سعید مسعودی کو سونپی گئی۔ 1940 سے پہلے

ملت، رہبر، کیسری اردو اخبار بھی تھے۔ 1946 میں کشمیر چھوڑو تحریک چلی تو نیشنل کانفرنس کے ترجمان ''خدمت'' پر مہاراجا کی حکومت نے پابندی لگادی۔ بعد میں مزید اخبار بھی شائع ہوئے۔ پریم ناتھ اور پھر بدری ناتھ مٹو کی ادارت میں ''مارتنڈ''، ''دیش''، ''روشنی''، وغیرہ۔ 1947 کے بعد جموں کشمیر میں صحافیانہ سرگرمیوں کی رفتار تیز ہوگئی۔ ''ہمدرد'' روزنامہ ''آفتاب''، ''مارتنڈ''، 1935 میں جماعت اسلامی نے ''اذان'' شروع کیا۔ بخشی غلام محمد کے دور میں پھر پابندی عائد ہوئی لیکن اس کے بعد سرینگر ٹائمز، روزنامہ چنار، آئینہ شائع ہوئے۔ جموں سے وید بھسین نے ''کشمیر ٹائمز'' نکالا۔

1967 میں شیخ عبداللہ نے محاذ رائے شماری کے لیے انگریزی میں ''فرنٹ'' اور اردو میں ''محاذ'' شائع کیا۔ عوامی ایکشن کمیٹی کے چیئرمین مولانا فاروق نے ہفت روزہ ''حریت'' شائع کیا۔ 1972 میں راقم نے بھی ادھم پور سے ہفت روزہ ''وقار'' شائع کیا جو 1975 میں ایمرجنسی کے دوران بند ہوگیا اور پھر شائع نہ ہوسکا۔ ستر کی دہائی میں موہن یادر کا ہفت روزہ اخبار ''رفتار'' جموں سے شائع ہوتا تھا۔ ''رفتار'' tabloid شکل میں تھا جو ممبئی سے شائع ہونے والے ہفت روزہ بلٹز کی طرز پر تھا۔ اسی اور نوے کی دہائی میں جموں سے انگریزی میں روزنامہ ایکسلسیئر اور کشمیر امیجز۔ کشیپ بندھو (تاراچند کول، آف کشمیر)، پنڈت گاشالال کول، سالگرام کول، جانکی ناتھ ٹنگ، اس دور کے کچھ مشہور صحافی بھی ہوئے۔

حالیہ برسوں میں جموں و کشمیر میں دو نئے اردو اخباروں نے واضح شناخت قائم کی ہے: جموں سے ''اذان'' اور سرینگر سے ''کشمیر عظمیٰ''۔ جموں سے ابھی دو نئے اردو اخباروں کا اجرا ہوا ہے۔ ایک روزنامہ ''اذانِ سحر'' اور دوسرا روزنامہ ''دیہات سندیش'' موخر الذکر کا مدیر یہ خاکسار ہے۔

گذشتہ بیس برسوں سے جموں و کشمیر میں ملیٹینسی نے قدم جمار کھے ہیں اور اس دوران یہاں ہزاروں افراد جاں بحق ہو چکے ہیں لیکن ریاست جموں و کشمیر کے اردو صحافیوں نے نہایت غیر جانبداری سے اپنے پیشہ ورانہ فرائض انجام دیئے ہیں جس کے لیے وہ یقینی طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ریاست کے صحافی جموں و کشمیر کے دائمی متلون اور حساس ماحول

میں نوع انسانی کی اظہار کی فطری جبلت کی کامیابی سے پاسداری کر رہے ہیں۔

ایک آخری اور ضروری بات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کروانا چاہتا ہوں۔ یہاں کی سرکاری زبان ہونے کے باوجود، جموں و کشمیر میں اردو کا کوئی پُرسان حال نہیں ہے، برملا طور پر اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کی حکومت اردو کے مسائل سے ناواقف ہے اور اس عدم واقفیت کی وجہ یہ ہے کہ حکومتیں سیاسی پارٹیاں بناتی ہیں اور یہ سیاسی پارٹیاں اردو کو جانتی ہی نہیں۔ صرف ایک پارٹی کو چھوڑ کر ریاست کی تمام سیاسی پارٹیاں اپنے پریس نوٹ صرف انگریزی میں دیتی ہیں اردو میں نہیں، جنھیں اردو اخبار ترجمہ نہیں کر سکتے اور اردو قاری معاشرے کے بہت سے واقعات اور اطلاعات سے محروم رہ جاتا ہے۔

کشمیر میں ادبی صحافت

ڈاکٹر الطاف حسین

ریاست جموں و کشمیر اس وقت تمام ہندوستان میں واحد ریاست ہے جہاں کی سرکاری زبان اردو ہے۔ ریاست میں صحافت کے ذریعے اردو عام ہوئی، لیکن عوام کی مزید دلچسپی اردو ادب اور زبان سے تب بڑھی جب تمام ہندوستان کے شہرت یافتہ شاعر، ادیب اور نثر نگاروں کے ریاست جموں و کشمیر میں آنے کا سلسلہ قائم ہوا۔ ان شاعروں اور ادیبوں میں شبلی نعمانی، مولوی عبدالحق، احسان دانش، روش صدیقی، فیض احمد فیض، حفیظ جالندھری، اثر صہبائی، جوش ملسیانی، جوش ملیح آبادی وغیرہ شامل ہیں۔ یہ تمام ادبی شخصیات ریاست کی ادبی محفلوں کی محور بن گئی تھیں۔ 1940 میں ریاست جموں و کشمیر ہندوستان کی بڑی اردو تحریک میں شامل ہوگئی۔ اس وجہ سے ریاست میں پہلی بار انجمن ترقی اردو ہند کی ایک شاخ قائم ہوگئی۔ یہ شاخ مولوی عبدالحق کے دورۂ جموں کے بعد کھولی گئی۔ مولوی عبدالحق نے ریاست "پرجا سبھا" میں شرکت کی جس سے وہ بے حد متاثر ہوئے۔ کشمیر میں اردو زبان کی مقبولیت اور ترقی کے بارے میں مولوی عبدالحق اپنی ایک رپورٹ میں کہتے ہیں:

''شاید ہندوستان کے کسی صوبے میں اردو اس قدر مقبول اور رائج نہیں جس قدر کشمیر میں ہے۔ مدارس میں اردو پڑھائی جاتی ہے اور ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ دفاتر کی زبان بھی اردو ہے اور بہت اچھے اردو کے ادیب اور شاعر موجود ہیں۔ وہاں کی اسمبلی کے اجلاس کو بھی جا کر دیکھا۔ سب ممبر بلا استثنا اردو میں بلا تکلف تقریر کرتے تھے۔ یہ سن کر آپ کو تعجب ہوگا کہ پنجاب اسمبلی میں ایسی اچھی اردو کی تقریریں نہیں ہوتیں۔''

تمام ملک کی طرح ریاست میں بھی ہندی اور اردو کا مسئلہ کھڑا ہوا۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس کمیٹی کے صدر ڈائریکٹر ایجوکیشن خواجہ غلام السیدین کو بنایا گیا۔ 1940 میں اس کی رپورٹ میں اردو کو ریاست کی پہلے درجے کی زبان کہا گیا۔ کیونکہ یہ زبان ڈوگری، لہندا، پنجابی اور اس کے علاوہ پہاڑی زبانوں کے بے حد قریب مانی گئی۔ اس لیے اردو کا ذریعۂ تعلیم ہونا صحیح قرار دیا گیا۔

اس کے بعد حکومت نے اسکولوں میں آسان اردو پڑھانے کا اعلان کر دیا۔ نیشنل کانفرنس اقتدار میں آنے سے پہلے ہی اس زبان کی حمایت میں شامل ہوگئی۔

شیخ محمد عبداللہ نے 1941 میں اپنی ایک تقریر میں کہا:

''نیشنل کانفرنس اس بات پر یقین رکھتی ہے اور واقعات چمکتے ہوئے سورج کی طرح اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جس پر ریاست کے تمام لوگ سالہا سال سے تعلیمی اور درباری ضروریات کے لیے اتفاق کر چکے ہیں۔ آئندہ بھی یہی زبان ان کی ترقی کا وسیلہ بننے کی اہلیت رکھتی ہے۔''

1947 کے بعد شیخ محمد عبداللہ حکومت نے جموں و کشمیر کے آئین میں اردو کو ریاست کی سرکاری زبان قرار دیا۔ اگرچہ اس فیصلے کے نتیجے میں شیخ محمد عبداللہ کو اقلیت کی طرف سے پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن اردو پھر اپنی ترقی کی طرف رواں دواں رہی۔ اس حکومت نے اردو کی ترقی کے لیے کئی علمی اور ادبی ادارے قائم کیے اور ریاست میں کلچرل اکادمی کا قیام عمل میں

لایا گیا۔ اردو صحافت پر مزید زور دیا گیا جس کے نتیجے میں ساٹھ کے عشرے میں یہاں نوے فیصدی صحافت اردو میں ہونے لگی۔ تقسیم سے پہلے بھی تمام تر صحافت اسی زبان میں ہوتی تھی لیکن شیخ محمد عبداللہ، شمیم احمد شمیم، مولانا مسعودی وغیرہ وغیرہ نے اسے مزید جلا بخشی۔ ریاست میں اردو اخبار ترقی کرنے لگے ان کا معیار مزید بلند ہوا اور کئی مزید اردو چھاپے خانے لگائے گئے۔ اسی عرصے میں شیخ محمد عبداللہ کی حکومت کو برطرف کیا گیا اور ایک بار پھر صحافت پر پابندی لگائی گئی۔ اگر دیکھا جائے اس زبان سے صحیح معنوں میں وفا صرف شیخ محمد عبداللہ نے کی۔ جب اُن کی حکومت دوبارہ بنی، اُنھوں نے پریس پر پابندیاں ہٹائیں ایک بار پھر اردو صحافت کو فروغ ملا اور اس کی ترقی کے لیے انھوں نے کئی اہم اقدام اُٹھائے۔ اس کے بعد جتنی بھی حکومتیں بنیں ان کا جھکاؤ اردو کے مقابلے میں انگریزی کی طرف رہا اور اردو جس تیز رفتاری سے ریاست میں ترقی کر رہی تھی 1984 کے بعد اس میں سست رفتاری آ گئی۔ ریاست میں بڑھتی ہوئی بدامنی اور بدترین حالات نے اس صنف کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا۔

مسائل اور امکانات:

حکومت کی پالیسیوں کی وجہ سے ریاست میں اردو کو بہت سے مسائل درپیش ہیں:

1- سب سے بڑا مسئلہ تو اس وقت اس زبان کے لیے زندہ رہنے کا مسئلہ ہے۔ موجودہ حکومت نے اسکولوں میں اس زبان کی اہمیت کو تقریباً ختم کرنے کی کوشش کی جس کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں، جبکہ یہ زبان ریاست جموں و کشمیر کے آئین کے مطابق اسکولوں میں پڑھانا بے حد ضروری ہے لیکن موجودہ حکومت رفتہ رفتہ اس زبان کو اسکولوں سے ہٹا رہی ہے۔ اس کے علاوہ دفاتر اور دوسرے سرکاری اداروں سے بھی اس زبان کو ہٹایا گیا ہے۔ یہ زبان عدالت اور محکمۂ پولیس تک ہی محدود ہے اور اس کی جگہ انگریزی زبان کو دی جا رہی ہے۔ سچ تو یہ ہے اردو کے مقابلے میں جموں و کشمیر میں کسی بھی زبان کو فوقیت دینا آئین کی خلاف ورزی ہے۔

2- اقتصادی طور پر اردو اخبار نویسی کمزور ہے۔ جتنے بھی اردو اخبار شائع ہوتے ہیں ان کی

مالی حالت بے حد کمزور ہے جس کی وجہ سے اخبار کا معیار صحیح نہیں ہوتا ہے۔ مالی حالت کی وجہ سے ہی تقریباً ہر اردو اخبار بہت جلد بند ہو جاتا ہے۔

3- یہ اخبارات اور رسائل گٹ اَپ کے لحاظ سے صحیح نہیں ہوتے۔ کیونکہ چھاپے خانے ترقی یافتہ نہیں ہیں۔ اس لیے پرنٹنگ کے اعتبار سے بھی بہت معمولی ہوتے ہیں۔

4- نیوز ایجنسی کی کمی بھی اردو صحافت کو درپیش ہے۔

5- زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ اخبارات کافی کمزور ہیں۔

6- ان میں خبروں کا معیار بھی بہت معمولی ہوتا ہے۔

7- اس زبان سے تعصب برتا جا رہا ہے۔ فرقہ وارانہ سوچ کو سیاست مزید بڑھاوا دے رہی ہے۔ اس کے نتیجے میں اس وقت اعلیٰ فیچر، مضامین اور اداریہ لکھنے والوں کی کمی درپیش ہے۔

8- ریڈیو اور ٹیلی ویژن بھی اس کو فروغ دینے میں کوئی خاص کردار ادا نہیں کر رہا۔ ان پر نشر ہونے والے پروگرام بھی اعلیٰ پیمانے کے نہیں ہوتے۔

9- اردو اخبارات اور رسائل کو اقتصادی طور پر تعاون کی ضرورت ہے لیکن تقریباً کوئی بھی ادارہ یا ایجنسی اردو اخبارات کو اشتہارات چھپوانے کو نہیں دیتی اور اشتہارات کی کمی کی وجہ سے بھی اردو صحافت کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

10- اردو صحافت کو تکنیک کا مسئلہ بھی درپیش ہے۔

11- صحافت کے لیے تربیت یافتہ ہونا بے حد ضروری ہے لیکن ریاست میں تربیت یافتہ صحافیوں کی بھی کمی ہے۔

12- اردو صحافت کی طرف لوگ اس وجہ سے بھی کم دلچسپی لے رہے ہیں کہ ان کا جھکاؤ انگریزی کی طرف ہے۔ 1947 سے پہلے تقریباً دو سو اردو اخبارات شائع ہوتے تھے لیکن اس وقت مشکل سے 100 اخبار شائع ہوتے ہیں اور معیار کے اعتبار سے یہ بہت کمزور ہوتے ہیں۔

13- ان اخبارات اور رسائل میں پرانی معلومات اور پرانا ادبی مواد ہوتا ہے۔ نیا ان میں

صفر کے برابر ہوتا ہے۔

14- ان تمام خامیوں اور کمیوں کے باوجود ان اخبارات اور رسائل کی قیمت بہت زیادہ ہے۔اس لیے بھی ان کی خرید وفروخت بہت کم پیمانے پر ہوتی ہے۔

15- آج تک ریاست میں کسی بھی سرکاری اردو اکادمی کا قیام عمل میں نہیں لایا گیا۔اس لیے ریاست اب تک اردو اکادمی سے محروم ہے اور اس کی ترقی میں مزید مشکلات درپیش ہیں۔

16- اپنے خیالات کا کھل کر اظہار کرنے کی آزادی صحافیوں کو حاصل نہیں ہے اور اگر حاصل ہے بھی تو یہ صحافی حقیقت سے منہ موڑتے ہیں۔اس لیے ان اخبارات اور رسائل میں سچ بہت کم ہوتا ہے۔

ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ امکانات سامنے آتے ہیں کہ اردو صحافت کا مستقبل ریاست جموں وکشمیر میں کوئی خاص روشن نہیں ہے۔اس کے مستقبل کو خطرہ لاحق ہے اب اردو زبان وادب کو بھی کوئی خاص فروغ نہیں مل رہا ہے۔اکادمی نہ ہونے کی وجہ سے بھی اس زبان کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن اردو صحافت سرکار کی بے توجہی کا شکار ہونے کے باوجود اب بھی اس میں تھوڑا بہت دم باقی ہے۔ریاست میں اعلیٰ اردو داں اور دانشور موجود ہیں جو نہ صرف ادب بلکہ صحافت پر بھی عبور رکھتے ہیں۔یہ تمام شخصیات اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے اپنی آواز بلند کرتی رہتی ہیں۔تعلیمی اداروں میں اردو پروفیشنل کورسز جاری کیے گئے ہیں اور انگریزی اخبارات کے ذریعے اردو زبان وادب پر توجہ دیں تو ایک بار پھر اردو صحافت میں تیز رفتاری آسکتی ہے۔اردو صحافت کو دوبارہ ترقی کے مراحل طے کرنے کے مواقع مل جائیں گے۔ یہاں یہ کہنا یکسر غلط ہوگا کہ ریاست جموں وکشمیر میں اردو کا مستقبل تاریک ہے۔البتہ اردو صحافت بے حد کمزور اور سست رفتار ہے۔اگر اردو داں شاعر اور ادیب اپنی روش پر چلتے ہوئے اسے مزید وسعت بخشتے رہے تو پھر سے یہاں کی اردو صحافت عروج پر پہنچ سکتی ہے۔اردو ادب وصحافت کے لیے یہ بات بھی خوش آئند ہے کہ موجودہ دور کی نئی نسل اس کی طرف سنجیدگی سے متوجہ ہورہی ہے۔ یہ لوگ اردو کی ترقی کے خواہاں ہیں اس کے فروغ کے لیے اردو کے پروفیشنل کورسز بھی کررہے

ہیں۔اس کے علاوہ چھوٹے شہروں، قصبوں اور تعلیمی اداروں میں مختلف ادبی پروگراموں کا انعقاد کراتے رہتے ہیں۔ان لوگوں کی اردو سے اتنی گہری دلچسپی اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ ریاست میں ایک بار پھر اردو صحافت کی زبردست تیز رفتاری کے امکانات باقی ہیں۔

جموں وکشمیر میں اُردو صحافت
زوال پذیر کیوں؟

ہارون رشی

ہندوستان میں اُردو صحافت کے 200 سال پورے ہونے کا جشن منایا جارہا ہے لیکن جموں وکشمیر میں اردو صحافت کی تاریخ بھی مختصر ہے اور اس کے عروج کا عرصہ بھی بہت محدود رہا ہے۔ اس ریاست میں اردو صحافت نے ابھی ایک صدی کا سفر بھی مکمل نہیں کیا ہے۔ اس سے بہت پہلے، 1924 میں لالہ مُلک راج صراف نے ریاست میں ہفت روزہ ''رنبیر'' کا اولین پرچہ نکال کر یہاں صحافت کی داغ بیل ڈالی تھی۔ حالانکہ اس سے بہت پہلے 1867 میں بھی یہاں ''بدیابلاس'' کے نام سے ایک ہفت وار اخبار جاری کیا گیا تھا۔ 1875 میں ''تحفۂ کشمیر'' کے نام سے ایک پرچہ جاری ہوا تھا۔ لیکن بیشتر مورخین کے مطابق ان اخبارات کی حیثیت سرکاری گزٹ سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ لیکن لالہ مُلک راج صراف کا مطلق العنانیت کے اُس دور میں ایک اخبار نکالنا اور اس کی اشاعت تسلسل کے ساتھ جاری رکھنا اپنے آپ میں ایک بڑی بات تھی۔

بعد کے ادوار میں اس ریاست میں اُردو صحافت کو پنڈت پریم ناتھ بزاز، مولانا محمد

سعید مسعودی، کشیپ بندھو، ایم اے صابر، نند لال واتل، غلام احمد کشفی، سلیم رفیقی، غلام رسول عارف، شمیم احمد شمیم، خواجہ ثناء اللہ بٹ اور صوفی غلام محمد صاحب جیسے کئی شہکار ملے، جنھوں نے اس مقدس پیشے کو اپنے خون جگر سے سینچا اور اس کی آبیاری کی۔ ان ہی شخصیات کی بدولت جموں و کشمیر میں اردو صحافت کو عروج حاصل ہوا۔ تقسیم برصغیر کے بعد یہاں کے اخبارات اور جرائد نے سیاسی اور سماجی معاملات میں عوام کی بھرپور رہنمائی کا فریضہ ادا کیا۔ ان اخبارات میں روزنامہ ''آفتاب'' قابل ذکر ہے۔ اس کے بانی خواجہ ثناء اللہ بٹ نے نہ صرف یہ کہ ایک اخبار جاری کیا بلکہ انھوں نے عوام کو اخبار پڑھنے کی طرف مائل کرنے کے لیے بھی جانفشانی کے ساتھ کام کیا۔ خواجہ صاحب کو ان کے غیر معمولی کام کا معاوضہ ان کی شہرت اور عوامی پذیرائی کی صورت میں ملا۔ آج بھی عوام اور دانشوروں کے ایک بڑے طبقے میں خواجہ ثناء اللہ بٹ کو جموں و کشمیر کے ''بابائے صحافت'' کے نام سے پکارا جاتا ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ ''آفتاب'' بہتر وسائل اور مالی فراوانی کے باوجود ایک ایسا انسٹی ٹیوٹ نہیں بن سکا، جو اردو صحافت کو حقیقی معنوں میں عروج عطا کر سکتا۔ یہی حال یہاں کے دیگر اردو اخبارات کا بھی رہا ہے۔

اب جہاں تک ریاست میں اردو صحافت کی موجودہ صورت کا تعلق ہے، اگرچہ یہ مکمل طور پر مایوس کن نہیں، لیکن بہت زیادہ اُمید افزا بھی نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جموں و کشمیر میں اُردو صحافت آج ایک ایسے دوراہے پر کھڑی ہے، جہاں اس کے سامنے عروج اور زوال کے دو راستے ہیں۔ دور جدید میں اردو صحافت کے مثبت پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اردو صحافت کی سب سے بڑی خوش قسمتی ہے کہ یہ بڑی تیزی کے ساتھ انٹرنیٹ سے جڑ رہی ہے۔ یونی کوڈ، فونوٹک اردو کی بورڈ اور ان پیج جیسے سافٹ ویرز کی بدولت اُردو صحافت کی ترقی کے امکانات وسیع ہوتے جا رہے ہیں۔ انٹرنیٹ کی وجہ سے آج اردو اخبارات کو آسانی سے مواد فراہم ہو رہا ہے۔ جدید ٹکنالوجی کے حامل چھاپہ خانوں کی بدولت آج اردو کے اخبارات اور جرائد کی دیدہ زیب اور خوبصورت پرنٹنگ ممکن ہو پا رہی ہے۔ ڈیزائننگ کے شعبوں میں ترقی کی وجہ سے اردو کے اخبارات اور رسائل کا رنگ روپ نکھر گیا ہے۔ ماضی قریب تک ہمارے اردو اخبارات کو یہ ساری سہولتیں میسر نہیں تھیں۔

لیکن ان تمام مثبت پہلوؤں کے برعکس وہ منفی پہلو بہت زیادہ ہیں، جن کی وجہ سے جموں و کشمیر میں اردو صحافت کے زوال کا امکان پیدا ہو گیا ہے۔ سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ اس مسلم اکثریتی ریاست جہاں چند دہائیاں قبل تک صرف اردو ہی عوام اور خواص کا اوڑھنا بچھونا تھی وہیں اب اردو پڑھنے والوں کی تعداد بتدریج گھٹتی جا رہی ہے۔ اردو صحافت کے قارئین کی تعداد میں مسلسل کمی واقع ہو رہی ہے۔ یہ صورت حال ہمارے یہاں اردو صحافت کے زوال کی عکاس ہے۔ بیشتر لوگ اب اردو کے بجائے انگریزی کی طرف مائل ہو رہے ہیں لیکن سب سے زیادہ ڈرا دینے والی بات یہ ہے کہ نئی نسل میں اردو زبان لکھنے پڑھنے کا رجحان بہت کم ہے۔ ہمارے بیشتر بچے اسکولوں یا گھروں میں برائے نام ہی اردو پڑھتے ہیں۔ چونکہ بچے ہی مستقبل کے شہری ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اردو صحافت کو مستقبل قریب میں قارئین کی شدید قلت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ریاست میں اردو صحافت کی زوال پذیری کا ایک اور سبب یہ ہے کہ یہ صحافیوں کو مناسب روزگار فراہم نہیں کر پا رہی ہے، جس کی وجہ سے صحافت کے میدان سے جڑنے والے نئے لوگ زیادہ تر انگریزی زبان کی صحافت کے ساتھ ہی اپنا کریئر وابستہ کرنے کو ترجیح دے رہے ہیں۔ ہماری ریاست میں اُردو اخبارات میں کام کرنے والے صحافیوں کو بیک وقت کئی اداروں کے لیے کام کرنا پڑتا ہے، تب کہیں جا کر اُنھیں دو وقت کی روٹی میسر ہو پاتی ہے۔ حالانکہ اردو اخبارات میں کام کرنے والے ان ہی صحافیوں کی محنت کے نتیجے میں ان اخبارات کے مالکان نام بھی کما رہے ہیں اور دام بھی۔ صحافیوں کے ساتھ اس ناموافق سلوک کے نتیجے میں اب یہ صورتحال ہے کہ ہماری ریاست میں اردو اخبارات کو قابل اور تربیت یافتہ عملے کی قلت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ماضی میں ایک عام تاثر تھا کہ صحافت ایک مقدس پیشہ ہے اور اسے ایک مشن کے طور پر اپنایا جانا چاہیے لیکن اب دنیا میں یہ سوچ بدل چکی ہے۔ متمدن معاشروں میں کسی بھی زبان میں شائع ہونے والے اخبارات، ان میں کام کرنے والے لوگوں کے لیے روزگار کا ذریعہ ہیں لیکن ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان اردو صحافت کے ساتھ جڑنے سے کترا رہے ہیں، کیونکہ انھیں پتہ ہے کہ اردو اخبارات کے ساتھ وابستہ ہو جانے سے اُن کی زندگیاں تباہ ہو جائیں گی۔ انھیں مالی بدحالی کا

سامنا کرنا پڑے گا۔ اس صورت حال کی وجہ سے ہمارے یہاں اردو اخبارات میں تربیت یافتہ یا تجربہ کار عملے کی قلت دیکھنے کو مل رہی ہے اور اس وجہ سے ہمارے یہاں اردو صحافت کا معیار ہر گزرنے والے دن کے ساتھ بری طرح متاثر ہو رہا ہے۔

جہاں تک انگریزی اخبارات کا تعلق ہے، ان سے وابستہ صحافیوں، بالخصوص رپورٹرز اور سب ایڈیٹرز کو قدرے مناسب تنخواہیں ملتی ہیں، اس لیے ان کے کام کا معیار بھی بہتر ہوتا ہے۔ انگریزی اخبارات کے رپورٹرز خبریں اور اسٹوریز لکھتے وقت حقائق کی اچھی طرح چھان پھٹک کرتے ہیں، ریسرچ کر کے متعلقہ حقائق اور اعداد و شمار کھنگالتے ہیں، دلائل جمع کرتے ہیں، متعلقین سے رابطے کر کے ان کی آرا حاصل کرتے ہیں اور اس طرح سے وہ قارئین کو زیادہ سے زیادہ اطلاعات بہم پہنچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ انگریزی اخبارات کے رپورٹرز اپنی اسٹوریز فائل کرتے ہیں تو سب ایڈیٹرز ان کی کاپیز کی زبان درست کرتے ہیں بلکہ اسے بہتر بناتے ہیں، اضافی الفاظ حذف کیے جاتے ہیں اور اس طرح سے مجموعی طور پر انگریزی اخبارات کے قارئین کو بہتر اور خوبصورت انداز میں خبریں پیش کی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس عمومی طور پر اردو اخبارات میں شائع شدہ مواد ان تمام پیشہ ورانہ تقاضوں سے عاری ہوتا ہے۔

میرا تجربہ ہے کہ ہمارے یہاں بیشتر اردو اخبارات کے مالکان ان سے جڑے صحافیوں کا کام دیکھنے کے بجائے، زیادہ تر اس فکر میں لگے رہتے ہیں کہ یہ صحافی دفتروں میں کتنے گھنٹے حاضر رہے ہیں۔ چند سال پہلے تک تو ہمارے اردو اخبارات میں شائع ہونے والی اسٹوریز کے ساتھ رپورٹرز کی بائی لائن دینے کا رواج بھی نہیں تھا۔ یہ بات روزنامہ ''کشمیر عظمیٰ'' کے حق میں جاتی ہے کہ اسی اخبار نے سب سے پہلے خبروں کے ساتھ متعلقہ رپورٹرز کے نام لکھنے کا عمل شروع کیا۔

سرکاری ملازمین کو صحافیوں کی جگہ کام پر لگانے کا رجحان ہمارے اردو اخبارات کا معیار گرنے کی ایک اور وجہ ہے۔ دن بھر ایک سرکاری دفتر میں ایک کلرک کی کرسی پر بیٹھ کر کام کرنے والا شخص جب شام کو اخبار کے دفتر میں سب ایڈیٹر کی جگہ کام کرے تو اس سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ اس پیشے کے تقاضے کے ساتھ انصاف کر سکے۔ شاید اب ہمارے قارئین بھی

یہ بات محسوس کر چکے ہیں کہ انھیں اردو کے بجائے انگریزی زبان کے اخبارات میں مفصل اور مدلل مواد پڑھنے کو ملتا ہے، جو پیشہ ور صحافیوں نے لکھا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ چند دہائیوں کے دوران اردو صحافت کے قارئین کا دائرہ گھٹتا گیا اور انگریزی صحافت کے قارئین کا دائرہ بڑھتا گیا۔ اس ریاست میں اُردو صحافت کے زوال کا بنیادی سبب بھی یہی ہے کہ اردو اخبارات جدید دور کے تقاضوں کے مطابق اپنے قارئین کو مواد فراہم کرنے میں ناکام ثابت ہو رہے ہیں۔

جموں و کشمیر میں زوال پذیر اردو صحافت کو پھر سے عروج عطا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے زوال کے اسباب کا تدارک کیا جائے۔ پس یہی ایک راستہ ہے کہ جس سے اردو صحافت کی مایوس کن صورتحال کو امید افزا بنایا جاسکتا ہے۔ اردو صحافت کو روزگار سے جوڑنے کی ضرورت ہے تاکہ صحافت کے پیشے سے منسلک ہونے والے نئے لڑکوں اور لڑکیوں کو اردو اخبارات سے وابستہ ہونے میں کوئی عار محسوس نہ ہو۔ انھیں اردو صحافت میں اپنا کریئر محفوظ اور خوشحال نظر آنا چاہیے۔

اس ریاست میں رجسٹرڈ اردو اخبارات کی تعداد سیکڑوں میں ہے، لیکن ان میں چند ایک ہی تسلسل کے ساتھ شائع ہوتے ہیں اور قارئین تک پہنچتے ہیں۔ بیشتر اخبارات صرف ریاست کے انفارمیشن محکمہ سے اشتہارات حاصل کرنے کے بعد چند کاپیاں شائع کر کے چھپے ہوتے ہیں۔ اس سلسلے کو یکسر روکنے کی ضرورت ہے۔ سرکاری اشتہارات صرف اُن اخبارات کو ملنے چاہئیں، جو اولاً تسلسل کے ساتھ اور معیار کو برقرار رکھتے ہوئے شائع ہوتے ہوں اور ثانیاً جو ان میں کام کرنے والے صحافیوں اور دیگر عملے کو مناسب تنخواہیں ادا کرتے ہوں۔ اس ضمن میں لیبر ڈیپارٹمنٹ اور پریس کونسل آف انڈیا پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

مختصر الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ جموں و کشمیر میں رو بہ زوال اردو صحافت کو سہارا دینے اور اسے پھر عروج عطا کرنے کے لیے موثر اور ٹھوس اقدامات کرنے کی فوری ضرورت ہے۔ برعکس صورت میں اس ریاست میں اردو صحافت ہر گزرنے والے دن کے ساتھ زوال پذیر ہوتی رہے گی اور دو تین دہائیوں تک بالآخر یہاں اس کا وجود ختم ہو جائے گا۔

!

لداخ میں اردو صحافت

کاچو اسفند یار خان

لداخ میں اردو صحافت کب اور کیسے شروع ہوئی اس کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا بہت مشکل ہے۔ بلکہ یہ کہنا اور بھی مشکل ہوگا کہ لداخ میں اردو زبان کب اور کیسے پہنچی۔ اس تاریخی پس منظر کو سمجھنے کے لیے ہمیں لداخ کی تاریخ پر نظر ڈالنی پڑے گی۔ یہ ایک جغرافیائی حقیقت ہے کہ لداخ کا محل وقوع ایک ایسی جگہ پر ہے جس کے مشرق میں چین، شمال میں ترکستان اور جنوب مغرب میں کشمیر اور ہندوستان واقع ہے۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ چین اور ترکستان کی زبانیں ہندوستانی یا اردو زبان سے یکسر مختلف ہیں، جن میں اردو یا ہندی کے الفاظ موجود نہیں ہیں۔ ترکستان کی زبان میں کچھ فارسی کے الفاظ ہوں تو ہوں لیکن ہندوستانی کے ساتھ اس کا کوئی لسانی رشتہ نہیں ہے۔ اس لیے یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ لداخ میں اردو کی ابتدا چین اور ترکستان کے ملکوں سے روابط کے نتیجے میں نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ لداخ میں اردو کا آغاز اور اس کے فروغ کے بارے میں اگر جاننا چاہیں تو ہمیں کشمیر اور ہندوستان کی طرف رُخ کرنا پڑے گا۔ کیونکہ زمانۂ قدیم میں جب بھی اور جس قدر بھی اردو یا ہندوستانی لداخ میں بولی یا سمجھی جاتی تھی،

یہ اُن لوگوں کی مرہون منت تھی جو ہندوستان اور کشمیر سے تجارت کی غرض سے یا مہم جوئی کے سلسلے میں یہاں آتے اور یہاں کے مقامی لوگوں کے ساتھ میل ملاپ کرتے تھے۔ قرین قیاس یہی ہے کہ یہ لوگ ہندوستانی میں بات کرتے تھے اور کچھ لداخی جن کو ان سے واسطہ پڑتا تھا، انہی لوگوں سے اس زبان کو سیکھ کر ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں بات کرتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم میں زیادہ تر وہی لوگ اس زبان کو کچھ حد تک سمجھ اور بول سکتے تھے جو لداخ کے تجارتی راستوں کے نزدیک آباد تھے، جبکہ اندرونی علاقوں میں پوری کی پوری آبادی اس زبان کے چند الفاظ کے سوا اس سے بالکل نابلد تھے۔ یہی حال تبتی اور ترکستانی تاجروں کا بھی تھا جو لداخ کے راستے کشمیر اور ہندوستان جاتے تھے۔ وہ بھی لداخیوں کے ساتھ اور کشمیریوں اور ہندوستانیوں کے ساتھ اس زبان کو رابطے کی زبان کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اُس زمانے میں لداخ کے گاؤں کا اِکا دُکا شخص ہی کچھ ہندوستانی سمجھ اور بول سکتا تھا۔ اس طرح اردو یا ہندوستانی شروع میں محض ایک رابطے کی زبان کے طور پر استعمال ہونے لگی۔ اس کے علاوہ لداخی بیوپاری جو تجارت کی غرض سے کشمیر آتے جاتے تھے، وہ بھی اسی بولی میں لین دین کرتے تھے۔ ان باتوں کے علاوہ لداخ میں صحیح معنوں میں اردو کے چلن کی ایک اور وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انیسویں صدی کے اوائل میں جب پنجاب اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں تعمیر و ترقی کے کام کا آغاز ہوا تو روزی روٹی کمانے کا ایک بہترین ذریعہ پیدا ہوا۔ کرگل اور بلتستان کے لوگوں کی ایک اچھی خاصی تعداد کام اور روزگار کی تلاش میں ان علاقوں میں جانے لگے جہاں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا تھا اور عام بول چال میں یہی زبان استعمال کرتے تھے۔ چونکہ یہاں کے معاشی حالات بہت ہی ناگفتہ بہ تھے۔ اس لیے رفتہ رفتہ کرگل اور بلتستان کے سیکڑوں نوجوان ہر سال سردیوں میں یہاں کی سخت سردی سے بچنے اور کچھ روزگار کی تلاش میں پنجاب کے پہاڑی علاقوں کا رُخ کرتے تھے۔ یہاں اُن کے لیے رابطے کی زبان صرف اور صرف یہی ہندوستانی تھی۔ اس طرح یہ لوگ ٹوٹی پھوٹی اردو سیکھ لیتے تھے اور کم از کم اپنا مدعا بیان کرنے کے قابل بن جاتے تھے۔ یہی لوگ لداخ واپس آ کر باہر والوں کے ساتھ بھی اسی زبان میں بات کرتے تھے۔ پھر 1889 میں مہاراجا پرتاپ سنگھ نے ریاست جموں و کشمیر میں اردو کو سرکاری زبان بنایا، جبکہ اس سے قبل بھی ریاست

میں اردو بولی اور سمجھی جاتی تھی اور رابطے کی زبان کی حیثیت سے مقبول تھی۔

1885 میں انگریز مشنریوں نے لیہہ لداخ میں ایک مورا وین مشن قائم کیا۔ شروع میں مشن کا نصب العین صرف عیسائیت کی تبلیغ تھی لیکن یہ مبلغ پادری لوگ تبلیغی کام کے ساتھ ساتھ علمی اور سماجی خدمات بھی سرانجام دیتے تھے اور اکثر پادری عالم، محقق اور فنون لطیفہ کے شیدائی تھے۔ مشن نے سب سے پہلے لداخ میں علم کی شمع روشن کی اور 1888 کے آس پاس لیہہ میں ایک اسکول قائم کیا جبکہ اُس وقت خطۂ لداخ میں کوئی اسکول موجود نہیں تھا۔ اردو یا ہندوستانی زبان کی مقبولیت کو دیکھ کر اس اسکول کا ذریعہ تعلیم ہندوستانی (اردو) اور انگریزی رکھا۔ اس طرح پہلی بار لداخی بچوں کو ایک منظم طریقے سے اردو پڑھنے اور لکھنے کی ترغیب ملی۔ چونکہ اردو مشن اسکول کے نصاب تعلیم میں شامل تھی۔ اس طرح پہلی بار اس خطے میں اردو یا ہندوستانی پڑھنے اور لکھنے کی سہولت میسر ہوئی۔ اسی طرح اس دور اُفتادہ خطے میں صحافت کی داغ بیل ڈالنے کی خاطر مشن نے لداخ میں سب سے پہلا اخبار بھی نکالا جو ریاست جموں وکشمیر سے نکلنے والا دوسرا سب سے پُرانا اخبار تھا۔ اس ضمن میں انگریز پادریوں کا رول قابل ستائش رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ اُنھوں نے ہی مقامی زبان میں پہلا اخبار نکالا، اُس کا نام غالباً ''لداخس فونیا'' یعنی لداخی خبر تھا۔ اس طرح کی کوششوں سے یہاں کے لوگوں میں خبریں پڑھنے کا شوق پہلی بار پیدا ہونے لگا۔ اِن کوششوں سے شہ پا کر ڈوگرہ حکومت نے بھی لیہہ میں ایک پاٹھ شالا کھولی جس کا ذریعہ تعلیم سنسکرت زبان تھی۔ یہ پاٹھ شالا لداخیوں کی سنسکرت سے عدم دلچسپی اور اردو سے لگاؤ کی وجہ سے جلد ہی بند ہوگئی۔

لداخ میں راجگان لداخ کے دور میں مذہبی تعلیم کے بغیر سیکولر تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اُس وقت لداخی طلبا مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لیے تبت کا رُخ کرتے تھے جو بودھ مذہب کا مرکز تھا اور وہاں سے مذہبی تعلیم حاصل کر کے واپس لوٹتے تھے۔ ذریعہ تعلیم تبتی زبان تھی۔ اردو یا ہندوستانی پڑھانے کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ البتہ انھیں راجاؤں کے دور میں پوریگ موجودہ کرگل کے ہر مسلم گاؤں میں چھوٹا موٹا مکتب موجود تھا۔ جہاں گاؤں کا ملا یا آخون بچوں کو دینیات اور قرآن خوانی سکھاتا تھا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ لفظ آخون فارسی لفظ اخوندہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ جس کا مطلب ''پڑھا لکھا'' ہے۔ یہ آخوندہ لوگ مشہور و معروف مسلم مبلغ حضرت شاہ

محمد نور بخشؒ کے شاگرد تھے جنھیں خود اُنھوں نے ہی تیار کیا تھا۔ یہ آخون لوگ مذہبی امور کی کماحقہ جانکاری رکھتے تھے۔ فارسی اور عربی کی تعلیم پڑھتے تھے اور حضرت کے مشن کو آگے بڑھانے میں پیش پیش رہتے تھے۔ حضرت شاہ محمد نور بخشؒ وہ عظیم مبلغ تھے جنھوں نے بلتستان اور پوریگ میں مذہب اسلام کو پھیلایا۔ وہ خود حضرت شاہ ہمدانؒ کے شاگرد تھے اور اُنہی کے تبلیغی مشن کو آگے بڑھا رہے تھے۔ اُن کے اس مشن کی وجہ سے ان خطوں میں فارسی اور عربی کی تعلیم کا رواج ہوا، جس کی وجہ سے آگے چل کر گگل اور بلتستان کے لوگوں کو اردو پڑھنے اور لکھنے میں بہت آسانی ہوئی اور اردو ایک رابطہ کی زبان کے طور پر چل پڑی۔ ایک انگریز سیاح ولیم مور کرافٹ نے 1820 میں لکھا ہے کہ پوریگ کے ہر گاؤں میں ایک یا دو لوگ ایسے ملتے تھے جو فارسی اور ہندوستانی میں بات چیت کر سکتے تھے۔ اس طرح اردو یا ہندوستانی پڑھنے اور لکھنے کا رواج چل پڑا تھا۔

کہتے ہیں کہ ایک اور مشہور مشنری ڈاکٹر فرانکی نے 1904 میں لداخی میں ایک اخبار جاری کیا۔ اس کا نام لداخس گی اخبار تھا یا غالباً اسی اخبار کا نام لداخس فونیا تھا۔ یہ اخبار مشن کے لیتھو پریس پر چھاپا جاتا تھا۔ اس میں خبریں، سلسلہ وار کہانیاں اور لداخی کہاوتیں پیش کی جاتی تھیں اور یہ اخبار مشن کے بند ہونے تک جاری رہا۔ ڈاکٹر فرانکی کے مطابق مشن اسکولوں میں ہندوستانی (اردو) ایک اہم ترین ذریعہ تعلیم تھی اور مشن پادریوں کو اردو سیکھنے پر زور دیتا تھا۔ آزادی سے قبل ایک اور مشنری والٹر اسبو، لیہہ میں کرسچن سرائے کے سامنے دو تختوں پر ''السٹریٹڈ ویکلی آف لندن'' کے باتصویر تراشے چسپاں کرتے تھے۔ ان تصویروں اور خبروں سے لداخیوں کو دوسری جنگ عظیم کے متعلق جانکاری حاصل ہوتی تھی۔ اس طرح ابتدا سے ہی ان مشنریوں نے لداخیوں کی خوابیدہ سماجی زندگی میں تعلیم و تربیت اور صحافت و جانکاری کی ترویج اور ترقی کے لیے بہت ہی دوررس اور انقلابی نوعیت کے اقدام اُٹھائے۔

ڈوگرہ حکومت نے 1930 تک لداخ میں تعلیم کی طرف بہت کم توجہ دی۔ لداخ پر قابض ہونے کے بعد حکومت نے تقریباً نصف صدی کے بعد ہی لیہہ میں ایک پرائمری اسکول کھولا، جبکہ گگل میں 60 سال کے بعد اسکول کھولا۔ حالانکہ اردو کو 1889 میں سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا تھا۔ انیسویں صدی کے آخر میں مہاراجا پرتاپ سنگھ نے اردو کو رابطے کی زبان کے طور پر

پوری ریاست میں نافذ کر دیا تھا اور اسے سرکاری زبان کا درجہ بھی دیا تھا اور پھر اس زبان کی ترویج اور ترقی کے لیے اسے اسکولوں میں ذریعہ تعلیم کے طور پر رائج کیا تھا۔ جب لیہہ اور کرگل میں سرکاری اسکول کھولے گئے تو ان میں اردو انگریزی کو تعلیم کا میڈیم بنایا۔ رفتہ رفتہ ان اسکولوں سے پڑھے لکھے لوگ نکلنے لگے تو یہ زبان بھی ایک متبادل زبان کے طور پر استعمال ہونے لگی۔

لداخ میں جب اردو پڑھنے والوں کی ایک اچھی خاصی تعداد بڑھنے لگی تو اردو اخبارات کے ذریعہ بیرونی دنیا کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہونے لگی۔ چونکہ انگریزوں کی وجہ سے ملک میں ڈاک کا نظام کافی حد تک منظم اور قابل اعتبار تھا۔ اس لیے کشمیر اور لاہور وغیرہ سے اردو اخبارات پہنچنے لگے اور چند پڑھے لکھے افراد ان اخباروں کے تراشے لوگوں کو سناتے تھے اور اس طرح لوگوں میں خبر سننے کی عادت شروع ہوئی۔ اس طرح لداخی عوام بیرونی دنیا کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانکاری حاصل کرنے لگے۔ آزادی سے قبل کشمیر اور لاہور سے ڈاک کے ذریعہ کئی اخبارات اور رسائل موصول ہوتے تھے۔ ان میں مخزن، صداقت، خلافت، زمیندار، انقلاب، ملاپ جیسے رسائل اور اخبار قابل ذکر تھے۔ 30-1920 کی دہائی میں ریاست میں شخصی راج کے خلاف دبی دبی زبانوں میں تحریک چل رہی تھی جس کے بارے میں ان اخباروں میں خبریں چھپتی تھیں۔ اس لیے اس دور میں ریاست میں اخبارات کی اشاعت اور بیرون ملک سے اخبارات کی آمد پر پابندی عائد کی گئی تھی۔ کشمیر میں بیرون ریاست سے چوری چھپے ان اخبارات کو منگایا جاتا تھا۔ یہی صورت حال لداخ میں بھی تھی۔ یہاں بھی ان اخبارات کو خفیہ طور پر منگاتے تھے۔ 1930 کی دہائی میں لداخ کا ایک پڑھا لکھا نوجوان منشی عبدالستار ان اخبارات کو پڑھ کر لوگوں کو تحریک آزادی کشمیر کے بارے میں باخبر کرتا تھا۔ وہ لوگوں میں بیٹھ کر اخبار پڑھ کر سناتا تھا، جس کی پاداش میں وہ مہاراجا کے عتاب کا شکار ہوا اور اُسے جیل جانا پڑا۔

آزادی کے بعد لداخ میں اسکولوں کا جال بچھایا گیا اور ہر گاؤں میں اسکول کھلنے لگا۔ نتیجے کے طور پر لداخی کم وبیش اردو جاننے لگا اور اخبارات بھی پڑھنے لگا لیکن اس دوران یہاں سے کوئی لوکل اخبار یا میگزین نکالنے کی ہمت کسی کو نہیں ہوئی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ لداخ سے کشمیر کے درمیان ذرائع آمد ورفت بہت کٹھن تھے۔ لداخ سے پیدل کشمیر پہنچنے میں کئی کئی دن لگتے

تھے۔اس لیے بیرونی دنیا سے خبروں کی ترسیل کا کوئی نظام بھی موجود نہیں تھا۔ دوسری یہ کہ لداخ کی کل آبادی بہت کم تھی اور اس میں شرح خواندگی مایوس کن حد تک کم تھی۔ ایسے میں غالباً کوئی بھی اردو میں اخبار نکالنے کا جوکھم اُٹھانا نہیں چاہتا تھا۔

لداخ کی تاریخ میں 1962 کی ہند چینی سرحدی لڑائی ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔اس لڑائی کے بعد لداخ کی معاشی حالت اور یہاں کے رسل و رسائل کی صورت یکسر بدلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ کیونکہ اس لڑائی کے بعد ہی حکومت ہند نے لداخ اور کشمیر کے درمیان کا راستہ اب موٹر گاڑیوں کی آمد و رفت کے قابل بنانے کی طرف خصوصی توجہ مرکوز کی اور ایک دو سال کے اندر ہی یہ راستہ بڑی بڑی گاڑیوں کے عبور و مرور کے قابل بن گیا۔ جس کی وجہ سے مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے ہونے لگا۔ ساتھ ہی ضروریات زندگی کے سامان کے ساتھ ساتھ اخبارات کی ترسیل کا سلسلہ بھی بہت بہتر ہوا جس سے یہاں کے لوگوں کا رابطہ کشمیر اور بیرونی دنیا سے سو فیصد بڑھ گیا۔ ساتھ ہی لوگوں میں اردو اخبارات پڑھنے کا شوق اور بھی پروان چڑھنے لگا۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ 1960 کے عشرے میں ہی حکومت ہندوستان نے محکمۂ فیلڈ پبلسٹی کے ذریعہ لداخ کے تقریباً ہر گاؤں کے لیے ایک ریڈیو سیٹ فراہم کیا، جسے گاؤں کے ایک گھر میں رکھ کر چلایا جاتا تھا اور اس کے ساتھ ایک لاؤڈ اسپیکر بھی تھا جس کے ذریعہ ریڈیو کی خبر یا پروگرام گاؤں کے ہر گھر میں ہر فرد سن سکتا تھا۔ البتہ اس ریڈیو سیٹ کے ذریعہ صرف ایک ہی اسٹیشن یعنی آل انڈیا ریڈیو ہی سنا جا سکتا تھا۔ باقی سارے اسٹیشن منجمد کیے ہوئے تھے۔ شاید اس لیے کہ لوگ پاکستانی ریڈیو کا پروپیگنڈہ نہ سن سکیں۔ اس طرح پوری دنیا کی خبریں شام کو اسی آل انڈیا ریڈیو کے ذریعہ سنتے تھے۔ لوگ بڑی بے صبری سے اس وقت کا انتظار کرتے تھے۔ خصوصاً 1962 میں جب چین اور ہندوستان کے درمیان لداخ سیکٹر میں ایک زبردست جنگ چھڑ گئی۔ ہر روز جنگ کی خبریں نشر ہوتی تھیں اور لوگ دم بخود ہو کر ان خبروں کو سنتے تھے اور بعد میں ان پر تبصرہ کرتے تھے اور یہ سارے پروگرام اردو یا ہندوستانی میں نشر ہوتے تھے۔ اس طرح ریڈیو اور اس پر نشر ہونے والی اردو خبروں اور پروگراموں سے نہ صرف اردو زبان کی ضرورت اور اہمیت کو تقویت ملی بلکہ لداخی سماج میں ایک مثبت اور دور رس تبدیلی لانے میں بھی مدد ملی۔ خصوصاً آل انڈیا ریڈیو

اور ریڈیو کشمیر سے نشر ہونے والی خبریں ہر گھر میں سنتے تھے۔ رفتہ رفتہ ہر گھر میں ریڈیو پہنچ گیا بلکہ پورٹیبل ریڈیو (ٹرانزسٹر) آنے کے بعد تو ہر فرد ریڈیو اُٹھائے ہوئے نظر آنے لگا۔ اب یہاں کے لوگ اخباروں کی جگہ بیرونی دنیا کی خبروں کے لیے زیادہ تر ریڈیو پر ہی انحصار کرنے لگے۔ ریڈیو کے ذریعہ اردو صحافت کے فروغ کا یہ سنہرا دور لداخ کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گا۔ پھر 1980 کی دہائی کے آخر میں لداخ میں ایل پی ٹی وی کے ٹاور زنصب کیے جانے لگے اور پہلی بار ٹی وی پروگرام کے ساتھ ساتھ اردو میں خبریں نشر ہونے لگیں۔ سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ ان تمام خبروں میں اردو خبریں زیادہ مقبول تھیں اور سب لداخی آسانی سے سمجھ جاتے تھے۔ اس کے علاوہ لوگ اردو سیریل بڑی دلچسپی کے ساتھ دیکھتے تھے۔

اس کے باوجود اس عرصے میں لداخ بشمول کرگل سے کوئی بھی اخبار شائع نہیں ہوا تھا۔ اگر چہ بعد میں معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ پرنٹنگ اور اشاعت کا کام بہت آسان ہو گیا تھا اور کوئی اخبار نکالنا زیادہ دشوار بھی نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود لداخ اور کرگل جیسے دور اُفتادہ علاقوں سے کوئی اخبار یا رسالہ نکالنا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ کیونکہ نئی تازہ خبروں کے لیے کشمیر سے لائے ہوئے اخباروں پر انحصار کرنا پڑتا تھا اور وہ خبریں پرانی ہو چکی ہوتی تھیں۔ کیونکہ اب لیہ جیسے شہر میں ہوائی سروس کی وجہ سے باہر سے ہر اخبار اُسی روز پہنچ جاتا ہے۔ صرف لوکل خبروں کی اشاعت کا کوئی مطلب بھی نہیں تھا۔ غالباً یہی وجہ رہی ہوگی کہ آج سے دس بارہ سال قبل تک لیہ اور کرگل سے نہ صرف اردو میں بلکہ کسی اور زبان میں بھی کوئی اخبار نہیں نکلتا تھا۔ ابھی بھی اکا دکا اخبار اور رسالے نکلتے ہیں اور وہ بھی زیادہ تر بودھی اور انگریزی کے ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ کشمیر کے کچھ نوجوانوں نے 2004 میں سری نگر سے ایک پندرہ روزہ اخبار ''کرگل نمبر'' کے نام سے شائع کرنا شروع کیا جو بعد میں کرگل اور لداخ میں کافی مقبول ہوا اور اب بھی باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ اسی راہ پر چلتے ہوئے پچھلے ایک دو سال سے اب کرگل سے ہی ایک لوکل اخبار ''وائس آف لداخ'' کے نام سے اردو اور انگریزی میں شائع ہو رہا ہے۔ اس طرح سے لیہ لداخ سے بھی ایک انگریزی اخبار ''ریچ لداخ'' اور ایک انگریزی میگزین ''رتاوا'' نکل رہے ہیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ آج کل جس تیزی سے دنیا بدل رہی ہے اُس کا اندازہ کرنا بھی بہت مشکل ہے۔ کل جو چیز

لوگوں کو مرغوب اور محبوب تھی وہی چیز دوسرے ہی دن فرسودہ ہو جاتی ہے اور لوگوں کے ذہن سے نکل جاتی ہے۔ خصوصاً پچھلی ایک دہائی کی تو بات ہی نرالی ہے۔ اس دہائی میں اقتصادی ترقی کے ساتھ ساتھ پرنٹ میڈیا میں ایک انقلاب آچکا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ اب پرنٹ میڈیا کی جگہ برقی میڈیا نے لے لی ہے اور لے رہا ہے۔ اب لداخ جیسے مقابلتاً سست رفتار خطہ میں بھی لوگوں کے پاس اخبارات اور سائل پڑھنے کے لیے بہت کم وقت بچا ہے۔ اس لیے وہ اب الکٹرانک میڈیا سے اپنی ان ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ انٹرنیٹ اس ضمن میں ایک انقلابی رول ادا کر رہا ہے۔ حکومت نے لداخ میں بھی جگہ جگہ موبائل ٹاورز کا ایک جال بچھایا ہے۔ اس وقت کوئی بھی گڈریا اپنی بھیڑ بکریوں کو چراتے ہوئے کسی بھی پہاڑ کی چوٹی سے اپنے گھر والوں یا رشتہ داروں سے بات کر سکتا ہے۔ اس وقت آدمی جہاں بھی ہو انٹرنیٹ کے ذریعہ دنیا بھر کی اہم خبروں سے خود کو واقف کرا سکتا ہے۔ پلک جھپکتے ہی دنیا بھر کی خبریں اُس کی مٹھی میں ہوتی ہیں۔ ایسے میں خطۂ لداخ میں پرنٹ میڈیا خصوصاً اردو صحافت کا مستقبل زیادہ روشن نہیں ہے۔ مذکورہ بالا وجوہ کے علاوہ اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اب اسکولوں میں بھی بچے اردو کی جگہ ہندی اور انگریزی پڑھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ضلع لیہہ میں تو صورت اور بھی ناگفتہ بہ ہے۔ یہاں معدودے چند اسکولوں کے علاوہ باقی تمام اسکولوں میں ہندی اور انگریزی پڑھائی جاتی ہے۔ ضلع کرگل میں بھی صورت حال زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہے۔ یہاں بھی اب اکثر بچے ہندی اور انگریزی پڑھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر زیادہ تر نئی نسل اردو زبان سے نابلد ہو رہی ہے جس کی وجہ سے آئندہ اس زبان کا مستقبل زیادہ روشن نہیں نظر آرہا ہے اور اس زبان کی ترقی کم از کم خطۂ لداخ میں محدود نظر آتی ہے۔ جسے ایک بدقسمتی کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ جو زبان ریاست جموں و کشمیر کے تینوں خطوں کو صدیوں تک ایک لسانی رشتے میں جوڑ کر رکھتی تھی اب یہی زبان سرکاری زبان ہونے کے باوجود علاقائی تعصب کا شکار ہو کر دم توڑ رہی ہے اور اس کے احیائے نو کے لیے کوئی بھی قدم نہیں اُٹھایا جا رہا ہے۔

کتابیات:

1- قدیم لداخ (تاریخ و تمدن) از کاچو سکندر خان سکندر
2- لداخ (تہذیب و ثقافت) از عبدالغنی شیخ
3- ذاتی مشاہدات، معلومات اور یادداشت

(س) پنجاب

پنجاب میں اُردو صحافت
ماضی کے آئینے میں (ایک طائرانہ نگاہ)

نصر ملک

خطہ ہندوستان میں اردو صحافت کا علاقہ بہت وسیع و عریض ہے۔ مختصر سے مضمون میں اُس کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ ہندوستان میں مطبوعہ صحافت کے آغاز کے کم و بیش دو سو سال بعد آج ہم اردو صحافت کے جس شاندار ماضی اور برطانوی استعماریت سے ہندوستان کی آزادی کے لیے ان اُردو اخبارات اور اُن کے مدیران کی قلمی مجاہدانہ جدوجہد کا ذکر کرتے ہوئے جہاں انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں وہاں ہم اُس جذبۂ ملّی کو بھی سلام پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتے جسے اردو صحافت کے ''ہندو، مسلم، سکھ'' مدیران نے ملک کے طول و عرض میں بیدار کیا اور جس کی بدولت ہندوستان کو آزادی نصیب ہوئی۔ لیکن چودہ اگست 1947 کو جہاں پاکستان کا قیام معرض وجود میں آیا وہاں دوسرے دن یعنی پندرہ اگست کو ہندوستان آزاد ہی نہیں منقسم بھی ہوا اور ملک کی اس تقسیم نے اردو صحافت کو بھی دو ٹکڑے کر دیا۔ جو اخبارات پہلے 13 اگست 1947 کی شام تک صرف ہندوستانی اخبارات تھے وہ 14/15 اگست کو ہندوستانی اور پاکستانی اخبارات بن گئے۔

پنجاب میں لاہور سمیت پاکستان کہلوانے والے علاقوں سے جو اردو اخبارات ہندو یا سکھ مالکان شائع کرتے تھے وہ تقسیم ہند کے بعد دہلی اور ہندوستان کے دوسرے شہروں میں منتقل ہو گئے۔ فی الوقت دنیا کا سب سے بڑا پاکستانی روزنامہ ''جنگ'' بھی پہلے دہلی ہی سے شائع ہوتا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق اگست 1947 تک ہندوستان میں اردو کے 548 اخبارات و سیاسی جرائد شائع ہوتے تھے۔[1]

بیسویں صدی کے آغاز میں ایسے اخبارات ملک بھر میں اپنے عروج پر نظر آتے ہیں جو انیسویں صدی میں جاری ہوئے تھے۔[2] ان میں ''وکیل''، ''صلح کل'' اور ''پیسہ اخبار'' سر فہرست دکھائی دیتے ہیں۔ اردو صحافت کو لاہور سے شائع ہونے والے مولانا ظفر علی خان کے اخبار ''زمیندار'' نے ایک نیا موڑ دیا۔ یہ پہلا اخبار تھا جس نے رائٹر اور ایسوسی ایٹڈ پریس سے خبریں لے کر شائع کرنی شروع کی تھیں۔ تقسیم سے قبل کے اردو اخبارات کا احاطہ کرنا ایک بہت ہی محنت طلب اور دلچسپ عمل تو ضرور ہے لیکن میرا موضوع تقسیم سے پہلے ''متحدہ پنجاب کے اردو اخبارات'' کا جائزہ لینا ہے۔ لہٰذا اب میں براہ راست اس موضوع کی جانب آتا ہوں۔

یہ ایک بڑی بدقسمتی ہی ہے کہ 1986 تا 1988 ''پنجاب میں اردو صحافت'' کے موضوع پر کوئی مستند یا کوئی دوسری الگ کتاب شائع نہیں ہوئی۔ البتہ مولانا امداد صابری اور عتیق صدیقی نے اردو صحافت پر اپنی تحقیقی کتابوں میں پنجاب کے اخباروں کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح پروفیسر عبدالسلام خورشید نے اپنی تصنیف ''صحافت پاک و ہند'' میں ''پنجاب کی صحافت'' پر دو ابواب شامل کیے ہیں لیکن انھوں نے بھی ان ابواب کے لیے زیادہ تر مواد مولانا امداد صابری ہی کی تصانیف سے حاصل کیا ہے لیکن ایسا کرتے ہوئے وہ کئی سنگین غلط بیانیوں کا شکار ہو گئے ہیں۔[3] اس میں کوئی شک نہیں کہ مغل حکمرانوں کے دور سے تعلق رکھنے والے درباری وقائع نویسوں کے روزناموں کا ذکر تاریخ کے اوراق میں ملتا ہے اور اس پر بہت کچھ لکھا بھی جا چکا ہے لیکن تعجب ہوتا ہے کہ پنجاب میں مہاراجا رنجیت سنگھ کے دور میں جو مختصر ''خبرنامے'' دربار کے لیے جاری کیے جاتے تھے اُن کا ذکر اردو صحافت کے کسی مورخ نے نہیں کیا۔ یہ بھی دھیان میں رہنا چاہیے کہ رنجیت سنگھ کے عہد میں فارسی یا اردو کا کوئی باقاعدہ روزنامہ یا ہفت روزہ شائع نہیں ہوتا تھا۔ پنجاب

پر فرنگیوں کے مکمل قبضے کے ساتھ ہی 14 رجنوری 1850 کو منشی ہرسکھ رائے نے لاہور سے ایک ہفت روزہ اخبار ''کوہ نور'' جاری کیا جسے انگریزوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ انھوں نے پنجاب بورڈ آف ایڈمنسٹریشن کی سرپرستی میں اپنا مطبع ''کوہ نور'' بھی قائم کیا۔ 1853 کی ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق ''کوہ نور'' کے بڑے بڑے خریداروں میں انگریز افسر بھی شامل تھے۔[4] غلام محمد پرتی اور منشی جمنا پرشاد اس ''کوہ نور'' کے اولین مدیران تھے اور پھر اس اخبار نے ایک طرح کے ''تربیتی اسکول'' کا درجہ حاصل کرلیا اور سید نادر علی سیفی، مولوی سیف علی، منشی نثار علی شہرت، مولوی تاج الدین، منشی لال سنگھ، مولوی عبداللہ اور منشی محرم علی چشتی جیسے عظیم اخبار نویسوں کو سامنے لایا۔ منشی ہرسکھ رائے لاہور میونسپل کمیٹی کے رکن بھی بنے اور اُن کا شمار لاہور کے 50 رؤسا میں ہوتا تھا۔

انگریز سرکار کی سرپرستی میں لاہور ہی سے مولوی شہسوار الدین کی ادارت میں ایک ہفت روزہ ''دریائے نور'' جاری ہوا۔ اس کا دفتر ''کوہ نور'' کے دفتر کی عمارت ہی میں تھا۔

1851 کے غالباً وسط میں سیالکوٹ سے منشی دیوان چند نے ''ریاض الاخبار'' جاری کیا اور ایک نئی طرز کی صحافت کو آگے بڑھایا۔ منشی دیوان چند نے ''چشمۂ فیض، خورشید عالم، ہمائے بے بہا، نورِ علیٰ نور اور دکنور یہ پیپر'' جیسے اہم ہفت روزہ اخبار جاری کیے اور اپنے دور کے ''اردو کے بابائے صحافت'' کا نام پایا۔ منشی دیوان چند کو بھی انگریزوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ اور بیشک اُن کے اخبار اردو میں شائع ہوتے تھے لیکن وہ خود اردو کو ذریعہ تعلیم بنائے جانے کے سخت مخالف تھے اور اُن کے برعکس منشی ہرسکھ رائے اُردو زبان کے علمبردار تھے۔ منشی دیوان چند نے بعد میں گوجرانوالہ میں ''مکتبہ دیوان چند'' قائم کیا اور اردو، ہندی اور گرمکھی میں کتابیں شائع کرنے لگے۔[5]

''دریائے نور'' کے سابق نائب مدیر منشی مہدی حسین خان نے 1852 میں ملتان سے ''ریاض نور'' جاری کیا۔ یہ ایک بیباک ہفت روزہ تھا۔ ایک سرکاری افسر کے خلاف لکھنے کے جرم میں انھیں سات کی قید کی سزا ملی اور اپنی رہائی کے بعد وہ لکھنؤ چلے گئے جہاں وہ منشی نول کشور کے ''اودھ'' اخبار سے منسلک ہو گئے۔ ملتان ہی سے 1854 میں ''شعاع الشمس'' کے نام سے فقیر غلام نصیر الدین نے اخبار جاری کیا جو بڑا قومیت پرست تھا۔ 1850 میں منشی گنڈا مل نے گوجرانوالہ

سے ایک ہفت روزہ "گلزار پنجاب" جاری کیا اور مئی 1854 میں گجرات سے "مطلع انوار"، 1856 میں راولپنڈی سے "سہیل پنجاب" اور "شملہ" اخبار جاری ہوئے اور امرتسر سے "باغ نور" اور لاہور سے "بحر حکمت" اور "معلم ہند" کا اجرا ہوا۔[6]

پنجاب میں جہاں اردو کے ہفت روزہ اور روزانہ اخبارات اپنے اپنے وسائل کے ساتھ اور بعض سرکاری سرپرستی میں شائع ہو رہے تھے وہاں ہندوستان میں فرنگی مخالف 1857 کے انقلاب کے بعد ایک نئی طرز کی صحافت نے جنم لیا اور کئی نئے ہفت روزہ اور روزانہ اخبارات شائع ہونے شروع ہوئے اور نیم سیاسی ماہنامے بھی سامنے آئے۔

سرکاری سرپرستی میں جاری ہونے والے "سرکاری اخبار" کا اجرا ہوا۔ پنڈت اجودھیا پرشاد اس کے مدیر تھے جبکہ آخری دور میں منشی پیارے لال آشوب نے اس کی ادارت سنبھالی اور مولانا محمد حسین آزاد اس کے نائب مدیر مقرر ہوئے۔ اس اخبار کے اخراجات پورے کرنے کے لیے پنجاب بھر میں ایک فیصد "کارپوریشن ٹیکس" لگایا گیا اور صوبے بھر میں نمبرداروں، پٹواریوں اور اسکولوں کے ہیڈ ماسٹروں کے لیے لازم قرار دیا گیا کہ وہ یہ اخبار خریدیں۔ گیارہ سال کے بعد یہ اخبار بند ہو گیا اور اس کے ایک سال بعد حکومت نے "اتالیق پنجاب" کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا۔ مولانا محمد حسین آزاد اور منشی پیارے لال اس کے مدیر تھے اور پھر السنہ شرقیہ کے بڑے عہدہ دار ڈاکٹر لائٹنر کی سرپرستی میں "انجمن مطالب مفیدۂ پنجاب" نے 1870 میں "انجمن پنجاب" جاری کیا جس کے مدیر پیرزادہ محمد حسین تھے اور پھر اسی انجمن نے یکم اپریل 1870 کو پنڈت گوپی ناتھ گورٹو کی ادارت میں ایک ہفت روزہ اخبار "ہمائے پنجاب" جاری کیا۔ چند سال بعد منشی نثار علی شہرت کو اس اخبار کا مدیر مقرر کر دیا گیا۔ اُن دنوں اخبارات کا بنیادی مقصد قدیم مشرقی علوم کا احیا اور ہندوستانی زبانوں کے ذریعے تعلیم کی اشاعت اور حکومت کو رائے عامہ سے آگاہ کرنا تھا۔ اخبار "انجمن پنجاب" ہر جمعہ کو باقاعدگی سے شائع ہوتا اور خبروں کے ساتھ ساتھ اُن پر رائے زنی کا اظہار کرتے ہوئے بڑے محتاط طریقے سے حکومتی اقدامات وغیرہ پر تنقید بھی کرتا تھا۔[7]

لاہور سے دیوان بوٹا سنگھ نے یکم جنوری 1873 میں مولوی نبی بخش کی ادارت میں ہفت روزہ "آفتاب" جاری کیا۔ یہ ایک قوم پرست اخبار تھا لیکن بدقسمتی سے بعد میں فرقہ پرستی کو ہوا

دینے لگا اور مولوی نبی بخش اس کی ادارت سے ہٹ گئے۔[8] اس سے پہلے رومن رسم الخط میں حکومت کے ایما پر مولوی فتح الدین سنبھلی نے "پنجاب پنچ" کے نام سے ہفت روزہ جاری کیا اور تسلیم کرتے ہوئے لکھا "انھیں ایک شریف سخن پرور اور نہایت فیاض حاکم (انگریز) کی امداد حاصل ہے۔[9] 1849 میں منشی معظم نے ہفت روزہ "لاہور کرانیکل" جاری کیا اور بعد میں اسے چھوڑ کر 1856 میں ہفت روزہ "پنجابی اخبار" جاری کیا جو 1890 تک باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ منشی صاحب فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور اتحاد کے زبردست حامی تھے اور حکومت کی پالیسیوں پر اکثر و بیشتر نکتہ چینی کرتے تھے۔

1881 میں "کوہ نور" کے مدیر کی حیثیت میں اپنے صحافتی سفر کا آغاز کرنے والے مولوی محرم علی چشتی نے "رفیق ہند" کے نام سے اپنے ہفت روزہ کا آغاز کیا یہ ایک آزاد سیاسی اخبار تھا جو سرکاری افسروں کی زیادتیوں اور یہاں تک کہ عدالتوں کے غیر منصفانہ و یکطرفہ فیصلوں کو بڑے مدلل انداز میں تنقید کا نشانہ بناتا تھا۔ یہ اخبار 1904 میں بند ہو گیا۔ انجمن حمایتِ اسلام نے لاہور سے اپنے ہی نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا۔ اس رسالے سے پنجاب کی بڑی بڑی ممتاز شخصیتیں وابستہ رہیں۔

1912 میں امرتسر سے شیخ محمد عالم نے ہفت روزہ "ویکلی" کی بنیاد رکھی۔ یہ وہی ہفت روزہ ہے جس کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبداللہ منہاس اور مولانا عبداللہ عمادی جیسے عظیم صحابیان علم و فن بھی وابستہ رہے۔ اس اخبار کا اپنا چھاپہ خانہ تھا اور اس کے آخری مدیر مولانا ثناءاللہ تھے جو قادیان سے شائع ہونے والے جماعت احمدیہ کے ترجمان ہفت روزہ الفضل اور دیگر اخبارات میں شائع ہونے والے جماعتِ احمدیہ کے دینی و سیاسی نظریات کے خلاف ڈٹ کر لکھتے تھے۔[10]

پنجاب میں روزناموں کا اجرا 1875 میں ہوا لیکن ابتدا میں، حویلی کابل خان، لاہور سے خواجہ احمد حسن نے "روزنامچہ پنجاب" کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا اور لاہور ہی سے منشی مہر بخش نے 1884 میں "شفیق ہند" کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار نکالا اور پھر اپنے مطبع سے انھوں نے دو اخبار "شامِ وصال" اور "نسیمِ صبح" جاری کیے جو اپنے اپنے نام کی نسبت سے

شام اور صبح کے وقت شائع ہوتے تھے۔ مولوی سیف الحق ادیب نے لاہور سے 1885 میں روزنامہ ''رہبر'' جاری کیا۔ 1888 میں ''کوہ نور'' کو اگرچہ روزانہ اخبار میں بدل دیا گیا لیکن یہ تجربہ ناکام رہا اور اخبار صرف تین ماہ جاری رہنے کے بعد بند ہو گیا لیکن منشی ہرسکھ رائے کے انتقال کے بعد اُن کی بیوہ ''کوہ نور'' کو ہفتہ وار اخبار کے طور پر شائع کرتی رہیں جو 1904 تک جاری رہا۔ ''اخبار عام'' کے اجرا کے کوئی 21 سال بعد منشی محبوب عالم نے لاہور سے یکے بعد دیگرے کئی اخبار جاری کیے۔ پہلے انھوں نے 1887 میں ہفت روزہ ''ہمت'' جاری کیا اور اپنا ایک مطبع قائم کر کے اسی سال منشی محبوب عالم نے روزنامہ ''پیسہ اخبار'' جاری کیا۔ اس اخبار کے سامنے تمام دوسرے اخبار ماند پڑ گئے اور اس کی کامیابی کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اُس زمانے میں منشی محبوب عالم کے چھاپہ خانہ میں 71 مشینیں نصب تھیں جو دن رات چلتی تھیں۔ اس اخبار کے نام کی نسبت سے لاہور میں ''انارکلی'' محلے کی اس گلی کا نام بھی ''پیسہ اسٹریٹ'' ہو گیا جہاں سے یہ اخبار شائع ہوتا تھا اور پھر اس اخبار کی ترسیل کے لیے محکمۂ ڈاک نے اسی نام سے ایک ڈاکخانہ بھی قائم کر دیا جو اب بھی موجود ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہفت روزہ ''پیسہ'' اخبار کی اشاعت پانچ ہزار تک تھی اور روزنامہ ''پیسہ'' کی اشاعت سولہ سو تک۔ 1924 میں لاہور کا یہ مقبول عام اخبار بند ہو گیا۔ منشی محبوب عالم نے کئی دوسرے رسائل و اخبار بھی جاری کیے جن میں ''بچوں کا اخبار''، ''شریف بی بی''، ''باغبان''، ''کلیدِ امتحان'' اور ''انتخاب لاجواب'' شامل تھے۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد منشی محبوب عالم کے بیٹے عبدالمجید نے ''انتخاب لاجواب'' کو لاہور ہی سے دوبارہ جاری تو کیا لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ منشی صاحب کی بیٹی فاطمہ بیگم نے بھی ''خاتون'' نام سے ایک روزنامہ جاری کیا لیکن یہ اخبار دو سال سے زیادہ نہ چل سکا اور بند ہو گیا۔ [11]

بیسویں صدی اردو اخبارات کے لیے بڑی زرخیز ثابت ہوئی۔ مولوی ثناء اللہ خان نے 1902 میں لاہور سے ہفتہ وار ''وطن'' جاری کیا۔ جو کم و بیش 33 سال تک شائع ہوتا رہا۔ 1915 میں یہ روزانہ شائع ہونے لگا لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد بند ہو گیا۔ 1904 میں لاہور سے لالہ دینا ناتھ اور چودھری رام بھج دت نے روزنامہ ''ہندوستان'' جاری کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی اشاعت 8 ہزار تک جا پہنچی۔ یہ کانگریس کا زبردست حمایتی اخبار تھا۔ لالہ دینا ناتھ ہی کی ادارت

میں چودھری رام بھج دت کے بیٹے کے نام سے ایک اخبار ''دیپک'' جاری کیا گیا۔ 1915 میں لالہ دینا ناتھ نے اخبار ''ہندوستان'' سے الگ ہو کر روزنامہ ''رمیش'' جاری کیا جو بہت مقبول ہوا۔ لالہ دینا ناتھ بذات خود ''آریہ سماجی'' تھے اور اسی وجہ سے اپنے نظریات کا پرچار کرنے کے لیے انھوں نے ایک ہفت روزہ ''ہمالیہ'' جاری کیا۔ آریہ سماجی حلقوں کے علاوہ یہ اخبار دوسرے لوگوں میں بھی بہت مقبول ہوا اور اس کی اشاعت سات ہزار تک تھی لیکن 1924 میں یہ ''رمیش'' اور ''ہمالیہ'' دونوں ہی بند ہو گئے۔ 1906 میں لاہور سے منشی محمد دین فوق نے ایک ماہنامہ ''کشمیری گزٹ'' جاری کیا اور اردو صحافت میں ایک دھوم مچا دی۔ 1913 میں اسے ہفتہ وار کر دیا گیا۔ یہ اخبار 30 سال تک شائع ہوتا رہا۔ منشی محمد دین فوق بڑے قوم پرست صحافی، ادیب، شاعر اور مورخ تھے اور علامہ اقبال سے خاص تعلق رکھتے تھے اور پنڈی بہاء الدین سے (1909) میں شائع ہونے والے رسالہ ''صوفی'' کے مدیر ملک محمد الدین اعوان کے ہمعصر اور بڑے قریبی تعلق داروں میں شمار ہوتے تھے۔[12]

صرف پنجاب ہی نہیں بلکہ پورے برصغیر کی اردو صحافت کی تاریخ میں بابائے صحافت مولانا ظفر علی خان کی شخصیت اور اُن کے روزنامہ ''زمیندار'' کا نام لیے بغیر مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔ 1903 میں اُن کے والد مولوی سراج الدین نے لاہور سے ایک ہفت روزہ ''زمیندار'' شروع کیا لیکن مالی مشکلات کے سبب تنگ آ کر اپنے آبائی قصبہ کرم آباد، تحصیل وزیر آباد منتقل ہو گئے۔ اُن کی وفات کے بعد مولانا ظفر علی خان نے اس ہفت روزہ کی باگ ڈور سنبھالی اور اسے دوبارہ لاہور سے شائع کرنا شروع کر دیا اور پھر جلد ہی اسے روزنامہ بنا دیا۔ روزنامہ ''زمیندار'' برطانوی استعماری راج کے سخت خلاف جہاد کا علمبردار تھا۔ یہ ایک ایسا اخبار تھا جو تمام حلقوں میں بے حد اور برابر مقبول تھا۔ انگریز سامراجی حکام اس سے سخت ناراض رہتے تھے اور انھوں نے اس اخبار کے خلاف ایک باقاعدہ تادیبی مہم شروع کر رکھی تھی۔ ادھر ''زمیندار'' نے گھن گرج کے ساتھ سامراجی حکومت پر تنقید کرتے ہوئے کچھ لکھا اُدھر انگریزوں نے اُس سے بھاری ضمانت طلب کر لی اور یہ سلسلہ ایک دو بار نہیں متعدد بار دُہرایا جاتا رہا، کبھی اخبار سے ضمانت طلبی اور یہاں تک کہ چھاپے خانے کی ضبطی کا حکم جاری کیا گیا تو کبھی دونوں تادیبی اقدام ایک ساتھ اُٹھائے گئے لیکن مولانا کے

حوصلے بلند سے بلند ہوتے گئے۔ اس معاملے میں کوئی دوسرا اخبار اتنا زیر عتاب نہیں تھا جتنا کہ ''زمیندار'' اور اس کے مالک و مدیر، مولانا ظفر علی خان۔ اردو صحافت کے مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ برطانوی سامراج کے خلاف قوم کو آگاہ و متحرک کرنے میں ''زمیندار'' نے جو تحریک شروع کی تھی کوئی دوسرا اخبار اس کا مقابلہ نہ کر سکا اور پھر رولٹ ایکٹ کے خلاف جدوجہد میں ''جلیانوالہ باغ'' میں قتل عام کے متعلق اور اس میں فرنگیوں کے ظالمانہ کردار پر مولانا ظفر علی خان کی تحریروں نے صرف پنجاب ہی نہیں پورے ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی آگ لگا دی۔ اسی دوران مولانا پریس ایکٹ کے خلاف احتجاجی مہم کے سلسلے میں خود انگلستان گئے اور وہاں سے اپنے اخبار کو ایک خصوصی مقالہ لکھ کر ارسال کیا اور جب یہ مقالہ ''زمیندار'' میں شائع ہوا تو مائیکل اوڈ ڈائر نے ''زمیندار'' کو فوراً بند کر دیا، اسی ہزار روپے کی ضمانت طلب کی اور پریس ضبط کر لیا اور ساتھ ہی دس ہزار روپے کی اضافی ضمانت بھی طلب کی۔ ضمانت کی ساری رقم بیک مشت جمع کرا دی گئی اور اخبار پھر طلوع ہو گیا۔ علامہ اقبال نے جب لاہور میں سرجان سائمن کا استقبال کیا تو مولانا نے اقبال کو بھی نہ بخشا۔ لالہ لاجپت رائے پر انگریز کے لاٹھی چارج پر انھوں نے ایک دھماکہ خیز نظم لکھی اور اپنے اخبار کے صفحہ اوّل پر شائع کی۔ سردار بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کو جب بغاوت کے الزام میں پھانسی دی گئی تو مولانا نے اس پر احتجاج کے لیے لاہور کے موری گیٹ میں ایک جلسے کے دوران ایک تقریر کی اور ایک ایسی فی البدیہہ نظم بھی پڑھی جس نے عوام کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف آگ بھڑکا دی، غرض یہ اخبار انگریزوں کے خلاف ''طبل جنگ'' پیٹتا رہا اور کبھی سرنگوں نہ ہوا۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد جب جواہر لال نہرو کراچی گئے تو مولانا نے اپنے اخبار میں انھیں خوش آمدید کہتے ہوئے لکھا:

ہمارے ملک میں بادِ بہاری چل کے آئی ہے
جواہر لعل نہرو کی سواری چل کے آئی ہے

یہ تھا اس قوم پرست ''زمیندار'' کا جذبۂ حب الوطنی اور ''ہندو مسلم اتحاد'' کے لیے ایثار۔[13]

متحدہ پنجاب میں ہندوستان کی تقسیم سے قبل جو روزنامے اور ہفتہ وار اخبارات شائع

ہوتے تھے، اس مختصر سی تحریر میں ان سب کا ذکر ناممکن ہے لیکن چند ایک اخبار ایسے ہیں کہ جنھیں کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً روز نامہ ''انقلاب'' جو مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا غلام رسول مہر کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ یہ ایک زبردست سیاسی اخبار تھا لیکن دوسری جنگ عظیم کے دوران انگریز سرکار اور جنگ کے حق میں پروپیگنڈہ کرنے کے لیے اسے گیارہ سو روپے ماہانہ امداد ملتی تھی، جس کی وجہ سے لوگ اسے قابل اعتماد نہیں سمجھتے تھے اور پھر روز نامہ ''سیاست'' جو ''ترک موالات'' کا بڑا حامی تھا، اس کی قومی خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ملک کی تقسیم کے بعد ''زمیندار'' کی طرح یہ دونوں اخبار بھی بند ہو گئے۔ ملک نور الٰہی کا جاری کردہ روز نامہ ''احسان'' مقبول عام اخبار تھا اور اسی طرح مولانا مرتضیٰ احمد کا اخبار ''شہباز'' بھی۔ وقار انبالوی اس کے ایڈیٹر تھے اور یہ یونینسٹ پارٹی کی ملکیت تھا۔ ایک وقت پر وقار انبالوی روز نامہ ''احسان'' کے بھی ایڈیٹر رہے تھے۔ اسی طرح 20 مارچ 1919 کو پنجاب میں آسمان صحافت پر ایک ستارہ چمکا۔ مہاشہ کرشن جو ہفت روزہ ''پرکاش'' جاری کرتے تھے۔ انھوں نے لاہور سے روز نامہ ''پرتاپ'' کے نام سے ایک بڑا جرأت مند اخبار جاری کیا جس نے بڑے کم عرصے میں اپنی صحافیانہ بہادری کے جوہر دکھاتے ہوئے قومیت پرستی کی ایسی روشنی پھیلائی کہ انگریز سرکار کو لینے کے دینے پڑ گئے اور اس نے مہاشہ کرشن پرشاد کو اپریل 1919 میں گرفتار کر لیا اور ان کی یہ گرفتاری اخبار کی بندش پر ختم ہو گئی۔ انھوں نے 1920 میں اپنی رہائی کے بعد اخبار کو دوبارہ جاری کیا لیکن اخبار کی ضمانت ضبط ہو گئی یہ اخبار جو پہلے شام کو شائع ہوتا تھا سوامی شردھانند کے قتل کے بعد صبح کو شائع ہونے لگا۔ لالہ نانک چند اس کے مدیر تھے اور انھوں نے اپنی سوچ و فکر کو بروئے کار لاتے ہوئے اردو صحافت کو ایک نیا رنگ دیا۔ انھوں نے ''پرتاپ'' کا ایک خصوصی ہفتہ وار ایڈیشن اور پھر ''خاص خاص نمبر'' شائع کرنے شروع کر دیے۔ ''پرتاپ'' کی ضمانت متعدد بار بحق سرکار ضبط کی جاتی رہی۔[19] کانگریس کی حمایت کرنے والا روز نامہ ''جے ہند'' 1946 میں شائع ہونا شروع ہوا اور جمنا داس اختر اس کے ایڈیٹر تھے۔ ملک کی تقسیم کے بعد ''جے ہند'' جالندھر سے کچھ عرصے کے لیے شائع ہوتا رہا لیکن پھر بند ہو گیا اور اس کے مدیر شری وریندر نے جالندھر ہی سے ''پرتاپ'' شائع کرنا شروع کر دیا۔ سروینٹس پیپلز سوسائٹی کے ایما پر لالہ لاجپت رائے نے روز نامہ ''بندے ماترم'' جاری

کیا۔ لالہ رام پرشاد، لالہ کپت رائے، لالہ فیروز چند اور پرنسپل چھبیل داس جیسے بلند پایہ صحافی اس کی مجلس ادارت میں شامل تھے، جبکہ نائب مدیران میں ملک یوسف العزیز، ساغر اکبر آبادی، شری دھرم ویر اور جمنا داس اختر شامل تھے۔ یہ مقبول عام اخبار تھا اور ایک وقت پر اس کی اشاعت گیارہ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد روزنامہ ''ملاپ'' دہلی، حیدرآباد اور جالندھر سے شائع ہونے لگا لیکن اس نے اپنی جنم بھومی لاہور سے رابطہ منقطع نہیں کیا تھا اور پاکستان کے قیام کے تین ماہ بعد تک بڑی باقاعدگی سے لاہور سے شائع ہوتا رہا لیکن بدقسمتی سے مہاشہ جی کے بیٹے یدھویر سنگھ پر قاتلانہ حملہ ہوا اور پریس کو آگ لگا دی گئی اور مہاشہ جی جان بچا کر دہلی چلے گئے، واہ قسمت! گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔ 15

امرتسر سے شائع ہونے والے سہ روزہ ''وکیل'' کو کیسے فراموش کیا جا سکتا ہے۔ اس کے مالک و ایڈیٹر شیخ غلام محمد تھے اور یہی وہ اخبار تھا جس کی ادارت مولانا ابوالکلام آزاد نے سنبھالی جو خود اُن کی اپنی صحافت کو پوری طرح نکھار پر لے آئی۔ اسی طرح پنجاب کے دوسرے درجنوں ماہوار، ہفت روزہ، سہ روزہ اور روزانہ اخبارات نے پورے برصغیر میں ''علم صحافت'' کے ساتھ قوم پرستی، انگریز دشمنی اور جدوجہد آزادی کی تحریک کو نئی جلا بخشی۔ لاہور کے لالہ شام کپور کا ہفت روزہ ''گرو گھنٹال'' اور اس کے بعد 1919 میں جاری کیا گیا ''کیسری'' اپنے دور کے معتبر اخبار تھے۔ سامراج دشمنی اور قوم پرستی میں ان دونوں کا کردار بہت نمایاں تھا اور یہی وجہ تھی کہ انگریز سرکار نے ان کی ضمانتیں ضبط کر لیں اور چھاپہ خانہ بھی بحق سرکار ضبط کر لیا گیا۔ لالہ کرم چند کا اخبار ''پارس'' بھی ایک کامیاب اخبار تھا۔ اسی طرح پنڈت مدن موہن مالویہ کے دست راست گوسوامی جی نے 1928 میں لاہور سے ''ویر بھارت'' کا اجرا کیا یہ اخبار کانگریس کا زبردست حامی اور ہندو مہاسبھا کا مخالف تھا۔ اس کے دو اڑھائی برس بعد گوسوامی جی روزنامہ ''تعلیم'' جاری کیا لیکن یہ کچھ زیادہ عرصہ نہ چل سکا اور اپنی بدنظمی کا شکار ہو گیا۔ اخبار ''ویر بھارت'' میں پنڈت میلا رام وفا کی سیاسی نظمیں بعنوان ''فرنگی سے خطاب'' شائع ہوئیں تو اس اخبار کے ایڈیٹر کو گرفتار کر لیا گیا۔ سامراج دشمنی میں یہ اخبار ''زمیندار'' کی طرز پر حکومت مخالف حملوں میں پیش پیش رہتا تھا۔ 1935 میں بھائی پرمانند نے اپنے ہفت روزہ اخبار ''ہندو'' کو روزانہ کر دیا۔ جنگ میں حکومت کے

لیے پروپیگنڈہ کرانے کے لیے حکومت اسے مالی امداد اور تحفظ مہیا کرتی تھی۔ احراری تحریک کے دوران مجلس احرار نے لاہور سے روزنامہ ''احرار'' جاری کیا اور ڈاکٹر عالم نے کانگریس کی مدد سے روزنامہ ''تریاق'' کا اجرا کیا لیکن یہ اخباری مقابلہ بازی میں مات کھا گیا۔ پنجاب میں کانگریس کے ایما پر معروف سیاستدان اور پنجاب کانگریس کے صدر ڈاکٹر ستیہ پال نے روزنامہ ''نیشنل'' جاری کیا۔ یہ وہ اخبار تھا جس میں حمید نظامی (جنھوں نے بعد میں اپنے روزنامہ ''نوائے وقت'' کی بنیاد رکھی جو اب پاکستان کا ایک بڑا معتبر اخبار مانا جاتا ہے) مولانا چراغ حسن حسرت اور باری لیگ جیسے نامور صحافی کام کرتے تھے۔ خلافت کی تحریک کے دوران لالہ نانک چند نانز نے راولپنڈی سے روزنامہ ''شکتی'' جاری کیا اور پنڈت کشن چند نے روزنامہ ''شانتی'' کی بنیاد رکھی اور راولپنڈی ہی سے ملک دلبر عالم اعوان نے ہفت روزہ ''ترجمان سرحد'' کا اجرا کیا۔ سکھوں کے سیاسی رہنما ماسٹر تارا سنگھ امرتسر سے روزنامہ ''اکالی'' جاری کرتے تھے اور سردار امر سنگھ لاہور سے ''شیر پنجاب'' شائع کرتے تھے۔ تقسیم ہندوستان اور قیام پاکستان کے بعد ملک کے بٹوارے کے ساتھ ہی پنجاب کے بیشتر اخبارات پاکستانی پنجاب کے علاقے سے ہندوستان منتقل ہو گئے اور پنجاب کا وہ حصہ جو پاکستان کے علاقے میں شامل کیا گیا وہاں سے جاری ہونے والے بیشتر اخبار دم توڑ گئے یا پھر وقفے وقفے سے جاری ہونے لگے یعنی سسک سسک کر مرنے لگے۔ وہ اخبارات جن کا کبھی پنجاب اور لاہور ہی نہیں پورے برصغیر میں طوطی بولتا تھا آج ان کا نام محض ''تاریخ کے اوراق'' میں ملتا ہے۔ تاریخ کے اوراق جن پر دھول جمی ہے اور جنھیں دیمک چاٹ رہی ہے۔[16]

کتابیات:

1، 2- روداد سمینار بعنوان ''اردو صحافت'' منعقدہ فروری 1986، دہلی۔ ماہنامہ ''ماہ نو'' (چالیس سالہ مخزن نمبر) جلد اول۔ مضمون بعنوان ''اردو اکادمی کا پہلا صحافی'' از: ڈاکٹر محمد صادق۔

3، 4، 5- رسالہ ''چاند'' الہ آباد۔ (خصوصی شمارہ، ایڈیٹر نمبر) نومبر دسمبر 1930 (مختلف مضامین سے استفادہ کیا گیا)۔

6، 7، 8 - اردو صحافت - مرتب، انور علی دہلوی۔

9، 10، 11- ''صحافت پاکستان و ہند'' از: پروفیسر عبدالسلام خورشید۔ لاہور۔ پاکستان۔
12، 13- اخبارات و مدیران، رسالہ ''کشمیر گزٹ'' (خصوصی نمبر)، ایڈیٹر مولوی محمد دین فوق۔ لاہور۔
14، 15، 16- ''پنجاب میں اردو صحافت'' مضمون از: شری جسنا داس اختر۔ اردو صحافت، مرتبہ: انور علی دہلوی۔ اردو اکادمی دہلی۔

(ش) اتر پردیش

یوپی میں اردو روزنامے: عصری منظرنامہ

شکیل احمد صبر حدی

اتر پردیش ہندوستان کا ایک بڑا اور سیاسی و سماجی لحاظ سے انتہائی اہم صوبہ ہے۔ اردو زبان و ادب اور بالخصوص اردو صحافت کے فروغ و ارتقا میں اس صوبہ نے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی آزادی میں اردو صحافت کا کردار بے حد اہم ہے تو اس میں بھی اتر پردیش سے شائع ہونے والے اخبارات سرفہرست نظر آتے ہیں۔ چاہے وہ ''حبیب الاخبار'' بدایوں ہو یا ''عمدۃ الاخبار'' بریلی کہ جب اس کے مدیر کو سزا ہوئی اور پریس ضبط کرلیا گیا تو موصوف نے اخبار کا نام بدل کر ''فتح الاخبار'' کے نام سے اسے پھر جاری کر دیا۔ نور الابصار الٰہ آباد، اعجاز لکھنؤ، متھرا اخبار و گنجینۂ اسرار متھرا، ہندوستانی لکھنؤ، اودھ پنچ لکھنؤ، اودھ اخبار لکھنؤ آگرہ اخبار، ریاض الاخبار گورکھپور، دبدۂ سکندری رام پور، اردوئے معلی علی گڑھ، اخبار مدینہ بجنور، تاریخ بغاوت ہند آگرہ، کریم الاخبار آگرہ، آفتاب ہند بنارس، طلسم لکھنؤ جیسے اہم اخبارات اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں جو مذہبی اور سیاسی محاذ پر اپنے قارئین کی رہنمائی کر رہے تھے۔ تاہم ان سے الگ ہٹ کر انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ اور تہذیب الاخلاق جیسے اخبارات تھے، جن کا مقصد

خالصتاً قوم کی تعلیمی و سماجی اصلاح تھی۔

1857 سے پہلے روزناموں کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اردو کا پہلا روزنامہ ''اردو گائڈ'' کے نام سے مولوی کبیر الدین نے نکالا تھا، جس پر انگریزوں کے خوشامدی ہونے کا الزام لگا اور وہ جلدی ہی بند ہو گیا۔ اس دور کے روزناموں میں پیسہ اخبار، روزنامہ پنجاب، وکیل امرتسر، زمیندار وغیرہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ لیکن جس اخبار کو اردو میں صحافیانہ اقدار اور پالیسی ساز ہونے کا سہرا حاصل ہے، وہ لکھنؤ کا ہی ''ہندوستانی'' اخبار ہے، جس کے تعلق سے بالمکند گپتا لکھتے ہیں: ''لکھنؤ کا 'ہندوستانی' اردو اخباروں میں سب سے پہلا اخبار ہے جس نے اردو اخباروں کی پالیسی قائم کی۔ اس اخبار نے دکھایا کہ اردو اخبار کس پالیسی پر چلیں اور کیا لکھیں۔'' آگے لکھتے ہیں: ''اردو دنیا میں 'ہندوستانی' ایک نئی چال کا اخبار نکلا۔ اس نے شروع ہی سے ملکی معاملات میں ہاتھ ڈالا اور ملکی معاملات پر آرٹیکل لکھنا شروع کیے۔ ہر ایک ملکی معاملے پر اس میں کچھ نہ کچھ لکھا جاتا ہے۔''

1857 کی پہلی جنگِ آزادی کے زخم اور 1947 میں ہندوستان کی تقسیم کے تعصب کا سامنا جس طرح ہندوستان بالخصوص شمالی ہند کی ایک بڑی آبادی اور اردو زبان کو کرنا پڑا، ظاہر ہے اس کے اثرات اس زبان کے اخبارات و رسائل پر بھی پڑے۔ آزادی سے پہلے صوبے کے مختلف شہروں آگرہ، بنارس، لکھنؤ، بریلی، الٰہ آباد، علی گڑھ، رام پور، بدایوں، میرٹھ، شاہجہاں پور، بجنور، اعظم گڑھ، گورکھپور وغیرہ سے شائع ہونے والے اخبارات و رسائل دھیرے دھیرے سمٹ کر لکھنؤ تک محدود رہ گئے۔ اب یو پی میں اردو اخبارات کا ایک ہی مرکز ہے لکھنؤ۔ یہیں سے پورے شمالی، جنوبی اور بالخصوص مشرقی اتر پردیش کی نمائندگی ہوتی ہے۔ رہا مغربی یو پی تو وہ پایۂ تخت دہلی سے زیادہ قریب رہنے کی وجہ سے معاشی و سماجی ہی نہیں، تعلیمی و تہذیبی طور سے بھی دلی میں رنگا ہوا ہے۔ چنانچہ صحافت کے لیے بھی وہ صرف دہلی ایڈیشن کی ڈاک کاپیوں کی طرف دیکھتا ہے۔ یہ معاملہ صرف اردو تک ہی نہیں انگریزی اور بعض ہندی اخبارات تک بھی پھیلا ہوا ہے۔

آج کی تاریخ میں یو پی بشمول لکھنؤ سے اردو کے کم و بیش دو سو روزنامہ اخبارات رجسٹرڈ ہیں، جن میں سے زیادہ تر کی اشاعت سرکاری اشتہاروں پر موقوف ہے، یعنی اسی دن کا اخبار چھپے گا جس دن کوئی اشتہار ہوگا اور یہ سنہری موقع چند کو چھوڑ کر باقیوں کو سال میں دو چار بار ہی میسر

آتا ہے۔ تاہم وہ اخبارات جو باقاعدگی کے ساتھ بازار تک پہنچتے ہیں اور لکھنؤ سمیت کانپور، بنارس ،الٰہ آباد سے شائع ہوتے ہیں اور اطراف کے اضلاع میں بھی پڑھے جاتے ہیں ان میں انقلاب، راشٹریہ سہارا، صحافت، اودھ نامہ، آگ، قومی خبریں، وارث اودھ، جدید مرکز، عوامی سالار، جدید عمل وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح کچھ قدیم اضلاع سے بھی اکا دکا اخبارات شائع ہو کر قارئین کی نظروں سے گزرتے ہیں، ان میں سیاست کانپور، مشرقی آواز گورکھپور، آواز ملک وارانسی شامل ہیں۔

جنگ آزادی کے آخری کے ایام میں اور آزادی کے بعد کے دنوں میں جو اخبار اتر پردیش میں برسوں تک اپنی دھاک بنائے رہا وہ اخبار تھا ''قومی آواز'' جسے جواہر لعل نہرو کے قائم کردہ ایسوسی ایٹیڈ جرنلس لمیٹیڈ کے تحت شروع کیا گیا تھا۔ یہ کمپنی ایک مکمل میڈیا ہاؤس تھی جس کے ہندی اخبار ''نوجیون'' اور انگریزی اخبار ''نیشنل ہیرالڈ'' کے تربیت یافتہ صحافی آج بھی ملک کے نامور اخباروں اور میڈیا ہاؤسز میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

لکھنؤ میں ''قومی آواز'' کی اشاعت بند ہونے کے چند مہینوں بعد یہاں سہارا انڈیا پریوار نے ''روزنامہ راشٹریہ سہارا'' کا اجرا کیا۔ یہ اخبار دھیرے دھیرے اتر پردیش کے مختلف اضلاع میں پہنچنے لگا اور قارئین میں اپنی پکڑ بنانے میں کامیاب رہا۔ اسی کے چند روز بعد اردو نامہ ''آگ'' بازار میں لانچ ہوا۔ سہارا اردو کی اشاعت شروع ہونے سے قبل کے دنوں میں مشہور صحافی جمیل مہدی کی ادارت میں ''عزائم'' بھی کئی برسوں تک کامیابی کے ساتھ نکلتا رہا۔

اتر پردیش کے صحافتی افق پر 2011 میں ممبئی کے روزنامہ ''انقلاب'' نے دستک دی۔ اس اخبار کو جاگرن گروپ نے مڈ ڈے انفومیڈیا لمیٹیڈ سے ٹیک اوور کر کے اتر پردیش میں لانچ کیا۔ اس اخبار کے اس وقت کئی ایڈیشن مغربی اور مشرقی اتر پردیش کے مختلف شہروں سے نکل رہے ہیں۔ غور کرنے والی بات یہ ہے کہ اردو روزنامہ راشٹریہ سہارا اور انقلاب دونوں کارپوریٹ میڈیا ہاؤس کے اخبارات ہیں۔ ان دونوں کے پیچھے مقصد تھا منافع کا حصول اور لینگویج میڈیا کے شعبے میں اپنی طاقت بڑھانا۔ دونوں میڈیا گروپ کے لیے اپنے پہلے سے موجود ہندی کے اخبارات کی وجہ سے مارکیٹ میں رسائی حاصل کرنا آسان تھا۔

یہ بھی ایک سچائی ہے کہ اردو زبان کی طرف سے حکومت کی بے اعتنائی اور اردو والوں

کی عدم دلچسپی کی وجہ سے اس صوبے میں اردو قارئین کی تعداد میں کمی واقع ہوئی ہے جس کی وجہ سے اردو اخبارات کے لیے کارپوریٹ کمپنیوں کے اشتہارات حاصل کرنا ایک مشکل عمل ہے۔ اس کے باوجود دونوں اخبارات نے کارپوریٹ اداروں کے اشتہارات حاصل کرنے کے لیے پوری محنت کی اور اپنے نیٹ ورک کا استعمال کر کے منافع حاصل کرنے میں وہ کامیاب رہے۔ عموماً یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ سیاسی منفعت اور سرکاری اشتہارات کا لالچ نہ ہو تو اردو اخبارات ایک دن بھی نہ چل سکیں گے، خاص طور سے کارپوریٹ اخبارات جیسے راشٹریہ سہارا اور انقلاب۔ ان اخبارات کو بغیر کسی منافع کے چلانا ان کارپوریٹ میڈیا ہاؤسز کے لیے ممکن بھی نہیں ہے۔ اخبار نکالنا ان کے لیے منافع کا سودا ہے۔ اس میں کاروباری، مالی اور سیاسی ساری منفعتیں شامل ہے۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا یوپی کے تین بڑے شہروں لکھنؤ، گورکھپور اور کانپور سے شائع ہوتا ہے، جبکہ اس کے دہلی ایڈیشن کی کاپیاں مغربی یوپی کے اکثر اضلاع تک پہنچائی جاتی ہیں۔ لیکن حالیہ دنوں میں کمپنی کی مالی حالت میں خرابی اور ذمہ دار صحافیوں کی کنارہ کشی اس اخبار کے لیے نیک شگون نہیں قرار دی جاسکتی۔ اسی طرح پانچ برس قبل ہندی کے مضبوط ترین میڈیا گروپ دینک جاگرن نے انقلاب ممبئی کے حقوق خرید لیے تھے اور اسے شمالی ہند بالخصوص یوپی کے تقریباً ان تمام شہروں سے جاری کرنے کا فیصلہ کیا تھا جہاں جہاں سے ہندی اخبار دینک جاگرن کی اشاعت ہوتی ہے۔ انقلاب آج یوپی کے لکھنؤ، علی گڑھ، آگرہ، میرٹھ مرادآباد، بریلی، کانپور گورکھپور، وارانسی اور الٰہ آباد وغیرہ شہروں سے شائع ہو کر اتر پردیش کے کونے کونے تک پہنچ رہا ہے۔ تاہم یہ بھی سچ ہے کہ ان ایڈیشنوں کی مکمل تیاری لکھنؤ و نوئیڈا کے دفاتر میں ہوتی ہے۔ کم اسٹاف اور کم خرچ میں اردو کے ایک اخبار کے اتنے ایڈیشنوں کی اشاعت کسی میڈیا ہاؤس نے آج تک نہیں کی تھی۔ دوسری طرف ہندی دینک جاگرن میں صورت حال مختلف ہے، وہاں ہر ایک ایڈیشن میں پورے ادارتی عملے کے علاوہ ایک ایک ضلع میں کئی کئی نمائندے ہیں۔ اس کی وجہ صاف ہے کہ اردو اخبار سے آمدنی ہندی کے مقابلے بے حد کم ہے۔

انقلاب کے اس تجربہ کا ایک مثبت پہلو ٹکنالوجی کا استعمال ہے، جبکہ اردو اخبارات عموماً ٹکنالوجی کے استعمال میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ فی الحال انقلاب اور روزنامہ راشٹریہ سہارا کو چھوڑ کر

سارے اردو اخبارات و رسائل مالی اعتبار سے کمزور، ٹکنالوجی اپگریڈیشن میں پیچھے اور کسی قسم کی اختراع سے بے حد دور نظر آتے ہیں۔

سرکاری ریکارڈ میں ان میں سے ہر ایک اخبار کی سرکولیشن ہزاروں میں دکھائی جاتی ہے، مگر اندرونی حالات کی خبر رکھنے والے بتاتے ہیں کہ یوپی سے شائع ہونے والے، روزانہ شائع ہونے والے اخبارات کی مجموعی سرکولیشن ڈھائی لاکھ سے زیادہ نہیں ہوگی۔ بعض افراد یہ دلیل دیتے ہیں کہ آزادی سے پہلے بھی اخبارات کا سرکولیشن کچھ زیادہ نہیں ہوتا تھا، جبکہ آج ٹیلی ویژن اور سوشل میڈیا کی وسعت کے باوجود ان اخبارات کی مجموعی سرکولیشن پہلے سے زیادہ ہے۔ اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ دور حاضر میں تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی اور تعلیم یافتہ افراد کی کثرت کے مقابلہ یہ سرکولیشن کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن اس کا ایک مثبت پہلو یہ بھی ہے کہ یوپی میں تعلیم اور ذریعۂ معاش کی قلت اور قصباتی کلچر حاوی ہونے کی وجہ سے اخبار کی ایک کاپی اور ریڈیو کے ایک سیٹ سے پانچ پانچ دس دس افراد مستفید ہوتے ہیں۔ اس کا ایک اور مثبت پہلو ان اخبارات کے انٹرنیٹ ایڈیشن ہیں جن کا قاری صوبہ چھوڑیے، ملک اور بیرون ملک تک پھیلا ہوا ہے۔

اس سارے منظرنامہ کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اتر پردیش جس نے سرسید، مولانا محمد علی جوہر، حسرت موہانی، دیانارائن نگم، نیاز فتح پوری، سید سلیمان ندوی، قاضی عبد الغفار، عبدالماجد دریابادی، عبدالرزاق ملیح آبادی، شوکت تھانوی، عبدالحمید انصاری، حیات اللہ انصاری، سجاد ظہیر، محمد عثمان فارقلیط، عشرت علی صدیقی، پروانہ ردولوی جیسے صحافی پیدا کیے، آج قحط الرجال کا شکار ہے لیکن غور کرنے کی بات یہ بھی ہے کہ ایک طرف حکومتوں کی بے اعتنائی اور دوسری طرف اردو صحافی تیار کرنے والے ادارے بھی نہیں ہیں۔ پہلے صحافیوں کی تربیت انٹرن شپ سے ہوا کرتی تھی۔ قومی آواز اس کی ایک مثال ہے جہاں سینئر صحافیوں کی نگرانی میں اخبار میں نئے جوائن کرنے والے عملے کی تربیت ہوتی تھی۔ پھر جدید دور میں صحافت کی ٹریننگ دینے والے ادارے قائم ہوئے اور وہاں سے نوجوان لڑکے لڑکیاں تیار ہو کر نکلنے لگے۔ قومی آواز کے بند ہونے کے بعد انٹرن شپ کا سلسلہ بند ہو گیا لیکن اس کے متبادل کے طور پر اردو صحافیوں کو ٹریننگ دینے والے ادارے وجود میں نہیں آ سکے۔

اتر پردیش میں اردو صحافت

محمد وصی اللہ حسینی

اتر پردیش کو جس طرح سیاسی اور مذہبی اعتبار سے اہمیت حاصل ہے اسی طرح ادبی اور صحافتی اعتبار سے بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جتنے قدآور ادبا اور شعرا اس سرزمین پر پیدا ہوئے اس کی مثال دوسری ریاست میں ملنا مشکل ہے۔ یہی حال صحافت کا بھی ہے۔ اس ریاست سے ایسے ایسے اخبارات ورسائل جاری ہوئے اور ان میں یہاں کے صحافیوں نے اپنے قلم کے ایسے جوہر دکھائے جس سے ملک کی تقدیر بدل گئی۔

اتر پردیش سے اردو کا پہلا اخبار کون سا شائع ہوا اس پر اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ ابھی بھی حتمی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ ریاست کا پہلا اردو اخبار کون سا ہے کیونکہ یہ المیہ ہے کہ اردو صحافت کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دینے کے باوجود اتر پردیش کی اردو صحافت کی تاریخ سائنسی اعتبار سے ہنوز مرتب نہیں کی گئی ہے جبکہ بعض ایسی ریاستوں کی تاریخ صحافت پر کتابیں منظر عام پر آگئی ہیں جن کی خدمات اتر پردیش سے نسبتاً کم ہیں۔ موقر ماہنامہ 'آجکل' نئی دہلی کے اردو صحافت پر دو خصوصی شمارے نظر سے گزرے۔ دونوں میں مختلف ریاستوں کی اردو

صحافت پر سیر حاصل مضامین ہیں لیکن فہرست مضامین سے اتر پردیش غائب ہے۔ اتر پردیش کی اردو صحافت پر تحقیقی کام کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اب تک دستیاب معلومات کی بنیاد پر خیال کیا جاتا ہے کہ اتر پردیش کا پہلا اردو اخبار 'خیر خواہ ہند' ہے جسے مرزا پور سے ایک پادری نے جاری کیا۔ اس سلسلے میں احمد ابراہیم علوی لکھتے ہیں:

> ''اتر پردیش کا اردو کا سب سے پہلا رسالہ 'خیر خواہ ہند' تھا۔ بعض لوگوں نے اسے ہفتہ وار بتایا ہے، جو 1837 میں مرزا پور سے شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کے ایڈیٹر ایک عیسائی تھے جو کہ پادری تھے۔ انھوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے ہی اس کا اجرا کیا تھا۔ ان کا نام پادری آرسی ماتھر بتایا گیا ہے۔ خیر خواہ ہند میں خبریں نہیں بلکہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ یہ رسالہ یقینی طور سے 1857 تک جاری رہا کیوں کہ ایسی مستند اطلاعات ہیں کہ 1857 کی پہلی جدوجہد آزادی کے دوران اس کو تہس نہس کر دیا گیا۔''

اگر چہ اردو کا پہلا اخبار رسالہ مرزا پور سے جاری ہوا لیکن اتر پردیش میں اردو صحافت کے بڑے مراکز آگرہ، لکھنؤ، مراد آباد، رامپور، کانپور، اعظم گڑھ، بنارس اور گورکھپور رہے ہیں۔ ان شہروں سے بہت سے مشہور و معتبر اخبارات، رسائل اور جرائد شائع ہوئے۔ لیکن اتر پردیش کے جن اخبار و رسائل کو سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی ان میں 'اودھ اخبار' 'اودھ پنچ' نگار، مدینہ، دلگداز، زمانہ، پنچ، معارف، الندوہ، نیا دور اور کتاب شامل ہیں۔

مذکورہ اخبارات و رسائل نے اردو زبان و ادب اور صحافت کے فروغ میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں کو باشعور بنانے، بیداری پیدا کرنے، لوگوں کی ذہن سازی کرنے، اخلاق و تہذیب اور آداب معاشرت سکھانے میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

اتر پردیش کا دوسرا اخبار آگرہ سے جاری ہوا جس کا نام 'اور نیٹل' تھا۔ اور نیٹل آگرہ سے شائع ہونے والا اردو کا پہلا اخبار ہے۔ اس کا اجرا 1845 میں ہوا۔ اس کے مالک و مدیر لالہ میگھ راج تھے جو مدرسہ آگرہ (آگرہ کالج) میں فارسی کے استاد تھے۔ یہ پندرہ روزہ اخبار تھا۔

پہلے اس کی طباعت مطبع 'زبدۃ الاخبار' میں ہوتی تھی، لیکن بعد میں لالہ میگھ راج نے 'اورینٹل میگزین پریس' کے نام سے اپنا ذاتی مطبع قائم کرلیا۔ اس اخبار کے بارے میں سید اختیار جعفری تحریر کرتے ہیں:

> ''اس اخبار کی زیادہ تفصیلات فراہم نہ ہوسکیں۔ نواب حاجی محمد اشرف، امداد صابری، نادر علی خاں اور محمد عتیق صدیقی تک نے اس کا کوئی خاص ذکر نہیں کیا لیکن آگرہ کی اردو صحافت کے بابا آدم کے طور پر اس کا تذکرہ مفتی انتظام اللہ شہابی نے آگرہ کی ادبی تاریخ صحافت، میں کیا ہے۔''

آگرہ سے دوسرا اردو اخبار 'صدر الاخبار' کے نام سے آگرہ کالج کے ایک انگریز پروفیسر سی فنک نے 1846 میں جاری کیا تھا۔ اس کے بارے میں پروانہ دولوی لکھتے ہیں:

> ''غالباً اردو کا یہ پہلا اخبار تھا جو کمپنی کے حصے فروخت کر کے جاری رکھا گیا تھا۔ پروفیسر سی فنک نے آگرہ کالج سے منسلک دو سو افراد کو 5.5 روپے کے حصے فروخت کیے تھے۔''

صدر الاخبار کے اجرا کے دوسرے سال یعنی 1847 میں اردو کا ایک اور اخبار 'اسعد الاخبار' کے نام سے جاری ہوا تھا۔ یہ ہفتہ وار اخبار تھا اور اس کے مالک منشی قمر الدین تھے۔ اس اخبار میں اودھ کے نواب کے امور سلطنت کی خبروں کو نمایاں طور پر جگہ دی جاتی تھی۔ یہاں سے منشی نول کشور نے 1856 میں 'سفیر آگرہ' نامی اخبار جاری کیا۔ اسی شہر سے 1859 میں ایک ماہنامہ 'تاریخ بغاوت ہند' شائع ہوا۔ اس کے ایڈیٹر مکند لال تھے۔ یہ رسالہ ملک کی آزادی کا علم بردار تھا۔ اس میں مجاہدین آزادی سے متعلق خبریں ہوتی تھیں۔ اس رسالے میں جنگ آزادی کے لیے نانا صاحب کا تاریخی اشتہار شائع ہوا تھا۔ یہ اشتہار نانا صاحب کے حکم سے اردو اور ہندی میں مصطفیٰ خاں کے چھاپے خانے سے طبع ہوا تھا۔ یہاں سے 'آگرہ اخبار' یکم جنوری 1863 میں جاری ہوا۔ یہ اخبار دس روزہ اور آٹھ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کے مالک مولوی خواجہ یوسف علی اور مہتمم خواجہ تجمل حسین تھے۔ اس اخبار نے بھی جنگ آزادی میں ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ اس کی تحریروں میں بڑی بیباکی پائی جاتی تھی۔ دوسرے اخبارات سے بھی اپنی پالیسی کے

مطابق تحریریں نقل کی جاتی تھیں۔ آگرہ سے 'مفید عام' 1869 میں منصۂ شہود پر آیا۔ اس کے مالک منشی احمد خاں صوفی، مہتمم وزیر خاں اور پرنٹر قادر علی خاں تھے۔ یہ پندرہ روزہ اخبار مفید عام پریس آگرہ میں چھپتا تھا۔ اس اخبار میں خبروں کے ساتھ مضامین اور شعرا کے کلام بھی شائع ہوتے تھے۔ تعلیم نسواں اور مدارس نسواں کے سلسلے میں عمدہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ گارساں دتاسی نے اپنے آخری خطبے میں اس اخبار کے حوالے سے یوں اظہار خیال کیا ہے:

> ''یہ جدید اخبار مہینے میں دو دفعہ نکلتا ہے۔ 20 صفحات پر مشتمل ہوتا ہے اور ہر صفحے پر دو کالم ہوتے ہیں۔ اس کی تقطیع چھوٹی فولیو ہے۔ مسٹر کیمپن ناظم تعلیمات صوبہ ہائے شمالی و مغربی نے جو نمبر نمونتاً میرے پاس بھیجا ہے اس اشاعت میں صوبہ ہائے شمالی و مغربی تعلیمی رپورٹ، تعلیم نسواں، کلکتہ یونیورسٹی، میسور اور جے پور کی تعلیمی حالت، مختلف اقسام کی زمینوں کے لحاظ سے ہندوستان کی زرعی پیداوار، قدیم فلاسفرا اور مورخین کی تالیفیں، ناصر الدین سبکتگین اور ان کے بیٹے محمود غزنوی کے حالات، میر، ذوق، گویا اور وزیر کے دیوانوں کے انتخاب اور اسی قسم کے دوسرے موضوعات پر مضامین درج ہیں۔''

آگرہ سے خواجہ یوسف علی نے 1879 میں ماہنامہ مخزن الخواتین جاری کیا۔ 1887 میں دینا ناتھ نگن کی رہنمائی میں ہفتہ وار 'کھتری ہتکاری' شروع ہوا۔ اس شہر سے ماہنامہ 'نقاد' 1913 میں سید نظام الدین شاہ دلگیر کی ادارت میں جاری ہوا۔ اس کے علاوہ اس علمی و ادبی شہر سے کئی دیگر اخبار جیسے مطلع الاخبار، قطب الاخبار، اخبار النوح، نور الابصار اور تیرھویں صدی وغیرہ بھی شائع ہوئے جو عوام میں کافی مقبول رہے۔ 1945 میں اردو صحافت کا جو سفر آگرہ میں شروع ہوا تھا ہنوز جاری ہے۔ سید اختیار جعفری کے مطابق تقریباً پونے دو سو اخبار اس شہر سے جاری ہوئے اور کم از کم 177 اخبارات و رسائل تحریری شکل میں کہیں نہ کہیں موجود ہیں۔

اردو ادب کے دبستانوں میں جس طرح 'دبستان لکھنؤ' کی اپنی اہمیت ہے اسی طرح صحافت کے دبستانوں میں بھی 'دبستان لکھنؤ' کی منفرد شناخت ہے۔ کلکتہ، دہلی، بنگلور، حیدر آباد

اور ممبئی کی طرح لکھنؤ کا اردو صحافت میں ایک ممتاز مقام ہے۔ اس کا ماضی بڑا تابناک رہا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ شہر نگاراں مذکورہ شہروں سے اس معاملے میں ایک قدم آگے رہا ہے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ اودھ اخبار، اودھ پنچ، سچ، رصدق، رصدق جدید، مسلم گزٹ اور ہمدم کو جو ملک گیر شہرت حاصل ہوئی وہ شاید مذکورہ شہروں کے ماضی کے کسی اخبار کو حاصل نہیں ہوئی۔ البتہ لکھنؤ کا حال شاید اتنا تابناک نہیں ہے جتنا حیدرآباد، ممبئی، بنگلور اور کلکتہ کا ہے۔ یہ تلخ حقیقت ہے کہ بعد کے دنوں میں یہ شہر میدان صحافت میں کیت کے اعتبار سے تو شاید سب سے آگے ہے لیکن کیفیت کے اعتبار سے پچھڑتا گیا۔ ایسا کیوں ہے اس کی ایک الگ المناک کہانی ہے جس کا ذکر یہاں مناسب نہیں۔

لکھنؤ سے پہلا اردو اخبار 'لکھنؤ اخبار' کے نام سے 1847 میں منظر عام پر آیا۔ اس کے ایڈیٹر لال جی تھے۔ اس اخبار اور اس کے ایڈیٹر کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ بقول محمد نظام الدین "لال جی اردو اور ہندی کے ماہر تسلیم کیے جاتے تھے۔ انھوں نے اپنے اخبار کے ذریعہ لوگوں کو بیدار کیا۔ اس اخبار میں اصلاحی اور معاشرتی مضامین کے علاوہ سیاسی مضامین چھپتے تھے۔

'لکھنؤ اخبار' کے اجرا کے نو سال بعد اور اودھ کی حکومت کے انتزاع کے محض چند مہینوں کے بعد لکھنؤ سے اردو کے دو اخبار ایک ہی سال میں جاری ہوئے۔ پہلا ہفت روزہ 'طلسم لکھنؤ' اور دوسرا ہفت روزہ 'سحر سامری' تھا۔ 'طلسم لکھنؤ' 15 جولائی 1856 کو جاری ہوا۔ یہ آٹھ صفحات پر مشتمل اخبار تھا اور اس کے ایڈیٹر مولوی محمد یعقوب انصاری فرنگی محلی تھے۔ محمد عتیق صدیقی کے مطابق طلسم لکھنؤ کی ایک مکمل فائل فرنگی محل کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ طلسم لکھنؤ کا ایک نمبر 16 دسمبر 1856 نیشنل آرکائیوز دہلی میں بغاوت کے کاغذات میں بھی موجود ہے۔ اس میں مقامی خبروں کے علاوہ حالات حاضرہ پر بھی تبصرہ ہوتا تھا۔ انگریزی حکومت سے نفرت اس کی تحریروں سے صاف جھلکتی ہے۔ انتزاع سلطنت اودھ اور گوروں کی غلامی کے خلاف تڑپ بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ 'طلسم لکھنؤ' کے سلسلے میں ڈاکٹر معین الدین عقیل رقم طراز ہیں:

"اس ہفتہ وار اخبار میں لکھنؤ اور ہندوستان اور غیر ممالک کی خبریں شائع

ہوتی تھیں۔ جہاں تک لکھنؤ کا تعلق تھا وہاں کی خبریں چشم دید کا درجہ رکھتی تھیں۔ اس اخبار میں اودھ کے خاص و عام پر اور لکھنؤ کی آبادی پر خصوصاً واجد علی شاہ کی معزولی کے جو اثرات مرتب ہو رہے تھے بآسانی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔''

لکھنؤ کا 'سحر سامری' 17 نومبر 1856 کو جاری ہوا۔ اس کے مدیر رگھوبیر پرساد عیاش تھے۔ یہ اخبار اپنے دور کا بہت مشہور اخبار تھا جس میں ہر طرح کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ یہ اخبار اودھ کے آخری نواب واجد علی شاہ کا حامی و ہمدرد تھا اس لیے اس میں سلطنت اودھ کی خبروں کو ترجیح دی جاتی تھی۔ اس نے واجد علی شاہ کی معزولی کی مخالف میں بہت کچھ لکھا۔ لکھنؤ سے اسی سال 1856 میں 'اعجاز لکھنؤ' کے نام سے ایک روزنامہ اخبار منظر عام پر آیا۔ اس کے ایڈیٹر بنی پرشاد تھے۔ اس اخبار میں سیاسی اور اصلاحی مضامین کے علاوہ شعر و شاعری بھی شائع ہوتی۔ اسی دور میں مخزن الاخبار اور تاج الاخبار بھی جاری ہوئے۔

لکھنؤ سے منشی نول کشور نے 26 نومبر 1858 کو 'اودھ اخبار' کی اشاعت شروع کی۔ یہ پہلے ہفت روزہ تھا لیکن اسے 1871 میں پہلے سہ روزہ اور 1874 میں روزنامہ کر دیا گیا۔ اس کے صفحات میں بھی اضافہ کیا گیا۔ اس کی اپنی کوئی سیاسی پالیسی نہیں تھی۔ مواد کے انتخاب میں ایڈیٹر کو پوری آزادی حاصل تھی۔ رواداری اور قومی یکجہتی پر زور تھا۔ اپنے مثبت پہلوؤں کی وجہ سے عوام میں اسے خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ممتاز ادبا شعرا اور دانشوروں و صحافیوں کا قلمی تعاون حاصل رہا۔ اس وقت کی ممتاز علمی شخصیات کو یکے بعد دیگرے اس کا ایڈیٹر بنایا گیا۔ جن ممتاز شخصیات نے اودھ اخبار کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی ان میں منشی غلام احمد تپش، منشی امیر اللہ تسلیم، منشی ہادی علی اشک، منشی فخر الدین فخر، یشو پرشاد، قدر بلگرامی، مولانا عبدالمجید سحر کاکوروی، پنڈت رتن ناتھ سرشار، سید امجد علی اشہری، نسیم دہلوی، عبدالحلیم شرر لکھنوی، مرزا حیرت دہلوی، سید جالب دہلوی، منشی نادر حسین نادر کاکوروی، منشی احمد علی کامل، نوبت رائے نظر، دوارکا پرشاد افق، دیبی پرشاد سحر، بشن نرائن، مرزا احمد عسکری، مرزا یاس یگانہ چنگیزی، پیارے لال شاکر میرٹھی، منشی پریم چند، امید امیٹھوی، فدا حسین، مولانا عبدالباری آسی لکھنوی، شوکت تھانوی، قاضی نصیر الدین احمد،

امین سلونوی اور دین دیال ماتھر قابل ذکر ہیں۔

لیکن جب اس کی سیاسی پالیسی میں تبدیلی ہوئی تو پھر یہ اخبار روبہ زوال ہونے لگا۔ اس کی سیاسی پالیسی میں تبدیلی الحاق اودھ کے مسئلے پر ہوئی۔ اودھ اخبار شروع میں الحاق اودھ کا مخالف تھا۔ لیکن جب 14 اپریل 1877 کو لارڈ لٹن نے لکھنؤ کے رؤسا کے ساتھ سختی برتنا شروع کردی تو اودھ اخبار نے اپنی پالیسی بدل لی اور سرکاری بولی بولنے لگا۔ وہ الحاق اودھ کا حامی بن کر اس کی حمایت میں پروپیگنڈہ کرنے لگا۔ اردو قارئین پر اس پالیسی کا منفی اثر پڑا اور اس کی مقبولیت میں کمی آنے لگی۔ اس کا فائدہ منشی سجاد حسین نے اٹھایا۔ انھوں نے الحاق اودھ کے معاملے پر اودھ اخبار کو ہدف تنقید بناتے ہوئے اپنے اخبار اودھ پنچ میں الحاق اودھ کی مخالفت میں تیز و تند مضامین اور اداریے شائع کیے۔ اردو قارئین اودھ پنچ کو اس کی خصوصیات کی وجہ سے پہلے سے ہی پسند کرتے تھے لیکن الحاق اودھ کا مسئلہ اٹھانے کی وجہ سے قارئین کی اچھی خاصی تعداد اودھ اخبار کو چھوڑ کر اودھ پنچ پڑھنے لگی۔

لکھنؤ سے 1860 میں 'اودھ گزٹ' جاری ہوا۔ اس کے مدیر گنگا پرشاد ورما تھے۔ انھوں نے 1883 میں ایک ہفت روزہ 'ہندوستان' بھی شائع کیا۔ اس میں عوامی مسائل، حالات حاضرہ اور کانگریس کی سیاسی سرگرمیوں کو ترجیح دی جاتی تھی۔ لکھنؤ سے ہی اخبار 'انجمن ہند' 1862 میں منظر عام پر آیا۔

لکھنؤ میں کشمیری پنڈتوں کی ایک سوسائٹی 'مراسلہ کشمیر' کے نام سے تھی۔ پنڈت کشن نرائن مراسلہ کشمیر کے سکریٹری تھے۔ اس سوسائٹی کے تحت 'مراسلہ کشمیر' کے نام سے ایک اخبار بھی 1872 میں منظر عام پر آیا۔ اس کے ایڈیٹر اور منتظم شیو نرائن بہار تھے۔ بہار کے 1874 میں انتقال کے بعد پنڈت بشن نرائن ابر نے مراسلہ کشمیر کی ذمہ داری سنبھالی۔ مراسلہ کشمیر ایک سماجی اخبار تھا جو کشمیری پنڈتوں کی تعلیم و تربیت، روزگار اور ترقی کے لیے کوشاں تھا۔ اس میں زیادہ تر انھیں موضوعات پر تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ 1872 میں لکھنؤ سے 'کائستھ سماچار' کے نام سے پندرہ روزہ لالا گوکل پرشاد کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا۔

اسی طرح پنڈت کشن نرائن نے ستمبر 1875 میں ایک ماہنامہ اردو رسالہ 'مرأۃ الہند' کے

نام سے لکھنؤ سے جاری کیا۔ مشہور محقق اکبر حیدری کشمیری کو اس کے 36 مکمل شمارے (15 ستمبر 1875 سے 15 ستمبر 1878 تک) ایک ضخیم جلد میں دستیاب ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ سہ ماہی 'فکر و تحقیق' نئی دہلی کے جنوری، فروری، مارچ، 2004 کے شمارے میں اس اخبار کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے شمارہ وار اس کے مشمولات پر نظر ڈالتے ہوئے اہم اقتباسات بھی پیش کیے ہیں۔ اس رسالے میں خبریں اور سماجی و ادبی مضامین شائع ہوتے تھے۔ زیادہ تر مضامین پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ہوتے تھے۔ بقول اکبر حیدری "غالباً یہ شمالی ہند کا پہلا ادبی رسالہ ہے۔" اس رسالے کی ضخامت 28 سے 34 صفحات ہوتی تھی۔ یہ رسالہ ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار تھا۔ متنازعہ امور سے گریز کرتا تھا۔ توہین آمیز، حقارت آمیز، طنزیہ، اشتعال انگیز، غیر اخلاقی اور تمسخر و استہزا پر مشتمل تحریریں شائع نہیں کرتا تھا۔ اس میں مضامین کی اشاعت کے لیے باقاعدہ اعلانیہ طور سے اصول و ضوابط مقرر تھے۔

شہر نگاراں سے 'اودھ پنچ' 16 جنوری 1877 کو جاری ہوا۔ یہ اخبار ہفتہ وار اور بارہ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ 'اودھ پنچ' کے مالک و مدیر منشی سجاد حسین کاکوروی تھے۔ 27 اپریل 1877 سے قبل یہ اخبار مطبع کائستھ سماچار میں چھپتا تھا۔ بعد میں ذاتی مطبع شام اودھ گولہ گنج میں قائم ہو گیا تو اس میں چھپنے لگا۔

اودھ پنچ ریاست کا ممتاز اور مقبول اخبار تھا۔ جب یہ اخبار جاری ہوا تو ملکی حالات بہت زیادہ خراب ہو چکے تھے۔ 1857 کے انقلاب کے سبب ہندوستانیوں پر انگریزوں کا ظلم و ستم کافی بڑھ گیا تھا۔ گوروں کے تسلط میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ایسے حالات میں استعماری طاقت کے خلاف سنجیدہ تنقید خطرے سے خالی نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ منشی سجاد حسین نے نیا طریقہ اختیار کیا۔ انھوں نے سیاست کو ظرافت کا لباس پہنا دیا۔ اس طریقۂ کار کا فائدہ یہ تھا کہ طنزیہ و مزاحیہ انداز میں اپنی بات انگریزی حکومت تک پہنچا دیتے تھے اور گرفت بھی نہیں ہو پاتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی مروجہ طریقے سے ہٹ کر بھی کام کرتے تھے۔ جب معاملہ بے حد سنگین ہوتا تھا تو سنجیدہ اداریے اور مضامین بھی شائع کیے جاتے تھے۔ مثلاً الحاق اودھ کے مسئلے پر عوام میں انگریزوں کے خلاف بڑی برہمی پائی جاتی تھی۔ اس وقت کا سب سے مقبول اخبار 'اودھ اخبار' شروع میں الحاق اودھ کا مخالف

تھا لیکن انگریزوں کی سختی کے بعد الحاق کا حامی ہو گیا۔ اس معاملے پر لوگوں میں اودھ اخبار کے خلاف بھی ناراضی پیدا ہونے لگی۔ منشی سجاد حسین نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور الحاق اودھ کے مسئلے پر انگریزوں اور اودھ اخبار دونوں کے خلاف محاذ کھول دیا۔ ان کے اس قدم سے 'اودھ پنچ' کو کافی فائدہ پہنچا اور ان کے اخبار کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔

'اودھ پنچ' کا دامن خوشامد سے پاک رہا۔ وہ ہمیشہ انگریزوں کی مکاری و عیاری کا پردہ چاک اور باشندگان ملک کو بیدار کرتا رہا۔ رواداری، اتحاد، اخوت اور قومی یکجہتی اس کا شعار تھا۔ ہولی اور بسنت کے زمانے میں یہ اخبار سرخ اور زعفرانی رنگ کے کاغذ پر شائع ہوتا تھا۔ اودھ پنچ نے پہلی مرتبہ انگریزی اخباروں کی نقل میں کارٹون چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا جو کافی مقبول ہوا۔ یہ طنزیہ و مزاحیہ اخبار اتنا مقبول ہوا کہ مختلف شہروں سے 'پنچ' کے نام سے اخبار نکلنے لگے۔ جیسے 'سرپنچ' (1877) اور 'بنارس پنچ' (1881) بنارس، میرٹھ پنچ (1881) میرٹھ، کشمیر پنچ (1883) بدایوں، 'کڑا پنچ' (1885) الہ آباد اور 'قنوج پنچ' (1885) قنوج سے جاری ہوئے۔

'رفیق نسواں' لکھنؤ سے 5 مارچ 1884 کو منصۂ شہود پر آیا۔ اس اخبار کے بارے میں امداد صابری لکھتے ہیں:

> ''لکھنؤ سے پندرہ روزہ اردو ہندی میں کلکتہ سے بنگالی اور مدراس سے تامل زبانوں میں 5 مارچ 1884 نکلنا شروع ہوا۔ یہ پرچہ عیسائی مشنریوں کی طرف سے عورتوں کے لیے جاری کیا گیا تھا۔ بارہ صفحات پر نکلتا تھا۔ بانی پادری کریون صاحب تھے۔ غربا کو مفت دیا جاتا تھا اور عام آدمیوں سے ایک پیسہ فی پرچہ لیا جاتا تھا۔''

پاکستان کی ڈاکٹر نسیم آرا نے اس سلسلے میں تحقیق کی ہے۔ ان کو اس اخبار کے دو شمارے انڈیا آفس لندن سے حاصل ہوئے۔ ایک شمارہ 6 اپریل 1885 جبکہ دوسرا شمارہ 30 ستمبر 1887 کا ہے۔ ان شماروں کو دیکھنے کے بعد وہ لکھتی ہیں۔ ''رفیق نسواں پندرہ روزہ اخبار تھا۔ پیر کے دن نکلتا تھا۔ شروع میں آٹھ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ بعد میں بارہ صفحات کر دیے گئے تھے۔ یکم جون 1884 سے بشمبھر ناتھ کی ادارت میں ماہنامہ 'نگم ارمان' جاری ہوا۔

لکھنؤ کے محلّہ نوبستہ کے ایک مشہور علمی وادبی خاندان میں 13 جولائی 1864 کو آنکھیں کھولنے والے ملک الشعرا منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی بنیادی طور پر شاعر تھے لیکن انھوں نے نثر نگاری، تاریخ، ڈراما نگاری، ناول نویسی، تراجم اور صحافت میں بھی اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔ وہ کئی اردو اخباروں کے ایڈیٹر تھے۔ وہ روایت پسند ضرور تھے لیکن نئے تجربے بھی کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے زمانے کی روش سے ہٹ کر 5 اگست 1888 کو اپنی نوعیت کا بالکل منفرد اخبار 'نظم' نکالا۔ 12 صفحات پر مشتمل اس پندرہ روزہ اخبار کی خصوصیت یہ تھی کہ آٹھ صفحات میں پوری خبریں منظوم پیش کی جاتی تھیں جبکہ چار صفحات منثور ہوتے تھے۔ منظوم خبریں فنی اعتبار سے بلند پایہ اور شعری محاسن کی حامل ہوتی تھیں۔ بحر و قافیہ کا التزام کیا جاتا تھا۔ بقول ڈاکٹر کوثر بھٹناگر "صحافت کی تاریخ کا پہلا اور شاید آخری تجربہ ہو۔" 'نظم' اخبار کے صفحہ اول پر افق صاحب کی ایک مثنوی شائع ہوتی تھی جو اخبار کی پالیسی، مقاصد اور اوصاف پر روشنی ڈالتی تھی۔ اس میں سیاسی، سماجی، مذہبی اور جرائم وغیرہ کی خبریں عام فہم اور دلچسپ انداز میں پیش کی جاتی تھیں۔

لکھنؤ سے عبدالحلیم شرر نے 1887 میں رسالہ 'دلگداز' نکالا۔ اس رسالے نے ادب وصحافت کے میدان میں اپنی جداگانہ شناخت بنائی۔ اس کے بعد انھوں نے 1890 میں ہفت روزہ 'مہذب' اور نومبر 1900 میں پردۂ عصمت، جاری کیا۔ پردۂ عصمت میں عورتوں کے مسائل پر تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ ہفت روزہ محشر، پندرہ روزہ اتحاد اور ماہنامہ الفرقان بھی نکالے۔ ان رسائل واخبارات سے سماجی اصلاح کا کام لیا۔

لکھنؤ سے ماہنامہ 'خیرخواہ اطفال' جاری ہوا جس کے ایڈیٹر پادری سمور تھے۔ احمد ابراہیم علوی کے مطابق "یہ رسالہ بچوں میں عیسائی مشن کی تبلیغ کرتا تھا۔ یہ ہندوستان کا بچوں کا پہلا رسالہ تھا"۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں لکھنؤ سے بڑی تعداد میں گلدستے بھی جاری ہوئے۔ جیسے گلدستۂ شعرا لکھنؤ 1859، گلدستۂ شعرا لکھنؤ 1872، گلدستۂ سخن لکھنؤ 1876، ریاض الشعرا لکھنؤ، پیام یار لکھنؤ 1882، رعنا لکھنؤ 1883، فیض سخن 1883، دامن گلچیں 1885، خنجر عشق لکھنؤ 1885، نغمۂ بہار لکھنؤ 1887، پیام عشاق لکھنؤ 1883، مرقع نگار لکھنؤ 1884۔

لکھنؤ کی انجمنوں کی جانب سے بھی اخبارات و رسائل جاری کیے جاتے تھے۔ اخبار انجمن ہند 1882 میں ہفتہ وار کی شکل میں جاری ہوا۔ اس اخبار کی سرپرستی لکھنؤ کے رؤسا کرتے تھے۔ منشی پیارے اس کے پرنٹر تھے۔ انجمن تہذیب لکھنؤ کے تحت یکم اکتوبر 1873 کو ہفتہ وار اخبار و رسالہ 'مرقع تہذیب' جاری ہوا۔

منشی نوبت رائے نظر نے 1897 میں 'خدنگ نظر' نکالا۔ یہ رسالہ آپ نے منشی کھنولال تائب کی تحریک سے جاری کیا تھا۔ خدنگ نظر پیام یار کے بعد لکھنؤ کا سب سے قدیم گلدستہ تھا۔ یہ رسالہ 1904 کے وسط میں مالی مشکلات کے سبب بند کر دیا گیا۔ پھر آپ کی ادارت میں 1910 میں انڈین پریس الہ آباد کا رسالہ 'ادیب' شائع ہوا۔ منشی دیانرائن نگم کے ہفتہ وار 'آزاد' کی ادارت بھی آپ نے سنبھالی۔ 'زمانہ' میں بھی نگم کے معاون رہے۔ 1914 میں لکھنؤ چلے گئے۔ یہاں 'تفریح' کے ایڈیٹر کی کرسی آپ کی منتظر تھی۔ کچھ عرصے بعد مشہور زمانہ اخبار 'اودھ اخبار' کی ادارت کا اعزاز حاصل ہوا۔ 'خادم ہند' سے بھی آپ وابستہ رہے۔

1907 میں ریاض خیرآبادی راجہ صاحب محمودآباد کی گزارش پر گورکھپور سے لکھنؤ منتقل ہو گئے تو 'ریاض الاخبار' لکھنؤ سے بھی شائع ہونے لگا۔

'الندوہ' لکھنؤ ہی نہیں پورے ہندوستان کا ایک موقر رسالہ تھا۔ اس رسالے سے علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالسلام ندوی، اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی جیسی شخصیات وابستہ رہی ہیں۔ الندوہ کا پہلا شمارہ مطبع مفید عام آگرہ میں چھپ کر اگست 1904 میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔ یہ 32 صفحات پر مشتمل تھا۔ الندوہ کے ٹائٹل پیج پر 'علوم اسلامیہ کا احیا، تطبیق معقول و منقول اور علوم قدیمہ و جدیدہ کا موازنہ' برابر لکھا جاتا تھا۔

سرورق پر علامہ شبلی نعمانی اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی دونوں کا نام ایڈیٹر کی حیثیت سے درج ہوتا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ رسالہ شبلی کے خوابوں کی عملی تعبیر تھا اور اصل ادارتی ذمہ داریاں وہی انجام دیتے تھے۔ انھیں کی وجہ سے اس ماہنامے کو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ الندوہ اردو زبان و ادب اور علوم اسلامیہ کا خدمت گار ہونے کے ساتھ ساتھ دارالعلوم ندوۃ العلما کا ترجمان بھی تھا۔ اس کے اجرا کا ایک مقصد طلبہ کی تحریری تربیت بھی تھا۔ علامہ شبلی نے اس کا معیار

اتنا بلند کر دیا تھا کہ اچھے اچھوں کو الندوہ میں مقالہ نگاری کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ لیکن اگر کوئی طالب علم معیاری مقالہ لکھتا تو شبلی اس کو الندوہ میں شائع کرتے اور اس طالب علم کی حوصلہ افزائی بھی کرتے۔ جون 1905 میں الندوہ کے پہلے نائب ایڈیٹر مولانا عبداللہ عمادی مقرر کیے گئے۔ اسی دوران جب شبلی کا لکھنؤ میں مستقل قیام ہو گیا تو رسالہ مفید عام پریس آگرہ کے بجائے آسی مدراسی کے مشہور مطبع اصح المطابع اور دیگر چھاپہ خانوں میں چھپنے لگا۔ اکتوبر 1905 سے مارچ 1906 تک مولانا ابوالکلام الندوہ کے سب ایڈیٹر رہے۔ اس وقت تک ان کی شہرت زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ الندوہ میں علمی مقالات لکھنے کی وجہ سے ان کی شہرت کو پر لگ گئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو 'مولانا ابوالکلام آزاد' الندوہ نے بنایا تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ الندوہ میں لکھنے کی وجہ سے جب ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوا تو ہر جانب سے ان کو پیشکش ملنے لگی۔ چنانچہ وہ 1906 میں مشہور زمانہ اخبار 'وکیل' امرتسر سے وابستہ ہو گئے۔

1906 میں مولانا آزاد کے امرتسر چلے جانے کے بعد علامہ شبلی نے مولانا سلیمان ندوی کو الندوہ کا سب ایڈیٹر بنایا۔ سید صاحب کچھ درمیانی وقفوں کو چھوڑ کر 1912 تک سب ایڈیٹر کے منصب پر فائز رہے۔ علامہ شبلی کی ایڈیٹری اور سید صاحب کی سب ایڈیٹری کا دور اس رسالے کا عہد زریں تھا۔ بقول نعیم صدیقی "اس رسالے کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جس مقالہ نگار کا نام ایک بار بھی الندوہ کے صفحات پر نظر آجاتا وہ قوم کی آنکھوں کا تارہ بن جاتا تھا"۔ درمیانی وقفوں میں عبداللہ عمادی اور مولانا عبدالسلام ندوی سب ایڈیٹر رہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ سید سلیمان ندوی اگرچہ 1906 سے ہی سب ایڈیٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے لیکن رسالے کے سرورق پر باضابطہ نائب ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کا نام پہلی بار مئی 1911 کے شمارے میں آیا۔ ارکان ندوہ سے اختلاف کی وجہ سے شبلی کے مستعفی ہو جانے کے بعد دارالعلوم کے استاذ میر عبدالکریم علوی کو اس کی ذمہ داری تفویض کی گئی۔ اس کے بعد جولائی 1914 سے مولوی اکرام اللہ خاں ندوی نے یہ ذمہ داری سنبھالی۔ 1916 کے آخر میں رسالے کے دور قدیم کا خاتمہ ہو گیا۔

1940 میں علامہ سید سلیمان ندوی نے پھر اس علمی رسالے کو نئی زندگی دی لیکن ناموافق حالات کی وجہ سے رشتۂ حیات منقطع ہو گیا۔ دور جدید میں الندوہ کی ادارتی ذمہ داریاں مولانا سید

ابوالحسن علی ندوی اور مولانا عبدالسلام قدوائی کے سپرد تھیں مگر کافی عرصے تک 'شذرات' خود سید سلیمان ندوی ہی لکھتے رہے۔ ان کے بعد آخر تک مولانا عبدالسلام قدوائی شذرات لکھتے رہے۔

لکھنؤ کا ایک اور ممتاز اور قابل ذکر رسالہ 'الناظر' ہے۔ اسے ظفر الملک علوی ناظر کاکوروی نے 1909 میں جاری کیا تھا۔ یہ پرچہ علمی وادبی حلقوں میں بڑی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ ناظر کاکوروی نے اپنا پریس بھی اسی نام سے قائم کیا تھا۔ الناظر ایک بلند پایہ ادبی ماہنامہ تھا جس میں ملک کے ممتاز ادیبوں کے مقالات شائع ہوا کرتے۔ یہ رسالہ عموماً متنازعہ امور سے گریز کرتا تھا اور سنجیدہ، علمی اور معیاری تحریروں اور تخلیقات کو ترجیح دیتا تھا۔ ظفر الملک غیور، خوددار اور بیباک شخصیت کے مالک تھے۔ حق گوئی ان کا شعار تھا۔ جو بات ناحق سمجھتے تھے اس پر برملا اظہار خیال کرتے تھے خواہ اس طرز عمل سے انھیں نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑتا۔ مرزا جعفر حسین ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''مولانا ظفر الملک اصول پرستی کے بھی شدت کے ساتھ دلدادہ تھے۔ کسی دنیاوی غرض یا مالی منفعت کے لیے اپنے اصولوں کو قربان کرنے کے لیے وہ کبھی آمادہ نہیں ہوئے۔ ایسے مواقع پر وہ خاموش رہنا بھی گناہ سمجھتے تھے اور آواز حق بلند کرنے میں بڑے سے بڑا ذاتی نقصان برداشت کرنے میں بھی ان کو دریغ نہیں ہوتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب نظام حیدرآباد کو خلیفۃ المسلمین کے لقب سے ممتاز فرمایا جارہا تھا۔ مولانا ظفر الملک نظام حیدرآباد کو اس منصب کا اہل نہیں سمجھتے تھے اور ان کے نزدیک اس عزت افزائی میں تملق اور خوشامد کی کارفرمائی تھی۔ لہٰذا ان سے ضبط نہ ہوسکا اور انھوں نے الناظر میں ایک اختلافی نوٹ سپرد قلم کیا۔ حیدرآباد میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ مولانا کے بعض دوستوں نے ان کو متنبہ کیا اور یہ خواہش کی کہ وہ اپنے کسی دوسرے نوٹ میں پہلے بیان کی کچھ وضاحت کرتے ہوئے صفائی پیش فرمادیں۔ مگر انھوں نے اس فرمائش کو ٹھکرادیا، اور اس کے برعکس دوسرا نوٹ پہلے سے زیادہ سخت شائع

کیا۔ جہاں تک مجھے یاد آرہا ہے شیخ ممتاز حسین عثمانی مرحوم نے بھی اپنے ہفتہ وار 'اودھ پنچ' میں اسی موضوع پر اپنے مخصوص طرز کا ایک نوٹ شائع کیا تھا۔ لکھنؤ سے اٹھائی ہوئی اس تحریک کا اثر یہ ہوا کہ الناظر کی اشاعتوں کو نقصان پہنچنے لگا۔ حیدر آبادی خریداروں نے جن کی تعداد بہت کثیر تھی، یکے بعد دیگرے علاحدگی اختیار کرنا شروع کر دی۔ اور ہوتے ہوتے پورے حیدر آباد میں 'الناظر' جانا بند ہو گیا۔ گمان غالب ہے کہ حکومت وقت کی جانب سے حیدر آباد کی ریاست میں الناظر کا داخلہ ممنوع ہو گیا تھا۔ مولانا ناظر الملک نے اپنا یہ نقصان خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا اور اپنی اصول پرستی میں اپنے عقیدے کی برابر ترویج کرتے رہے۔ نہ ان کا قلم رکا اور نہ شدت اختلاف میں کوئی کمی آئی۔ مگر آخر میں انھیں کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی۔

'مسلم گزٹ' لکھنؤ سے جنوری 1912 میں جاری ہوا۔ یہ ہفتہ وار اخبار آٹھ صفحات پر مشتمل تھا۔ ممتاز ادیب و دانشور اور سرسید کے ادبی مشیر وحید الدین سلیم اس کے ایڈیٹر تھے۔ اس اخبار کی تقطیع اتنی بڑی تھی کہ اس کے آٹھ صفحات کا مواد دوسرے اخبارات کے 16 صفحات سے بھی زیادہ ہوتا تھا۔ یہ اخبار دوسرے اخبارات کے مقابلے میں زیادہ آزاد اور بیباک تھا۔ مسلم گزٹ دراصل علامہ شبلی نعمانی کی سرپرستی میں شروع ہوا تھا۔ یہ قوم پرست اخبار تھا اور مسلمانوں کو علاحدگی پسند سیاست چھوڑ کر قومی سیاست اختیار کرنے پر زور دیتا تھا۔ چونکہ وحید الدین سلیم ایک بلند پایہ ادیب اور ماہر لسانیات تھے اس وجہ سے مسلم گزٹ ادبی و لسانی اعتبار سے بھی بڑا وقیع تھا۔ اس اخبار کے بانی و مالک اول سید میر جمال تھے۔ مسلم گزٹ چونکہ آزادی ہند اور قومی یکجہتی کا علمبردار تھا اس وجہ سے اس کی دو بار ضمانتیں لی گئیں۔ سید میر جمال نے دباؤ میں آکر لکھنؤ کے مقامی حکام سے معافی مانگ لی اور لائق و فائق ایڈیٹر وحید الدین سلیم کو علاحدہ کر دیا۔ یہ اخبار درمیان میں پانچ چھ مہینے تک بند رہا۔ بعد میں بغیر جدید ضمانت دیے سید شبیر حسن قتیل نے اس اخبار کو غالباً سید میر جمال کی اجازت سے دوبارہ زندہ کیا۔ قتیل نے بھی جم کر لکھا اور کسی کی رورعایت نہیں کی۔ پھر اخبار سے

دو ہزار کی ضمانت طلب کر لی گئی۔ آخر کار مسلم گزٹ کو بند کر دیا گیا۔

لکھنؤ سے 'ہمدم' یکم اکتوبر 1916 کو روزنامے کی شکل میں نمودار ہوا۔ اس کے ایڈیٹر سید جالب دہلوی تھے۔ یہ اخبار چھ صفحات پر مشتمل تھا اور اس کا سالانہ چندہ بارہ روپے تھا۔ شہر کے بلوچ پورہ واقع فخر المطابع میں طبع ہوتا تھا۔ پروفیسر عابدہ سمیع الدین کے بقول "اس اخبار میں ملکی و غیر ملکی خبروں کے ساتھ مقالات اور نوٹس بھی شائع ہوتے تھے۔ اس کا اجرا ایسے پر آشوب زمانے میں ہوا جبکہ 1916 کی جنگ عظیم کے اثرات تھے۔ ہندوستانی اخبارات کے لیے سخت قانون نافذ تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر ضمانت ضبط کر لی جاتی تھی اور مقدمات دائر ہو جاتے تھے۔ ایسے حالات میں اس اخبار نے اپنی آزادانہ پالیسی کو برقرار رکھا اور اپنے ضمیر کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں لکھا اور نہ ملکی مفاد کو نظر انداز کیا۔"

'صبح امید' لکھنؤ سے اکتوبر 1918 میں جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی تھے۔ یہ رسالہ عموماً 50/56 صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ رسالے کا سرورق بیل بوٹوں کے ہلکے آسمانی رنگ اور سورج کی کرنوں سے سجا بے حد خوبصورت ہے۔ چکبست اس رسالے کو ہندوستان پریس نظیر آباد سے طبع کر کر امین الدولہ پارک سے شائع کیا کرتے تھے۔ یہ رسالہ 'سروینٹس آف انڈیا' کے زیر نگرانی اور پنڈت کشن پرشاد کول کے زیر اہتمام شائع کیا جاتا تھا۔ اس کی قیمت چھ آنے فی شمارہ تھی۔

'اخوت' لکھنؤ سے مارچ 1919 میں روزنامے کی شکل میں وجود میں آیا۔ اس کے ایڈیٹر مولانا فضل الرحمٰن اور مالک نواب ذوالقدر جنگ تھے۔ یہ اخبار چار صفحات پر مشتمل اور سالانہ چندہ بارہ روپے تھا۔ اخبار کی اشاعت سے ایک مہینہ قبل سراوآباد کے ایک اخبار 'رہنما' کے 11 فروری 1919 کے شمارے میں اس کا اشتہار شائع ہوا تھا جس میں اس کی پالیسیوں پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اشتہار کا متن درج ذیل ہے:

> "روزانہ اخوت قومی شیرازہ بندی کے لیے جاری کیا جا رہا ہے، نامور فدایان قوم مستند اہل قلم نے بیڑا اٹھایا ہے کہ اس کو مسلمانوں کا بہترین پرچہ بنا دیں گے۔ مسلمانوں میں فوجی اسپرٹ پیدا کرنا، وہ

مساوات اور اخوت پھیلانا جو ہمارے مذہب کی پاک تعلیم ہے۔ شاہ
دگدا کو ایک پلیٹ فارم پر لانا، قومی جذبات اور خیالات کی سچی ترجمانی
کرنا، ان کو اصول تجارت سکھانا، ممالک اسلامیہ کی خبریں پہنچانا اور تمام
ملکی و سیاسی معاملات پر آزادی سے بحث کرنا اس کا نصب العین ہے۔"

مذکورہ اشتہار میں جو دعویٰ کیا گیا تھا وہ سچ ثابت ہوا۔ اس اخبار نے بڑی بیباکی سے اداریے اور مضامین شائع کرنا شروع کر دیا جو انگریزوں کو سخت ناگوار گزرتا تھا۔ اخبار کی زبان بڑی دلچسپ اور شستہ ہوا کرتی تھی۔ یہ اخبار بڑی آب و تاب کے ساتھ نکل رہا تھا کہ اسی دوران مولانا عبدالباری فرنگی محلی کا ایک مراسلہ انگریزوں کے خلاف شائع ہوا جس کی وجہ سے اخبار سے ایک ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی۔ اسی طرح اخبار نے جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے رولٹ بل کی حمایت میں جلسہ کرنے والے انگریزوں کے خوشامدیوں کے خلاف ایک مضمون شائع کیا۔ جلسے کے مدعیان نے اخبار کے ایڈیٹر و پرنٹر پبلشر کے خلاف ہتک عزت کا مقدمہ دائر کر دیا۔ انگریز حکومت موقع کی تلاش میں تھی۔ چنانچہ اس نے ارکان اخبار کو سزا سنا دی۔ مضمون نگار مولوی فضل الرحمان کو جو غالباً اس وقت 'اخوت' کے ایڈیٹر تھے دس ماہ قید کی سزا دی گئی۔ اخبار کے پرنٹر پبلشر مولوی فخر الدین کو چھ ماہ کی قید کی سزا دی گئی۔ چودھری رحم علی ہاشمی ایڈیٹر اخوت رہا ہوئے۔

سید مقبول حسین وصل بلگرامی نے جنوری 1926 میں 'سرقع' کے نام سے ایک علمی و ادبی ماہنامہ رسالہ لکھنؤ سے جاری کیا تھا۔ وصل بلگرامی شاعر، ادیب اور صحافی تھے۔ سرقع کے لکھنے والوں میں علامہ اقبال، حسرت موہانی، عزیز لکھنوی، صفی لکھنوی، پیارے صاحب رشید، اثر لکھنوی، ریاض خیرآبادی اور جوش ملیح آبادی قابل ذکر ہیں۔ وصل بلگرامی کو علامہ اقبال کی خصوصی سرپرستی حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وصل کی درخواست پر علامہ اقبال نے سرقع کے سرورق کے لیے ایک شعر عنایت کیا تھا جو برابر چھپتا رہا۔

لکھنؤ کا ایک اور مشہور زمانہ رسالہ 'نگار' تھا جس کے مالک و مدیر نیاز فتحپوری تھے۔ یہ رسالہ بڑی پابندی سے نکلتا تھا اور زیادہ تر مضامین خود لکھتے تھے۔ نیاز فتحپوری قادیانی شخصیت کے

حامل تھے۔ ان کے رسالے 'نگار' کا شمار اردو کے اہم رسالوں میں ہوتا تھا۔ کتنے ادبا، شعرا اور دانشوروں کو 'نگار' کی وجہ سے شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ نگار کے سومن نمبر اور غالب نمبر اتنے مقبول ہوئے کہ محکمۂ تعلیم نے انھیں ایم اے کے نصاب میں شامل کر لیا تھا۔

نگار فروری 1922 سے جنوری 1923 تک آگرہ سے شائع ہوتا رہا جبکہ وہ خود بھوپال میں مقیم تھے۔ فروری 1922 سے دسمبر 1925 تک نگار اگرچہ آگرہ پریس میں چھپتا رہا لیکن شائع بھوپال سے ہی ہوا کرتا تھا۔ جنوری 1926 سے 'نگار' وصل بلگرامی کے المطابع پریس میں طبع ہونے لگا۔ جب نیاز 1927 میں بھوپال سے لکھنؤ منتقل ہوئے تو انھوں نے اپنا نگار پریس قائم کیا اور جولائی 1927 سے نگار ان کے اپنے پریس میں لکھنؤ سے چھپ کر شائع ہونے لگا۔ جولائی 1962 تک نگار لکھنؤ سے شائع ہوا۔ نیاز فتحپوری نے لکھنؤ سے پاکستان ہجرت کی تو وہاں سے بھی رسالے کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا۔ اگست 1962 کا شمارہ کراچی سے شائع ہوا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھنؤ سے جنوری 1925 میں ہفتہ وار سچ نکالا۔ یہ اخبار نو سال تک شائع ہوتا رہا اور 1933 میں مولانا کی دیگر علمی سرگرمیوں کی وجہ سے بند ہو گیا۔ یہ اخبار بہت جلد عوام و خواص میں مقبول ہو گیا۔ 'سچ' جمعہ کو شائع ہوتا تھا۔ مولانا دریابادی 'سچی باتیں' کے عنوان سے اداریہ لکھا کرتے تھے جو اپنے حسن انشا، ایجاز بیانی اور معنویت کی وجہ سے کافی مقبول ہوا۔ یہ پرچہ بنیادی طور پر مذہبی تھا لیکن اپنی زبان اور اسلوب کی وجہ سے ادبی حلقوں میں بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ سماجی اصلاح میں اس رسالے کا بڑا کردار رہا ہے۔ ادبی صحافت میں بھی اسے ایک خاص مقام حاصل ہے۔ مذہبی اور مشرقی اقدار کا تحفظ اس کا نصب العین تھا۔ اس اخبار کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ اس میں غیر ملکی انگریزی اخباروں، رسالوں اور مذہبی و علمی کتابوں سے اہم معلومات فراہم کی جاتی تھیں۔ مولانا دریابادی کے مختصر اور بے لاگ تبصرے بھی خاصے کی چیز ہوتے تھے۔ یہ پرچہ بعد میں مئی 1935 میں 'صدق' کے نام سے نکلا۔ صدق ستمبر 1950 تک جاری رہا۔ پھر یہ 'صدق جدید' کے نام سے جاری ہوا اور مولانا کے انتقال 1985 تک جاری رہا۔ ضلع لکھنؤ کے قصبہ کاکوری سے پندرہ روزہ 'کاکوری اخبار' منشی احترام علی علوی کی سرپرستی میں کلیم الدین احمد نے 1930 میں جاری کیا۔ 1947 میں یہ اخبار بند ہو گیا۔

مساوات اور اخوت پھیلانا جو ہمارے مذہب کی پاک تعلیم ہے۔ شاہ
وگدا کو ایک پلیٹ فارم پر لانا، قومی جذبات اور خیالات کی سچی ترجمانی
کرنا، ان کو اصول تجارت سکھانا، ممالک اسلامیہ کی خبریں پہنچانا اور تمام
ملکی و سیاسی معاملات پر آزادی سے بحث کرنا اس کا نصب العین ہے۔''

مذکورہ اشتہار میں جو دعویٰ کیا گیا تھا وہ سچ ثابت ہوا۔ اس اخبار نے بڑی بیباکی سے اداریے اور مضامین شائع کرنا شروع کر دیا جو انگریزوں کو سخت ناگوار گزرتا تھا۔ اخبار کی زبان بڑی دلچسپ اور شستہ ہوا کرتی تھی۔ یہ اخبار بڑی آب و تاب کے ساتھ نکل رہا تھا کہ اسی دوران مولانا عبدالباری فرنگی محلی کا ایک مراسلہ انگریزوں کے خلاف شائع ہوا جس کی وجہ سے اخبار سے ایک ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی۔ اسی طرح اخبار نے جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے رولٹ بل کی حمایت میں جلسہ کرنے والے انگریزوں کے خوشامدیوں کے خلاف ایک مضمون شائع کیا۔ جلسے کے مدعیان نے اخبار کے ایڈیٹر و پرنٹر پبلشر کے خلاف ہتک عزت کا مقدمہ دائر کر دیا۔ انگریز حکومت موقع کی تلاش میں تھی۔ چنانچہ اس نے ارکان اخبار کو سزا سنادی۔ مضمون نگار مولوی فضل الرحمان کو جو غالباً اس وقت 'اخوت' کے ایڈیٹر تھے دس ماہ قید کی سزا دی گئی۔ اخبار کے پرنٹر پبلشر مولوی فخرالدین کو چھ ماہ کی قید کی سزا دی گئی۔ چودھری رحم علی ہاشمی ایڈیٹر اخوت رہا ہوئے۔

سید مقبول حسین وصل بلگرامی نے جنوری 1926 میں 'مرقع' کے نام سے ایک علمی و ادبی ماہنامہ رسالہ لکھنؤ سے جاری کیا تھا۔ وصل بلگرامی شاعر، ادیب اور صحافی تھے۔ مرقع کے لکھنے والوں میں علامہ اقبال، حسرت موہانی، عزیز لکھنوی، صفی لکھنوی، پیارے صاحب رشید، اثر لکھنوی، ریاض خیرآبادی اور جوش ملیح آبادی قابل ذکر ہیں۔ وصل بلگرامی کو علامہ اقبال کی خصوصی سرپرستی حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وصل کی درخواست پر علامہ اقبال نے مرقع کے سرورق کے لیے ایک شعر عنایت کیا تھا جو برابر چھپتا رہا۔

لکھنؤ کا ایک اور مشہور زمانہ رسالہ 'نگار' تھا جس کے مالک و مدیر نیاز فتحپوری تھے۔ یہ رسالہ بڑی پابندی سے نکلتا تھا اور زیادہ تر مضامین خود لکھتے تھے۔ نیاز فتحپوری قاموسی شخصیت کے

حامل تھے۔ ان کے رسالے 'نگار' کا شمار اردو کے اہم رسالوں میں ہوتا تھا۔ کتنے ادبا، شعرا اور دانشوروں کو 'نگار' کی وجہ سے شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ نگار کے مومن نمبر اور غالب نمبر اتنے مقبول ہوئے کہ محکمۂ تعلیم نے انھیں ایم اے کے نصاب میں شامل کر لیا تھا۔

نگار فروری 1922 سے جنوری 1923 تک آگرہ سے شائع ہوتا رہا جبکہ وہ خود بھوپال میں مقیم تھے۔ فروری 1922 سے دسمبر 1925 تک نگار اگرچہ آگرہ پریس میں چھپتا رہا لیکن شائع بھوپال سے ہی ہوا کرتا تھا۔ جنوری 1926 سے 'نگار' وصل بلگرامی کے المطابع پریس میں طبع ہونے لگا۔ جب نیاز 1927 میں بھوپال سے لکھنؤ منتقل ہوئے تو انھوں نے اپنا نگار پریس قائم کیا اور جولائی 1927 سے نگار ان کے اپنے پریس میں لکھنؤ سے چھپ کر شائع ہونے لگا۔ جولائی 1962 تک نگار لکھنؤ سے شائع ہوا۔ نیاز فتحپوری نے لکھنؤ سے پاکستان ہجرت کی تو وہاں سے بھی رسالے کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا۔ اگست 1962 کا شمارہ کراچی سے شائع ہوا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھنؤ سے جنوری 1925 میں ہفتہ وار سچ نکالا۔ یہ اخبار نو سال تک شائع ہوتا رہا اور 1933 میں مولانا کی دیگر علمی سرگرمیوں کی وجہ سے بند ہو گیا۔ یہ اخبار بہت جلد عوام و خواص میں مقبول ہو گیا۔ 'سچ' جمعہ کو شائع ہوتا تھا۔ مولانا دریابادی 'سچی باتیں' کے عنوان سے اداریہ لکھا کرتے تھے جو اپنے حسن انشا، ایجاز بیانی اور معنویت کی وجہ سے کافی مقبول ہوا۔ یہ پرچہ بنیادی طور پر مذہبی تھا لیکن اپنی زبان اور اسلوب کی وجہ سے ادبی حلقوں میں بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ سماجی اصلاح میں اس رسالے کا بڑا کردار رہا ہے۔ ادبی صحافت میں بھی اسے ایک خاص مقام حاصل ہے۔ مذہبی اور مشرقی اقدار کا تحفظ اس کا نصب العین تھا۔ اس اخبار کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ اس میں غیر ملکی انگریزی اخباروں، رسالوں اور مذہبی و علمی کتابوں سے اہم معلومات فراہم کی جاتی تھیں۔ مولانا دریابادی کے مختصر اور بے لاگ تبصرے بھی خاصے کی چیز ہوتے تھے۔ یہ پرچہ بعد میں مئی 1935 میں 'صدق' کے نام سے نکلا۔ صدق ستمبر 1950 تک جاری رہا۔ پھر یہ 'صدق جدید' کے نام سے جاری ہوا اور مولانا کے انتقال 1985 تک جاری رہا۔ ضلع لکھنؤ کے قصبہ کاکوری سے پندرہ روزہ 'کاکوری اخبار' منشی احترام علی علوی کی سرپرستی میں کلیم الدین احمد نے 1930 میں جاری کیا۔ 1947 میں یہ اخبار بند ہو گیا۔

دس پندرہ سال بعد سعید احمد علوی نے دوبارہ شروع کیا۔ اب یہ اخبار کراچی سے شائع ہوتا ہے۔ کاکوری سے ماہنامہ 'البدر' بھی شائع ہوتا ہے۔

ہفتہ وار 'ہندوستان' 1937 میں لکھنؤ سے جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر ممتاز ادیب و صحافی حیات اللہ انصاری تھے۔ انصاری صاحب قوم پرست اور گاندھیائی طرز فکر کے حامل تھے۔ ہندوستان نے مسلم لیگ کی تقسیم وطن تحریک کی زبردست مخالفت کی۔ حیات اللہ انصاری ملک کے بٹوارے کو قومی و ملی مفاد کے خلاف سمجھتے تھے۔ ان امور پر انھوں نے کھل کر لکھا۔ 1942 کی 'ہندوستان چھوڑو تحریک' میں شدت آنے اور قید و بند کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد یہ اخبار بند ہو گیا۔ اپنی گرفتاری کے بعد گاندھی جی نے کہا اب اس اخبار کی ضرورت نہیں کیونکہ ہر ہندوستانی آج بذات خود اخبار ہو گیا ہے۔

دسمبر 1945 میں لکھنؤ سے روزنامہ 'قومی آواز' جاری ہوا۔ اس کے بانی پنڈت جواہر لعل نہرو اور ایڈیٹر حیات اللہ انصاری تھے۔ ان کے بعد عشرت علی صدیقی اور عثمان غنی ایڈیٹر ہوئے۔ اردو صحافت کی اصول سازی میں اس اخبار کا بڑا کردار ہے۔ حیات اللہ انصاری نے ممتاز صحافیوں اور ادیبوں کی ایک ٹیم بنالی تھی جس نے اس اخبار کو تاریخ ساز اخبار بنا دیا۔ یہ اخبار آٹھ صفحات پر مشتمل تھا اور غالباً اردو صحافت کی تاریخ میں پہلی بار اسی اخبار نے ضمیمہ نکالنا شروع کیا۔ اس کے دہلی اور پٹنہ ایڈیشن بھی شائع ہوتے تھے۔ آج کل یہ اخبار بند چل رہا ہے۔ آزادی سے عین قبل لکھنؤ سے مسلم لیگ کا ترجمان روزنامہ 'تنویر' جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر چودھری خلیق الزماں تھے۔ حکیم عبدالقوی دریابادی معاون تھے۔ آزادی کے بعد ہفت روزہ 'ندائے ملت' منظر عام پر آیا۔ اس کے ایڈیٹر ڈاکٹر محمد آصف قدوائی اور ڈاکٹر محمد اشتیاق قریشی رہ چکے ہیں۔ یہ نہایت سنجیدہ اخبار تھا اور معاصر حالات پر بڑی گہری نظر رکھتا تھا۔ یہ اخبار ملک بھر میں جاتا تھا اور کثیر الاشاعت ہونے کے باوجود عوامی نہیں تھا۔

تاریخ ساز رسالہ 'نیا دور' لکھنؤ سے اپریل 1955 میں شائع ہونا شروع ہوا اور آج تک جاری ہے۔ یہ ان معدودے چند مجلات میں شامل ہے جن کو طویل عمر ملی۔ اس کے علاوہ معیار کے اعتبار سے بھی اس کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے تقریباً تمام اہم قلم کاروں

کا تعاون اسے حاصل رہا ہے اور آج بھی حاصل ہے۔ خصوصی نمبرات کی وجہ سے علمی و ادبی دنیا میں اس کی منفرد شناخت ہے۔ نیا دور نے مختلف حیثیتوں سے وہ اعلیٰ معیار قائم کر دیا ہے جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

نیا دور کا پہلا شمارہ اپریل 1955 میں شائع ہوا تھا لیکن اس سے پہلے یہ رسالہ 'اطلاعات' کے نام سے نکلتا تھا۔ اطلاعات کا اجرا 1946 میں ہوا تھا۔ اس کے ایڈیٹر علی جواد زیدی تھے۔ اطلاعات سے پہلے یہ رسالہ 'ہماری آواز' کے نام سے شائع ہوتا تھا جس کے ایڈیٹر مشیر احمد علوی ناظر کاکوروی تھے۔ احمد ابراہیم علوی لکھتے ہیں:

> ''نیا دور سے پہلے جو رسالہ نکلتا تھا اس کا نام اطلاعات تھا۔ اور اس سے قبل اس کا نام 'ہماری آواز' تھا۔ اس وقت اتر پردیش صوبہ متحدہ ہوا کرتا تھا اور اس کا صدر مقام الٰہ آباد تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں حکومت کی سرگرمیوں اور جنگی خبروں سے عوام کو باخبر رکھنے کے لیے حکومت نے 'ہماری آواز' کا اجرا کیا تھا۔ اس کے ایڈیٹر ورلڈ وار سکریٹری مشیر احمد علوی ناظر کاکوروی تھے۔ اس وقت یہ جنگ کی خبروں کے علاوہ معلوماتی مضامین پر مشتمل پندرہ روزہ رسالہ تھا اور ٹائپ سے شائع ہوتا تھا۔ یہ ہے نیا دور کی تاریخ جس سے شاید ہی محکمہ اب واقف ہو اور شاید ہی 'ہماری آواز' کی کوئی فائل محکمۂ اطلاعات میں محفوظ ہو۔''

نیا دور کے تقریباً 100 خصوصی نمبر اور خصوصی گوشے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے تعمیری ادب نمبر، غالب نمبر، اثر لکھنوی نمبر، احتشام حسین نمبر، مسعود حسین رضوی ادیب نمبر، امیر خسرو نمبر، عبدالماجد دریابادی نمبر، فراق گورکھپوری نمبر، شکیل بدایونی نمبر، میر تقی میر نمبر، قرۃ العین حیدر نمبر، عرفان صدیقی نمبر، جواہر لعل نہرو نمبر، لال بہادر شاستری نمبر، اندرا گاندھی نمبر، مولانا محمد علی جوہر نمبر، منشی نول کشور نمبر، منشی دیانرائن نگم نمبر، صباح الدین عمر نمبر، بہادر شاہ ظفر نمبر، اودھ نمبر، نصف صدی نمبر، یادرفتگاں نمبر، افسانہ نمبر، اطفال نمبر، آزادی نمبر، جمہوریت نمبر کافی پسند کیے گئے۔ ان میں سے بعض کے ہندی ایڈیشن بھی شائع ہوئے۔

اسی طرح ڈاکٹر ذاکر حسین، علامہ اقبال، آل احمد سرور، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر افغان اللہ خاں، شمیم کرہانی، جمیل مہدی، سلام مچھلی شہری، علی سردار جعفری، پروفیسر محمود الٰہی وغیرہ پر اہم گوشے نکالے گئے جن کو پوری اردو دنیا میں بڑی پذیرائی ملی۔ نیا دور کے ایڈیٹروں میں علی جواد زیدی، صباح الدین عمر، سید خورشید احمد، امیر احمد صدیقی، سید امجد حسین اور شاہ نواز قریشی رہے ہیں۔ آج کل ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی اس کے مدیر ہیں۔

دسمبر 1962 میں ماہنامہ 'کتاب' کی اشاعت کا آغاز لکھنؤ سے ہوا۔ یہ اصلاً ترقی پسندوں کا ترجمان تھا لیکن انتہا پسندی سے گریز کرتا تھا۔ کسی قدر متوازن رسالہ تھا۔ اس کے اصل کرتا دھرتا عابد سہیل تھے لیکن رسالے پر بحیثیت ایڈیٹر ان کے دوست عبدالحلیم خاں کے گھر کی ملازمہ کے بیٹے جمیل احمد کا نام درج ہوا۔ چونکہ عابد سہیل اس وقت انگریزی روزنامہ 'نیشنل ہیرالڈ' لکھنؤ میں سینئر سب ایڈیٹر تھے اس وجہ سے ان کا نام مدیر کی حیثیت سے نہیں دیا گیا۔ بقول عابد سہیل ''جمیل احمد طویل عرصے تک کتاب کے ایڈیٹر رہے لیکن کتاب اور وہ ایک دوسرے کے لیے بس دور کا جلوہ تھے'۔ عابد سہیل اپنا نام مجلس مشاورت میں بالکل آخر میں درج کرتے تھے۔ مجلس مشاورت میں پہلے پروفیسر احتشام حسین اور حیات اللہ انصاری تھے بعد میں قمر رئیس اور سہیل عظیم آبادی کے نام بھی شامل ہوئے۔ کتاب کی اشاعت میں عابد سہیل کے ایک کرم فرما کا بڑا مالی تعاون رہا۔

کتاب کی اصل شہرت اس کے خاص نمبروں کی وجہ سے تھی۔ اس رسالے کے شوکت تھانوی نمبر، علی عباس حسینی نمبر، منتخب افسانہ نمبر، ہندی کہانی نمبر، مراٹھی کہانی نمبر کافی مقبول ہوئے۔ اس نے کثرت سے گوشے بھی شائع کیے۔ مثلاً گوشہ بنگالی ادب، گوشۂ مصطفیٰ زیدی، گوشۂ احتشام حسین، گوشۂ سجاد ظہیر، گوشۂ کرشن چندر اور گوشۂ راجندر سنگھ بیدی کافی پسند کیے گئے۔ سال نامے بھی شائع ہوتے تھے جو کافی ضخیم ہوتے تھے۔ 'کتاب' کو ہندو پاک کے تمام ممتاز ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور دانشوروں کا تعاون حاصل تھا۔ ماہنامہ 'کتاب' نہایت ہی آن بان اور شان سے شائع ہوتا رہا لیکن جدیدیت کے علم بردار رسالے 'شب خون' الٰہ آباد نے اس کی رفتار کو بریک لگا دیا۔ عابد سہیل نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''تین چار سال بعد 'شب خون' کا اجرا ہوا۔ 'کتاب' کو اس سے نقصان کا آغاز اس وقت ہوا جب اس میں جنس سے متعلق ایک ترجمے کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ کتاب کے وی پی پیکٹ واپس آنے لگے۔ خریداری قبول کرنے والوں کی رفتار کم ہوگئی۔ اسی دوران ترقی پسندوں کے دو بڑے اجتماعات ہوئے جن میں 'کتاب' کو زندہ رکھنے کے منصوبے بنائے گئے۔ کمیٹی بنی لیکن کوئی اجتماعی کوشش تو دور کی بات اس سلسلے میں جو لوگ بہت پرجوش تھے ان تک میں سے کسی نے خریداری بھی قبول نہ کی۔ پھر بھی میں نے ہار نہ مانی۔''

عابد سہیل نے اسے جاری رکھنے کی پوری کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے اور بالآخر مالی دشواریوں کے سبب ہار مان کر اسے بند کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ جولائی 1975 میں 'کتاب' کا الوداعی شمارہ شائع ہو کر یہ رسالہ بند ہو گیا۔

1970 کی دہائی میں دارالحکومت لکھنؤ سے روزنامہ 'قائد' نکلا۔ اس کے روح رواں آل انڈیا مسلم مجلس کے بانی صدر ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی تھے۔ اس اخبار کا مقصد قومی آواز کے اثر کو کم کرنا اور مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا تھا۔ یہ اخبار زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکا اور چند برسوں کے اندر بند ہو گیا۔ اس اخبار کے صحافیوں میں جمیل مہدی، محفوظ الرحمٰن اور حکیم عبدالقوی دریابادی قابل ذکر ہیں۔ 1970 میں یوپی کانگریس کمیٹی نے ہفتہ وار 'جدید شاہراہ' جاری کیا۔ اس کے ایڈیٹر ضیا عظیم آبادی ہوا کرتے تھے۔ 1971 میں شاہ نواز قریشی اس کے معاون مدیر مقرر ہوئے۔ پھر یکم اپریل 1975 کو مدیر بنا دیے گئے۔ 1977 کے آخر میں یہ اخبار بند ہو گیا۔

1969 میں جمیل مہدی نے لکھنؤ سے ہفتہ وار 'عزائم' کی اشاعت شروع کی۔ یہ اخبار بہت جلد عوام میں مقبول ہو گیا۔ اس کا شمار ایک رجحان ساز اخبار کے طور پر ہونے لگا۔ اپنی صاف گوئی اور بیباکی کے لیے مشہور تھا۔ ہفتہ وار عزائم کا 'جدوجہد آزادی اور اس کے بعد' نمبر بڑا فکر انگیز اور اہمیت کا حامل ہے۔ تقریباً دس برسوں تک ہفتہ وار نکالنے کے بعد جمیل مہدی نے 1979 میں 'عزائم' کو روزنامہ کر دیا۔ اس روزنامے کو جمیل مہدی نے اپنی افتاد طبع کے مطابق

ایک خاص شکل دی۔ عزائم میں کام کرنے والے صحافیوں میں حفیظ نعمانی، حسام صدیقی، محمد مسعود اور شوکت عمر قابل ذکر ہیں۔ جمیل مہدی کے انتقال کے بعد حسام صدیقی اس اخبار کو نکالنے لگے اور جمیل مہدی کی جگہ حفیظ نعمانی اس کے مدیر بنائے گئے۔ لیکن یہ کوشش زیادہ کامیاب نہیں ہوئی اور اخبار جلد ہی بند ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ جمیل مہدی کے انتقال کے بعد حسام صدیقی اس اخبار کو جاری رکھنا چاہتے تھے لیکن جمیل مہدی کے بھتیجے، جو دہلی یونیورسٹی میں استاذ ہیں، اس اخبار کو جاری رکھنے کے حق میں نہیں تھے جس کی وجہ سے یہ مقبول عام اخبار بند ہو گیا۔

روزنامہ 'آفتاب عالم' لکھنؤ سے 20 جنوری 1987 کو جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر رام لعل اور ایسوسی ایٹ ایڈیٹر احمد ابراہیم علوی تھے۔ آصف برنی بھی اس اخبار سے وابستہ رہے۔ انیس احمد عباسی کے روزنامہ 'حقیقت' اور عبدالرؤف عباسی کے روزنامہ 'حق' کا لکھنؤ کی اردو صحافت میں اہم مقام ہے۔

دہلی سے شائع ہونے والے روزنامہ 'ان دنوں' کا لکھنؤ ایڈیشن 1993 میں شروع ہوا۔ اس کے ایڈیٹر ظہیر مصطفیٰ ہیں۔ اخبار کے ایڈیٹوریل ایڈوائزر حفیظ نعمانی اور احمد ابراہیم علوی رہے ہیں۔ آج کل ایڈیٹوریل ایڈوائزر شاہ نواز قریشی ہیں۔ قومی آواز کے بند ہونے کے بعد یہ اخبار لکھنؤ میں کافی مقبول ہو گیا تھا۔ لکھنؤ سے روزنامہ 'علی الصبح' 25 ستمبر 1998 کو جاری ہوا۔ اس کے مالک حیدر اور ایڈیٹر احمد ابراہیم علوی تھے۔ اس اخبار کی عمر بہت کم رہی اور بہت جلد بند ہو گیا۔ روزنامہ صحافت 1990 کے آس پاس نکلا۔ اس کے مالک و مدیر امان عباس ہیں۔ اس اخبار سے حسن واصف عثمانی اور عرفان صدیقی بطور ایڈیٹوریل ایڈوائزر وابستہ رہے ہیں۔ دیگر وابستگان میں اختر یونس قدوائی، خورشید کامل قدوائی اور شاہ نواز قریشی قابل ذکر ہیں۔

لکھنؤ کی اردو صحافت ایک نئے دور سے اس وقت آشنا ہوئی جب پہلی بار کسی بڑے کارپوریٹ گھرانے نے اردو صحافت پر توجہ دی۔ 5 فروری 1999 کو سہارا انڈیا پریوار نے اردو روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' نکالا۔ اس کے گروپ ایڈیٹر ڈاکٹر عزیز برنی تھے۔ آج کل اس کے گروپ ایڈیٹر سید فیصل علی ہیں۔ اس اخبار نے اردو صحافت میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ شاید یہ ہندوستان کا پہلا اردو اخبار ہے جس کے ایڈیشن ملک کے تمام اہم شہروں سے نکل رہے ہیں۔ اس

کی لکھنؤ ٹیم میں ایڈیٹوریل ایڈوائزر کے علاوہ قطب اللہ، نافع قدوائی، کلام خان، فضل الرحمان، محمد راشد خان، احرار الہدیٰ شمس اور حمایت جائسی وغیرہ رہے ہیں۔

روزنامہ ''آگ'' لکھنؤ سے 23 ستمبر 2006 کو منظر عام پر آیا۔ پہلے یہ اخبار پندرہ روزہ تھا۔ اور یکم اکتوبر 1961 کو جاری ہوا تھا۔ اس کے مالک و مدیر احمد ابراہیم علوی تھے۔ موجودہ وقت میں یہ روزنامہ 'ٹرو میڈیا انڈین کمیونی کیشن لمیٹڈ' کے زیر اہتمام شائع ہو رہا ہے۔ اس کے پرنٹر محسن علی خاں، پبلشر میثم علی خاں اور ایڈیٹر احمد ابراہیم علوی ہیں۔ اس اخبار سے راقم (محمد وصی اللہ حسینی) بطور نیوز ایڈیٹر وابستہ ہے۔ اس اخبار کے کانپور، فیض آباد، اعظم گڑھ اور گورکھپور ایڈیشن بھی شائع ہوتے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' کا لکھنؤ ایڈیشن، 27 مئی 2011 کو جاری ہوا۔ کانپور ایڈیشن 9 جون 2011 کو منظر عام پر آیا۔ اتر پردیش کے دیگر شہروں سے بھی اس کے ایڈیشن شائع ہوتے ہیں۔ اس وقت لکھنؤ اور کانپور کے علاوہ گورکھپور، الہ آباد، بنارس، علی گڑھ، آگرہ، میرٹھ اور بریلی سے بھی شائع ہوتا ہے۔ اس کے نارتھ ایسٹ ایڈیٹر شکیل حسن شمسی ہیں۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' لکھنؤ سے یکم جولائی 2001 کو جاری ہوا۔ شاہ نواز قریشی، خورشید کامل قدوائی، مصطفیٰ زیدی اور عالم نقوی وغیرہ اس سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ آج کل فیاض رفعت اور عبید اللہ ناصر اس سے وابستہ ہیں۔ اس کے مالک وقار احمد ہیں۔ لکھنؤ کا روزنامہ 'جدید عمل' بھی بازار میں نظر آتا ہے۔ یہ اخبار کئی بار بند ہوا اور پھر جاری ہوا۔ آج کل پابندی سے نکل رہا ہے۔ اس کے مالک سچدانند گپتا اور ایڈیٹر ڈولی گپتا ہیں۔ ایڈیٹوریل انچارج کی حیثیت سے حفیظ نعمانی، عبید اللہ ناصر، محمد وصی اللہ حسینی وابستہ رہے ہیں۔ آج کل ایڈیٹوریل انچارج محمد ارمان اور ان کے معاونین ضرغام الدین اور ڈاکٹر محمد نسیم الدین ندوی ہیں۔ روزنامہ 'وارث اودھ' بھی لکھنؤ سے نکل رہا ہے۔ اس کے بنارس، بارہ بنکی اور فیض آباد ایڈیشن بھی شائع ہوتے ہیں۔ اس کے اصل کرتا دھرتا محمد اسحاق اور ایڈیٹر آصف برنی ہیں مذکورہ اخبارات کے علاوہ دیگر سیکڑوں اخبار لکھنؤ سے شائع ہو رہے ہیں۔

لکھنؤ سے بہت سے دیگر رسائل بھی منظر عام پر آئے۔ ماہنامہ 'الفرقان' مولانا

منظور احمد نعمانی کی ادارت میں 1948 میں نکلا۔ یہ رسالہ آج بھی پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ ماہنامہ 'فروغ ادب' ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کی ادارت میں 1954 میں جاری ہوا۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر سعادت علی صدیقی، شفاعت علی صدیقی اور عرفان صدیقی نے بھی اس کے ادارتی فرائض انجام دیے۔ خصوصی نمبرات نکالنے میں اسے امتیاز حاصل رہا ہے۔ آج کل یہ رسالہ بند چل رہا ہے۔ ماہنامہ 'نکہات' 1974 میں جاری ہوا۔ اس کے مدیر مولانا عبدالسمیع ندوی تھے۔ یہ رسالہ جمعیۃ مرکز یہ تبلیغ الاسلام کانپور کا ترجمان تھا۔ پانچ چھ ماہ تک یہ رسالہ کانپور سے شائع ہوتا رہا۔ پھر کچھ دشواریوں کے سبب اس کو لکھنؤ منتقل کر دیا گیا۔ مولانا عبدالسمیع ندوی کی وفات تک یہ رسالہ لکھنؤ سے نکلتا رہا۔ بعد میں مالیات کی عدم فراہمی کے سبب بند ہو گیا۔ ماہنامہ 'رنگ و بو' 1969 میں جاری ہوا۔ اس کے مدیر علی سجاد ناصر تھے۔ ماہنامہ 'رضوان' 1956 میں جاری ہوا اور ہنوز جاری ہے۔ اس کے مدیر مولانا محمد حمزہ حسنی ندوی ہیں۔ اس رسالے کے اجرا کا مقصد خواتین میں تعلیمی و دینی بیداری پیدا کرنا ہے۔ ماہنامہ 'ثانی' 1961 میں جاری ہوا۔ اس کے مدیر سید محمد علی جعفری تھے۔ ماہنامہ 'صبح ادب' 1975 میں نکلا۔ اس کے مدیر ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی تھے۔ اتر پردیش اردو اکادمی کی جانب سے ماہنامہ 'خبر نامہ' 1972 اور دو ماہی 'اکادمی' 1981 میں جاری ہوا۔ یہ دونوں رسالے ہنوز شائع ہو رہے ہیں۔ ماہنامہ 'رہنمائے برادر' جون 1979 میں منظر عام پر آیا۔ اس کے مدیر سلیم عمر تھے۔ ماہنامہ 'معلم اردو' 1981 میں نکلا۔ اس کے مدیر اظہار احمد تھے۔ ماہنامہ 'بانگ درا' جنوری 1992 میں جاری ہوا اور 2001 تک جاری رہا۔ اس کے مدیران محمد عرفان ندوی، کمال اختر ندوی اور امین الدین شجاع الدین رہ چکے تھے۔ 2002 میں تکنیکی وجوہ سے اس کا نام 'بانگ حرا' کر دیا گیا۔ اس کے مدیر مولانا علاء الدین ندوی اور معاون مدیر مولانا عبدالرشید ندوی ہیں۔ یہ علمی و دینی رسالہ آج بھی اپنی آب و تاب سے نکل رہا ہے۔ سہ ماہی 'بنجارہ' 1974 میں نکلا۔ اس کے مدیر شہنشاہ مرزا تھے۔ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کی ادارت میں ماہنامہ 'امکان' نومبر 2000 میں نکلا۔ ڈاکٹر شاہدہ صدیقی نے جنوری 2001 میں مصور ادبی ماہنامہ 'سب رنگ نو' جاری کیا۔ ماہنامہ 'زاویہ' فروری 2008 میں جاری ہوا۔ اس کی مالک و ایڈیٹر فرح ناز تھیں۔ ایڈیٹوریل ایڈوائزر محمد طارق خاں، مینجنگ ایڈیٹر آصف ریاض اور چیف ایڈیٹر (اعزازی) ڈاکٹر

عامر ریاض تھے۔ اس کا پہلا شمارہ مجاز کی شخصیت اور شاعری پر تھا۔ ماہنامہ 'ایوان ثاقب' جنوری 2008 میں جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر ظاہر قزلباش جبکہ چیف ایڈیٹر شاہ نواز قریشی تھے۔ مشاورتی بورڈ میں بشیشر پردیپ، عشرت ظفر، فیاض رفعت، عائشہ صدیقی، احسن رضوی اور شمیم رضوی رہ چکے ہیں۔

دوماہی 'گلبن' لکھنؤ سے جنوری 2003 سے جاری ہوا۔ اس سے قبل یہ گجرات کے شہر احمد آباد سے شائع ہوتا تھا۔ اس کا اجرا 1977 میں ہوا۔ یہ پہلی اشاعت سے دسمبر 1987 تک ماہنامہ رہا۔ جنوری 1988 سے تا حال دوماہی نکل رہا ہے۔ یہ دسمبر 2002 تک احمد آباد سے نکلتا رہا لیکن جنوری 2003 سے لکھنؤ سے شائع ہو رہا ہے اور ہنوز جاری ہے۔ یہ علمی، فکری اور ادبی پرچہ ہے۔ لکھنؤ میں اس کی شہرت کم ہے لیکن باہر بہت مقبول ہے۔ یہ حقیقی معنوں میں ایک بین الاقوامی رسالہ ہے۔ اس کے مضامین، افسانوں اور خصوصاً اداریوں کی دھمک دور دور تک سنائی دیتی ہے۔ اس کی ایڈیٹر ثریا ظفر اور مینجنگ ایڈیٹر سید ظفر ہاشمی ہیں۔ شہر لکھنؤ سے ماہنامہ 'اصلاح' بھی شائع ہو رہا ہے۔ یہ ماہنامہ جنوری 1898 سے بہار کے ضلع سیوان کے قصبہ کھجوہ سے جاری ہوا۔ ابتدا سے جنوری 1982 تک کھجوہ سے نکلتا رہا۔ 1982 سے لکھنؤ سے نکل رہا ہے۔ اس کی اشاعت کے سو سال سے زائد ہو چکے ہیں۔ اس رسالے نے جنوری تا مارچ 1999 کے ضخیم شمارے کو 'صدی نمبر' کے طور پر شائع کیا ہے۔ سہ ماہی 'الواعظ' لکھنؤ سے دسمبر 1921 میں جاری ہوا۔ یہ رسالہ آج بھی بڑی آب و تاب کے ساتھ نکل رہا ہے۔ اس کے مدیر نثار احمد واعظ زین پوری ہیں۔ یہ رسالہ بھی صدی کی دہلیز پر کھڑا ہے۔ حسام الاسلام صدیقی نے 21 جنوری کو ہفت روزہ 'جدید مرکز' جاری کیا۔ اسی نام سے یہ اخبار دیوناگری میں بھی شائع ہوتا ہے۔

مذکورہ اخبارات و رسائل کے علاوہ شہر نگاراں سے روزنامہ 'قومی خبریں' روزنامہ عوامی سالار، روزنامہ جائزہ، ہجوم، ماہنامہ 'حریم' ماہنامہ 'کلیاں' نئی نسلیں، گیلری، سہ ماہی سنگتی لکیریں، سہ ماہی کاروان ادب، پندرہ روزہ تعمیر حیات، ماہنامہ لاریب، المصطفیٰ، اودھ کی پکار، ماہنامہ الثاقب، سہیل یمن، النجم، سرفراز، نظارہ، ماہنامہ مدینۃ العلم، ماہنامہ النفس، ہفت روزہ توحید میل، سہ ماہی مصباح الہدیٰ، ہفت روزہ نوروز، ماہنامہ شعاع عمل، خیاباں اور اسدو غیرہ بھی جاری ہوئے۔

گورکھپور بھی قدیم زمانے سے علم وادب کا شہر رہا ہے۔ یہاں سے بھی کثیر تعداد میں اردو اخبارات اور رسائل وجرائد شائع ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ گورکھپور سے پہلا اردو اخبار 'ریاض الاخبار' جاری ہوا جسے ریاض خیرآبادی نے 1881 میں نکالا۔ یہ ہفتہ وار اخبار تھا اور بارہ صفحات پر مشتمل تھا۔ یہ اخبار انھوں نے خیرآباد سے 1872 میں نکالا تھا لیکن جب وہ گورکھپور منتقل ہو گئے تو یہاں سے بھی اس کی اشاعت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس میں مقامی خبروں کے علاوہ غیر ممالک کی بھی خبریں ہوتی تھیں۔ اخبار کے آخری صفحے پر درج ہوتا تھا۔ 'مطبع ریاض الاخبار گورکھپور مملوکہ حافظ نظام الدین احمد باہتمام سیتلا بخش کارپرداز کے چھپ کر شائع ہوا'۔ ریاض خیرآبادی ہی نے گورکھپور سے ایک دوسرا اخبار فتنہ 8 جولائی 1882 کو جاری کیا۔ یہ ہفتہ وار 16 اوراق پر مشتمل اور سالانہ چندہ ڈیڑھ روپیہ تھا۔ فتنہ کے مہتمم حافظ نظام احمد انداز خیرآبادی تھے۔ یہ اخبار عوام میں بہت مقبول ہوا۔ یکم جنوری 1885 میں اس میں 16 صفحات کا مزید اضافہ کر دیا گیا۔ اب فتنہ اور عطر فتنہ شائع ہونے لگا۔ فتنہ میں نثری مضامین اور عطر فتنہ میں نظمیں، غزلیں اور رسائل سے ماخوذ مواد شائع کیا جاتا تھا۔ 1898 کے بعد یہ اخبار حکیم برہم کے سپرد ہو گیا۔ اب اخبار کی پشت پر 'حکیم برہم پروپرائٹر، پبلشر اور ایڈیٹر' درج ہونے لگا۔ حکیم برہم نے اس کو 1912 تک شائع کیا پھر اس کو بند کر کے 'رجسٹریشن ریویو' نکالا۔

گورکھپور کے مولوی احسان اللہ عباسی، حبیب اللہ بیرسٹر اور مولوی سبحان اللہ وغیرہ نے ایک کمپنی قائم کر کے اس کے تحت 1895 میں روزنامہ 'صلح کل' جاری کیا۔ اس کے ذمہ دار ریاض خیرآبادی بنائے گئے۔ حکیم برہم اخبار کے خاص رکن تھے۔ جالب دہلوی کو بھی بلایا گیا۔ اس میں ملکی وغیر ملکی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ 1903 میں اخبار کے مالک مولوی سبحان اللہ ہو گئے اور حکیم برہم مدیر مقرر ہوئے۔ مولوی عبداللطیف خاں نے 1886 میں ہفتہ وار اخبار 'لطیف اخبار' نکالا۔ خواجہ محی الدین لکھنوی اس کے مدیر تھے۔ اس میں خبروں کے ساتھ ادبی مواد بھی ہوتا تھا۔ لطیف اخبار کے دفتر سے 1887 میں ہفتہ وار 'پیکر' شائع ہوتا تھا۔ یہ 16 رصفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کے بھی مہتمم مولوی عبداللطیف خاں اور ایڈیٹر خواجہ محی الدین لکھنوی تھے۔

گورکھپور سے ماہنامہ 'کلچیں' 1903 میں شائع ہوا۔ یہ ماہنامہ پہلے 1891 میں لکھنؤ سے

جاری ہوا۔ اس کے مہتمم سید محمد عسکری وسیم خیر آبادی تھے۔ ریاض الاخبار پریس سے شائع ہوتا تھا۔ اگست 1905 سے گلچیں دوبارہ لکھنؤ سے شائع ہونے لگا۔ اسی شہر سے ہفتہ وار 'الوقت' دسمبر 1892 میں جاری ہوا۔ سیتلا بخش شائق لکھنوی اس کے مہتمم اور محمد سعید زار اس کے ایڈیٹر تھے۔ اس میں قومی اور بین الاقوامی خبریں چھپتی تھیں۔ ادبیات پر خاص زور دیا جاتا تھا۔ یہیں سے اخبار مشرق 1906 میں جاری ہوا۔ اس کے مالک و مدیر حکیم برہم تھے۔ 1928 میں حکیم برہم کے انتقال کے بعد ان کی بیٹی مشرق کی مالک ہوگئیں۔ مدیر محمد قربان وارث مقرر ہوئے۔ 8 مارچ 1954 کو ڈاکٹر عاصم واحدی نے قربان وارث سے اخبار کے جملہ حقوق حاصل کر لیے اور وہی پروپرائٹر، پرنٹر، پبلشر اور مدیر ہوئے۔ گورکھپور سے 'لسان العصر' مارچ 1910 میں شائع ہوا۔ اس کی زندگی بہت مختصر رہی۔ جولائی 1910 میں بند ہوگیا۔ اس کے ایڈیٹر قاضی تلمذ حسین تھے۔ یہ بہت اعلیٰ معیار کا اخبار تھا۔ وحید اللہ عباسی نے 1920 کے آس پاس 'التحقیق' جاری کیا۔ عباسی صاحب اس کے مدیر اعلیٰ اور شاہ نذیر ہاشمی اس کے مدیر تھے۔ مولوی سبحان اللہ، فاروق دیوانہ اور سید کامل وغیرہ نے 22-1921 میں ہفتہ وار 'بیداری' جاری کیا۔ یہ تحریک آزادی کا علمبردار تھا۔ بیباک تبصرے اس اخبار کی خصوصیت ہوا کرتے تھے۔ سید کامل حسین اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

1921 میں گورکھپور سے 'سبحان' جاری ہوا۔ اس کے مدیر اعلیٰ کیفی چریاکوٹی تھے۔ اس اخبار کی بھی عمر بہت کم رہی اور صرف چار شمارے شائع ہوکر یہ اخبار بند ہوگیا۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں انگریزی اور ہندی شعرا کے کلام بھی شائع ہوتے تھے۔ 1922 میں ماہنامہ 'خوشتر' جاری ہوا۔ اس کے مہتمم وسیم خیر آبادی اور مالک ہری ہردت خوشتر تھے۔ یہ اخبار رفاہ عام پریس سے طبع ہوتا تھا۔ اسی شہر سے 1924 میں رسالہ 'روحانیت' منظر عام پر آیا۔ اس کے مدیر مولانا آزاد سبحانی تھے۔ یہ اخبار دو سال بعد بند ہوگیا۔ روحانیت اخبار بند ہوجانے کے بعد مولانا آزاد سبحانی نے 1927 میں رسالہ دعوت نکالا۔ یہ رسالہ سترہ سال تک جاری رہا لیکن بعد میں مولانا کی مصروفیت بڑھنے کے سبب بند ہوگیا۔

گورکھپور سے 1927 میں 'موٹر کار' کا اجرا عمل میں آیا۔ اس کے مدیر ماسٹر عبدالرحیم سیتاپوری تھے۔ اس میں انھوں نے موٹر کار کی مشین پر معلومات فراہم کیں اور کل پرزوں کی شکلیں

بھی مرتب کیں۔ اس اخبار میں ادبیات کا حصہ بھی اچھا خاصا ہوتا تھا۔ اسی شہر کے میاں صاحب جارج اسلامیہ ہائی اسکول سے 1930 میں ''عزیز' جاری ہوا۔ اس کے سرپرست جواد علی شاہ اور نگراں چھوٹے خاں تھے۔ یہ رسالہ 1942 تک جاری رہا۔ بدیع الزماں اعظمی اس کے مدیر تھے۔ یہ بنیادی طور پر بچوں کا تعلیمی اور اخلاقی رسالہ تھا مگر اس میں دیگر تخلیقات اور تحریریں بھی شائع ہوتی تھیں۔ اس شہر سے ہفتہ وار 'مراد' 1930 میں شائع ہوا۔ اس کے سرپرست ساجد علی وکیل اور مدیر حکیم امجد حسین نظر تھے۔ یہ اخبار قومی یکجہتی، اتحاد، رواداری اور فرقہ وارانہ خیر سگالی کا سفیر تھا۔ مذکورہ اخبارات و رسائل کے علاوہ زبان و ادب کے اس شہر سے نکلنے والے صلح، ایوان، شاہکار، کونین، ست سنگ، زندگی، نشیمن، بھائی، صبح وطن، اشتراک، نبض، ادبی اصناف، تاجور اور روزنامہ 'راپتی' وغیرہ نے بھی صحافت کے سفر کو آگے بڑھایا۔ ضلع بستی (اب سنت کبیر نگر) سے مولانا صادق علی قاسمی نے 1988 میں ماہنامہ 'نقوش حیات' جاری کیا۔ یہ رسالہ اب بھی نکل رہا ہے۔

بنارس سے شائع ہونے والا اردو کا سب سے پہلا اخبار غالباً 'بنارس اخبار' ہے۔ یہ 1847 میں منظر عام پر آیا۔ بنارس ہی سے 'اخبار سدھاکر' پنڈت رتن ایشور تیواری کی ادارت میں نکلا۔ اس اخبار میں مقامی خبروں کے علاوہ ملکی خبریں بھی شائع ہوتی تھیں۔ اسی شہر سے نکلنے والے اخبار 'باغ و بہار' کے ایڈیٹر بابو کیدار گھوش تھے۔ گھوش جی اردو اور ہندی زبانوں میں مہارت رکھتے تھے۔ اس اخبار میں مقامی خبروں کے علاوہ مذہبی اور سماجی مضامین شائع ہوتے تھے۔ یہاں سے 1852 میں 'آفتاب ہند' جاری ہوا۔ اس کے مالک و مدیر بابو کاشی داس ستر تھے۔ معاصر اخبارات میں یہ اخبار بہتر طرز تحریر کا حامل اور با اثر تھا۔ اسی شہر سے 1854 میں 'بنارس گزٹ' شائع ہوا۔ اس کے مدیر گوبند رگھوناتھ تھے۔ انھوں نے اپنی محنت اور قابلیت سے اسے ایک معیاری اخبار بنایا۔ بنارس سے گوبند رگھوناتھ نے ایک ہفتہ وار کا اجرا کیا جس کا نام 'تقویم ہند' تھا۔ یہ اخبار 1851 میں جاری ہوا۔ اس میں علم نجوم اور تقویم سے متعلق تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ اسی شہر سے ماہانہ رسالہ 'مراۃ العلوم' جاری ہوا۔ اس کی ادارت کی ذمہ داری ہربنس لال کے سپرد تھی۔ اس کے مالک بابو بھیرو پرشاد تھے۔ اس اخبار میں زیادہ تر اصلاحی اور مذہبی مضامین شائع ہوتے تھے۔ بنارس سے آج کل ایک معیاری رسالہ 'نئی صدی' نکل رہا ہے۔ بھدوہی سے 'سبق اردو' نکل

رہا ہے۔

علی گڑھ بھی تعلیم، زبان وادب اور تہذیب وتمدن کا اہم مرکز رہا ہے۔ مسلم یونیورسٹی، سرسید، سائنٹفک سوسائٹی اور تہذیب الاخلاق کی وجہ سے اس کا شہرہ پوری دنیا میں ہے۔ یہاں سے اخبار 'سائنٹفک سوسائٹی' سرسید نے 1866 میں جاری کیا۔ یہ اخبار پہلے ہفت روزہ تھا بعد میں سہ روزہ ہوگیا۔ اس کے اداریے عام طور پر سرسید خود لکھتے تھے۔ اس اخبار میں قومی وبین الاقوامی امور پر تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ سماجی، تعلیمی اور معاشی مسائل پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ دوسرے اخباروں سے بھی مضامین نقل کیے جاتے تھے۔ سرسید اگر چہ انگریزوں کے خیر خواہ تھے لیکن قومی، ملی اور لسانی وقار پر اگر آنچ آتی تھی تو وہ اپنے مخصوص انداز میں اس کا جواب بھی دیتے تھے۔ خاص طور سے سرسید ریاستوں کے حقوق اور دیسی صحافت کے وقار کی حفاظت کے لیے سینہ سپر رہتے تھے۔ متانت اور سنجیدگی اس اخبار کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس میں کبھی کسی قوم، فرقہ یا فرد کی دل آزاری نہیں کی گئی۔ ہندو مسلم تنازعات سے ہمیشہ دور رہا۔ اگر مجبوری میں کچھ لکھنا پڑا تو اتحاد واتفاق اور صلح وآشتی کی تلقین کی۔ تحریریں جذباتی نہیں ہوتی تھیں بلکہ دامن بچا کر کام لیا جاتا تھا۔ اخبار میں خبروں کی صحت اور اختصار پر خاص زور دیا جاتا تھا۔

علی گڑھ سے سرسید نے 'تہذیب الاخلاق' 1870 میں جاری کیا۔ یہ پہلے دس روزہ اخبار تھا۔ بعد میں ماہنامے میں تبدیل ہوگیا۔ یہ رسالہ آج بھی علی گڑھ سے ماہنامے کی شکل میں نکل رہا ہے۔ اس کا مقصد مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ درجے کی تہذیب واخلاق سے مزین کرنا تھا۔ اس رسالے نے بڑے دوررس اثرات مرتب کیے۔ تہذیب الاخلاق نے نہ صرف اردو زبان وادب کی بڑی خدمت کی بلکہ مسلمانوں کی ترقی اور ان کی ذہن سازی میں ناقابل فراموش کارنامہ انجام دیا۔ آج بھی اس رسالے کا شمار اردو کے ممتاز اور اہم رسائل میں ہوتا ہے۔ یہ رسالہ بھی ہندوستان کے ان چند رسالوں میں ہے جن کو طویل عمر ملی۔ 'معارف' علی گڑھ سے حاجی محمد اسماعیل خاں اور مولوی وحید الدین سلیم کی ادارت میں جولائی 1898 میں شائع ہوا۔

'اردوئے معلیٰ' علی گڑھ سے جولائی 1903 میں منظر عام پر آیا۔ اس کے مالک ومدیر حسرت موہانی تھے۔ جنگ آزادی میں اس رسالے کا بڑا رول رہا ہے۔ اس میں ہر قسم کے مضامین

شائع ہوتے تھے۔ ادبیات کا حصہ اچھا خاصا ہوتا تھا۔ حسرت موہانی نے اس اخبار کے ذریعہ مسلمانوں کی ذہن سازی کا بڑا کام لیا۔ یہ رسالہ کئی بار نکلا اور بند ہوا۔ اس کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا اور دوسرا علی گڑھ کا ہے جبکہ تیسرا اور چوتھا دور کانپور کا ہے۔ پہلا دور جولائی 1903 سے شروع ہوکر 1908 میں ختم ہوتا ہے۔ دوسرا دور 1910 سے جولائی 1913 تک ہے۔ تیسرا دور 1917 سے 1922 تک ہے، جبکہ چوتھا اور آخری دور 1925 سے 1942 تک ہے۔ اس کے علاوہ علی گڑھ سے پندرہ روزہ 'خیر وخبر' روزنامہ 'اودھ نامہ' دو ماہی 'الفاظ' وغیرہ بھی جاری ہوئے۔

کانپور سے سب سے ممتاز اور اہم رسالہ 'زمانہ' شائع ہوا۔ 1903 میں منشی دیانرائن نگم اس کے ایڈیٹر بنائے گئے۔ نگم کی ادارت میں اس ماہنامے نے ادبی حلقوں میں بڑی پذیرائی حاصل کی اور پورے ہندوستان میں مشہور ہوگیا۔ خصوصی شمارے نکالنے میں اسے امتیاز حاصل تھا۔ یہ رسالہ 1942 تک جاری رہا۔ زمانہ مسلسل 39 سال تک نکلتا رہا۔ ادبی حیثیت اس کی تو مسلّم ہی تھی لیکن اس نے قومی یکجہتی اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے بڑی قربانی دی ہے۔ کتنے ادیبوں اور شاعروں کو 'زمانہ' نے شہرت کی بلندیوں پر پہنچایا۔ منشی پریم چند کو 'پریم چند' بنانے میں 'زمانہ' کا بڑا کردار رہا ہے۔ زمانہ کے لکھنے والوں میں علامہ اقبال، سوامی رام تیرتھ، عبدالحلیم شرر، علامہ شبلی نعمانی، خواجہ الطاف حسین حالی، اثر لکھنوی اور جگر مرادآبادی قابل ذکر ہیں۔ ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ 'زمانہ' اصلاح معاشرہ کے لیے بھی کوشاں رہتا تھا۔ عورتوں کے لیے الگ گوشہ تھا۔ 'عالم نسواں' کے عنوان کے تحت عورتوں سے متعلق دنیا بھر کی خبریں شائع کی جاتی تھیں۔

یہ رسالہ پہلی بار فروری 1903 میں منشی شیوبرت لال ورمن کی ادارت میں قیصری پریس بریلی سے شائع ہوا تھا۔ اس کے مالک منشی راج بہادر تھے۔ منشی شیوبرت لال ورمن کو گھریلو معاملات کی وجہ سے 'زمانہ' کی ادارت چھوڑنا پڑی۔ اکتوبر 1903 تک یہ رسالہ انھیں کی ادارت میں بریلی سے شائع ہوتا رہا۔ ان کی سبکدوشی کے بعد منشی راج بہادر نے رسالہ منشی دیانرائن نگم کے سپرد کردیا۔ چنانچہ نومبر 1903 کا شمارہ نگم نے مرتب کیا مگر رسالے کے سرورق پر ایڈیٹر کا نام شیوبرت ورمن ہی لکھا۔ خود دیانرائن نگم نے اپنے نام کے آگے 'مرتبہ' لکھا اور یہی

روش 1942 میں ان کے انتقال تک برقرار رہی۔ 'زمانہ' کی ترتیب اگرچہ نگم کانپور میں کرتے تھے مگر یہ رسالہ قیصری پریس بریلی ہی سے شائع ہوتا تھا۔ اس کے دو برس بعد 1905 میں اس کی اشاعت کانپور سے شروع ہوئی۔ اس کی طباعت کے لیے 'زمانہ پریس' کے نام سے ایک پریس بھی منشی جی نے اپنے مکان کے ایک حصے میں قائم کر دیا تھا۔ زمانہ جون 1949 تک جاری رہا۔ ناموافق حالات کی وجہ سے 46 سال تک اردو زبان وادب اور ملک کی خدمات انجام دینے کے بعد بند ہو گیا۔ منشی دیانرائن نگم نے 1912 میں ایک اور ہفتہ وار اخبار 'آزاد' بھی نکالنا شروع کیا تھا۔

کانپور سے حسرت موہانی نے 'اردوئے معلیٰ' کا تیسرا دور شروع کیا۔ اس سے قبل وہ اسے علی گڑھ سے نکال رہے تھے۔ کانپور سے 'اردوئے معلیٰ' 1917 میں شائع ہوا اور 1922 میں بند ہو گیا۔ پھر 1925 میں جاری کیا جو 1942 تک جاری رہا۔ اس اخبار نے ملک وملت اور زبان وادب کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ حسرت نے کانپور سے ایک سہ ماہی رسالہ 'تذکرۃ الشعرا' بھی جولائی 1913 میں شائع کرنا شروع کیا۔ اس رسالے کا ڈکلریشن داخل نہیں کیا گیا اس لیے حسرت اسے رسالہ نہیں کتاب کہتے تھے۔ جولائی اگست 1919 'تذکرۃ الشعرا' کا آخری شمارہ تھا۔ کانپور سے 'مستقل' بھی جاری ہوا۔ اس کے بھی مالک ومدیر حسرت موہانی تھے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ روزنامہ اخبار کی شکل میں اکتوبر 1928 سے نکلنا شروع ہوا۔ جنوری 1932 سے ماہانہ ہوا اور 1936 سے یہ 'اردوئے معلیٰ' کے ضمیمے کی حیثیت سے شائع ہونے لگا۔ یہ مکمل سیاسی اخبار یا رسالہ تھا۔ حسرت نے اپنے سیاسی خیالات کا برملا اظہار کرنے کے لیے یہ اخبار جاری کیا تھا۔ اس کے مضامین بڑے شعلہ بار ہوا کرتے تھے۔ بقول عبدالشکور "ان مضامین کو پڑھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ کے کاغذی پیراہن میں شرارے جمع کر دیے گئے ہیں۔"

کانپور سے عبدالغنی عیوض بخش نے یکم جنوری 1886 کو ماہنامہ 'عطار' نکالا تھا۔ یہ دیسی دوائیں تیار کرنے والوں کا ترجمان تھا۔ 1892 میں اسی شہر سے ماہنامہ 'تحفۂ محمدیہ' محمد سعید کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا۔ کانپور سے رسالہ 'انجمن تہذیب' 1875 میں جاری ہوا۔ اسی شہر سے نور الآفاق اور نور انوار بھی جاری ہوئے۔ یہیں سے سیاست جدید، انوار قوم، پیغام وغیرہ اخبارات بھی شائع ہو رہے ہیں۔

اعظم گڑھ سے علامہ سید سلیمان ندوی نے مشہور زمانہ مجلّہ ماہنامہ 'معارف' جولائی 1916 میں جاری کیا۔ معارف کا خاکہ علامہ شبلی نعمانی نے تیار کیا تھا لیکن ان کی ناگہانی موت کے بعد اس میں رنگ سید صاحب نے بھرا۔ یہ رسالہ دارالمصنفین کا ترجمان تھا۔ ماہنامہ 'معارف' بہت جلد ملک کے طول وعرض میں مقبول ہوگیا اور لوگوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ موقر رسائل وجرائد نے اس پر اچھے اور حوصلہ افزا تبصرے کیے۔ ممتاز رسالوں میں اس کے 'شذرات' اور مقالات نقل کیے جانے لگے۔ علامہ سید سلیمان ندوی ہی اس کی ادارتی ذمہ داری سنبھالتے تھے لیکن جب وہ یورپ کے سفر پر گئے تو آٹھ ماہ کے لیے عبدالماجد دریابادی نے اس کے ادارتی فرائض انجام دیے۔ جولائی 1946 میں جب سید صاحب بھوپال چلے گئے تو نگرانی خود کرتے رہے لیکن عملی طور پر ادارتی کام شاہ معین الدین احمد ندوی کرتے رہے۔ درمیان میں صرف ایک سال 1947 میں ریاست علی ندوی اس کے ایڈیٹر رہے۔ 1949 سے شریک مرتب کی حیثیت سے رسالے کے سرورق پر شاہ معین الدین ندوی کا نام آنے لگا۔ 1951 میں جب سید صاحب پاکستان چلے گئے تو قانونی پیچیدگی کے سبب ان کا نام ہٹانا پڑا۔ جولائی 1951 سے معارف کی ادارت ایک مجلس کے سپرد کی گئی اور شاہ معین الدین ندوی اس کے چیف ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ معارف کی مجلس ادارت میں مختلف اوقات میں عبدالماجد دریابادی، مناظر احسن گیلانی، عبدالستار صدیقی، عبدالسلام ندوی، ابوالحسن علی ندوی، محمد اویس نگرامی، عبدالسلام قدوائی، ڈاکٹر نذیر احمد، سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور شمس الرحمان فاروقی شامل رہے ہیں۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے 'معارف' کو ایک معیاری رسالہ بنانے کے لیے سخت محنت کی اور اپنی تمام توانائیاں صرف کردیں۔ الندوہ اور الہلال میں کام کے دوران جو تجربات حاصل کیے تھے ان کو بھی بروئے کار لاتے ہوئے معارف کو خوب سے خوب تر بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ معارف کا شمار ملک کے ممتاز اور موقر رسالوں میں ہوتا ہے۔ معارف میں 'شذرات' کے عنوان سے جو اداریہ شائع ہوتا ہے وہ بھی خاصے کی چیز ہوتا ہے۔ معارف کا ایک کالم 'مطبوعات جدیدہ' ہے جس کے تحت نئی کتابوں پر مختصر مگر جامع تبصرے کیے جاتے ہیں۔ اس رسالے کا ایک مستقل عنوان 'ادبیات' ہوتا ہے۔ اس کے تحت نظم یا غزل شائع کی جاتی ہے۔ معارف کو ہندو پاک کے تمام ممتاز

ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور دانشوروں کا تعاون حاصل ہے۔ معارف میں کسی کا شائع ہو جانا انتہائی قابل فخر سمجھا جاتا ہے اور کسی بھی قلم کار کے لیے سند کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ تاریخی رسالہ آج بھی جاری ہے۔ مئی 2016 کے شمارے میں مجلس ادارت کے تحت دو نام مولانا سید محمد رابع ندوی لکھنؤ اور پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی علی گڑھ کے ہیں۔ مرتبہ کے تحت اشتیاق احمد ظلی اور محمد عمیر الصدیق ندوی ہیں۔ اعظم گڑھ سے ماہنامہ 'الرشاد' اور 'الاصلاح' بھی نکلتے ہیں۔ مئوناتھ بھنجن سے 'عالمی ادب گزٹ' شائع ہو رہا ہے۔

اتر پردیش میں اردو صحافت کے اہم اور اولین مراکز میں مراد آباد کا بھی شمار ہوتا ہے۔ یہاں سے کثرت سے اردو اخبارات و رسائل شائع ہوئے۔ اردو زبان و ادب کے فروغ میں اس ضلع کا اہم کردار رہا ہے۔ صوفی امبا پرساد مراد آبادی صحافت کے اہم ستون کہلاتے ہیں۔ ڈاکٹر فرقان سنبھلی کی اطلاع کے مطابق مراد آباد میں اردو صحافت کا آغاز 1840 میں ہوا۔ اس سال جمشید علی نے 'بلند اخبار' اور 'جام جم' اردو ہفت روزہ کی اشاعت اور ادارت شروع کی۔ 1876 میں ہفت روزہ جام جمشید منظر عام پر آیا۔ 1877 میں 'نیر اعظم' کی اشاعت شروع ہوئی۔ اس کے ذمہ دار امجد علی تھے۔ 1881 میں 'رہبر' جاری ہوا۔ 82-1881 میں صوفی امبا پرساد نے ہندی اور اردو زبانوں میں ہفت روزہ 'تنتر پربھاکر' جاری کیا۔ انھوں نے 1884 میں ماہنامہ 'جامع العلوم' جاری کیا۔ اس میں باغیانہ خبروں کی اشاعت ہوتی تھی۔ بعد میں یہ ماہنامہ ہفت روزہ میں تبدیل ہو گیا۔ پھر انھوں نے 1887 میں 'ستار ہند' اخبار نکالا۔ اس کے بعد ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ 1889 میں ابن علی نے 'نیر اعظم' ہفت روزہ جاری کیا جو کہ 1936 میں بند ہو گیا۔ مراد آباد سے 1896 میں نرائن سوامی پرساد کے زیر ادارت ہفت روزہ 'محرک' شروع ہوا جو ایک ماہ بعد 'آریہ متر' کے نام سے نکلنے لگا۔ امجد علی کے بھائی ابن علی نے 1901 میں 'نیر اعظم' کی اشاعت شروع کی۔ 18 جنوری 1886 کو منشی دھرکی ادارت میں مراد آباد سے 'دھرم پرکاش' جاری ہوا۔

مراد آباد سے 'مخبر عالم' 8 جون 1903 کو وجود میں آیا۔ یہ ہفتہ وار اخبار تھا۔ اس کے ایڈیٹر عبدالعلی عابد تھے۔ آٹھ صفحات پر مشتمل تھا اور اس کا سالانہ چندہ تین روپے تھا۔ مخبر عالم پریس میں باہتمام منصور علی منجر چھپتا تھا۔ مولانا امداد صابری کے مطابق پہلا شمارہ مخبر عالم کے نام سے چھپا۔

تیسرا شمارہ 24 جون 1903 'مخبر عالم و رحمت عالم' کے نام سے شائع ہوا اور اخبار کے نیچے یہ عبارت درج ہونے لگی۔ ''روہیل کھنڈ میں سب سے آزاد اور زیادہ چھپنے والا۔'' یہ اخبار سودیشی تحریک کا علمبردار تھا۔ آزادی پسند اخبار تھا اور انگریزوں کی غلامی کو لعنت سمجھتا تھا۔ قوم کو بیدار کرنے میں اس نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔

مراد آباد سے 1913 میں چھ اردو ہفت روزے اور ایک ماہنامے کی اشاعت شروع ہوئی۔ اس کے بعد یہاں سے 1918 میں مشہور اخبار 'رہنما' منظر عام پر آیا۔ اس کے ایڈیٹر محمد اشفاق حسین صدیقی مراد آبادی تھے۔ یہ اخبار پندرہ روزہ اور سولہ صفحات پر مشتمل تھا۔ سالانہ چندہ چھ روپے تھا۔ صدیقی پریس مراد آباد میں چھپتا تھا۔ رہنما نے سامراجیت کے خلاف آواز بلند کی۔ اس میں خبروں کے مقابلے میں نظریاتی تحریروں پر زور دیا جاتا تھا۔

مراد آباد میں اخبار و رسائل نکلنے کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ 1922 میں بربادِ مراد آبادی نے 'بربادٗ' جنوری 1930 کو شیدا علی نے 'حکومت' 1933 میں عمر دراز بیگ نے 'جدت' 1937 میں افتخار فریدی نے کانگریس، اسی سال مرزا اسحاق بیگ نے پبلک، 1950 میں پرتھوی راج مشرا نے ماہنامہ 'ساتھی' 1953 میں آر کے پوربی نے 'سنسار' 1957 میں پیارے میاں انصاری نے 'انصاری دنیا' 1960 میں تابش حیدری نے قوم، 1963 میں دیوکی نندن شرما نے 'علاج' 1965 میں سحر صدیقی نے 'رہنما' 1966 میں ارشاد بزمی نے 'بزم کیف' 1973 میں 'مکمل چھاپا۔ اسی سال سرفراز الدین صدیقی نے 'محافظ قوم' کی اشاعت شروع کی۔ 1984 میں روزنامہ 'گرج' منظر عام پر آیا۔

ان کے علاوہ مراد آباد سے روزناموں میں آواز، جدت، قومی کارواں، نیر اعظم، دشت بہ دشت، جدید خیر و خبر، مظلوم کی پکار، آئینۂ عالم ہفت روزوں میں رہنما، چلتی دنیا، نیا سنسار، فریب کی آواز، فدائے قوم، سن آف انڈیا، ہم کسی سے کم نہیں، انصاری دنیا، صدائے حق، نقوش، عکس سنبھل، آفتاب، پنچ بہادر، المہندی، پندرہ روزوں میں عصائے کلیم، قریشی دنیا، الا اخبار، نئی نسل، نئی روشنی، ماہناموں میں گل و خار، چاند، انصار گزٹ، تیر نیم کش وغیرہ بھی شائع ہوتے ہیں۔

میرٹھ سے بھی متعدد اخبارات و رسائل نکلے۔ اس ضلع کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ

یہاں سے پہلی بار باقاعدہ جنگ آزادی کا آغاز ہوا۔ اسماعیل میرٹھی کی وجہ سے اس ضلع کا نام پوری دنیا میں روشن ہے۔ اردو زبان وادب کے اعتبار سے یہ علاقہ مردم خیز رہا ہے۔ میرٹھ سے 20 جنوری 1883 کو اخبار 'تحفۂ ہند' جاری ہوا۔ یہ ہفتہ وار اخبار تھا اور اس کے مالک و مدیر مولوی احمد حسن شوکت تھے۔ اس میں صفحات کی تخصیص نہیں تھی۔ یہ اخبار شوکت المطابع میں چھپتا تھا۔ سیاسی اعتبار سے اس کا رجحان کانگریس کی طرف تھا۔ میرٹھ سے 'سفر قیصر' 25 ستمبر 1900 کو جاری ہوا۔ یہ میرٹھ کا پہلا نسوانی پرچہ تھا۔ اس کے بارے میں جمیل اختر لکھتے ہیں:

''حیرت کی بات ہے کہ تاریخ صحافت کی کسی کتاب میں اس رسالے کا تذکرہ نہیں ملتا۔ میرٹھ سے دلی بے حد قریب ہے اس کے باوجود امداد صابری کو اس رسالے کی بھنک تک نہیں لگی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب تاریخ صحافت میں اس کا ذکر نہیں کیا۔ پاکستان میں قومی نجائب گھر کتب خانہ لاہور میں اس کے دو شمارے موجود ہیں جسے ڈاکٹر نسیم آرا نے تلاش کیا ہے۔ ان کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق ایک 25 ستمبر 1900 کا، دوسرا نومبر دسمبر 1900 کا مشترکہ شمارہ تھا۔ 25 ستمبر کے شمارے پر جلد ایک شمارہ ایک درج ہے۔ اس لیے اس رسالے کے اجرا کی تاریخ 25 ستمبر 1900 قرار پائی۔ سرورق پر درمیان میں رسالے کا نام اور دائیں بائیں جانب 'تعلیم' اور 'نسواں' کے الفاظ تحریر ہیں جس سے اس کا مقصد واضح ہوتا ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ 'تعلیم نسواں' ہی اس رسالے کا خاص مقصد تھا۔ یہ ماہانہ رسالہ تھا اور اس کو محمد نذیر احمد سعد نے جاری کیا تھا اور فیض عام پریس میرٹھ سے شائع ہوتا تھا۔ یہ رسالہ 16 صفحات پر مشتمل تھا۔ ایڈیٹر کوئی خاتون تھیں جن کا نام درج نہیں البتہ تہذیب نسواں کی تقلید میں 'ایڈیٹر ایک شریف اور پردہ نشیں خاتون' درج ہے۔''

'عصر جدید' نامی ماہانہ رسالہ جنوری 1903 کو میرٹھ سے جاری ہوا۔ ایڈیٹر خواجہ غلام الثقلین تھے۔ یہ رسالہ 44 صفحات پر مشتمل تھا۔ شروع میں کارخانہ بلالی سلیم پریس سادھورا انبالہ میں باہتمام منشی محمد بلال کرم بخش چھپتا تھا۔ جولائی 1904 سے مطبع نور مرقع نور الانوار میرٹھ میں طبع ہونے لگا۔ یہ رسالہ اصلاح معاشرہ کا علمبردار اور قومی یکجہتی کا ترجمان تھا۔ سماجی برائیوں کے خلاف اس میں مضامین کثرت سے شائع ہوتے تھے۔ سودیسی پر زور دیتا تھا۔ لب

دلہجہ بیباکانہ و آزادانہ تھا۔ اسی شہر سے خلیق حسن نظامی نے اپریل 1913 میں 'توحید' نکالا۔ اس اخبار نے اردو صحافت کے وقار میں اضافہ کیا۔ میرٹھ سے شیخ حبیب احمد نے ہفت روزہ 'پولیس نیوز' نکالا جو اپنی نوعیت کا منفرد اخبار تھا۔ اس کا اجرا 24 دسمبر 1892 میں ہوا۔ ماہنامہ 'آریہ سماچار' میرٹھ سے منشی کلیان رائے کی ادارت میں 1879 میں منظر عام پر آیا۔

گنگا جمنا سرسوتی کے سنگم والا شہر الٰہ آباد کئی حیثیتوں سے ممتاز و منفرد ہے۔ یہاں کے باشندوں نے اردو زبان و ادب کی بھی آبیاری کی۔ جب اردو زبان کی ترقی ہوئی تو اردو صحافت کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ یہاں سے کئی اردو اخبارات و رسائل جاری ہوئے۔ الہ آباد سے 'قیصر الاخبار' جنوری 1877 میں نکلا۔ اس کے روح رواں منشی سراج الدین احمد خاں تھے۔ یہ ہفت روزہ اخبار تھا اور اس میں بین الاقوامی مسائل پر معلوماتی مضامین شائع ہوتے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ اس کی نوے فیصد خبریں غیر ملکی ہوتی تھیں۔ دس فیصد میں نصف افغانستان، آزاد قبائلی علاقہ بلوچستان اور ناگا قبائل کے ہنگاموں کے بارے میں ہوتی تھیں۔ باقی خبریں ملکی امور سے متعلق ہوتی تھیں۔ عجیب بات ہے کہ جہاں سے یہ اخبار شائع ہوتا تھا یعنی الٰہ آباد وہاں کی خبریں شاذ و نادر ہی ہوتی تھیں۔ اسی شہر سے جنوری 1878 میں ہفت روزہ 'احسن الاخبار' جاری ہوا۔ یہاں سے 1907 میں باغیانہ رجحان کا حامل ہفت روزہ 'سوراجیہ' منصۂ شہود پر آیا۔ اس کے مالک و مدیر شانتی نارائن بھٹناگر تھے۔ الٰہ آباد کے اس اخبار میں انگریزوں کے خلاف مضامین خوب شائع ہوتے تھے۔ سنگم کے شہر سے 1916 میں 'نئی روشنی' اخبار جاری ہوا۔ یہ روزانہ اخبار چھ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ واحد یار خاں اس کے بانی و ایڈیٹر تھے۔ امداد صابری کے مطابق "آزاد خیال اخبار تھا۔ سنجیدگی اور متانت کے ساتھ حکومت پر نکتہ چینی کرتا تھا۔ تعلیمی امور میں دلچسپی لیتا تھا۔ مدارس و کالج اور اسکولوں کی روئداد چھاپتا تھا"۔

الٰہ آباد سے ابن صفی نے 'جاسوسی دنیا' کے نام سے پاکٹ سائز رسالہ نکالا۔ اس رسالے نے اردو زبان و ادب کے فروغ میں بڑا کردار ادا کیا۔ جو لوگ اردو سے ناآشنا تھے انھوں نے جاسوسی دنیا پڑھنے کے لیے اردو سیکھی۔ اس ماہنامے نے مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔ مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اسے حاصل کرنے کے لیے ہر ماہ کی ایک مقررہ تاریخ کو الٰہ آباد

سمیت متعدد شہروں میں ایک لمبی قطار لگتی تھی۔ بعد میں 'جاسوسی دنیا' کے ادارے نے 'نکہت' کے نام سے ایک دوسرا جاسوسی رسالہ شائع کیا۔

فلہ آباد سے منشی نوبت رائے نظر نے یکم جنوری 1910 کو 'ادیب' جاری کیا۔ یہ باتصویر مجلہ تھا۔ نفیس کاغذ کے استعمال اور اعلیٰ پائے کے مضامین کی اشاعت سے اردو ادب میں شہرت پائی۔ مولانا ذکاء اللہ، منشی تلوک چند، منشی درگا سہائے اور علامہ اقبال جیسی شخصیات کی تحریریں شائع ہوتی تھیں۔

ماہنامہ 'شب خون' فلہ آباد سے 1966 میں جاری ہوا۔ پہلا شمارہ مئی 1966 میں منظر عام پر آیا تھا لیکن اس پر جون 1966 درج تھا۔ یہ رسالہ جون 2005 کو ضخیم الوداعی شمارے کے ساتھ بند ہو گیا۔ اگر چہ اس کی ایڈیٹر ایک خاتون تھیں لیکن اس کے اصل کرتا دھرتا ممتاز نقاد اور جدیدیت کے بانی شمس الرحمان فاروقی تھے۔ یہ ماہنامہ جدیدیت تحریک کا علمبردار اور ترجمان تھا۔ اسی شہر سے 'جوش بانی' بھی جاری ہوا۔ یہ جوش لٹریری سوسائٹی کے تحت شائع ہوتا تھا اور اس کے مدیر پروفیسر علی احمد فاطمی تھے۔ یہاں سے ماہنامہ 'شاہکار' بھی جاری ہوا۔

صحافت کے حوالے سے بجنور کی شہرت 'مدینہ' کی وجہ سے ہے۔ لیکن اس سے قبل بھی یہاں سے اخبارات و رسائل شائع ہو چکے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی زیادہ تفصیل نہیں ملتی۔ بجنور سے شری لال نے 30 اپریل 1884 کو انجمن زراعت کے نام سے ایک ماہنامے کا اجرا کیا۔ اس میں زراعت سے متعلق تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ اردو کا پہلا زراعتی رسالہ تھا۔

'مدینہ' بجنور سے یکم مئی 1912 کو جاری ہوا۔ اس ہفتہ وار کے بانی مولوی مجید حسن تھے۔ یکم جنوری 1917 سے یہ اخبار سہ روزہ ہو گیا۔ اس تاریخ ساز اخبار سے بڑی سرکردہ شخصیات وابستہ رہی ہیں۔ اس کا اندازہ ایڈیٹروں کی فہرست سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے ایڈیٹروں میں حافظ نور الحسن ذہین، آغا زر رفیق بلند شہری، مولانا مظہر الدین شیر کوٹی، مولوی نصیر الحق دہلوی، مولوی اتحاد حسین بریلوی، حافظ علی بہادر خاں سراوآبادی، شاہ خلیل الرحمٰن بہاری، قاضی محمد عدیل عباسی، قاضی بدر الحسن جلالی، مولوی امین احسن اصلاحی، مولوی شبیر احمد چاند پوری، مولوی

نور الرحمٰن بجھرا یونی، ابو سعید بزمی، حمید حسن فکر، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا ابو اللیث اصلاحی، قدوس صہبائی، مولانا حامد الانصاری غازی اور پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی جیسے اہل قلم، ادیب اور صحافی نظر آتے ہیں۔ ایڈیٹروں کی تقرری سے پہلے واضح کر دیا جاتا تھا کہ 'مدینہ' کی پالیسی قوم پرورانہ ہے اور وہ ملک کی آزادی خواہ جماعتوں کا ہم نوا اور مسلمانوں کے حقوق اور مسلم مفاد کا ترجمان ہے۔ اس پالیسی سے اتفاق ہو تو تشریف لا کر ہماری عزت و ہمت بڑھایئے۔ مدینہ انگریزی حکومت کے خلاف شمشیر برہنہ تھا۔ حالات حاضرہ، قومی و ملی مسائل کے علاوہ ادبی و ثقافتی موضوعات پر اداریے اور مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس کے قلمی معاونین میں اکبر الہٰ آبادی، علامہ شبلی نعمانی، علامہ اقبال، مولانا حسرت موہانی، ظفر علی خاں، ماہر القادری، جگر مراد آبادی، مولانا محمد علی جوہر، شوق قدوائی، روش صدیقی، ساغر نظامی، محمد عثمان فارقلیط وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بجنور سے شاہ امان اللہ نے 1921 میں 'نگینہ' اور 'الامان' اخبارات نکالے۔ ماہنامہ 'غنچہ' بھی بجنور سے جاری ہوا۔ بچوں کا رسالہ 'اچھا ساتھی' بھی یہاں سے مولانا سراج الدین ندوی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔

رامپور سے بھی بڑی تعداد میں اخبارات و رسائل جاری ہوئے۔ یہاں سے نکلنے والے رسالوں میں الحسنات، ذکریٰ، نور، ہلال، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ امبیڈکر نگر سے مئی 2009 میں 'وقار ادب' جاری ہوا اور ستمبر 2014 میں بند ہو گیا۔ اس کے مالک و مدیر ڈاکٹر ذکا اشرفی تھے۔ شاہجہاں پور سے ہفت روزہ 'آریہ درپن' منشی کلیان سنگھ کی ادارت میں نکلا۔ شاہجہاں پور سے نسیم شاہجہاں پوری کی ادارت میں ماہنامہ 'شان شاہجہاں پور' بھی نکلا۔ یہاں سے ماہنامہ 'افق نو' اور دو ماہی 'کاوش' بھی جاری ہوئے۔ 1867 میں مولوی رفیع الدین کی ادارت میں دیوبند سے 'روئداد اسلامی' جاری ہوا۔ یہاں سے عامر عثمانی نے ماہنامہ 'تجلی' جاری کیا تھا جو اپنے زمانے میں بے حد مقبول رسالہ تھا۔ بدایوں سے رسالہ انجمن علمی 1882 میں جاری ہوا۔ مظفر نگر سے رسالہ انسٹی ٹیوٹ 1867 میں منظر عام پر آیا۔ گونڈہ سے رسالہ انجمن رفاہ 1870 میں نکلا۔

اتر پردیش کے دیگر اضلاع اور شہروں سے بھی اخبار و رسائل شائع ہوئے لیکن ان کی تفصیل نہیں ملتی۔ اس پر تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔

مصادر و مآخذ

1 پروفیسر عابدہ سمیع الدین: قومی محاذ آزادی اور یو پی کے مسلمان صحافی

2 ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی: ماہنامہ 'نیا دور' لکھنؤ، اردو صحافت نمبر، جون۔ جولائی 2011

3 حسن ضیاء: ماہنامہ 'آجکل' نئی دہلی، اردو صحافت نمبر، اگست 2014

4 ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی: ماہنامہ 'نیا دور' لکھنؤ، منشی دوارکا پرشاد افق نمبر، ستمبر 2014

5 ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی: علامہ سید سلیمان ندوی: شخصیت و ادبی خدمات

6 ف س اعجاز: نیاز فتحپوری

7 احمد ابراہیم علوی: پندرہ روزہ 'جائزہ' لکھنؤ، 15 مئی 1990

8 سہیل انجم: احوال صحافت

9 سید اختیار جعفری: آگرہ میں اردو صحافت

10 ڈاکٹر محمد فرقان سنبھلی: اردو صحافت اور ضلع مرادآباد

11 ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ: سہ ماہی 'فکر و تحقیق' نئی دہلی، اپریل، مئی، جون 2005

12 مرزا جعفر حسین: قدیم لکھنؤ کی آخری بہار

13 اطہر فاروقی ہفت روزہ 'ہماری زبان' نئی دہلی، 22 تا 28 مئی 2016

(ص) کرناٹک

کرناٹک میں اردو صحافت: ایک تحقیقی جائزہ

ڈاکٹر انیس صدیقی

صحافت نہ صرف اطراف و جوانب کے حالات، واقعات اور حقائق سے راست آگہی کا نام ہے، بلکہ یہ ان حالات کے پس پردہ کارفرما عوامل سے بھی بحث کرتی ہے۔ روز اول ہی سے انسانی اذہان کی تعمیر و تشکیل اس کا منصب رہا ہے۔ صحافت نہ صرف انسانی فکر و شعور میں بالیدگی پیدا کرنے بلکہ ان عوامل سے واقفیت حاصل کرنے میں بھی معاونت کرتی ہے، جو قوموں کی ترقی و تنزل کا باعث بنتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ قومی سطح پر جمہوری، فلاحی اور اصلاحی نظام کے قیام اور استحکام کا کار عظیم بھی انجام دیتی ہے۔ چونکہ یہ ترقی یافتہ ذہن اور عصری شعور کی دستاویز ہوتی ہے، اس لیے اسے جمہوریت کے چوتھے ستون سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

صحافت کی غیر معمولی اہمیت و افادیت کے باوصف اردو صحافت کے سرمایے کا تحقیقی جائزہ لیا جائے تو شدید محرومی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی وجہ اول تو یہ ہے کہ ابتدا ہی سے اخبارات و رسائل کے حسن کو مانند حباب تصور کیا گیا، خرید اپڑھا اور ردی کی نوکری کی نذر۔ نتیجتاً آج کتب خانے صحافتی ذخائر سے محروم ہیں۔ حتیٰ کہ مالکان اور مدیران کے پاس بھی اخبارات اور رسائل کی

فائلیں موجود نہیں ہیں۔ دوم یہ کہ دانشوران علم وادب نے صحافت کو اپنے حد یقے سے باہر ہی رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب کی مستند و معتبر تاریخیں، شعری و نثری کارناموں سے بھری ملتی ہیں، لیکن اردو زبان وادب کے فروغ میں اردو صحافت کی غیر معمولی خدمات یا اس کی تاریخ پر کوئی مکمل اور قابل اعتبار حوالہ جاتی کتاب نہیں ملتی۔

قدیم اردو اخبارات کے چند ماخذات میں فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی کے خطبات، 1888 میں شائع ہوئی سید محمد اشرف کی تالیف 'اختر شہنشاہی' (سوانح عمری اخبارات) اور منشی عبدالعزیز کی 1904 میں منظر عام پر آئی کتاب 'فہرست اخبارات ہند' اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کے علاوہ جن محققین نے اس جانب توجہ کی، ان میں محمد عتیق احمد، عبدالسلام خورشید، بدر شکیب، مولانا امداد صابری، نادر علی خان اور گربچن سنگھ قابل ذکر ہیں۔ چونکہ ان تمام محققین کا تعلق شمالی ہندوستان سے ہے۔ اس لیے ان کی کتابوں میں جنوبی ہندوستان بالخصوص کرناٹک کی اردو صحافت کے آغاز وارتقا سے متعلق مواد تشنگی سے دوچار کرتا ہے۔

ریاست کرناٹک میں اردو صحافت کی تاریخ پر سب سے پہلے ممتاز محقق نصیر الدین ہاشمی نے توجہ کی۔ ان کی 1928 میں شائع ہوئی تالیف 'مدارس میں اردو' کے آخری 90 صفحات 'میسور میں اردو' کے لیے مختص ہیں۔ اس کے بعد 1941 میں سعید محمد عبدالخالق کی 96 صفحات پر مشتمل کتاب 'میسور میں اردو' منظر عام پر آئی۔ اسی سال رسالہ 'اردو' اورنگ آباد کے اپریل کے شمارے میں مولوی عبدالحق کا ایک طویل مضمون 'انیسویں صدی میں مدراس کے اردو اخبارات' شائع ہوا۔ ڈاکٹر حبیب النسا کا تحقیقی مقالہ 'ریاست میسور میں اردو کی نشو ونما' زیور طباعت سے آراستہ ہوا۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر آمنہ خاتون، محمد خان، سلیم تمنائی، ڈاکٹر طیب انصاری، پروفیسر اقبال ہاشمی، پروفیسر عبدالغفار شکیل، ابن مخدوم وغیرہ نے چیدہ چیدہ مضامین لکھ کر مٹی کا حق ادا کیا۔ واضح رہے کہ 1956 میں فضل حق کمیشن کی سفارشات کے تحت لسانی بنیاد پر ریاستوں کی تشکیل جدید سے قبل ریاست کرناٹک، ریاست میسور کے نام سے موسوم تھی اور اس کے بیشتر اضلاع دیگر صوبوں کا حصہ تھے۔ لہٰذا کرناٹک میں اردو صحافت کے آغاز وارتقا کا یہ تحقیقی جائزہ موجودہ کرناٹک کے کل 30 اضلاع میں اردو صحافت کی صورت حال کا احاطہ کرتا ہے۔

کرناٹک میں اردو صحافت کے نقطۂ آغاز کے ضمن میں محققین کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بیشتر محققین نے عہد ٹیپو سلطان میں جاری ہوئے 'فوجی اخبار' کو تقدم کا درجہ دیا ہے۔ 'میسور میں اردو' کے ممتاز مورخ سعید محمد عبدالخالق رقمطراز ہیں:

''.....بنگلور کے ایک عمر رسیدہ بزرگ نے جو اپنے مرحوم دادا کی روایت سے بیان کرتے ہیں کہ ٹیپو سلطان نے جو سرکاری مطبع قائم کیا تھا، اس سے، اس کے حکم سے ایک سرکاری ہفتہ وار اخبار شائع ہوتا تھا، جس کی تقسیم اس کی فوج تک تھی۔'' [1]

ڈاکٹر عبداللیث صدیقی نے غالباً اسی حوالے سے لکھا ہے:

''اردو کا پہلا اخبار فوجی اخبار ہے، جسے ٹیپو سلطان کے حکم سے سری رنگا پٹن سے جاری کیا گیا تھا۔'' [2]

پروفیسر عبدالغفار شکیل نے اس بات کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

''تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ ٹیپو سلطان کے حکم سے 1794 میں ایک ہفتہ وار 'فوجی اخبار' نکلنا شروع ہوا۔ ان میں زیادہ تر فوجی خبریں ہوا کرتی تھیں۔ ان کے علاوہ فوجی احکامات اور انگریزوں کی شاطرانہ چالوں اور فرانسیسیوں کی دوستی سے متعلق باتیں درج ہوتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان کے شہید ہونے کے بعد اس اخبار کی فائلیں ضبط کر لی گئیں۔'' [3]

اگر فوجی اخبار، کہیں دستیاب ہو جائے تو اسے ہندوستان کے اولین اخبار کا افتخار حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن فوجی اخبار تا حال نایاب ہے۔ علاوہ ازیں امتیاز علی عرشی نے اپنے مضمون 'قدیم اخبارات کی کچھ جلدیں' (مطبوعہ، نوائے ادب، ممبئی اپریل 1958) میں کرناٹک کے پہلے اخبار 'سفیر کرناٹک' (اجرا: 3 مارچ 1860) کا ذکر کیا۔ کنڑا کے ایک اور معروف محقق این سیتارام شاستری نے ایک اور اخبار 'قاضی الملک' (اجرا: 1859) کو کرناٹک کا پہلا اردو اخبار قرار دیا ہے۔ لیکن 'فوجی اخبار' کی طرح 'سفیر کرناٹک' اور 'قاضی الملک' بھی عدم دستیاب ہیں۔

فی الحال تحقیق اور محصول شواہد کی بنیاد پر کرناٹک کے صحافتی افق پر نمودار ہونے والا

اولین اخبار ہفتہ وار 'قاسم الاخبار' ہے، جسے محمد قاسم غم نے بنگلور سے جاری کیا تھا۔ اس اخبار کے سنہ اجرا کے تعلق سے بھی محققین صحافت بڑی غلط فہمی کا شکار نظر آتے ہیں۔

سعید محمد عبدالخالق لکھتے ہیں:

''محمد قاسم غم نے 'قاسم الاخبار' 1965 میں جاری کیا۔''[4]

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید اور ناز انصاری نے بھی اپنی اپنی تصانیف میں 'قاسم الاخبار' کا سنہ اجرا 1865 ہی بتایا ہے۔ مولوی عبدالحق کے مطابق بھی اس کا اجرا 1865 میں ہی ہوا۔ جب کہ قدیم اردو صحافت کی اولین اور مستند تاریخ تصور کی جانے والی کتاب 'اختر شہنشاہی' میں اس کے مولف سید محمد اشرف نے 'قاسم الاخبار' کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''.....قاسم الاخبار، بنگلور، ہفتہ وار، 4 ورق کلاں، یوم دوشنبہ، سالانہ 9 روپے، مالک محمد قاسم علی صاحب غم، از مطبع چام راج پریس، اجرا جنوری 1861۔''[5]

سید محمد اشرف کے اس بیان کی تائید مولانا امداد صابری اور محمد خان نے بھی اپنی اپنی تصانیف میں کی ہے۔ راقم الحروف نے انجمن ترقی اردو ہند دہلی کے کتب خانے میں 'قاسم الاخبار' کی جلدیں دیکھیں۔ لیکن تلاش بسیار کے باوجود ابتدائی جلدیں دستیاب نہ ہوسکیں۔ پندرہویں جلد کے پہلے شمارے پر درج تاریخ 8 فروری 1875 کے حساب سے 'قاسم الاخبار' کی تاریخ اور سنہ اجرا یکم جنوری 1861 بہ روز دوشنبہ طے پاتا ہے۔

ریاست کرناٹک کا یہ اولین اخبار اپنے مدیر محمد قاسم غم کی اعلیٰ مدبرانہ اور صحافتی صلاحیتوں کا مظہر تھا۔ یہ اخبار نہ صرف کرناٹک بلکہ ہندوستان کے تمام معاصر اخبارات میں منفرد مقام رکھتا تھا۔ 'قاسم الاخبار' میں مقامی اور ملکی خبروں کے علاوہ عصری، سیاسی و سماجی مسائل کا احاطہ کیا جاتا تھا۔ اس کے مشمولات میں اداریے کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ ہر شمارے میں اداریہ بڑے اہتمام سے لکھا جاتا تھا۔ جس میں ہم عصر مسائل پر نہایت مفکرانہ انداز میں روشنی ڈالی جاتی تھی۔ شعر و ادب کے لیے بھی 'قاسم الاخبار' میں خاص جگہ مختص ہوتی۔ جس میں ممتاز اہل قلم کی نگارشات شائع کی جاتی تھیں۔ 1891 میں غم کے انتقال کے بعد ان کے فرزند محمد شریف ادب

پھر 1911 میں ممتاز مورخ محمود خان محمود نے اس اخبار کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ اس طرح ریاست کرناٹک کا یہ اولین اخبار، اردو کے ان معدودے چند اخباروں میں سے ایک ہے، جو نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک جاری رہے۔

'قاسم الاخبار' نے ریاست میں صحافت کی روایت قائم کی، اس کی ترویج کے در وا کیے۔ اخبار بینی کی اہمیت اور افادیت کا احساس نہ صرف خواص بلکہ عوام میں بھی ہونے لگا۔ یک کے بعد دیگرے کئی اخبارات و رسائل منظر پر آئے، جنھوں نے اصلاح معاشرہ اور قارئین کو اپنے عصر سے آگاہ رکھنے کے علاوہ اخلاقی و ذہنی نشو و نما کو اپنا منصب بنایا۔

ہفتہ وار اخبار:

'قاسم الاخبار' کے بعد 'طلسم کرناٹک' دوسرا اخبار ہے، جسے قادر باشا قادر نے 1865 میں بنگلور سے جاری کیا۔ گارساں دتاسی نے اپنے خطبہ میں اس اخبار کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''طلسم کرناٹک، بنگلور سے نکلتا ہے، جس میں کبھی کبھی اچھے مضامین چھپتے ہیں۔''[۵]

مشمولات کے اعتبار سے اس اخبار نے اپنے عہد کے اخبارات میں اپنی پہچان بنائی تھی۔

'منشور محمدی' کو ہندوستان کے اولین مذہبی اخبار کا افتخار حاصل ہے۔ جسے محمد قاسم غم نے 25 راگست 1872 کو اپنے ہفتہ وار 'قاسم الاخبار' کے ضمیمے کے طور پر جاری کیا تھا۔ بعد میں اس اخبار کو مستقل عشرہ وار کی شکل دی گئی۔ اس اخبار کا مقصد مسلمانوں کو مسیحیت کی تبلیغ، اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن کے خلاف زہر افشانی کرنے والے اخبارات 'کوکب ہند'، 'نور افشاں' اور 'شمس الاخبار' کے اثرات سے محفوظ رکھنا اور اسلامی تحفظ کے جذبے کو تعلیم یافتہ طبقے میں عام کرنا تھا۔ چنانچہ سید محمد اشرف نے اپنی تالیف میں لکھا ہے:

''ناظرین حقائق آگیں کو واضح ہو کہ یہ اخبار اپنی حق گوئی اور حسنِ بیان سے عالم کو منور کرتا ہے۔ جو اخبار مخالفین مذہب کے مسلمانوں کو رنج پہنچاتے ہیں اور اعلانیہ بہ ذریعے اخبار مذہب اسلام کی توہین کرتے ہیں

یہ ان کی تردید کرتا ہے۔"[3]

مسیحیت کے سیلاب کو روکنے اور اسلام دشمنی کا جواب دینے کے مقصد سے جاری کیے گئے اس اخبار کے بیشتر قلمی معاونین کا تعلق شمالی ہندوستان سے تھا۔ یہ اخبار تقریباً 22 سال جاری رہا۔

'میسور اخبار' یکم اپریل 1873 میں جاری ہوا۔ اس کے مدیر حافظ سید محمد تھے۔ گارساں دتاسی کے مطابق "یہ اخبار بہت شستہ اردو میں بنگلور کی اعلیٰ فن طباعت (جس کو فردوسی کہتے ہیں) کا مظہر ہے"۔[4] عربی و فارسی تراکیب سے گریز، صاف اور رواں زبان میں تحریر کیے گئے اداریے اس اخبار کی جان ہوا کرتے تھے۔

اسی دور میں محمد ابراہیم طیش نے 'بادصبا' 1885 میں جاری کیا۔ بعد میں غلام محمد شوکت اس کے مدیر ہوئے۔ فن کتابت اور طباعت کے ماہر غلام محمد شوکت نے دو اور اخبار 'احسن الاخبار' اور 'ایڈورڈ گزٹ' شائع کیے۔ 'ایڈورڈ گزٹ' جو شہنشاہ ایڈورڈ ہشتم کے جلوس کی یادگار کے طور پر یکم/ جولائی 1901 کو جاری کیا گیا تھا، اپنے مدیر کی اعلیٰ صحافتی بصیرت کا آئینہ دار تھا۔ اس اخبار کی زبان عربی و فارسی تراکیب سے آراستہ رواں اور سلیس ہوتی تھی۔ صالح علمی ذوق پیدا کرنے اور معلومات عامہ کے دائرے کو وسیع کرنے میں اس اخبار نے غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔

شمالی کرناٹک کا پہلا اخبار 'بیدر گزٹ' مہر علی کی زیر ادارت 8/ اکتوبر 1907 کو آسمان صحافت پر طلوع ہوا۔ اس اخبار کے مزاج و معیار کے تعلق سے معاصر ادبی رسالے 'صبح بہار' کے جولائی 1909 کے شمارے میں لکھا ہے:

> "..... ہر مذاق کے موافق عام اخباری مقاصد کے علاوہ ملکی، قومی، علمی، تمدنی، اخلاقی، تجارتی، اصلاحی، تاریخی، معاملات پر دلچسپی سے بحث کرنے والا، حکام کے بے جا عمل پر تنقید کرنے والا، رعایا کی آواز حکام تک گوش گذار کرنے والا، حقوق شاہی کا محافظ، مسلم کا سچا مشیر، ان میں ہمدردی اور اتفاق کی زندگی پیدا کرنے والا۔ ریاست نظام میں اپنے رنگ

کا اکیلا ہفتہ وار اخبار۔''

کلیم الملک سید غوث محی الدین نے 1924 میں ہفتہ وار 'الکلام' جاری کیا۔ اپنے مفید و معلوماتی مضامین اور تبصروں کی بدولت اس نے جلد ہی مقبولیت حاصل کر لی۔ جس کے پیش نظر اسے مدیر نے روزنامے میں تبدیل کر دیا۔

سرزمین بندہ نواز'' گلبرگہ کی اردو صحافت کا نقش اول ہفتہ وار 'ہمدرد' ہے۔ اس کا اولین شمارہ یکم جون 1948 کو عثمان صحرائی کی زیر ادارت منظر عام پر آیا۔ اس اخبار کا مقصد انڈین یونین کے ارادوں کی مذمت کرتے ہوئے ریاست حیدرآباد کے خوش آئند اور روشن مستقبل کے لیے سعی کرنا تھا۔

1956 میں ریاست کرناٹک کی تشکیل جدید سے قبل جاری دیگر ہفتہ وار اخباروں میں آفتاب کرناٹک رحکیم محمد امام امامی، اخبار قوم رابوسعید عبدالقیوم، ہلال رعبدالرحمٰن، سیف اللہ ر محمد رضا علی رضوی، کمرشیل اینڈ ٹکنیکل گائیڈ رحکیم محمد غوث کولاری کا ذکر اردو صحافت کی تاریخوں میں ملتا ہے۔ علاوہ ازیں غلام محمد شوکت کا' کاس اخبار' قادر شریف صابر کے اخبار 'پنچ الیچ' اور 'المسلم' عبدالباسط برق کے اخبار 'اڈوائیز ر' اور 'جارج گزٹ' منشی نیاز وارثی کے اخبار 'تاج و بیکلی 'اور 'طوفان میل' بھی اس عہد کے اہم ہفتہ وار اخبار تھے۔

1956 کے بعد منظر عام پر آئے ہفتہ وار اخباروں میں پہلا اخبار ہفتہ وار 'کارواں' ہے۔ جسے بنگلور سے صداقت شعار اور بے باک صحافی محمد عظیم آتش نے 6 / جون 1957 کو جاری کیا تھا۔ بدلتی ہوئی سماجی صورت حال سے ملت اسلامیہ کو ہم آہنگ رکھنا اور سیاسی و سماجی سطح پر ان کی ترتیب و تہذیب اس اخبار کا مقصد تھی۔

کرناٹک میں اردو صحافت کی تاریخ کا سب سے اہم اور روشن نام ہفتہ وار 'نشیمن' ہے۔ اسے ایک دور میں ہندوستان کے سب سے کثیر الاشاعت ہفتہ وار کا اعزاز بھی حاصل رہا ہے۔ اس کا پہلا شمارہ عثمان اسد کی زیر ادارت 26 رجنوری 1962 کو منظر عام پر آیا۔ مسلمانوں میں سیاسی شعور کی بیداری اور انھیں ایک اور نیک دیکھنا، اس اخبار کا مقصد تھا۔ عثمان اسد کی پر خلوص محنت اور پر سوز لگن نے 'نشیمن' کو وہ معیار عطا کیا کہ نہ صرف یہ ہندوستان کا مقبول عام ہفتہ وار بن گیا بلکہ

اس کے مضامین، تبصرے اور تجزیے پاکستان کے موقر روزنامے 'جنگ' میں نقل ہوتے تھے۔ 'نشیمن' کے مدیر عثمان اسد اور ان کے معاون امیر اللہ نظامی کے انتقال کے بعد اس اخبار کی مقبولیت بتدریج کم ہونے لگی۔ نصف صدی سے زائد عرصے سے جاری یہ اخبار بلاشبہ کرناٹک کی اردو صحافت کے باب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

گلبرگہ سے فروری 1971 میں ہفتہ وار 'کونسل' جاری ہوا۔ جس کے مدیر سمیع قتیل تھے۔ 1974 میں ممکور سے نذیر بیگ آرزو نے ہفتہ وار 'لوک' جاری کیا۔ یہ دونوں ہی اخبار اپنے مشمولات اور کتابت و طباعت کے لحاظ سے اوسط درجے کے اخبار تھے۔ ڈاکٹر عبدالقادر نے اگست 1975 میں بنگلور سے 'رہبر ہند' شائع کیا۔ 'جنوبی ہند کی اقلیتوں کا عظیم بے باک ترجمان' کی عبارت کے ساتھ شائع ہونے والا یہ اخبار زیادہ عرصے تک جاری نہیں رہ سکا۔ گلبرگہ سے 1976 میں 'امین جہاں' منظر عام پر آیا۔ اس کے مدیر فعال و نکتہ رس نوجوان ساغر پٹیل تھے۔ کانگریسی نظریات سے متاثر یہ اخبار اپنے محدود مالی وسائل کے باوجود دو سال تک جاری رہا۔ 'اقلیت' رائچور سے 1978 میں نور محمد رتن نے معروف شاعر وحید واجد کے اشتراک سے جاری کیا۔ اقلیتوں کے مسائل کی ترجمانی کا دعویٰ یہ اخبار بھی جلد ہی بند ہو گیا۔

ریاست کرناٹک کے دور افتادہ شہر شموگہ سے عتیق احمد کی زیر ادارت 'ندائے عرفات' 1978 میں منظر عام پر آیا۔ یہ ایک سیاسی، علمی و مذہبی ہفتہ وار تھا۔ بیدر سے 'ہیرو ازم' کا اجرا 1979 میں ہوا۔ اس کے مدیر محمد صدیق تھے۔ ملت اسلامیہ کے سینوں میں دین کے تئیں سچی لگن، خدا کے ذات پر کامل یقین، اطاعت خدا و رسول کے جذبے سے معمور کرنا اس کے مقاصد میں شامل تھا۔

'نشیمن' کے بعد 'سالار' دوسرا ہفتہ وار ہے، جسے اردو حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ سالار پبلی کیشنز ٹرسٹ نے اسے 1980 میں جاری کیا۔ دیدہ زیب طباعت اور پرکشش سرخیوں کے ساتھ یہ اخبار حالات حاضرہ کا مرقع ہوتا ہے۔ متنوع اور قابل مطالعہ مواد اسے اپنے معاصر اخبارات میں منفرد و ممتاز کرتا ہے۔ اس دوران میں 'سالار' کو رسالے کی صورت میں شائع کرنے کا تجربہ بھی کیا گیا۔ اس طرح اسے کرناٹک کے اولین نیوز میگزین کا افتخار بھی حاصل ہے۔

'فلم کار' کرناٹک کا پہلا فلمی اخبار تھا، جسے منشی نیاز وارثی نے 1958 میں جاری کیا۔ اس کے علاوہ کرناٹک سے جاری فلمی اخباروں میں 'فلم ایڈوانس' (انیس احمد، کے این اقبال)، 'فلم ویک' (فرحت کمال)، 'نوازش' (منیر شباب) نے فلمی صحافت کو نیا رنگ عطا کیا۔ ان اخبارات میں فلم نگری کی متنوع اور دلچسپ مصروفیتوں کی تفصیلات، فلم اسٹاروں کے سوانحی گوشے، فلموں کی شوٹنگ، پریمیر شو وغیرہ کا احاطہ کیا جاتا تھا۔

'صدائے سحر' 1980 میں شبیر احمد قدوسی کی زیر ادارت منظر عام پر آیا۔ اس کا مقصد ملت اسلامیہ کی ذہنی تربیت اور صاف ستھرے ادبی ذوق کی نشو ونما کرنا تھا۔ بیدر سے 'آفتاب بیدر' 1982 میں آسمان صحافت پر طلوع ہوا۔ اس سیاسی، مذہبی، علمی اور ادبی ہفتہ وار کے مدیر سید شاہ فرید اللہ علوی تھے۔ گلبرگہ میں اردو صحافت کی تاریخ کا اہم نام 'بہمنی ٹیوز' ہے، جسے عزیز اللہ سرمست نے 1983 میں جاری کیا۔ اس کی اجرا کا مقصد بقول مدیر ''پیشہ ورانہ صحافت کے بجائے سرسید اور مولانا آزاد کے اعلیٰ صحافتی اصولوں کی نمائندگی'' تھا۔ تلخ، ترش اور جارحانہ لب ولہجے کے حامل اداریے اس اخبار کی مقبولیت کے سبب بنے۔

'بلگام سن' شہر بلگام سے 1984 میں منظر عام پر آیا۔ مدیر ریاض بخاری نے اس کے ذریعے قارئین کے سیاسی وسماجی شعور کو بیدار کرنے کی مخلصانہ سعی کی۔ 'عروج ہند' بنگلور کی معروف سیاسی وسماجی شخصیت محمد عبید اللہ شریف کی زیر ادارت 1985 میں مطلع صحافت پر نمودار ہوا۔ اس اخبار نے قومی وریاستی سطح پر مسلمانوں کے مسائل کی جرأت اور بے باکی کے ساتھ ترجمانی کی۔ یہ اخبار کم وبیش آٹھ سال جاری رہا۔

کرناٹک سے جاری ہفتہ وار اخباروں میں ایک اور اہم نام 'ایقان' ہے، جسے صحافت کے وسیع تجربے کے حامل حامد اکمل نے گلبرگہ سے 1986 میں جاری کیا۔ یہ اخبار مدیر کی صالح فکر، غیر جانب دارانہ روش کا آئینہ دار تھا۔ مجاہد آزادی ٹیپو سلطان کی سرزمین منڈیا سے اردو کا پہلا اخبار 'ڈسٹرکٹ لیڈر' کا اجرا آر نور اللہ شریف نے 1986 میں کیا۔ اس کا مقصد فرقہ پرستی، غلط سماجی رسوم اور دیگر لعنتوں کے خلاف ملت کو متحد کرنا تھا۔

کے این اقبال کی ادارت میں 1989 میں منظر عام آیا اخبار 'رہبر سیاست' ہفتہ وار کے

لیے درکار تمام تر خوبیوں سے متصف تھا۔ اسی سال بنگلور ہی سے 'نگوار جنوب' جاری ہوا۔ اصلاح مفاسد اور خدمتِ قوم وملت کے جذبے کے زیر اثر جاری اس اخبار کے مدیر محمد عباس تھے۔

مذکورہ بالا اخبارات کے علاوہ کئی اور ہفتہ وار اخبار کرناٹک سے شائع ہوئے۔ ان میں سے بیشتر تلاش بسیار کے باوجود حاصل نہیں ہو سکے۔ کچھ ایسے ہیں، جنھوں نے نہایت قلیل زندگی پائی اور بعض ایسے بھی ہیں، جنھیں ان کے معیار مزاج کے باعث قابل ذکر نہیں سمجھا گیا۔ ایسے اخباروں میں یہ انسانیت (بیدر)، بنگلور اخبار (بنگلور)، تجدید (گلبرگہ)، تمنا (بنگلور)، تنظیم میسور (میسور)، جناح (بیدر)، چراغ ہند (گلبرگہ)، راچور سماچار (راچور)، رہنمائے کرناٹک (راچور)، شیشہ و تیشہ (بنگلور)، عدل (گلبرگہ)، کلیم الملک (شمکور)، کوثر (میسور)، گاواں (بیدر)، وقت کا پیغام (بیدر) چند ہیں۔

روزنامے:

ریاست کرناٹک میں اردو روزناموں کی روایت کے آغاز کا سہرا کلیم الملک سید غوث محی الدین کے سر ہے، جنھوں نے اپنے مقبول ہفتہ وار 'الکلام' کو روزنامے میں تبدیل کر دیا۔ اس طرح کرناٹک کا اولین روزنامہ 'الکلام' 31/ دسمبر 1925 کو بنگلور سے افق صحافت پر طلوع ہوا۔ اس اخبار کے اجرا کا عہد ذہنی انتشار کا عہد تھا۔ انگریزی سامراج کے خلاف بغاوت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ نئی نئی قوی تحریکیں جنم لے رہی تھیں۔ ان تبدل سے دوچار حالات میں بیدار مغزی، وسیع النظری اور جذبۂ اشاعت علم سے سرشار سید غوث محی الدین نے حالات حاضرہ سے قارئین کو باخبر رکھنے کے علاوہ اردو زبان وادب کی خدمت اور مسلمانوں میں تعلیمی بیداری کو 'الکلام' کے فرائض میں شامل کیا۔ تقریباً چار دہوں پر محیط اس مقبول ترین اخبار کی خدمات تاریخ صحافت میں سنہرے لفظوں میں لکھے جانے کے قابل ہے۔

'الکلام' کے صحافتی اقدار کی پاسداری روزنامہ 'آزاد' نے کی، جسے فروری 1940 میں محمد علی کمال نے جاری کیا تھا۔ تقریباً چالیس سالوں تک اس اخبار نے نہ صرف قارئین کے ذوق اخبار بینی کی آبیاری کی بلکہ قلم کاروں کے ذوق مضمون نگاری اور اخبار نویسی کو بھی مہمیز کیا۔ بنگلور کی صحافتی دنیا کے کئی اہم اور معتبر نام 'آزاد' کے ہی تربیت یافتہ ہیں۔

روزنامہ 'پاسبان' بنگلور کے طول عمر اخباروں میں منارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا اجرا محمد اسماعیل تابش نے حسن ثنیٰ کے اشتراک سے فروری 1946 میں کیا۔ اس اخبار کے بنیادی مقاصد میں جذبۂ آزادی کی بیداری اور مختلف فرقوں میں ہم آہنگی کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ ملتِ اسلامیہ کے تشخص اور اس کے مسائل کی ترجمانی کرنا بھی ہے۔ آج بھی یہ اخبار محمد عبید اللہ شریف کی زیر ادارت شائع ہو رہا ہے۔

ماقبل تشکیل نو، ریاست کرناٹک سے جاری دیگر روزناموں میں روزنامہ بنگلور، خان بہادر عباس خاں، اعلان، محمد خان مارسٹن اور بنگلور اخبار، محمد حسین، واحد علی قابل ذکر ہیں۔

مابعد تشکیل جدید ریاست کرناٹک سے جاری ہونے والے اردو روزناموں میں سب سے اہم 'سالار' ہے۔ جسے اردو کے معروف ادیب و شاعر محمود ایاز نے 2 فروری 1964 کو جاری کیا۔ اس سے قبل محمود ایاز نے سہ ماہی 'سوغات' کے ذریعہ ادبی دنیا میں ہل چل مچادی تھی۔ اب روزنامے کے اجرا کی توسط سے انھوں نے اخباری دنیا میں انقلاب بپا کیا اور اپنی جدت طبع، خوش سلیقگی اور پرسوز لگن سے 'سالار' کو نہایت قلیل عرصے میں ریاست کا مقبول ترین اخبار بنادیا۔ معیاری اداریوں اور عصری مسائل پر عمدہ مضامین اور مختلف نیوز ایجنسیوں سے محصولہ تازہ ترین خبروں سے مزین یہ اخبار انگریزی اور کنڑا اخباروں کا ہم پلہ تھا۔ اس کا ادبی ایڈیشن اتنا بلند معیار ہوتا تھا کہ اسے ملک بھر میں ایک ادبی رسالے کی سی مقبولیت حاصل تھی۔ 1980 میں محمود ایاز سالار سے دستبردار ہوئے اور اخبار کے جملہ حقوق سالار پبلی کیشنز ٹرسٹ نے حاصل کر لیے۔ کچھ عرصے کے بعد یہ اخبار الامین تحریک کے بانی ڈاکٹر ممتاز احمد خان کی زیر نگرانی شائع ہونے لگا۔ آج بھی یہ اخبار الامین تحریک کے زیر اہتمام شائع ہوتا ہے۔ اس کے مدیر اعلیٰ ممتاز مورخ، ادیب، دانشور پروفیسر بی شیخ علی ہیں، جب کہ ادارت کے فرائض افتخار احمد شریف انجام دے رہے ہیں۔

'رہنمائے کرناٹک' بنگلور سے 1969 میں منظر عام پر آیا، اس کے مدیر ڈاکٹر سید عبدالقادر تھے، جنھوں نے صحافت سے غیر معمولی دلچسپی کے سبب اپنے پیشۂ طب کو ترک کیا۔ یہ اخبار ان کے 1987 میں انتقال تک پابندی شائع ہوتا رہا۔

'سلامتی' شمالی کرناٹک کے تاریخی شہر گلبرگہ کا اولین روزنامہ ہے۔ جولائی 1970 میں

جاری یہ اخبار حکیم شاکر اور حامد اکمل کی مشترکہ کوششوں کا ثمرہ تھا۔ صوری معنوی اعتبار سے ایک معیاری اخبار کی صفات کا حامل یہ اخبار پندرہ سال جاری رہ کر بند ہو گیا۔ 2006 میں نئے انتظامیہ کے ساتھ اس کا دوبارہ اجرا ہوا، لیکن زیادہ عرصے تک جاری نہیں رہ سکا۔

شہر میسور کے تجربہ کار صحافی خلیل بے باک نے 1970 میں اپنے ہفتہ وار اخبار 'کوثر' کو روزنامے میں تبدیل کیا۔ یہ روزنامہ اپنے مدیر کی صالح سیاسی فکر اور سماج و معاشرے کے تئیں ان کے واضح مثبت تصور کا آئینہ دار تھا۔

محسن کمال کی زیر ادارت شائع ہونے والے ہفتہ وار 'گاوان' کو 1971 میں روزنامہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ صحافت کی مبادیات سے واقف محسن کمال نے اپنے محدود وسائل کے ساتھ باذوق قارئین کی تشفی کی ممکنہ کوشش کیں۔

شہر میسور سے شائع ہونے والے دیگر روزنامے 'شمس' (نذیر احمد) اور 'آفتاب کرناٹک' (ڈاکٹر شفیع احمد شریف) ہیں، جو بالترتیب 1975 اور 1976 میں منظر عام پر آئے۔ ان کا شمار ضلعی مستقر سے جاری ہونے والے اوسط درجے کے اخبارات میں ہوتا ہے۔

بیدر سے جاری ہونے والے روزناموں میں اہم اخبار 'حیدرآباد کرناٹک' ہے۔ ایم اے حمید نے اسے 1979 میں جاری کیا۔ مقامی روزنامے کی حیثیت کا حامل یہ اخبار بیدر اور اطراف و جوانب کی سیاسی، سماجی، علمی و ادبی سرگرمیوں کا مرقع ہوتا ہے۔

بیلگام سے روزنامہ 'جوہر گفتار' کا پہلا شمارہ ستمبر 1982 میں فاروق حنان کی زیر ادارت شائع ہوا۔ اس سے قبل یہ اخبار ہفتہ وار اور سہ روزہ اخبار کی حیثیت سے شائع ہوا کرتا تھا۔ اس اخبار کو یہ اعزاز ہے کہ یہ ویب آفسیٹ پر طبع ہونے والا کرناٹک کا پہلا اخبار تھا۔ حق کا نقیب اور صداقت کا داعی یہ اخبار طویل عرصہ تک پابندی سے شائع ہوتا رہا۔

'علم بردار' ابتدا میں ہفتہ وار تھا، پھر نومبر 1983 میں اسے روزنامے کی شکل دی گئی۔ معروف صحافی راز امتیاز اس کے مدیر تھے۔ 1984 میں جاری روزنامہ 'بہمنی نیوز' گلبرگہ کا دوسرا روزنامہ ہے۔ اس کے مدیر عزیز اللہ سرمست ہیں۔ بے باک سیاسی و سماجی تجزیے اور مدیر کے جارحانہ طرز نگارش نے بہت جلد قارئین کے حلقوں میں جگہ بنالی۔ اردو زبان و ادب کی ترویج کے

ضمن میں بھی اس اخبار کی خدمات قابل لحاظ ہیں۔

'اردو لیڈر' شام نامہ تھا، جسے عبدالخالق نے 1984 میں جاری کیا۔ ترتیب و تزئین کے اعتبار سے یہ ایک معیاری اخبار تھا۔ 'اعتماد' کو فاروق حنان نے 1985 میں ہبلی سے جاری کیا۔ 'نمودار' بیلگام سے جاری ہونے والا دوسرا روزنامہ تھا، جسے فن کتابت کے ماہر اور صحافتی تجربہ کار واحد حسین نے 1986 میں جاری کیا تھا۔ 'ادبی عکاس' کا اجرا بیدر سے ایس سعید الحسن قادری نے 1984 میں کیا۔ معروف ادیب سلیم تمنائی کی زیر ادارت 'ٹیپو میل' میسور سے 1987 میں منظر عام پر آیا۔ یہ تمام اخبار ضلعی مستقر سے شائع ہونے والے مقامی اوسط درجے کے اخبار ضرور ہیں، لیکن ان کی اردو صحافت کی شمع کو روشن رکھنے کی سعی قابل تحسین ہے۔

'امین وطن' 1982 میں کرناٹک اسلامک پبلی کیشنز بنگلور کے زیر اہتمام جاری ہوا۔ محمد منظور احمد اس کے مدیر تھے۔ ہندستانی اقلیتوں، بالخصوص مسلمانوں کے مسائل، خیالات و جذبات کی ترجمانی کا داعی یہ اخبار سیاسی سرپرستی اور مالی استحکام کے باوجود زیادہ عرصہ جاری نہیں رہ سکا۔

روزنامہ 'سلطان' اردو کمپیوٹر کمپوزنگ پر شائع ہونے والا کرناٹک کا پہلا اخبار ہے۔ ہمہ رنگی دیدہ زیب سرورق سے آراستہ اس کا افتتاحی شمارہ 1990 میں منظر عام پر آیا۔ اس کے مدیر محمد نثار تھے۔ خالص سیکولر اور قومی یکجہتی کے اصولوں پر چلنے کے عزم کے ساتھ جاری کیا گیا یہ اخبار کثیر سرمایے اور صنعتی اصولوں پر چلائے جانے کے باوجود زیادہ عمر نہیں پا سکا۔

گلبرگہ کے ہفتہ وار 'ایقان' کو مدیر حامد اکمل نے یکم/جنوری 2002 کو روزنامہ میں تبدیل کر دیا۔ اپنے طویل صحافتی تجربے کے ساتھ انھوں نے اپنے محدود وسائل کا سلیقے سے استعمال کیا، لیکن زیادہ عرصہ تک اسے جاری نہیں رکھ پائے۔ پھر جون 2016 میں انھوں نے 'ایقان ایکسپریس' کا اجرا کیا۔ ارفع صحافتی اقدار کی مبادیات سے واقف حامد اکمل کی زیر ادارت یہ اخبار اپنی ترتیب و تزئین، خبروں اور مضامین کے انتخاب اور اداریوں کے سبب انفراد رکھتا ہے۔ روزنامہ 'انقلاب دکن' گلبرگہ کی صحافتی تاریخ کا ایک اہم نام ہے، جو ربع صدی سے نہایت پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ محی الدین پاشاہ کی ادارت میں یہ اخبار 1995 میں منظر عام پر آیا۔ ملی اتحاد اور

عوامی مسائل کی ترجمانی کے عزائم کے ساتھ جاری یہ اخبار شمالی کرناٹک کا واحد مقبول اخبار ہے۔

2007 میں سجادہ نشین بارگاہ بندہ نواز کی زیر سرپرستی گلبرگہ سے روزنامہ 'کے بی این ٹائمز' جاری ہوا۔ سید شاہ تقی اللہ حسینی اس کے مدیر ہیں۔ رنگین طباعت کی تمام عصری سہولتوں سے آراستہ یہ اخبار اردو قارئین کے درمیان اپنی جگہ بنانے کے لیے کوشاں ہے۔

شہر شموگہ سے 'آج کا انقلاب' بہ پابندی شائع ہوتا ہے جسے مدثر احمد نے 2009 میں جاری کیا تھا۔ قومی ملی وسماجی مسائل پر اداریے مدیر کے صائب فکر کی غمازی کرتے ہیں۔

روزنامہ 'سیاست' بھی بنگلور کا مقبول روزنامہ ہے۔ ابتدا میں یہ حیدرآباد کے قدیم اور معروف اخبار 'سیاست' کے بنگلور ایڈیشن کے طور پر شائع ہوتا تھا۔ اب یہ آزادانہ طور پر ممتاز سیاسی رہنما آر روشن بیگ کی زیر ادارت شائع ہو رہا ہے۔ سہارا گروپ کے اخبار 'راشٹریہ سہارا' کا بھی بنگلور ایڈیشن شائع ہو رہا ہے۔ اس اخبار نے نہایت کم وقت میں اردو قارئین کی توجہ حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔

ماسبق اور اق میں ریاست کرناٹک سے افق صحافت پر نمودار ہوئے، ان کی روزناموں کا ذکر کیا گیا جنھوں نے صحافتی منظرنامے پر اپنے نقش چھوڑے ہیں۔ ان کے علاوہ جو روزنامے کرناٹک سے شائع ہوئے ان میں نوائے شام (محمود ایاز)، بیدار (عبدالغفار جاسمی)، خانۂ خدا (شریف مصطفیٰ زاہد)، کرناٹک لیڈر (صالح منیر)، صدف ٹائمز (خالد انجم) شہباز (احمد اللہ خان) بنگلور سے شائع ہوئے۔ گلبرگہ سے جاری ہوئے روزنامے گلبرگہ ایکسپریس (خواجہ انور) ہمارا کرناٹک ٹائمز (محبوب علی جگر)، دور حاضر (عبدالعظیم)، بزم سیاست (فیروز زنجانی) سالار دکن (محمد عارف حسین) ہیں۔ آفتاب بیدر، بساط حیات شہر بیدر سے منظر عام پر آئے۔

رسائل وجرائد:

روزناموں اور ہفتہ وار اخباروں کے علاوہ ریاست کرناٹک اردو رسائل وجرائد کی بھی متنوع تاریخ رکھتی ہے۔ 15/اپریل 1875 کو عبدالمجیب کی زیر ادارت پندرہ روزہ 'محافظ' بنگلور کا اجرا کرناٹک میں اردو رسائل کی اشاعت کا نقش اول تھا۔ آٹھ صفحات پر، اخباری صورت میں

شائع ہونے والے 'محافظ' میں مشمولات اور ترتیب و تزئین کے اعتبار سے ایک رسالے کی تمام خوبیاں موجود تھیں۔ عبدالحفیظ آرام نے خواتین میں سماجی، تعلیمی اور اخلاقی شعور پیدا کرنے کے مقصد سے 1880 میں ماہ نامہ 'ترغیب' کا اجرا کیا۔ یہ رسالہ خواتین کے لیے مختص رسائل کے باب میں اپنی پہچان رکھتا تھا۔ کرناٹک کا اولین گلدستہ 'شمع سخن' 1884 میں بنگلور کے ممتاز شاعر عبدالحق تحقیق کی زیر ادارت منظر عام پر آیا۔

ماہ نامہ 'صبح بہار' خالص ادبی و علمی نوعیت کا رسالہ تھا، جسے مولوی محمد علی نے مئی 1906 میں بنگلور سے جاری کیا۔ مشاہیر شعرا و ادبا کی تخلیقات سے یہ رسالہ مزین ہوتا تھا۔ علمی، ادبی، تاریخی اور تمدنی مضامین کا مرقع ماہ نامہ 'ستارۂ میسور' جنوری 1925 میں محمد سلیمان پرواز کی زیر ادارت منظر عام پر آیا۔ اصلاحی مقاصد اور اردو زبان و ادب کی خدمت کے جذبے سے سرشار ماہنامہ 'کوثر' کا اجرا محمود خان محمود نے کیا۔ ابوضیا عزیز نے اگست 1940 میں ماہ نامہ 'فانوس' جاری کیا۔

صمد شاہین اور ممتاز شیریں نے اگست 1944 میں ماہ نامہ 'نیا دور' جاری کیا۔ اس ماہ نامہ کا شمار برصغیر کے صف اول کے ادبی رسالوں میں ہوتا ہے۔ افتتاحی شمارے میں مدیران نے رسالے کے اجرا کے مقاصد کا اظہار اس طرح کیا ہے:

> ''نیا دور، کے پیش نظر جو مقصد ہے، وہ معیاری ترقی پسند ادب کی اشاعت ہے، چونکہ ادب کا زندگی سے تعلق ناگزیر ہے۔ 'نیا دور' اس معاملے میں کبھی مصالحت نہیں کرے گا کہ مقصد کی خاطر فن بھینٹ چڑھ جائے یا بغیر مقصد کے فن ہی فن کا خول رہ جائے۔''

1948 میں صمد شاہین اور ممتاز شیریں کی پاکستان ہجرت تک 'نیا دور' کے چودہ شمارے شائع ہوئے۔

مذہبی ماہ نامہ 'الاسلام' کا اجرا ابوالفضل محمد حسین فیضی نے کیا۔ جس میں قرآن و احادیث، تصوف، اسلامی تاریخ و تمدن پر مضامین شائع کیے جاتے تھے۔ ماہ نامہ 'رفیق' بیجاپور سے نومبر 1953 میں منظر عام پر آیا اس کے مدیر سید سراج الدین قاضی تھے۔ علمی و ادبی مضامین،

افسانے ادبا و شعرا کے تعارف نامے، غزلیں اور اصلاحی و ناصحانہ نوعیت کی نظمیں اس میں جگہ پاتی تھیں۔ شہر گلبرگہ سے 1956 میں اکرام صہبائی، قاضی حسام الدین اور عظیم یوسف زئی نے ماہنامہ 'گلبرگ' کا اجرا کیا۔ خالص ادبی نوعیت کے اس رسالے کے مشمولات اس کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی کی مظہر ہیں۔

مذکورہ بالا رسائل کے علاوہ ماقبل تشکیل جدید منظر عام پر آئے ان ماہناموں کے نام بھی مختلف کتابوں میں درج ہیں۔ آفتاب/عبدالباسط نور، جلوۂ سخن/شرف الدین سلیم، رسالہ حبیب/غلام محمد شوکت، رسالہ دلسوز/قادر شریف صابر، روزی روزگار/محمد غوث کولاری، غزل/شہاب درانی، سحاب/بلی راقبال سگری، انجمن/میسور/سلیم تمنائی۔

ریاست کرناٹک کی تشکیل نو کے بعد منظر عام پر آنے والے رسائل میں سب سے اہم رسالہ دو ماہی 'سوغات' ہے۔ 'نیا دور' کے بعد 'سوغات' واحد رسالہ ہے، جسے ساری اردو دنیا میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ اردو کے معتبر صحافی، شاعر اور نقاد محمود ایاز نے اسے جنوری 1959 میں جاری کیا تھا۔ 'سوغات' نے اصول و معیار کے معاملے میں مفاہمت کیے بغیر ہر تحریک و رجحان اور ادبی گروہ بندیوں سے خود کو آزاد رکھا۔ اس نے اردو دنیا کو جدید ادبی رجحانات سے روشناس کرانے میں غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔

سیدہ ذکریٰ بتول کرناٹک کی پہلی خاتون صحافی ہیں۔ انھوں نے 1958 میں خواتین کے لیے ماہنامہ 'ذاکر' جاری کیا اور خواتین میں مذہبی، اخلاقی اور تعلیمی شعور بیدار کرنے کی سعی بلیغ کی۔ شہر گلبرگہ سے آستانہ بندہ نوازؒ کے زیر اہتمام علمی و مذہبی ماہنامے 'شہباز' کا اجرا فروری 1960 میں عمل میں آیا۔ احکامات ربانی اور ارشادات نبوی کی اشاعت، اولیائے کرام کی عظمت و احترام کی تعلیم، نوجوانوں میں جذبۂ ایمانی پیدا کرنا، حضرت بندہ نوازؒ کی حیات افروز تعلیمات کی تشہیر اس رسالے کے مقاصد میں شامل تھا۔ سید سفیر اللہ حسینی اور سید خسرو حسینی اس کے مدیران تھے۔ یہ رسالہ لگ بھگ پندرہ سال پابندی سے شائع ہوتا رہا۔

'چراغ نو' یادگیر سے اور 'افشاں' بیلگام سے بالترتیب غلام محبوب اور نثار اختر کی زیر ادارت 1962 اور 1967 میں جاری ہوئے۔ صوری اور معنوی اعتبار سے معمولی درجے کے یہ

رسالے اس لیے اہم ہیں کہ نئے مقامی قلم کاروں کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارنے کی ان رسالوں نے کوششیں کیں۔ ریاست کرناٹک کے مشہور شاعر وحید واجد نے 1972 میں رائچور سے ماہنامہ 'نجات' کا اجرا کیا۔ نیم ادبی اور فلمی رسالہ ماہنامہ 'الفاظ' شکیل مظہری کی زیر ادارت مئی 1970 میں منظر عام پر آیا۔ معروف اہل قلم کی شعری و نثری تخلیقات کے علاوہ اس رسالے کے کچھ صفحات فلمی دنیا سے متعلق مضامین کے لیے مختص ہوتے تھے۔ پندرہ روزہ 'محنت' کا اجرا حکیم شاکر نے 1970 میں گلبرگہ سے کیا۔ ریاستی، ملکی اور بین الاقوامی سیاسی و سماجی صورت حال پر تجزیے و تبصرے اس اخبار نما رسالے کی خصوصی پہچان تھے۔

'گڈی' ایک فلمی و ادبی ماہنامہ تھا، جسے اے آر حمید نے بنگلور سے اگست 1972 میں جاری کیا۔ اس کے علاوہ دیگر فلمی رسائل پندرہ روزہ 'خوبصورت' (عظیم اللہ خاں 1983)، شیشم (فرحت کمال 1987) بھی بنگلور سے منظر عام پر آئے، جن میں فلموں سے متعلق مضامین، فلمی شخصیتوں کے انٹرویو وغیرہ اہتمام سے شائع کیے جاتے تھے۔ ان رسائل کا ادبی حصہ بھی جان دار ہوا کرتا تھا۔ لیکن یہ تینوں رسائل کچھ عرصے تک ہی جاری رہ سکے۔

'درماں' ریاست کرناٹک کا واحد ادبی ماہنامہ کے سرنامے کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ اس کے مدیر سید ضیا اللہ تھے۔ مشہور و معروف ادبا و شعرا کی تخلیقات، ادبی لطائف، کتابوں پر تبصرے اس اخبار کی زینت ہوتے تھے۔

کرناٹک سے جاری مذہبی رسائل میں نور و نار (اظہار افسر، 1947) تسخیر انسانیت (مظہر علی خان اشرفی 1975 نشتر (نواب رضا خیری بندہ نوازی 1977)، العہید (محمد نور اللہ عبیدی 1978) سلسبیل (اشرف سعودی 1981)، صدائے سحر (شبیر احمد منظر قدوسی 1982)، اسلامی مشغلے (ڈاکٹر پی آر رشید احمد 1983) بنگلور سے جاری ہوئے۔ گلبرگہ سے جاری مذہبی ماہناموں میں نوائے سرمست (عزیز اللہ سرمست 1981) انوار جلالیہ گوگی شاہ پور (سید محمد یوسف حسینی 1993) قابل ذکر ہیں۔

شہر ہبلی سے ماہ نامہ 'تحریک ادب' اور پندرہ روزہ 'ہبلی ٹائمز' بالترتیب 1971 اور 1975 میں منظر عام پر آئے۔ یہ دونوں ہی رسائل مقامی علمی، ادبی اور تعلیمی سرگرمیوں

کے آئینہ دار ہوتے تھے۔

ریاست کرناٹک کے معروف طنز و مزاح نگار محبوب بڑائی نے 1975 میں دھارواڑ سے 'کرناٹک پنچ' کا اجرا کیا۔ ریاست کے اردو عوام کی ادبی، سماجی، علمی اور قومی زندگی کی عکاسی کا دامن یہ اخبار، مدیر کی ادبی، سیاسی و سماجی بصیرت کا مظہر تھا۔ یہ اخبار کم و بیش ایک دہے تک جاری رہا۔ دھارواڑ ہی سے 1979 سے ماہنامہ 'اعتماد' جاری ہوا۔ اس کے مدیر معین الدین ملا تھے۔ اردو زبان و ادب کی بقاو ترویج کے مقصد سے جاری کیے گئے اس رسالے میں شعر و ادب کے علاوہ اصلاحی اور معلوماتی مضامین بھی شائع کیے جاتے تھے۔

گلبرگہ سے جاری ادبی رسائل میں واردات (خالد سعید 1980) شعلۂ نوا (خلیل مجاہد 1982) نوائے عصر (انیس صدیقی 1982) اور استعارہ (خورشید وحید 1985) اہم ہیں۔ یہ سارے رسائل خالص ادبی نوعیت کے تھے۔ مقامی فنکاروں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے سربرآوردہ ادبا و شعرا کی تخلیقات ان کی زینت ہوتی تھیں۔

شاعر ادیب و صحافی عادل ادیب کی زیر ادارت 1978 میں بنگلور سے پندرہ روزہ 'صدرنگ' منظر عام پر آیا۔ مدیر نے رسالے کی اجرا کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ یہ اردو کی ترقی و بقا کا ضامن ہوگا۔ ادبی تخلیقات کے علاوہ اس میں مسلم دنیا کی اہم خبروں اور ان پر تجزیوں کی اشاعت کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ یہ رسالہ کرناٹک کے ان طول عمر رسائل میں سے ایک ہے، جنھوں نے ایک دہے سے زیادہ عمر پائی۔ کولار سے 1979 میں پندرہ روزہ 'صدائے مومن' کا اجرا عمل میں آیا۔ سیاسی نوعیت کا یہ اخبار رسالہ اپنے عہد کی سیاسی سرگرمیوں کا مرقع تھا۔ کسی سیاسی نظریے سے وابستگی کے بغیر حق و صداقت کے جذبے سے متصف تحریریں اس کی وقعت میں اضافہ کرتی تھیں۔

ریاست کرناٹک کو اردو صحافت کی تاریخ میں اس بات کا بھی افتخار حاصل ہے کہ اسپورٹس سے متعلق اردو کا اولین رسالہ 'کھیل کی دنیا' یہیں سے شائع ہوا۔ پندرہ روزہ 'کھیل کی دنیا' 5 نومبر 1982 کو سید عسکر واسطی کی زیر ادارت منظر عام پر آیا۔ عسکر واسطی کی کھیل کود سے دلچسپی اور بنگلور کے اخبارات کے لیے کھیل کود سے متعلق صفحات کو ترتیب دیتے ہوئے انھیں

احساس ہوا کہ اردو میں صرف کھیل کود کے لیے مختص رسالے کا فقدان ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس رسالے کا اجرا کیا۔ یہ رسالہ اپنے مشمولات اور ترتیب وتزئین کے اعتبار سے معاصر انگریزی اسپورٹس میگزینوں کی طرح اردو کا مکمل اسپورٹس میگزین تھا۔ لیکن چند ماہ ہی جاری رہ کر یہ منفرد رسالہ معاشی مسائل کا شکار ہو کر بند ہو گیا۔

کھیل کود کی طرح جرائم کے موضوع پر اردو میں رسائل عنقا ہیں۔ اس جانب عبید اللہ شریف نے توجہ کی اور 15/مارچ 1987 کو ریاست کا جنس وجرائم سے متعلق پہلا اردو پندرہ روزہ 'کرائم انفارمر' جاری کیا۔ اسم بامسمیٰ اس اخبار میں مختلف النوع جرائم کی خبریں تصاویر کے ساتھ شائع کی جاتی تھیں۔ اسی نوعیت کے رسالہ 'کرائم رپورٹر' کا اجرا بنگلور کے معروف کرائم رپورٹر خالد انجم نے کیا تھا۔

سید ذکریٰ بتول کے بعد فریدہ رحمت اللہ اسا کرناٹک کی دوسری خاتون صحافی ہیں۔ انھوں نے جنوری 1989 میں اردو زبان وادب کی ترقی وترویج اور صالح وصحت مند ادب کو عام کرنے کی غرض سے ماہنامہ 'زرین شعاعیں' کا اجرا کیا۔ شعر وادب کے ساتھ مذہب اور امور خانہ داری سے متعلق مفید مواد کی اشاعت کے سبب اس رسالے نے نہایت قلیل عرصہ میں ملک گیر سطح پر اپنی پہچان بنائی اور اجرا سے لے کر آج تک ہر ماہ پابندی سے شائع ہو کر ایک نئی مثال قائم کی ہے۔

ریاست کرناٹک کی اردو اکادمی کا سہ ماہی ترجمان 'اذکار' اور ممتاز شاعر خلیل مامون کی زیر ادارت شائع ہونے والے 'نیا ادب' اور دھارواڑ سے افروز کاٹھیواڑی کی زیر ادارت جاری سہ ماہی 'خرمن' کا شمار بھی کرناٹک سے جاری اردو کے موقر رسائل میں ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا رسائل وجرائد کے علاوہ کئی اور رسائل کرناٹک سے منصۂ شہود پر آئے۔ ان میں سے کئی نایاب ہیں تو کچھ اپنے معیار ومزاج کے اعتبار سے قابل ذکر نہیں ہیں۔''

مجموعی طور پر کرناٹک کی اردو صحافت کے اس تحقیقی جائزہ کا ماحصل یہ ہے کہ یہاں کی اردو صحافت کا نگار خانہ جہاں زیرک اور طباع صحافیوں سے بھرا پڑا ہے وہیں زیادہ تعداد ایسے صحافیوں کی بھی ہے، جنھوں نے صحافت کی باقاعدہ تربیت حاصل نہیں کی ہے یا انھیں صحافت کے

تمام تکنیکی پہلوؤں کا گہرا شعور نہیں ہے۔ ان میں سے اکثر خود رو پھول ہیں یا پھر روزگار کی پریشانیوں سے تنگ آ کر اخبار نویس ہو گئے۔ بہر حال یہ بھی غنیمت ہے کہ انھوں نے اردو اور اردو صحافت سے وابستہ ہو کر اردو صحافت کی شمع کو مزید روشن کرنے کی مقدور بھر سعی کی۔

آخر میں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ اس تحقیقی جائزے کے لیے مواد کی فراہمی کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے۔ تاہم اس میں کسی اخبار رسالے کا نام شامل ہونے سے رہ گیا ہو یا کسی اخبار رسالے سے متعلق واقعاتی غلطی در آئی ہو تو اسے میری کم علمی اور تحقیق کی دشواریوں سے محمول کریں۔

حوالے غیر مطبوعہ:

1- سعید، محمد عبدالخالق میسور میں اردو، ص 76

2- عبداللیث صدیقی، آج کا اردو ادب، ص 22

3- عبدالغفار شکیل، محمد حیدر علی اور ٹیپو میں اردو (مقالہ) (مطبوعہ: نوائے ادب، ممبئی ستمبر 1957، ص 56)

4- سعید محمد عبدالخالق، میسور میں اردو، ص 77

5- سید محمد اشرف، اختر شہنشاہی (سوانح عمری اخبارات) ص 190

6- گارساں دتاسی، خطبات گارساں دتاسی، ص 344

7- سید محمد اشرف، اختر شہنشاہی (سوانح عمری اخبارات) ص 248

8- گارساں دتاسی، خطبات گارساں دتاسی، ص 341

(ض) مدھیہ پردیش

مدھیہ پردیش میں اردو صحافت

عارف عزیز

ریاست مدھیہ پردیش کی جن چار یونٹوں سے مل کر تشکیل ہوئی ہے، ان میں بھوپال ریاست، مدھیہ بھارت، وندھیہ پردیش اور مہاکوشل شامل ہیں۔ آزادی سے قبل اور اُس کے بعد تک یہاں اردو کا رواج تھا خاص طور پر سابق بھوپال ریاست اور مدھیہ بھارت میں اردو مقامی عوام کی زبان تھی اس ہندی بھاشی ریاست کا قیام 1956 میں لسانی ریاستوں کی تشکیل کے وقت ہوا، لیکن اس کے چاروں یونٹوں میں جغرافیائی قربت پہلے سے موجود تھی اور اسی لیے پچاس سال سے زیادہ عرصہ تک یہ ایک منظم و متحد ریاست کی حیثیت سے ہندوستان کے نقشہ پر قائم رہی، بعد میں اس کے دو حصے مدھیہ پردیش اور چھتیس گڑھ ہو گئے۔

مدھیہ پردیش میں اردو صحافت کی ابتدا انیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں اندور سے ہوئی، ڈاکٹر محمد نعمان خاں کے بقول:

> ''مدھیہ پردیش کا سب سے قدیم اور معلوم اخبار ہفتہ وار ''مالوہ اخبار'' ہے جو مہاراجا اندور اور مسٹر ہیملٹن ریزیڈینٹ آف اندور کی زیر سرپرستی،

زیرِ ادارت دھرم نرائن 1849 میں اندور سے جاری ہوا، آٹھ صفحات پر مشتمل اس اخبار کے ایک کالم میں اردو اور دوسرے کالم میں ہندی میں خبریں شائع ہوتی تھیں، جن کا تعلق اندور کے علاوہ گردونواح کی دیگر ریاستوں سے بھی تھا، جناب عتیق احمد صدیقی نے اپنی کتاب ''صوبہ شمال ومغربی کے اخبارات ومطبوعات'' صفحہ 77 میں ''مالوہ اخبار'' کی چھ سالہ اشاعت کا نقشہ پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ اخبار تقریباً 6 سال 1855 تک پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ مدھیہ پردیش کا دوسرا قدیم اخبار ''گوالیار اخبار'' ہے۔ یہ سرکاری اخبار 1853 میں لکشمی پرشاد کی زیرِ ادارت گوالیار سے جاری ہوا، دو کالم پر مشتمل اس اخبار میں بھی ہندی، اردو دونوں زبانوں میں خبریں شائع ہوتی تھیں''۔

(ڈاکٹر محمد نعمان خاں: ''بھوپال ادب کے آئینے میں''، صفحہ: 97-98، 1994)

مدھیہ پردیش کے قدیم اخبارات و رسائل میں 'رتن پرکاش' (رتلام)، 'محتشم جاورہ' (جاورہ) کے علاوہ 'افتخار' اور 'انتخاب' شامل ہیں۔ 'رتن پرکاش' اِتنا معیاری جریدہ تھا کہ اُس کے مضامین 'اودھ اخبار' اور 'اخبار عالم' میں نقل ہوئے، 'حسنِ خیال' سیہور سے علامہ محوی صدیقی کی نگرانی میں نکلا اور 'اخلاق' گوالیار سے عبدالغفور کی زیرِ ادارت 36 سال تک شائع ہوتا رہا۔ بھوپال سے منظرِ عام پر آنے والا پہلا مطبوعہ اور دستیاب اخبار ہفت روزہ 'عمدۃ الاخبار' ہے، جو حکیم اصغر حسین اخگر نے 1871 میں شروع کیا، عبدالسلام خورشید کی تحقیق کے مطابق یہ کئی سال تک شائع ہوتا رہا، لیکن 'عمدۃ الاخبار' سے پہلے بھی ایک قلمی اخبار کا سراغ ملتا ہے جو 1857ء کی جنگ آزادی کے دوران ولی شاہ نامی ایک باغی سپاہی نے نکالا تھا۔ مظفر رئیس اپنے مضمون مطبوعہ ہفت روزہ 'ایاز' (بھوپال نمبر) 1972 میں لکھتے ہیں کہ ''اس بے نام اخبار میں ولی شاہ روزانہ حالات حاضرہ پر ایک تازہ مضمون تحریر کر کے اپنے ساتھی سپاہیوں کو سناتا تھا اور اسے بھوپال کا پہلا بے باک صحافی تسلیم کیا جا سکتا ہے''۔ عتیق احمد صدیقی نے ''بھوپال اخبار'' کے نام سے ایک اور اخبار کی اشاعت کا حوالہ دیا ہے لیکن اس کا کوئی شمارہ دستیاب نہیں۔

مذکورہ اخبارات کے علاوہ بھوپال سے منظرِ عام پر آنے والے اخبارات و رسائل میں ہفت روزہ 'دبیر الملک'، 'صداقت'، 'موجِ نربدا'، 'ہلال'، 'مظفری'، 'اخترِ ہند'، 'صفیر عام'، 'صبحِ وطن'، 'مزدور'، 'شاہ کار'، 'آواز'، 'رہبرِ وطن'، 'عرفان'، 'شاہکار'، 'نیا بھوپال' اور 'مالوہ ریویو' اہمیت کے حامل ہیں۔ آخر الذکر اخبار 1913 میں نکلا، اس کے مدیر معروف مؤرخ سید محمد یوسف قیصر اور کامدار عبدالتین تھے۔ اس زمانے میں 'والا جاہی' (مدیر امجد علی اشہری)، 'گلبنِ سخن' (عبدالشکور اخلاص)، 'گلِ رعنا' (نورالحسن سارنگ پوری)، 'سیر منیر' (ارجمند محمد خاں)، 'ظل السلطان' (محمد امین زبیری)، 'الریاض' (ریاض الدین)، 'محسن الملک' (حامد سعید خاں)، 'نگار' (نیاز فتح پوری)، 'جادہ' (کوثر چاند پوری) جیسے ادبی رسائل کی اشاعت بھی ہوئی، بھوپال ریاست کی آخری بیگم نواب سلطان جہاں تعلیم نسواں اور خواتین کی بیداری کی زبردست حامی تھیں لہٰذا ان کی تحریک پر خواتین کے کئی رسائل شائع ہوتے رہے۔ 'الحجاب'، 'بانو'، 'امہات' اور 'آفتابِ نسواں' نے ملک گیر شہرت و مقبولیت حاصل کی، اسی دور کا اہم رسالہ 'ندیم' ہے جو 1922 میں سعید اللہ خاں رزی نے شروع کیا۔

اس لحاظ سے مدھیہ پردیش کی اردو صحافت کی تاریخ ہندوستان کے تناظر میں 27 برس پیچھے ہے تاہم 2016 تک کوئی 167 سال پر پھیلی ہوئی ہے، مادھو راؤ سپرے سنگھرالیہ بھوپال کی مرتبہ فہرست ''مدھیہ پردیش میں اردو اخبارات'' از شوکت رموزی، مطبوعہ 1989 کو پیشِ نظر رکھا جائے تو اس عرصہ میں پورے مدھیہ پردیش سے بحیثیت مجموعی 301 اردو کے اخبارات و جرائد شائع ہوئے، جن میں سے اگست 1947 تک منظرِ عام پر آنے والے اخبارات میں 3 روزنامے، ایک سہ روزہ، 78 ہفت روزہ، 9 پندرہ روزہ، 28 ماہنامے، 2 سالنامے (ان کی مجموعی تعداد 121 ہوتی ہے) شامل ہیں۔ مذکورہ اخبارات و رسائل میں سے 88 کی اشاعت بھوپال سے ہوئی اور باقی 33 ریاست کے دوسرے شہروں سے نکلتے رہے، اس طرح ملک کی آزادی تک اردو اخبارات نے یہاں کی سیاسی و سماجی ترقیات میں بھرپور حصہ لیا اور اپنا ایک مقام بنایا۔

اردو صحافت آزادی کے بعد:

مدھیہ پردیش میں اردو صحافت کا یہ کارواں آزادی کے بعد بھی پوری سرگرمی کے ساتھ رواں دواں رہا اور 69 سالہ مدت (1947-2016) میں ریاست کے دارالحکومت بھوپال اور دیگر

شہر گوالیار، جبلپور، سیہور، کھنڈوہ، اندور، مہو، رتلام، برہانپور، ساگر، شیوپوری، بلاسپور، جاورہ، سرونج وغیرہ میں اخبارات کی جو اشاعت ہوئی، ان کی مجموعی تعداد اگرچہ 204، لیکن 165 صرف بھوپال سے منظرِ عام پر آئے اور مدھیہ پردیش بننے سے پہلے یا بعد میں بھوپال ہی اردو صحافت کے سب سے بڑے مرکز کی حیثیت سے اُبھرا، جہاں سے 2016 میں بھی روزنامے ہفت روزہ، پندرہ روزہ، ماہنامے اور سہ ماہی نکل رہے ہیں۔ 1935 سے ہفت روزہ کی حیثیت سے شروع ہونے والے ''ندیم'' کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ 1938 سے یہ اخبار روزنامہ ہوگیا اور مسلسل شائع ہو رہا ہے، اسے بھوپال کا پہلا روزنامہ اور 1949 تک ریاست کا نیم سرکاری اخبار بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے ایڈیٹروں میں محمود الحسن صدیقی، ڈاکٹر تیموری، حکیم سید قمر الحسن اور قمر اشفاق کے نام شامل ہیں۔ اکیاسی سال سے مسلسل شائع ہونے کا اعزاز بھی اسے حاصل ہے۔

بھوپال سے منظرِ عام پر آنے والا دوسرا قابلِ ذکر روزنامہ 'افکار' ہے، جو آزادی سے پہلے 1945 سے 1946 تک ادبی ماہنامے کی حیثیت سے نکل کر بند ہوگیا۔ 1951 میں دوبارہ روزنامہ کی حیثیت سے اے آر رشدی اور اشتیاق عارف کی ادارت میں شروع ہوا اور چوبیس سال تک مسلسل شائع ہوکر 1976 میں تین ماہ کے لیے اس کی اشاعت موقوف ہوگئی، سہ بارہ صغیر بیدار اور عیسیٰ صدیقی کی زیرِ ادارت صبح کے اخبار کی حیثیت سے نکلنے لگا، درمیان میں دوبارہ اشتیاق عارف اور کچھ عرصہ کے لیے مقصود عمرانی اس کے ایڈیٹر رہے۔ 'افکار' کا آخری دور 1986 میں راقم (عارف عزیز) کی ادارت میں شروع ہوا لیکن ملکیت کے ایک تنازعہ کا شکار ہوکر سوا سال میں بند ہوگیا۔

آزادی کے بعد مدھیہ پردیش سے تیسرا روزنامہ 1963 میں صنعتی شہر اندور سے شائع ہوا، اس کے ایڈیٹر عبدالغفور مجاہد اور اداریہ نگار عزیز اندوری تھے۔ 14X50 کے سائز پر یہ تین سال 1966 تک جاری رہا، روزنامہ 'الحمرا' کو 1946 میں ڈاکٹر خلیل بدر بطور ہفت روزہ نکال چکے تھے، تین سال بعد انھوں نے اسے دوبارہ روزنامہ کی حیثیت سے شروع کیا، لیکن بھوپال ریاست میں اس وقت چیف کمشنری راج نافذ ہوگیا تھا لہٰذا اخبار پابندیوں کا مقابلہ نہیں کرسکا اور بند ہوگیا، 'الحمرا' کا تیسرا دور سید محمود الحسینی کی ادارت میں 1978 تک جاری رہا، عوامی اخبار کی حیثیت سے

اسے مقبولیت بھی ملی لیکن بھاسکر گروپ کا اعلیٰ وسائل یافتہ روزنامہ 'آفتاب جدید' شائع ہوا تو 'الحرا' اس کا مقابلہ نہ کر سکا اور مجبوراً اسے بند کرنا پڑا۔ 'الحرا' کو چار سال قبل 2012 میں جاوید یزدانی نے چوتھی مرتبہ نکالا لیکن دو سال بعد اس کی اشاعت موقوف ہو گئی۔

مدھیہ پردیش کی اردو صحافت میں جس اخبار نے دھوم مچادی وہ 'آفتاب جدید' ہے جو سینئر صحافی اشتیاق عارف کی زیر ادارت 1978 میں طلوع ہوا، آٹھ ماہ بعد اخباری عملہ کی ہڑتال کے نتیجہ میں ادارتی ذمہ داریاں سید محمود الحسینی کو منتقل ہو گئیں اور صرف ایک ماہ بعد محمود الحسینی کے اچانک انتقال پر غضنفر علی خاں کے نام بظاہر ایڈیٹر کا قرعہ فال نکلا لیکن عملاً ادارتی ذمہ داریاں تین ماہ مولانا شرقی خالدی، تین سال مفتی جنید صدیقی اور آخر میں کچھ عرصہ مقصود عمرانی نبھاتے رہے، یہاں تک کہ اگست 1986 میں وسیع سرکولیشن اور اعلیٰ معیار کے باوجود یہ اخبار اس کے مالک اگروال خاندان کے فیصلے سے اچانک بند ہو گیا کیونکہ ادارتی عملہ اور مالکان کے درمیان اخبار کی پالیسی کو لے کر اختلاف پیدا ہو گیا تھا، آخر زمانہ میں ایک پرانے صحافی ادیناش چندر رائے کو اخبار کا ایڈمنسٹریٹر بنایا گیا لیکن اردو داں ہوتے ہوئے بھی وہ اخبار کی پالیسی پر کنٹرول نہیں کر سکے، اس اخبار کا دوسرا دور 1987 میں شروع ہوا۔ مقصود عمرانی، دیوی سرن، اقبال مسعود اور ظفر صہبائی نے یکے بعد دیگرے ایڈیٹر کے فرائض انجام دیے لیکن یہ اخبار جس کا ماضی شاندار تھا، دوسرے دور میں پرانا معیار قائم نہیں رکھ سکا اور 1998 میں بند ہو گیا، آفتاب جدید میں راقم (عارف عزیز)، انعام اللہ لودھی، اقبال مسعود، مسلم سلیم، عمر فاروق ندوی اور خالدہ بلگرامی جیسے تازہ دم صحافی کام کر کے صحافت میں اپنی شناخت قائم کر چکے ہیں۔ اس زمانے میں اردو اخبارات کی لیتھو پر طباعت کا چلن تھا، لیکن آفتاب جدید روٹری آفسیٹ پر شائع ہوا اور یو این آئی، پی ٹی آئی کی سروس بھی اُسے دستیاب رہی۔

آزادی کے بعد مدھیہ پردیش کا چھٹا اور بھوپال کا پانچواں روزنامہ 'بھوپال ٹائمز' 26 جنوری 1988 کو منظر عام پر آیا، یہ اخبار اپنی صوری اور معنوی خوبیوں کے باعث یاد رکھا جائے گا۔ مولانا حبیب ریحان ندوی نے اس کے چیف ایڈیٹر، رضوان خاں نے ایڈیٹر اور راقم (عارف عزیز) نے جوائنٹ ایڈیٹر نیز ایڈیٹوریل نگار کے علاوہ ایڈیٹنگ کے جملہ فرائض انجام دیے، بعد

میں یہ بھوپال کے پہلے رنگین ہفت روزہ کی حیثیت سے بھی چھ ماہ 1990 تک نکلتا رہا۔

آزادی کے بعد بھوپال سے نکلنے والا چھٹا اور قابلِ ذکر روزنامہ 'اردو ایکشن' ہے جو 1983 سے ڈاکٹر ماجد حسین کی ادارت میں بطور ہفت روزہ شروع ہوا۔ بارہ سال بعد 1995 میں روزنامہ ہوگیا، اس میں حامد حسن شاد مرحوم، خلیق صدیقی اور مشاہد سعید نے کام کیا، اخبار کا ضخیم 'بھوپال نمبر' 1996 میں شائع ہوا ہے۔

مذکورہ روزناموں کے علاوہ بھوپال سے 'پرچم نو' 1949، 'پیام' 1951، 'حقیقت' 1951، 'خورشید' 1954، 'نیا بھوپال' 1954 بھی شائع ہوئے لیکن 'نیا بھوپال' کو ہی کچھ استحکام ملا جبکہ 'حق و انصاف' 1998، 'یلغار ٹائمز' 2008 'پردیش کی خبریں' 2014 'اخبار مشرق' 2015 فی الحال شائع ہو رہے ہیں، 'اخبار مشرق' سال گذشتہ سے بھوپال میں شروع ہوا ہے لیکن اس کے کلکتہ، دہلی، لکھنؤ سمیت سات ایڈیشن دوسرے شہروں سے نکل رہے ہیں۔

جہاں تک مدھیہ پردیش سے ہفت روزہ اخبارات کا تعلق ہے تو آزادی کے بعد کئی اخبارات نکلے جن میں 'نئی راہ'، 'ترجمان'، 'نیا سماج'، 'راہی'، 'نیا دور'، 'بھوپال پنچ'، 'ایاز'، 'رفتار'، 'الجبل' قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ اخبارات میں 'بھوپال پنچ'' اودھ پنچ' لکھنؤ کی طرح طنز و مزاح کے لیے مخصوص تھا، اسے معروف طنز و مزاح نگار عبدالاحد خاں تخلص بھوپالی نے نکالا اور مقبول بھی ہوا لیکن زندگی نے وفا نہیں کی، تین سال قہقہے اور مسکراہٹیں بکھیر کر 1993 میں بند ہوگیا، دوسرا 'ایاز' عارف بیگ نے 1972 میں شروع کیا، ایمرجنسی کے بعد اشفاق مشہدی ندوی اسے ایڈٹ کرتے رہے اور 28 سال شائع ہوا، 'رفتار' محفوظ منظر کی ادارت میں نکلا، 1984 تک جاری رہا، 'الجبل' سہیلے جوہر قریشی نے بعد میں محمد ارتضیٰ نے نکالا، اس عرصہ میں مدھیہ پردیش کے دوسرے شہروں سے بھی متعدد اخبارات و رسائل منظرِ عام پر آئے جن میں قابل ذکر 'آفتابِ مالوہ' اور 'شعلہ و شبنم' (اُجین)، 'تان سین' (گوالیار)، 'سفیرِ مالوہ'، 'امیرِ احرار' اور 'شاخیں' اندور، 'نئے چراغ'، 'بہارستان' اور 'طلسم حرف' (کھنڈوہ)۔ کھنڈوہ کے مذکورہ رسائل میں 'نئے چراغ' 1959 میں مظفر حنفی کی ادارت میں نکلنے والا ایک معیاری ادبی جریدہ تھا۔ 'شجر' اور 'آئینہ' (برہانپور)، 'اوراک' (شیوپوری)، 'گلشن کے پھول' (مہو) کے علاوہ سرونج سے کئی قلمی رسالے اختصار

احمد ہاشمی، خالد محمود، مختار شمیم، شان فخری وغیرہ نے نکالے لیکن یہاں سے شائع ہونے والے سیفی سرونجی کے سہ ماہی 'انتساب' کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ 1983 سے یہ ادبی رسالہ مسلسل شائع ہو رہا ہے، اور اس کے کئی خاص نمبر بہت مقبول ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں بھوپال سے اس عرصہ میں متعدد ادبی رسائل منظرِ عام پر آئے ہیں جن کے نام درج ذیل ہیں۔

پاسبان (لطف اللہ نظمی، جوہر قریشی)، 'آرٹ اینڈ کلچر' اور 'شعلۂ حرف' (ایم عرفان)، 'شہپر' (شاہد اختر)، 'مجلہ سیفیہ'، (پروفیسر عبدالقوی دسنوی)، 'نوائے سیفیہ' (آفاق حسین صدیقی)، 'آوز' (شفا گوالیاری۔ افسر صہبائی)، 'مزاج' (عیسیٰ صدیقی)، 'تشکیل' (خان باسط)، 'شناخت' (ظفر صہبائی اور اقبال مسعود)، 'فکر و آگہی' (ڈاکٹر رضیہ حامد)، 'صدائے اردو' (نعیم کوثر)، 'تمثیل' (نصرت مہدی۔ اقبال مسعود)، 'کاروانِ ادب' (کوثر صدیقی، جاوید یزدانی) 'اردو ہلچل' (جاوید یزدانی۔ پروفیسر مختار شمیم)۔

بچوں کے رسائل کی اشاعت اوّل و آخر صرف بھوپال سے ہوئی، جن میں 'طفلستان' پہلا بچوں کا رسالہ ہے جو عباس انصاری نے 1947 میں نکالا، بعد میں 'بچوں کا پاکستان' اور 'معصوم دنیا' (گوہر جلالی)، 'بچوں کی دنیا' (جاوید محمود)، 'جگنو' (نعیم کوثر) بھی شائع ہوئے، مذہبی رسائل میں دارالعلوم تاج المساجد کا ترجمان پندرہ روزہ 'نشانِ منزل' (1949)، ڈائجسٹ 'جذب و سلوک' (1984)، جامعہ اسلامیہ عربیہ ترجمہ والی مسجد کا ترجمان ماہنامہ 'دینِ مبین' (1985) اور جامعہ حسینیہ خیر العلوم کا ترجمان 'دعوت خیر'' (1999) بھوپال سے شائع ہوئے لیکن 'دینِ مبین' اور 'دعوتِ خیر' پابندی کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ دیگر اخبارات و رسائل میں ہفت روزہ 'شاہین کانشیس'، 'آبِ حیات'، 'رخسارِ ہند'، 'بابِ ادب'، 'سائبان' بھوپال سے اور 'عالمی زبان' سرونج سے نکل رہے ہیں۔

مدھیہ پردیش کی اردو صحافت کے اس 167 سالہ اجمالی جائزہ سے واضح ہوتا ہے کہ ریاست میں اردو صحافت کا مرکز ابتدا سے بھوپال رہا ہے، جہاں سے آج بھی چھ اردو روزنامے، ایک سہ ماہی، ایک پندرہ روزہ اور نئے پرانے آٹھ ہفت روزہ اخبارات و رسائل منظرِ عام پر آ رہے ہیں۔

(ط) ہریانہ

ہریانہ میں اردو صحافت

ڈاکٹر محمد مستمر

ہریانہ میں اردو صحافت کے حوالے سے روشنی ڈالنے سے قبل ہمیں تھوڑا سا تاریخی پس منظر کی جانب بھی جانا پڑے گا۔ جس وقت ہریانہ، متحد پنجاب کا حصہ ہوا کرتا تھا اور ہماچل پردیش بھی اسی میں شامل تھا نیز اور تھوڑا ذرا پیوستہ سے گزشتہ کی طرف سفر کریں تو آزادی سے قبل مغربی پنجاب یعنی پاکستانی پنجاب بھی اسی کا حصہ تھا۔ جس کا پایۂ تخت لاہور تھا اور صحافتی اعتبار سے لاہور، جالندھر اور امرتسر مراکز ہوا کرتے تھے۔ صحافتی نوعیت سے اُن امور میں کوئی شک و شائبہ نہیں کہ اردو صحافت میں جو کردار پنجاب نے ادا کیا وہ سب سے نمایاں ہے۔ اگر یوں کہہ دیا جائے کہ پنجاب صوبہ اردو صحافت کا دارالسلطنت تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ فرانسیسی محقق گارساں دتاسی کی تحقیق کے مطابق 1852 تک مشترکہ پنجاب سے نکلنے والے اردو اخبارات کی تعداد 24 تھی ان میں سے کچھ اخبارات روہتک، جھجر، ہانسی اور انبالہ سے بھی شائع ہوا کرتے تھے جبکہ ابھی اردو صحافت کو شروع ہوئے صرف تیس سال کا ہی عرصہ ہوا تھا۔ یہ اپنے آپ میں ایک بہت بڑی بات تھی۔ ان اخبارات میں روزنامہ ہفت روزہ، پندرہ روزہ اور ماہنامہ سبھی طرح کے اخبارات شامل ہیں۔

ہریانہ میں اردو صحافت کو ہم چار ابواب میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

1۔ آزادی سے پہلے

2۔ آزادی کے بعد (مشترکہ پنجاب کے حوالے سے)

3۔ ہریانہ کے وجود کے بعد

4۔ موجودہ صورت حال

1۔ آزادی سے پہلے: افضل مصباحی اپنی کتاب ''اردو صحافت آزادی کے بعد'' میں صفحہ نمبر 81 پر رقم طراز ہیں کہ'' پنجاب سے 1857 کے بعد روزنامہ 'پنجاب' لاہور سے نکلنا شروع ہوا۔ اسی امر کے ساتھ وہ صفحہ 314 پر مذکورہ کتاب میں لکھتے ہیں کہ'' 14 جنوری 1850 میں منشی ہرسکھ رائے نے سرزمین پنجاب سے پہلا ہفت روزہ اخبار 'کوہ نور' جاری کیا۔'' یہاں موصوف کے بیان کی خود ہی تردید ہو جاتی ہے اسی ضمن میں مہندر پرتاپ چاند کی تحقیق کے مطابق متحد پنجاب (ہریانہ) سے جاری ہونے والا پہلا اخبار 'نوائے ہند' تھا جس کا سن اشاعت 1840 ہے جس کو ہانسی (حصار) سے چودھری غلام نبی راعی نے جاری کیا تھا۔ اس سے اس بات کا اژالہ ہو جاتا ہے کہ مشترکہ پنجاب یا ہریانہ سے نکلنے والا پہلا اخبار 'نوائے ہند' تھا یعنی اردو صحافت کا آغاز پنجاب میں 1857 کے بعد نہیں بلکہ 1857 سے پہلے ہو چکا تھا۔ پھر یہ سلسلہ چل پڑتا ہے اور مختلف مقامات سے اخبارات شائع ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ پہلے میں یہاں مشترکہ پنجاب کے حوالے سے اُن اخبارات کا ذکر کروں گا بعد ازاں خالص ہریانہ سے شائع ہونے والے اخبارات کا۔

14 جنوری 1850 میں منشی ہرسکھ رائے نے سرزمین پنجاب سے پہلا ہفت روزہ اخبار 'کوہ نور' کا اجرا کیا۔ منشی ہرسکھ رائے انگریزوں کے بہت قریب تھے اس لیے انھیں یہ اخبار نکالنے میں کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ اس اخبار کا پہلا مدیر منشی سورج بھان کو بنا گیا جو پہلے ہی کئی انگریزی کتابوں کا ترجمہ اردو اور دیگر ہندوستانی زبانوں میں کر چکے تھے۔ اب یہ سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور 'کوہ نور' کی ہی عمارت سے شہسوار الدین نے اپنی ادارت میں 'دریائے نور' ہفت روزہ اخبار کی اشاعت کی۔ اسی سال سیال کوٹ سے دیوان چند نے اپنی نگرانی میں 'ریاض الاخبار' کا اجرا کیا۔ بعد ازاں انھوں نے اور کئی اخباروں کا شائع کیے جن میں چشمہ، فیض، خورشید عالم،

ہمائے بے بہا، نور علی نور اور 'وکٹوریہ پیپر' شمولیت کے حامل ہیں۔ 'وکٹوریہ پیپر' کو انگریزوں نے مکمل طور پر اپنی حمایت کے لیے جاری کیا تھا۔ یہ اخبار مسلسل 1925 تک شائع ہوتا رہا۔ 1854 میں فقیر غلام قصیر الدین کی ادارت میں ملتان سے 'شفاء الشمس' نام کا ہفت روزہ اخبار کی اشاعت شروع ہوئی۔ یہ انگریزوں کے خلاف اخبار تھا۔ 1854 سے پہلے ہی ہفت روزہ ایک اخبار منشی کنڈا مل نے گوجراں والا سے 'گلزار پنجاب' کے نام سے جاری کیا تھا۔ انہی اخبارات کے ساتھ راولپنڈی سے 'مہیل پنجاب' اور 'شعلہ' امرتسر سے 'باغ نور' لاہور سے 'بحر حکمت' اور 'معلم ہند' اخبار عمل میں آئے۔ 1857 کے غدر کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ اسی سال لاہور سے ایک ہفت روزہ اخبار 'سرکاری اخبار' وجود میں آیا۔ ابتدا میں حکومتِ پنجاب کے محکمہ تعلیم کے ترجمہ نگار پنڈت اجودھیا پرشاد اس اخبار کے مدیر مقرر ہوئے۔ آخری زمانے میں منشی پیارے لال آشوب اس اخبار کے مدیر منتخب ہوئے جبکہ مولانا محمد حسین آزاد اس کے نائب مدیر بنائے گئے۔ اس کے بعد پنجاب سرکار نے ہی ماہنامہ 'اتالیق' کا اجرا کیا۔ اس کے دو مدیر پیارے لال اور محمد حسین آزاد مقرر کیے گئے۔ محمد حسین آزاد کی ادارت میں 1 اپریل 1870ء کو 'انجمن پنجاب' اور پنڈت گوپی ناتھ گورٹو کی ادارت میں 'ہمائے پنجاب' ہفت روزہ اخباروں کا اجرا کیا گیا۔ انہی اخباروں کے ساتھ۔ مفتی محمد چشتی کی ادارت میں 'رفیقِ ہند' ہفت روزہ شائع ہوا اور 'آفتاب' اخبار لاہور سے جاری کیا گیا۔ انجمن حمایت اسلام نے 'انجمن حمایت اسلام' نام سے ماہنامہ پرچہ کا اجرا کیا جس کا سنِ اشاعت 1885 ہے۔ 1912 میں شیخ محمد عالم نے امرتسر سے ایک ہفت روزہ 'ویکلی' جاری کیا۔ اس کے آخری مدیر مولانا ثناء اللہ امرتسری تھے۔ اس اخبار سے اُس وقت کے بڑے بڑے جید عالم شامل تھے جن میں مولانا آزاد، عبداللہ منہاس، مولانا عبداللہ وغیرہ علماً کے نام پیش پیش ہیں۔ اس اخبار کے ذریعہ مرزا غلام احمد قادیانی سے مباحثہ ہوا کرتا تھا۔ ساتھ ہی یہ آزادی کی جدوجہد کا بھی غماز اور پلیٹ فارم تھا۔ پنجاب میں باضابطہ طور سے روزناموں کا آغاز 'روزنامچہ پنجاب' سے ہوتا ہے۔ جس کی اشاعت خواجہ حسن نے لاہور سے کی۔ علاوہ ازیں منشی ہر بخش نے 'شفیقِ ہند' اخبار کا اجرا 1884 میں لاہور سے کیا۔ اسی سال انھوں نے 'نسیم صبح' اور 'شام وصال' جیسے اخبارات سے روزناموں کا آغاز کیا۔ یہ اخبارات بہ سلسلہ صبح و شام کو شائع ہوتے تھے۔ 1885 میں مولوی سیف الحق نے

'رہبر ہند' روزنامہ کا اجرا کیا۔ 1888 تک آتے آتے 'کوہ نور' کو بھی روزنامہ کر دیا گیا تھا۔ لیکن تین مہینے کے بعد بند ہو گیا تھا۔ بعد ازاں انیسویں صدی کے اختتام تک کئی ہفت روزہ اخبار، روزنامہ کر دیے گئے تھے اور بیسویں صدی کے لگتے ہی تو روزناموں کا سلسلہ ہی چل پڑتا ہے۔ 1871 سے شائع ہونے والا ہفت روزہ اخبار 'اخبار عام' صدی کی آخری دہائی میں روزنامہ ہوا پھر سہ روزہ کیا گیا، پھر روزنامہ ہوا اور پھر سہ روزہ کیا گیا۔ اس طرح 1932 تک 'اخبار عام' بہت سے نشیب و فراز سے گزرتا رہا۔

اس کے بعد اردو صحافت کا وہ دور شروع ہوتا ہے جسے عہد زریں کہا جا سکتا ہے۔ مشہور صحافی محمود عالم نے ایک کے بعد کئی اخبارات نکالے جن میں 1883ء میں نکلنے والا ماہنامہ 'زمیندار' 1887 میں نکلنے والا ہفت وار 'ہمت' اور سب سے مشہور و معروف ہفت وار 'پیسہ' اخبار جو اسی سال جاری ہوا شمولیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے کچھ عرصے بعد لاہور میں خود اپنی پریس قائم کی اور 'پیسہ' اخبار کو بطور روزنامہ نکالنا شروع کیا۔ اس اخبار کو اتنی شہرت ملی کہ اس کے سامنے تمام اخبارات بونے ثابت ہونے لگے۔ اس اخبار کی اشاعت پانچ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ علاوہ ازیں انھوں نے بچوں کے لیے بھی کئی اخباروں کا اجرا کیا جن میں 'شریف بی بی'، 'باغبان'، 'کلید امتحان' اور 'انتخاب لاجواب' قابل ذکر ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ یہ تمام اخبارات بند ہو گئے اور 1924 تک آتے آتے 'پیسہ' اخبار بھی بند ہو گیا۔ 1895 میں 'وکیل' اخبار بھی لاہور سے شائع ہونا شروع ہوا جو 'پیسہ' اخبار کے ہم عصروں میں آتا ہے۔ 1899 میں جالندھر سے 'آریہ مسافر' بھی جاری ہوا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں 1902 میں مولانا ثناء اللہ امرتسری نے ہفت روزہ اخبار 'وطن' جاری کیا۔ 1915 میں اسے روزنامہ بھی کیا گیا لیکن دوڑ نہ سکا اور دوبارہ ہفت روزہ ہی نکالنا پڑا۔ یہ اخبار لگ بھگ 33 سال تک جاری رہا۔ 1903 میں لدھیانہ سے 'آرمی نیوز' اور لاہور سے 'شریف' شائع ہوئے۔ لالہ دینا ناتھ اور چودھری رام دت نے 1904 میں 'ہندوستان' نامی روزنامہ جاری کیا۔ مذکورہ اخبار کانگریس تحریک کی حمایت کرنے والا اخبار بن گیا تھا۔ لاہور سے ہی رام دت کے فرزند دیپک نے اپنے نام سے ہی 'دیپک' نامی روزنامہ اخبار کی اشاعت کی۔ اسی

درمیان لالہ دینا ناتھ 'ہندوستان' اخبار سے الگ ہو گئے اور انھوں خود کا اپنا روزنامہ اخبار 'رمیش' جاری کیا۔ آریہ سماج کی نمائندگی کے لیے انھوں نے ایک ہفت روزہ 'ہمالیہ' کی بھی اشاعت کی۔ لیکن یہ دونوں اخبار 1924 میں بند ہو گئے۔ مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا غلام رسول مہر نے 'انقلاب' جاری کیا۔ یہ اخبار کانگریس پارٹی کے خلاف تھا اور کمیونسٹ پارٹی کی زبردست حمایت کرنے والا اخبار تھا۔ اس کے بعد انھوں نے 'سیاست' کی شروعات کی۔ یہ اخبار بھی کانگریس کی پالیسیوں اور منصوبہ بندیوں کے خلاف تھا۔ دونوں اخبارات تقسیم وطن کے بعد بند ہو گئے۔ انہی حضرات کے ساتھ ملک نور الٰہی نے لاہور سے روزنامہ 'احسان' اور مولانا مرتضیٰ احمد نے روزنامہ 'شہباز' اخباروں کی اشاعت کی۔ مہاشہ کرشن نے 1919 میں لاہور سے 'پرکاش' اخبار کا اجرا کیا اور پھر اپنی ادارت میں ہی 'پرتاپ' یکم اپریل 1919 کو لاہور سے ہی جاری کیا لیکن ایک ہفتے بعد برطانوی حکومت نے اس پر روک لگادی۔ ایک سال بعد پابندی ہٹائے جانے پر یہ دوبارہ 1920 میں شروع ہوا اور ملک کی آزادی تک یہ لاہور سے شائع ہوتا رہا بعد ازاں یہ دہلی منتقل ہو گیا اور آج تک شائع ہو رہا ہے۔ مہاشہ کرشن کے ایک فرزند ویریندر نے الگ سے 'جے ہند' 1946 میں شروع کیا تھا جو کانگریس کی حمایت میں لکھتا تھا۔ تقسیم وطن کے بعد یہ جالندھر سے شائع ہونے لگا جو بعد میں بند ہو گیا۔ پنجاب سے ہی لالہ لاجپت رائے نے 1920 میں 'بندے ماترم' کا اجرا کیا۔ 1925 میں مہاشہ خوشحال چند نے روزنامہ 'ملاپ' لاہور سے جاری کیا۔ تقسیم وطن کے بعد 'ملاپ' بھی دیگر اخباروں کی طرح دہلی منتقل ہو گیا۔ لاہور کی زرخیز زمین سے ہی 1919 میں لالہ شام کپور نے ہفت روزہ اخبار 'گرو گھنٹال' اور پھر روزنامہ 'کیسری' کی شروعات کی۔ اسی ضمن میں مدن موہن مالویہ نے 'ویر بھارت' کے نام سے 1928 میں لاہور سے اخبار نکالا۔ 23/ مارچ 1940 کو حمید نظامی کی ادارت میں 'نوائے وقت' جاری ہوا۔ لالہ نانک چند نے 1943ء میں 'پربھات' لاہور سے جاری کیا۔ 1943 کے آس پاس ہی سادھو سنگھ ہمدرد نے سکھوں کی ترجمانی کے لئے 'اجیت' نامی اخبار لدھیانہ سے شائع کیا۔ اس کے کچھ سال بعد ہی گوسوامی نے روزنامہ 'تعلیم' کا اجرا کیا لیکن جلد ہی بند ہو گیا۔ بھائی پرمانند نے اپنے ہفت روزہ اخبار 'ہندو' کو 1935 میں روزنامہ کر دیا۔ لاہور سے ہی تحریک احرار نے روزنامہ 'احرار' جاری کیا اور ڈاکٹر عالم نے بھی روزنامہ 'تریاق' کا

اجرا کیا۔ اسی طرح کانگریس کے صدر ستیہ پال نے روزنامہ 'نیشنل کانگریس' سردار موہن سنگھ سامنی نے 1946ء میں 'بندے ماترم' ڈرلبھ سنگھ نے روزنامہ 'نگار' لالہ نانک چند ناز نے روزنامہ 'شکتی' پنڈت کشن چند نے روزنامہ 'شانتی' ملک دلبر عالم عنوان نے ہفت روزہ 'ترجمان سرحد' ماسٹر تارا سنگھ نے امرتسر سے روزنامہ 'اکالی' اور سردار امر سنگھ نے لاہور سے پہلے 'لال گزٹ' پھر 'شیر پنجاب' اخبار شائع کیا۔ لاہور کے ہی اخبارات میں 'پارس' کا ذکر بھی آتا ہے۔

اب یہاں اُن اخبارات و رسائل کا ذکر کیا جائے گا جو آزادی سے پہلے بالخصوص ہریانہ کے اضلاع سے شائع ہوتے تھے۔ جیسا کہ گزشتہ صفحات پر بھی کہا گیا ہے کہ ہانسی (حصار) سے 1840 میں 'نوائے ہند' نامی اخبار چودھری غلام نبی راعی کی ادارت میں اشاعت کے مراحل سے گزرتا تھا۔ اس سے یہ بات صاف عیاں ہو جاتی ہے کہ کلکتہ سے نکلنے والا اردو کا پہلا اخبار 'جام جہاں نما' سے ٹھیک اٹھارہ سال بعد ہریانہ کی سرزمین سے اردو صحافت کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا۔ کچھ لوگ موہنا (گوڑگاؤں) سے نکلنے والے اخبار 'کارنامۂ ہند' کو ہریانہ کا پہلا اخبار مانتے ہیں جو ہفت روزہ خواجہ محمود ہاشم کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ لیکن اس اخبار کا سنِ اشاعت 1866 ہے۔ اسی زمانے میں 'صدائے وطن' نام کا اخبار فرید آباد سے نکلتا رہا۔ جس کے مدیر چودھری محمود راعی تھے۔ 1886ء میں ضلع انبالہ سے 'مرچنٹ انبالہ' کے نام سے اخبار جاری ہوا۔ جس کے مالک و مہتمم پنڈت شیو پرساد تھے۔ یہ اخبار فی سبیل اللہ تقسیم ہوتا تھا۔ 'امیر الاخبار' ضلع بھوانی سے پندرہ روزہ علاء الدین خاں علائی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اسماعیل پانی پتی نے رسالہ 'جہاں نما' پانی پت کی سرزمین سے نکالنا شروع کیا جس کا بعد میں نام بدل کر 'کائنات' کر دیا گیا تھا۔ آپ 'مشعل' رسالہ کے بھی مدیر رہے جو پانی پت سے ہی حالی مسلم ہائی اسکول سے جاری ہوتا تھا۔ ضلع مجھر سے بلجیت سنگھ مطیر کا نام بھی مشہور ہے جو سہ ماہی جریدہ 'تناظر' کے اعزازی مدیر و معاون رہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے ایک بہت بلند پایہ کتاب تصنیف کی جس کا نام 'اخبار نویسی کے ابتدائی اصول' ہے۔ اس کتاب کے کئی زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب یقیناً اردو صحافت بلکہ تمام زبانوں کی صحافت کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ضلع حصار سے نکلنے والے اخبار 'پکار' کے مدیر مشکور حسین یاد تھے جو بعد میں پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔ 'پیغام' اخبار پہلے بہاول پور سے

پھر جالندھر سے اور آخر میں سونی پت سے شائع ہونے لگا تھا۔ جس کی ادارت کا ذمہ آتش بہاول پوری کے سر تھا۔ پانی پت سے ہی شائع ہونے والا اخبار 'دین بندھو' بھی موصوف کی ہی ادارت میں نکلتا تھا۔ 'روشنی' اخبار بھی سونی پت سے ہی شائع ہوتا تھا جس کے مدیر تبسم علی پوری تھے۔ یہ ہفت روزہ اخبار تھا۔ فرید آباد سے نکلنے والا اخبار ماہنامہ 'تہذیب' کے مدیر سید نیر فرید آبادی تھے۔ حکیم عبدالشکور 'میوات' سے 'آفتاب میوات' نکالتے تھے۔ یہ پرچہ 1926 سے 1945 تک جاری رہا۔ میوات سے دو پرچے 'اہلِ حدیث' اور 'میو گزٹ' نکلتے تھے جن کی ادارت کی ذمہ داری حکیم اجمل خاں میواتی کے سپرد تھی۔ سر چھوٹو رام جن کا نام جاٹوں کی تاریخ میں نمایاں مقام رکھتا ہے، جاٹوں کے ہر دل عزیز لیڈر تھے۔ وہ ایک ترقی پسند خیالات کے حامی تھے اور کسانوں کے مسیحا کہلاتے تھے۔ انھوں نے کسان طبقہ میں بیداری پیدا کرنے کے لیے اردو کا ہفت روزہ اخبار 'جاٹ گزٹ' کا اجرا کیا جس کے وہ مدیر اور بانی تھے۔ اس اخبار میں چھوٹو رام کے بے باکانہ قلم کی جولانیوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ اخبار موصوف نے اپنی سرزمین 1913 کے آس پاس روہتک سے نکالا۔ سری رام شرما نے 18/مارچ 1923 کو روہتک سے ہفت وار اخبار 'ہریانہ تلک' کا آغاز کیا جو آزادی کے بعد تک شائع ہوتا رہا اور بعد ازاں یہ اخبار 1962 میں ماہنامہ ہو گیا تھا جو 1969 تک جاری رہا۔ 'ہریانہ تلک' کو برطانوی حکومت نے تین بار ضبط کیا تھا۔ جس باعث اسے روہتک کے بجائے غازی آباد، میرٹھ اور دلی سے 'جلاوطن' کے نام سے شائع کیا گیا۔ روہتک سے ہی ہفت وار اخبار 'تحقیقات' 1940 میں لچھمن داس کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا۔ پانی پت سے نارائن داس دسیجہ نے 'دولتِ بارش' 1941 میں ماہنامہ اخبار جاری کیا جیسا کہ اس کے نام سے ہی ظاہر کہ یہ اخبار صنعت و تجارت سے تعلق رکھتا تھا۔

آزادی کے بعد (مشترکہ پنجاب کے حوالے سے): اب یہاں اُن اخبارات و رسائل کا ذکر کیا جائے گا جو پنجاب آزادی کے بعد وجود میں آتا ہے۔ آزادی کے بعد افسوس ناک پہلو یہ رہا کہ لاہور جو اردو صحافت کا گڑھ ہوا کرتا تھا وہ حصہ پاکستان میں چلا گیا اور سب سے بڑا زیاں جو پہنچا وہ اردو صحافت کو پہنچا۔ آزادی کے بعد کا پنجاب اردو زبان و صحافت سے بالکل ہی خالی ہو گیا۔ بڑے بڑے اور معیاری اخبارات سب لاہور کے حصہ میں آ گئے۔ آزادی کے بعد روزنامہ

'ہند سماچار' ہندوستان کے بڑے اخباروں میں شامل ہوتا ہے۔ لیکن زبان و بیان کے اعتبار سے اس کا جو معیار ہے وہ قابل تشویش ہے۔ اس کی زبان اردو نہیں رہی بس آپ رسم الخط کو اردو کہہ سکتے ہیں اور خالص رسم الخط سے زبانیں بلندی کے مقام کو حاصل نہیں کر سکتی ہیں۔ اُن کے اپنے تقاضے اور ضابطے ہوتے ہیں جن سے زبان کی خوبصورتی اور نزاکت قائم رہتی ہے۔ 'ہند سماچار' اخبار کو چوپڑا گروپ چلاتا ہے جو جالندھر سے شائع ہوتا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ آزادی کے بعد پنجاب کا خطہ اردو صحافت کے حوالے سے بالکل ہی خالی ہو گیا تھا تاہم 'ہند سماچار' کے علاوہ کچھ اخبارات و رسائل پنجاب سے نکلتے رہے اور دم توڑتے رہے۔ انھیں زندہ کیسے رکھا جا سکتا تھا.....؟ جواب کلیئر ہے کہ جب قارئین ہی نہ رہے تو اردو کو کون پڑھتا۔۔۔؟ کسی بھی زبان کی بقا اس کے قارئین پر منحصر ہوتی ہے۔ دیوان تصور نے 1948 میں امرتسر سے ماہنامہ 'مشرق' اور پھر 1958 میں گوڑگاؤں سے ہفت وار اخبار 'نشانہ' بھی جاری کیا۔ تارا چند ورما کی ادارت میں ہفت وار 'شعلہ' جالندھر سے 1953 میں شائع ہونا شروع ہوا تارا چند ورما کو بے باک صحافی ہونے کی وجہ سے اوباش قسم کے لوگوں نے قتل کر دیا تھا چنانچہ یہ اخبار بند ہو گیا۔ کامریڈ رام چندر نے آزادی کے بعد لدھیانہ سے 'میرا دیش' نامی ہفت روزہ اخبار جاری کیا۔ 1949 میں 'شیر بھارت' اخبار کی ادارت کی بھی ذمہ داری سنبھالی۔ اسی درمیان موصوف نے 'طوفان' اور ایک فلمی پرچہ 'ویکلی' کا بھی اجرا کیا۔ نرنجن داس شرما نے امرتسر سے 'آواز' نام کا اردو اخبار نکالا جو سناتن دھرم سبھا کے زیر اہتمام نکلتا تھا۔ 'انبالہ ٹائمز' 1965 میں انبالہ سے ہفت وار نکلنا شروع ہوا جس کے مدیر ہیرانند شرما تھے۔ یہ اخبار ہریانہ کے وجود کے بعد بھی 1971 تک جاری رہا جو بعد میں ہندی زبان میں نکلنے لگا۔ اوم پرکاش ملک نے 1963 میں ایک ہفت روزہ اخبار 'آواز ہند' کے نام سے انبالہ سے جاری کیا جو ہریانہ کے قیام کے بعد 1968 تک پابندی کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔

ہرگوپال شرما نے ضلع روہتک سے 1949 میں 'جگت نیتر' کے نام سے پندرہ روزہ اخبار کا اجرا کیا۔ یہ اخبار اردو ہندی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ روہتک سے ہی کرشن لال باجی نے 1964 میں پندرہ روزہ 'پرشارتھی گزٹ' نکالنا شروع کیا۔ ضلع سونی پت سے اٹلس سائیکل والوں کا اخبار 'اٹلس پریوار' نکلتا ہے۔ جس میں کارخانہ کی خبریں ہوتی ہیں۔ اس کے مالک ستیہ ویر

ملہوترہ ہیں۔ یہ ہندی اور اردو، دونوں زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ امرناتھ کوہلی باغی نے فرید آباد سے ہفت وار پرچہ 'شیرِ سرحد' جاری کیا۔ فرید آباد سے ہی نیک چند نے 'ہمدرد' رسالہ نکالنا شروع کیا جس میں اردو شعرا کا کلام شائع ہوتا تھا۔ کچھ شمارے نکلنے کے بعد یہ رسالہ بند ہو گیا۔ اور بھی کئی اخبارات و رسائل فرید آباد سے نکلے جن میں شاہد انبالوی نے ماہنامہ اخبار 'اژدرنگ' اور روپ لال بہتہ نے 'پیغامِ وطن' نام کے اخبار نکالے۔ 'اژدرنگ' اخبار کے مدیر خاموش سرحدی تھے جو خود بھی کرنال سے 'کانگریس' اخبار نکالتے تھے۔ کانگریس ایک ادبی و اخلاقی پرچہ تھا۔ روپ لال بہتہ ایک سیاسی آدمی تھے اور ریزرو سیٹ سے ایم ایل اے بھی رہے۔ کرنال سے راجپال بھاٹیہ نے 1954 میں ہفت وار اخبار 'جنم بھومی' کا اجرا کیا۔ یہ پرچہ آٹھ صفحات پر مشتمل تھا جس میں ادبی و اخلاقی مضامین شامل ہوتے تھے۔ پانی پت سے ہری چند نے 1960 میں 'نرالا جوگی' اخبار کا اجرا کیا۔ یہ اخبار ادویات سے متعلق تھا اور اردو ہندی دونوں زبانوں میں چھپتا تھا۔ گوڑگاؤں سے دو اخباروں کا اجرا عمل میں آیا۔ 1953 میں گوبانی رام آریہ نے 'اردو میوات' کے نام سے اخبار نکالنا شروع کیا۔ اپنے دور میں اردو پرچوں میں اس اخبار کی تعداد سب سے زیادہ تھی جس کی 6840 کاپیاں شائع ہوتی تھیں۔

آزادی کے بعد متحد پنجاب سے سرکاری طور پر دو رسالوں کا اجرا عمل میں۔ ایک محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ و ثقافت چندی گڑھ سے 'پاسبان' اور دوسرا پرچہ بھاشا و بھاگ پٹیالہ سے 'پرواز ادب' شائع ہونے شروع ہوئے۔ ماہنامہ 'پاسبان' 2000 کے آس پاس بند ہو گیا۔ ماہنامہ 'پرواز ادب' ابھی بھی پابندی کے ساتھ نکلتا ہے۔ جس کی ادارت کی ذمہ داری پہلے طارق کفایت سرانجام دیتے تھے۔ گزشتہ اٹھارہ برسوں سے اشرف محمود ندن اس کے مدیر ہیں۔ یہ پرچہ خالص ادبی ہے اور اس کی ادبی آب و تاب ہنوز باقی ہے۔ آزادے کے بعد کچھ رسائل مالیر کوٹلہ سے شائع ہوتے رہے جو بعد میں بند ہو گئے، جن میں صدائے اہلِ پنجاب' مدیر ظہور احمد ظہور اور 'لیڈی راج' مدیر ناز بھارتی، قابلِ ذکر ہیں۔

ہریانہ کے وجود کے بعد: اب میں یہاں اُن اخبارات و رسائل کا ذکر کرنا ناگزیر سمجھوں گا جو ہریانہ کے وجود یعنی 1966 کے بعد نکلتے رہے اور نکلنے شروع ہوئے۔ اس سے قبل

میں اپنی بات کو آگے جاری رکھوں اس امر پر روشنی ڈالنا ضروری ہے کہ ہریانہ کا قیام عمل میں آنے تک پنجاب میں اردو صحافت کو گہن لگنا شروع ہو گیا تھا۔ اب ایسے نا مساعد حالات میں کیا اردو صحافت کو فروغ و جلا ملتی۔ اب جو بھی اخبارات و رسائل نکلے یا زندہ رہے یا کبھی بند ہو گئے یا وقفہ وقفہ پر نکلتے رہے، اُن رسائل و اخبارات کے پیچھے مہاجرین کا بہت بڑا رول رہا۔ کیونکہ وہ اپنے ساتھ جس زبان کو لائے تھے وہ اردو زبان تھی، اُن کا میڈیم اردو زبان تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ پنجابی اُن کی مادری زبان تھی مگر اُن کی تمام تر تعلیمات اردو زبان میں ہی ہوئی تھی۔ یہی وجہ رہی کہ جو کچھ تھوڑا بہت باقی رہا اور اردو صحافت زندہ رہی، وہ مہاجرین کی بدولت رہی۔ ''میوات کے مسلمانوں کا تو خدا ہی مالک ہے۔'' بس اسی جملے پر اکتفا کیا جا سکتا ہے۔ یا وہ مسلمان جو دریائے جمنا کے کنارے کنارے کثیر تعداد میں آباد ہیں۔ وہ اردو کیا۔۔۔؟ اپنے آپ سے بھی ناواقف ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ ہریانہ میں ابھی بھی لگ بھگ چھے فیصد مسلمان آباد ہیں مگر تعلیم اور بالخصوص اردو کے حوالے سے جمود طاری ہے۔ موجودہ کھٹر سرکار کو چھوڑ کر ہمیشہ چار پانچ ایم ایل اے اسمبلی میں پہنچتے ہیں اور دو تین وزیر بھی رہتے ہیں۔ لیکن انھوں نے بھی اردو کے حوالے سے آج تک کوئی اقدامات نہیں اُٹھائے۔ بہر کیف یہ تو صورت حال رہی۔ اب اخبارات و رسائل کی طرف آتے ہیں۔

گوڑگاؤں سے جنسی دھر نمبردار نے 1974 میں 'گورد بھوی' نام سے اخبار جاری کیا۔ یہ ہفت وار تھا اور اردو ہندی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ سونی پت سے نکلنے والا اخبار ہفت روزہ 'اشوک چکر' کافی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ اخبار آسانند منجال کی ادارت میں 1956 سے نکلنا شروع ہوا تھا جو قیام ہریانہ کے بعد بھی جاری رہا۔ آسانند کے صاحب زادہ ڈاکٹر ہیتاب علی پوری 1990 تک اسے چلاتے رہے۔ فرید آباد سے مدن لال بھیسن نے 1967 میں 'کیریکٹر' نام سے پندرہ روزہ اخبار کا اجرا کیا۔ فرید آباد سے ہی امر ساہنی ہفت روزہ 'آواز' نکالتے رہے جو گزشتہ دو برس ہوئے ان کے وفات کے ساتھ ہی بند ہو گیا۔ حافظ سہارن پوری جو ہریانہ وقف بورڈ میں ملازم ہیں، تقریباً چالیس سال تک ہفت وار 'صدائے وطن' نکالتے رہے۔ انہی کے ساتھ عبدالسمیع انصاری تین سال ہریانہ وقف بورڈ کا رسالہ 'وقف گزٹ' ہفت وار شائع کرتے رہے۔ روہتک

سے شری رام شرما نے' ہریانہ تلک' کا اجرا ۱۱ھارہ مارچ 1923 کو ہفت وار کی شکل میں کیا تھا جو ہریانہ کے وجود کے بعد 1969 تک جاری رہا، یہ اخبار 1962 میں ماہنامہ ہو گیا تھا۔ روہتک سے ہی مراری لال پنوار کی ادارت میں 1967 میں ماہنامہ 'شہید' کا اجرا عمل میں آیا۔ موصوف نے ایک اور اخبار 'لہریں' کے نام سے جاری کیا تھا۔ یہ اخبار بھی ماہنامہ تھا۔ انہی کے ساتھ 1977 میں روہتک سے 'دیشنا دان' ہفت وار اخبار اوم پرکاش کھنہ نے جاری کیا۔ اوم پرکاش ملک کی ادارت میں انبالہ سے ایک ہفت روزہ اخبار 1963 سے 1968 تک 'آواز ہند' کے نام سے شائع ہوتا رہا۔ اسی ضمن میں انبالہ سے ہی دو پرچے اور جاری ہوئے ایک ہفت وار 'ارمان' 1972ء میں نانک چند ارمان کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا اور دوسرا سہ ماہی رسالہ 'اوقاف' کے نام سے 1974 میں حکیم اجمل خاں نے جاری کیا۔ 1971 میں 'جوشِ جنوں' کے نام سے مدن موہن کمار نے پندرہ روزہ جریدہ کا اجرا ضلع جیند سے کیا۔ کرنال سے نکلنے والے اخبارات میں 'آریہ کیسری' اور 'ضمیر فروش' کے نام قابلِ ذکر ہیں جو بہ سلسلہ سیلا رام برق کی ادارت میں 1967 میں پندرہ روزہ اور 1967 میں ہی رتن لال وید کی ادارت میں ماہنامہ نکلنا شروع ہوا۔ انہی اخبارات کے ساتھ 'مہان بھارت' اور 'بانگِ عمل' شامل ہیں۔ 'مہان بھارت' کو 1975 میں ہفت روزہ نند کشور سندھالیہ نے نکالنا شروع کیا جبکہ 'بانگ عمل' کے مدیر گوردیپ سنگھ بخشی تھے یہ اخبار 1974 میں جاری ہوا۔ ایم رانا نے ضلع یمنا نگر سے 1978 سے 'لالہ ساچار' اخبار کا آغاز کیا۔ ہریانہ کی راجدھانی 'منی مزرہ' چندی گڑھ سے 1980 میں ماہنامہ 'آئینہ' کا اجرا عمل میں آیا۔ اس کے چار شمارے ہی نکل پائے کہ یہ بند ہو گیا۔ اس کے مدیر و مالک حکیم مشکور ایوبی اور معاون مدیر قاری مہربان علی تھے۔ یہ رسالہ خالص ادبی تھا اور مطالعہ کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ اس کا معیار بہت بلند تھا۔

1966 کے بعد یعنی ہریانہ کے قیام کے بعد جو بھی اخبارات و رسائل نکلنے شروع ہوئے یا ہریانہ کے وجود میں آنے سے قبل نکل رہے تھے وہ آہستہ آہستہ بند ہوتے گئے۔ جس کی بنیادی اور خاص وجہ یہ رہی کہ ان اخبارات کو پڑھنے والے مہاجرین تھے جو سلسلے وار دارِ فانی سے کوچ کرتے گئے اور قارئین کی تعداد گھٹتی رہی۔ نتیجتاً قاری نہ ہونے کے سبب ان اخبارات و رسائل کو بند کرنا پڑا۔ کچھ اخبارات و رسائل کافی عرصہ تک نکلتے رہے اور کچھ کے چند شمارے ہی نکل پائے۔

2000 تک آتے آتے مذکورہ بالا اخبارات و رسائل نے بالکل ہی دم توڑ دیا۔

ہریانہ کے قیام کے بعد محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ و ثقافت ہریانہ نے 'تعمیرِ ہریانہ' کا اجرا کیا۔ جس کی ادارت کی ذمہ داری ڈاکٹر سلطان انجم سرانجام دیتے ہیں۔ یہ ایک سیاسی و ادبی ماہنامہ رسالہ ہے۔ جس میں سرکار کی سرگرمیوں اور خبروں کے ساتھ ساتھ ادبی مواد بھی موجود ہوتا ہے۔ یہ رسالہ مسلسل پابندی کے ساتھ نکل رہا ہے جس کی ادبی حیثیت اور چمک دمک برقرار ہے۔ ہریانہ اردو اکادمی کے قیام کے بعد سہ ماہی رسالہ 'جمناتٹ' کا اجرا عمل میں آیا جو 1986 یعنی اکادمی کے قیام سے لے کر ہنوز جاری ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض دفعہ مشترکہ ہو جاتا ہے۔ اکادمی کا ایک پرچہ دو ماہی 'خبرنامہ' کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ جس میں اکادمی کی سرگرمیوں کے ساتھ اطراف و اکناف میں ہونے والی ادبی سرگرمیاں بھی محیط ہوتی ہیں۔ 2009 میں یہ اردو ہندی دونوں زبانوں میں شائع ہونے لگا۔ اب گزشتہ دو برس سے بند ہو چکا ہے۔ 'جمناتٹ' پہلے ناشر نقوی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا بعد ازاں 1998 میں شمس تبریزی اس رسالہ کے مدیر مقرر کیے گئے۔ اس وقت اس کا کوئی مدیر نہیں کیونکہ شمس تبریزی ستمبر 2015 میں اپنے عہدے سے سبکدوش ہو گئے اور اب اس کی ادارت کی ذمہ داری سید عبدالحنان کے سپرد ہے اور راقم الحروف کا تعلق بطور معاون ہے۔ 'خبرنامہ' پہلے ناشر نقوی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا پھر شمس تبریزی اس کے مدیر رہے اور ڈاکٹر ایوب خاں بطور معاون۔

اب یہاں اُن حضرات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ جن کا تعلق ریاستِ ہریانہ سے رہا یعنی ہریانہ میں پیدا ہوئے لیکن وہ ہریانہ سے باہر مختلف اخبارات و رسائل سے وابستہ رہے اور اپنی صحافتی صلاحیتوں، قلم کی جولانیوں، اداریوں اور زشحاتِ قلم سے جمہور کے دلوں کو گرماتے رہے نیز اردو زبان و ادب اور صحافت کی گراں بہا خدمات کو انجام دیتے رہے۔ جن صحافیوں کا پتہ چلتا ہے اُن کا ذکر ضلع وار کیا جائے گا۔

ضلع انبالہ: رام ناتھ اسیر دو ماہی 'جمہور' سے وابستہ رہے۔ موصوف نے یہ رسالہ سریندر موہن اور پیارے لال آزاد کے ساتھ مل کر جاری کیا تھا لیکن بدقسمتی سے اس کے دو شمارے ہی شائع ہو سکے۔ اقبال سحر انبالوی ماہنامہ 'رشحات' لاہور کے مدیر رہے۔ حسن رضوی کی وابستگی

روز نامہ' جنگ' لاہور سے تھی ۔ علاوہ ازیں ہفت روزہ' اخبار جہاں' کراچی کے اور روز نامہ 'مساوات' (لاہور) کے کالم نگار تھے ۔ ساتھ ہی ہفت روزہ' شہاب' اور روز نامہ' مشرق' (لاہور) کے نائب مدیر بھی رہے ۔ کرشن کمار طور گزشتہ تیس سالوں سے' سرسبز' دھرم شالہ سے نکالتے ہیں جو ہنوز جاری ہے ۔ عارج روپ نگری' شوالک' سے، مشہور شاعر ناصر کاظمی' خیال، ہمایوں، ہم لوگ (پاکستان) سے، وقار انبالوی' زمیندار (لاہور)، ملاپ، ویر بھارت، احسان، سفینہ، نوائے وقت سے، نند کشور وکرم قومی اخبار، امرت، ارتقا، نئی کہانی، آجکل (نئی دہلی) سے وابستہ رہے ۔ نند کشور وکرم کئی برسوں سے اپنا ذاتی مجلہ' عالمی اردو ادب' نکال رہے ہیں جس کی ادبی حیثیت و معیار سے پوری اردو دنیا واقف ہے ۔

ضلع پانی پت: پانی پت کے حوالے سے خواجہ احمد عباس سب سے نمایاں مقام رکھتے ہیں اور اُن کی صحافتی صلاحیتوں و لیاقتوں کا پوری اردو دنیا دم بھرتی ہے ۔ آپ' بمبئی کرانیکل' اور ہفت روزہ' بلٹز' کا آخری صفحہ لکھتے تھے ۔ سلیم پانی پتی کا تعلق' معارف' (علی گڑھ) مسلم گزٹ اور زمیندار سے رہا ۔ ظفر عباس قریشی لاکالج لاہور کے جریدہ' چناب' اور ماہنامہ' طلوع اسلام' (لاہور) سے وابستہ رہے ۔

ضلع حصار: حصار سے ایک نام انوار فیروز کا پتہ چلتا ہے جو پاکستان سے نکلنے والے مختلف اخبارات میں کالم لکھتے رہے ۔

ضلع سرسہ: سرسہ سے بھی ایک نام ابھر کر سامنے آتا ہے ۔ وہ ہیں مشکور حسین یاد ۔ جو پہلے حصار سے نکلنے والے ہفت روزہ اخبار' پکار' کے مدیر رہے ۔ ہجرت کے بعد پاکستان سے نکلنے والے کئی جرائد سے وابستگی رہی جن میں ماہنامہ' مصباح القرآن'، ماہنامہ' انیس' اور ماہنامہ' چشمک' شمولیت کے حامل ہیں ۔

ضلع سونی پت: سونی پت سے بھی ایک نام دکھائی دیتا ہے ۔ وہ ہے جیمنی سرشار ۔ موصوف ہفت وار' نیا جیون' (فیروز پور) کے مدیر رہے ۔

ضلع فرید آباد: ساحر ہوشیار پوری ماہنامہ' کیلاش' (ہوشیار پور)، 'چندن' (کانپور) اور 'ماہ نو' دہلی سے وابستہ رہے ۔ سمن سرحدی کا تعلق ماہنامہ' سدا بہار' اور پندرہ روزہ' ہند سندیش' سے

رہا۔ اسی ضمن میں کیول فرید آبادی کی 'شیرِ سرحد' سے، ہاشمی فرید آبادی کی 'پیسہ' اور انجمن ترقی اردو دہلی کے ہفت روزہ پرچہ 'ہماری زبان' سے وابستگی رہی۔

ضلع کورو کشیتر: شباب للت لگ بھگ بارہ برس تک بھاشا و سنسکرتی وبھاگ ہماچل پردیش کے سہ ماہی رسالہ 'جدید فکر و فن' کے مہمان مدیر رہے۔ بال کرشن مضطر کا تعلق منزل، ایشیا، راہی، مزدور کی آواز، دستک، نیا مارگ، بزمِ خیال، چٹان، بڑھتے قدم، روزانہ، حق پرست، آوارہ بادل، اخبارات و رسائل سے بطور مدیر و معاون رہا۔

گوڑ گاؤں: گوڑ گاؤں سے دیوان تصور کا نام آتا ہے جو 'ملاپ' اور 'قومی آواز' سے منسلک رہے۔

موجودہ صورتِ حال: جیسا کہ گزشتہ بھی کہا گیا ہے کہ ہریانہ میں اردو صحافت آزادی کے بعد مہاجرین کی بدولت زندہ رہی۔ اگر یہ بات کہی جائے کہ 2000 کے بعد ہریانہ میں اردو صحافت کا سورج غروب ہو گیا، تو بے جا نہ ہوگا۔ حالانکہ ہریانہ میں سن دو ہزار کے بعد مردم شماری میں تیزی سے اضافہ ہوا اور لوگ دیگر ریاستوں خاص طور پر اتر پردیش اور بہار سے ہجرت کر کے پانی پت، یمنا نگر کرنال سونی پت، فرید آباد، گوڑ گاؤں اور پنچکولہ و چنڈی گڑھ جیسے شہروں میں آباد ہو گئے۔ مگر زبان کی طرف رجحان تو تب ہو جب پیٹ کی بھوک شانت ہو اور روزی روٹی کا مسئلہ آسان ہو۔ جو پرانے باشندے ہیں یعنی جنھوں نے تقسیم کے وقت ہجرت نہیں کی جیسے علاقائے میوات اور دریائے جمنا کے کنارے آباد قریات و قصبات۔ اُن پر اس قدر جمود طاری ہے کہ اُنھیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہریانہ میں اردو اکادمی بھی قائم ہے۔ سرکار کی متعصب پالیسیوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہریانہ میں اردو زبان و ادب اور صحافت کے حوالے سے مستقبل تابناک نہیں ہے۔ جس طرح پنجاب میں محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ و ثقافت، سے نکلنے والا ماہنامہ جریدہ 'پاسبان' اور ہماچل پردیش میں سنسکرتی و بھاشا و بھاگ سے شائع ہونے والا سہ ماہی جریدہ 'جدید فکر و فن' بند ہو گیا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب ہریانہ میں محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ و ثقافت، سے جاری ہونے والا ماہنامہ رسالہ 'تعمیرِ ہریانہ' بھی بند ہو جائے گا کیوں کہ سلطان انجم رٹائر ہونے کے بعد بھی خود ہی کام کر رہے ہیں اور گزشتہ آٹھ برسوں سے ایسے حالات پیدا کر دئے ہیں کہ

پوسٹ فلپ ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ ایسا ہی 'قومی آواز' جو ایک سرکاری اخبار تھا اس کی کیا حالت ہوئی کیوں اور کیسے بند ہوا آپ سبھی حضرات واقف ہیں۔! یہی حال 'جمنا تٹ' کا بھی ہونے والا ہے۔ گزشتہ ڈیڑھ برس سے پوسٹ خالی پڑی ہوئی ہے اور رسالہ کا مالک خدا ہی ہے۔ دو ماہی 'خبر نامہ' جس کا ماسبق ذکر ہو چکا ہے، تو بند ہی ہو گیا ہے۔ جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اردو زبان و ادب اور صحافت کی نمائندگی دسر پرستی کرنے ولا کوئی نہیں ہے۔ ہریانہ میں جو شعرا و ادبا جتنی بھی تعداد میں ہیں، ان کو اردو سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اُن کے لئے بس اتنا ہی کافی ہے کہ اُن کی تخلیقات شائع ہو گئیں یا اُن کی متعصب ذہنیت کام کرتی رہتی ہے کہ کیسے زبان کو نقصان پہنچایا جائے۔ سنہ 2000 کے بعد صرف ایک رسالہ دیکھنے میں آتا ہے جو یمنا نگر کے قصبہ بوڑیہ سے سہ ماہی 'فیضانِ کریمی' کے نام سے نکلتا ہے۔ جس کی ادارت کے فرائض حافظ حسین احمد عرف پیر جی سرانجام دیتے ہیں۔ یہ رسالہ ہنوز جاری ہے۔ فرید آباد سے 'آواز' 2000 کے بعد تک ہفت وار نکلتا رہا۔ جس کے مدیر امر سامی تھے جو گزشتہ دو برس ہوئے اُن کی وفات کے ساتھ بند ہو گیا۔

سب سے اہم سوال یہ کھڑا ہوتا ہے کہ ان حالات کے ذمہ دار کون حضرات ہیں.....؟

ان تمام حالات کے ذمہ دار وہ حضرات ہیں جو مرکز یا دوسرے سرکاری اداروں میں کلیدی عہدوں پر جلوہ افروز ہیں یا وہ پروفیسر حضرات ہیں جن کو اللہ نے دولت اور عہدہ دونوں سے نوازہ ہے۔ ہریانہ ہی نہیں میں پورے وثوق کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ جب تک ہمارے دلوں کے اندر خلوص پیدا نہ ہوگا، نہ ہم اردو زبان کو زندہ رکھ سکتے ہیں اور نہ ہی اردو صحافت کی بقا ممکن ہے۔ میرا ذاتی مشاہدہ اس بات کا غماز ہے کہ جتنا نقصان آزادی کے بعد اردو صحافت کو مسلمانوں سے پہنچا ہے وہ دوسروں سے نہیں۔ اب یو پی کی ہی بات لے لیجئے۔ یو پی میں اس وقت ایک ساتھ بیس ہزار سرکاری اردو ٹیچر کام کر رہے ہیں جن میں نوے فیصد مسلمانوں کی تعداد ہے۔ کتنے ٹیچر ہیں جو اردو کا اخبار پڑھتے ہیں، رسالوں کی تو بات ہی چھوڑ دیجئے.....! بہ مشکل دو فیصد۔ اسی کے ساتھ سب سے بڑی زیادتی یہ کر رہے ہیں کہ اردو نہیں پڑھاتے۔ کہتے ہیں کہ سرکار کتابیں نہیں بھیجتی ہے۔ اور بھی بہت سے مسائل اور وجوہات وہ آپ کے سامنے بیان کر دیں گے۔ مگر مسائل سے تو تبھی لڑیں گے جب دل میں درد، کسک اور خلوص ہوگا۔ ضمیر تو مردہ ہو چکے ہیں اور قرآن کا ارشاد

ہے جو قوم خود اپنی حالت نہیں بدلتی خدا بھی اُس قوم کی حالت نہیں بدلتا۔ ہم کلیدی عہدوں پر بیٹھ کر صرف اسٹیج کی زینت بننا چاہتے ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ کسی بھی قوم اور شعبہ کا تعلق اخلاص پر منحصر کرتا ہے جب دل میں یقین ہوتا ہے تو کامیابی یقیناً قدم چومتی ہے۔ ہمیں اگر اردو صحافت اور زبان و ادب کو زندہ رکھنا ہے تو اپنے بچوں کو اردو پڑھانا ہوگا۔ میں میڈیم کی حمایت میں نہیں۔ اردو زبان کو ایک مضمون کی شکل میں بھی اسکولوں میں نافذ کرنی چاہیے۔

کتابیات:

1۔ اردو زبان و ادب میں کے فروغ میں ہریانہ کا حصہ	از: مہندر پرتاپ چاند	غیر مطبوعہ (مکمل 2007)
2۔ اردو صحافت آزادی کے بعد	از: ڈاکٹر افضل مصباحی	اشاعت دوم (2013)
3۔ سالنامہ آئینہ اردو صحافت	ایڈیٹر: مرتضیٰ اقبال	مارچ 2015، شمارہ۔ 1، جلد۔ 1

(ظ) راجستھان

اردو صحافت اور صوبہ راجستھان

ڈاکٹر زیبا زینت

Joumalism is not only to communicate but also to educate صحافت کے میدان کا سچ یہی ہے لیکن صحافت کیسے عوام کی رگوں میں سرایت کر گئی یہ پہلو بھی قابلِ تحقیق ہے۔ گر بات ہندوستان کی کی جائے تو یہ ایک حقیقت ہے کہ جنگِ آزادی میں اردو صحافیوں نے روشنائی اور کاغذ سے کہیں زیادہ اپنا خونِ جگر پیش کیا۔ یہ وہ دور تھا کہ جہاں اردو صحافت نہ پیشہ تھی، نہ ذریعۂ معاش، نہ سیاسی داؤ پیچ کا جال تھی، نہ تفریح و قصیدہ گوئی کا میدان۔ اردو صحافت جذبات، حقیقت اور جنون کا عکس تھی۔ ملک، قوم اور عوام کی سچی آواز تھی، ایک انقلاب کی چیخ تھی۔ ہندوستان کے ہر عام و خاص کے قلب میں اٹھتی ہوئی چنگاریوں کا وہ آتش فشاں تھی جس نے اندر ہی اندر جنگِ آزادی کا آغاز کیا۔ سرسید احمد خاں، حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے مقررین، ادیب، خطیب، شاعر اور عظیم الشان شخصیات نے اردو صحافت کے فن کو بلند کیا نتیجتاً جن کی بے بہا طاقت و صلاحیت نے نہ صرف عوام کو بیدار کیا بلکہ انگریزوں کا ہند میں سانس لینا تک محال کر دیا تھا۔ صحافت کے ہی وہ نشتر و تیر و کماں تھے کہ جنھوں نے برٹش حکومت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔

آزادی کا باوقار آفتاب اسی کے شانے پر طلوع ہوا۔

حضرات! یہ تو وہ عام بات تھی جو صحافت کی خدمات اور پر جوش جذبات کی نمائندگی کرتی ہے۔ اب ذرا راجپوتانہ میں صحافت کے آغاز و ارتقا پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔ راجپوتانہ جسے راجستھان کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ دھوروں اور ویروں کی سرزمین ہے۔ زبان اردو کی ارتقائی شکل وصورت یہاں اس انداز کی نہیں تھی جس قدر دیگر صوبوں میں نظر آتی تھی اور یہی حال صحافت کی معصوم صبح کے ساتھ بھی رہا تھا۔ دراصل نوابوں کی نگری ٹونک کو علاحدہ کر دیا جائے تو راجستھان میں اردو کا ماحول تابناک نہ تھا۔ رفتہ رفتہ وقت کے شانوں پر زبان نے سفر کیا اور ریگستان میں اردو کے گل بوٹے کھلنے لگے۔ لیکن صحافت کی پذیرائی ابھی باقی تھی۔ راجستھان میں اردو کے حوالے سے، اردو صحافت کے حوالے سے بزرگ محقق وادیب ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی صاحب اپنے ایک مقالے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''راجستھان میں پہلا اردو اخبار ''مظہر السرور'' کے نام سے 1851 میں بھرت پور سے مولوی صفدر علی نے جاری کیا تھا جو اردو اور ہندی کے دو کالموں میں چھپتا تھا۔ یہ اخبار کب تک جاری رہا اس کا پتہ نہیں چلتا۔ اس کے بعد مسٹر کنہیا لال نے 1856 میں جے پور سے ایک اخبار ''روضہ التعلیم'' کے نام سے جاری کیا۔ یہ اخبار بھی ہندی اردو کے دو کالموں میں چھپتا تھا۔ اسی طرح 1858 میں ''خیر خواہ خلائق'' کے نام سے منشی سوہن لال اور منشی اجودھیا پرشاد نے اجمیر سے ایک ہفت روزہ اخبار جاری کیا تھا جس میں خبروں کے علاوہ مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ 1851 سے 1900 تک راجستھان کے مختلف شہروں سے شائع ہونے والے جن اخباروں کے حوالے ملتے ہیں ان کے معدودے چند شماروں کا سراغ ملا ہے باقی اخباروں کے صرف نام ہی نام باقی ہیں۔ اس دوران حسب ذیل اردو اخبارات راجستھان کے مختلف شہروں سے جاری ہوئے جن میں بیشتر ہفت روزہ تھے نیز ان میں جے پور، جودھپور اور ٹونک ریاستوں

کے سرکاری گزٹ بھی شامل ہیں، جن میں اردو کا حصہ بھی شامل ہوتا تھا۔"

مظہر السرور (بھرت پور -1851) روضہ التعلیم (جے پور -1856) خیر خواہ خلائق (اجمیر -1858) نیر راجستھان (جے پور -1869) مارواڑ گزٹ (جودھپور -1870) محب وارواڑ (جودھپور -1871) سوشل راجپوتانہ (اجمیر -1871) جے پور اخبار (جے پور -1874) چراغ راجستھان (اجمیر -1874) امین الاخبار (ٹونک -1884) حدیقۃ الاخبار (ٹونک -1885) سفیر ٹونک (ٹونک -1887) معین الہند (اجمیر -1890) راجپوتانہ گزٹ (اجمیر -1890) جے پور اسٹیٹ گزٹ (جے پور - غالباً -1892) اخبار بھرت پور (بھرت پور -1895)) اور ترجمان جودھپور۔ مذکورہ بالا فہرست کو مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے کہ اس زمانہ میں راجستھان کی جن مختلف ریاستوں کے دفاتر میں سرکاری طور پر اردو زبان استعمال ہونے لگی تھی وہاں شعر و ادب کی ترویج کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا ممکن ہے ایسی ریاستوں میں اخبار بھی جاری ہوئے ہوں۔

"تذکرۂ شعرائے جے پور" (مخطوطہ بخط مصنف) تحریری 6 جنوری 1955 میں 21 تا 41۔

جے پور کے رسائل نیرنگ جہاں، الکمال، بزم راجستھان کے علاوہ شادماں کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے جس میں پطرس بخاری کا مضمون "کتے" پہلی بار چھپا تھا۔ اسی رسالے میں علامہ سیماب اکبرآبادی اور مولانا اطہر ہاپوڑی کی فن عروض سے متعلق بحث بعنوان "معروضہ عروضی" قسطوار شائع ہوئی تھی۔ ماہنامہ 'آفتاب' (جھالاواڑ) ماہنامہ 'آستانہ' (اجمیر) وغیرہ کے نام بھی بصد شوق پیش کیے جا سکتے ہیں۔ البتہ بعض رسائل ایسے بھی ہیں جس میں ادبی کوائف شائع ہوتے رہے ہیں جو راجستھان کی ادبی تاریخ میں بڑی اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ مثال کے طور پر "ماہنامہ روشنی" مجریہ جنوری 1935 کو رام نواس باغ جے پور کے البرٹ ہال میں منعقد ہوا تھا جس میں 36 گھنٹے کی چار نشستوں میں کل 170 مقامی اور بیرونی شعرا نے اپنا طرحی کلام پیش کیا تھا۔ مشاعرے کی مصرعہ طرح حسب ذیل تھی:

"آئے نہ بے نقاب وہ میرے خیال میں"

اس مشاعرے میں جے پور کے تمام شعرا کے علاوہ پنڈت برجموہن کیفی، تاثر، پنڈت معجز دہلوی، پنڈت آنند نرائن ملا، سیماب اکبرآبادی، جگر مرادآبادی، تاباں بدایونی، میکش

اکبرآبادی، ماہر القادری، سراج لکھنوی، بوم میرٹھی وغیرہ نے شرکت کی تھی۔ اس مشاعرے کی تفصیلات تذکرہ شعرائے میں بھی درج ہیں جن کا ماخذ ماہنامہ ''روشنی'' ہے۔ اس مشاعرے کی روداد پر روشنی کی اشاعت پر فخر ہوتا ہے۔ ورنہ تاریخ اسے فراموش کر جاتی۔ اگر ماہنامہ ''روشنی'' میں اس مشاعرے کی روداد شائع نہ ہوتی تو شاید اس کے انعقاد کی بھی خبر کسی کو ہوتی۔ بقول مولانا شاغل:

> ''گھٹیا کاغذ اور سستی لکھائی چھپائی ہی سہی تاہم مولوی امیر الدین خاں شوخ کا یہ احسان کم نہیں ہے کہ انھوں نے اس مشاعرے کی کچھ نہ کچھ روداد اور تھوڑا بہت انتخاب کلام ماہنامہ روشنی بابت ماہ مارچ و اپریل 1935 میں چھپوا دیا۔ ورنہ مفصل حالات اور مکمل انتخاب کی طباعت تو 'نو من تیل اور رادھا' کی شکل ہو کر رہ گیا۔''

(مخطوطہ ''تذکرہ شعرائے جے پور'' ص:23)

لہٰذا جیسے جیسے اردو زبان و ادب کی نئی راہیں ہموار ہو رہی تھیں ویسے ویسے اردو صحافت کی بھی ترقی کی نئی جہتیں راجستھان میں منظر عام پر آ رہی تھیں۔ راجستھان میں صحافت کا یہ عالم تھا کہ یہاں شائع ہونے والے بیشتر اخبارات ریاستوں کی سرحد کو عبور نہ کر پائے۔ گو کہ مختلف اچھے اور معیاری اخبار و جرائد جاری تو ہو رہے تھے لیکن ان کا اشاعتی سفر طویل نہ ہو سکا یہ چند ماہ و سال کے بعد خیر باد کہہ گئے۔ مختصر عرصہ ان کی اشاعت رہی۔ اب اس کی وجوہات کیا تھیں یہ بھی ایک اپنی دلسوز داستان ہے۔ کوئی شئے تب تک باقی رہتی ہے جب تک اس کی دلچسپی اور محبت باقی رہتی ہے۔ اردو زبان و بیان کا فقط ایک شعبہ ایسا تھا جو کہ بغیر مذہب و ملت لوگوں کو اپنا گرویدہ بنائے ہوئے تھا۔ وہ تھا شاعری، غزل، نظم یعنی منظوم ادب۔ جہاں مشاعرے کا اہتمام ہوتا لوگ رات رات بھر بڑی دلچسپی کے ساتھ حاضری دیتے اور لطف اندوز ہوتے۔ وہی گر بات اردو اخبار کی ہوتی تو ایک عام رائے یہ بھی تھی کہ اسے خرید کے پڑھنے سے کیا فائدہ یوں ہی کبھی نظر آ جائے تو اٹھا کر دیکھ لیا۔ خرید کر نا پڑھنے کی یہ عادت بھی اردو اخباروں کی ترقی کی راہ میں دشواری بنی ہوئی تھی۔ حالانکہ اردو اخباروں اور رسائل میں بہت لیاقت اور خوبی کے ساتھ یہاں کے عام و خاص

کی تخلیقات بھی شائع کی جارہی تھیں جس کی وجہ سے راجستھان کے ادیبوں اور شاعروں کی منظوم و منثور تخلیقات اور مقامی ادب منظر عام پر آتا رہا اور یہ افتخار بھی اردو صحافت کو ہی حاصل ہے کہ راجستھان میں اردو ادب کی تاریخ و تحقیق کا ایک گرانقدر ماخذ وہ تمام اشاعتی سرمایہ باقی رہ گیا اور جس کے ذریعہ آج راجستھان میں اردو شعر و ادب کی تاریخ و تحقیق کو تقویت مل رہی ہے۔ اگر اس وقت اس ذخیرے کو جمع نہیں کیا جاتا تو آج اس کا نام و نشاں بھی باقی نہ ہوتا گر یہ رسائل و جرائد بھی نہ ہوتے تو یہاں کی ادبی تاریخ پر اسی طرح گمنامی کے پردے پڑے رہتے۔

اسی طرح راجستھان کے علاقے ہاڑوتی میں اردو صحافت کے متعلق ڈاکٹر قمر جہاں اپنے مضمون راجستھان میں علاقائی اردو صحافت ہاڑوتی کے حوالے سے فرماتی ہیں کہ:

> ''ہاڑوتی سے روزانہ اخبار کبھی جاری نہیں ہوا۔ کوٹہ سے جاری ہونے والا سب سے پہلا ماہانہ قومی رسالہ 'نور باف زندگی' تھا جسے محمد سلیمان صاحب نے 1925 میں شائع کروایا۔ سلیمان صاحب اردو کے دوست، اردو کے پرستار اور اردو کے مخلص خدمت گزار تھے۔ معاشرتی فلاح و بہبود کے پیش نظر اس کا اجرا عمل میں آیا۔ اس کا ایک ہی شمارہ شائع ہو سکا۔ ریاست نے اس کو مزید اشاعت کی اجازت نہیں دی۔ یہ رسالہ اگر جاری رہتا تو اردو زبان و ادب کے فروغ و ارتقا کا باعث ہوتا۔ 'رسالہ نور باف زندگی' کا مقصد ایک مخصوص فرقے کی تعلیمی، اقتصادی اور معاشرتی حالات کی اصلاح و ترقی، ادبی و تاریخی مضامین کے ذریعے ان کی غفلت و بے حسی کو دور کرنا اور انھیں علمی ذوق پیدا کرنا تھا۔''

بات کریں جے پور، ٹونک اور اطراف کی تو راجستھان کے مختلف شہروں جے پور، اجمیر، ٹونک، بھرت پور اور الور وغیرہ سے کئی اخبارات جاری ہوتے رہے جن میں زیادہ تر ہفت روزہ اخبار تھے۔ مگر ان میں کوئی بھی دیرپا ثابت نہیں ہوا۔ نیز ایسے اخباروں کے حوالے تو ملتے ہیں مگر زیادہ تر اخبارات کا کوئی ریکارڈ نہیں ملتا۔ اردو کے اخبارات میں شائع ہونے والی مقامی خبروں کے علاوہ دوسری خبریں عام طور پر دوسری زبانوں کے اخباروں سے مستعار لی جاتی تھیں

اور اردو ترجمہ کر کے شائع کی جاتی تھیں جو عام طور پر تاخیر سے چھپتی تھیں اور ہفتہ وار اخباروں میں چھپنے والی خبروں کی اشاعت میں مزید تاخیر ہوتی تھی۔ اسی زمانے میں پندرہ روزہ اخبار 'ہماری طاقت' بھی 1984 میں جے پور ہی سے جاری ہوا تھا جو غالباً 1991 تک جاری رہا اور پھر ایک طویل وقفے کے بعد 2009 میں ایک بار پھر نئے رنگ روپ اور کوشش کے ساتھ دوبارہ جاری ہوا اور تیزی کے ساتھ ترقی کرتا ہوا راجستھان کی حدود کو پار کر کے ملک کے دوسرے صوبوں تک راجستھان کی آواز پہنچانے لگا ہے۔

کمپیوٹر اور الکٹرانک میڈیا کے ذریعہ خبروں کی فراہمی اور طباعت کی جدید سہولیات کے باعث اردو اخبارات کے شعبے میں راجستھان میں بڑی تبدیلی آئی اور پابندی کے ساتھ اشاعت اور وقفہ اشاعت کے دوران کی اہم خبروں کے علاوہ صوبائی سطح کی ادبی سرگرمیوں کی شمولیت کی وجہ سے اخباروں کی مقبولیت بھی بڑھتی گئی۔ ٹونک کی ادبی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ راجستھان کا شیراز ٹونک بھی صحافت کی خدمات میں پیش پیش رہا۔ ... کے ادیب و دانشور، شاعر، حکیم، عالم تو مشہور و معروف ہیں ہی ساتھ ہی یہاں کے عربی فارسی انسٹی ٹیوٹ کا جریدہ بھی اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی اپنے مقالے اے پی آئی ٹونک کا سالانہ جریدہ ''جرنل'' (اردو) کا ادبی سفر میں لکھتے ہیں:

> ''مولانا ابوالکلام آزاد عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک ۔ راجستھان تحقیق و تاریخ کا بین الاقوامی ادارہ ہے جس کا قیام حکومت راجستھان نے 1978 میں کیا۔ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے سالانہ ادبی، تحقیقی مجلہ ''جرنل'' کی اشاعت کا آغاز 1982 سے ہوا۔ اس ''جرنل'' میں تحقیقی مضامین کے ساتھ وہ مقالات اور توسیعی خطبات بھی شائع ہوتے ہیں جو یہاں وقتاً فوقتاً منعقد ہونے والے سیمیناروں، کانفرنسوں اور ورکشاپ میں پڑھے جاتے ہیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے ادارہ ہذا کے فاؤنڈر ڈائریکٹر صاحبزادہ شوکت علی خاں نے تحقیق کے رہنما، پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی نمبر سے ''جرنل'' کا آغاز کیا۔ اس مجلہ میں ہندوستان اور

پاکستان کے محققین کے مضامین شامل کیے۔"

یہاں اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ راجستھان میں چند تعلیمی اداروں کے سالانہ اردو میگزینوں یا مجلوں سے بھی جن کو صحافت کے دائرہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ راجستھان کے ابھرتے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کی اشاعت کو تقویت پہنچائی ہے۔ اردو صحافت کا ادبی پہلو نہ صرف شعر و ادب کی ترویج کو تقویت پہنچاتا ہے بلکہ خصوصی طور پر علاقائی ادب کی تاریخ و تحقیق کے لیے مواد بھی فراہم کرتا ہے۔ اشاعت کی دشواریوں اور خاص طور پر عدم استحکام کے باوجود راجستھان کی ادبی تاریخ کو زندہ رکھنے کا کام ان تمام نے بخوبی انجام دیا۔ حالانکہ دشواریاں جو کہ ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھیں۔ مالی وسائل کی کمی، خریداروں کا فقدان، طباعت کی دشواریاں، کتابت کی پریشانیاں اور عوام کا عدم تعاون راجستھان میں اردو صحافت کی پسماندگی کی وجوہات رہیں۔ یہی نہیں بلکہ اخباری خبروں کے لیے اردو کی خبر رساں ایجنسیوں اور خبر رساں نمائندوں کی عدم موجودگی بھی اخباری صحافت کی ترقی میں رکاوٹ بنی رہیں۔

حالات نے کروٹ لی اور اردو صحافت ترقی کی پرستار ہوگئی اور بہت مشکل سفر طے کرتے ہوئے آج اردو صحافت اکیسویں صدی کی پیشانی چوم رہی ہے۔ جہاں نہ صرف تہذیب و تمدن، زبان و بیان، معاشرہ اور افکار ہی تبدیل ہوئے ہیں۔ وہیں صحافت کے شعبہ نے بھی اپنی روایتی گرد جھاڑ کر نئی قبا اختیار کر لی ہے۔ بقول عبدالحئی:

> "زمانہ قدیم کے ماہرین و مفکرین نے ترسیل کے سلسلے میں جتنے بھی خواب دیکھے تھے دور حاضر کی مشینی ایجادات نے انھیں حقیقت میں تبدیل کر دیا۔ ترسیل نے آج مختلف افراد کو، مختلف معاشرے کو بلکہ پوری عالمی برادری کو ایک دھاگے میں پرو دیا ہے اور مختلف ممالک میں لوگوں کی سوچ، تہذیب و ثقافت بدل رہی ہے۔ یہاں تک کہ معیشت، سیاست اور رہن سہن سب کچھ تبدیل ہو رہا ہے۔ شاید اسی لیے ولبر شرم نے اپنی کتاب ماس میڈیا اینڈ نیشنل ڈیولپ میں لکھا ہے "mass media communication can change the world."۔ آج صحافت پرنٹ

میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا دو قسموں میں تقسیم ہو چکی ہے، وہیں اردو عالمی میڈیا کلچر کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ تکنیکِ نو کی آمد کے ہمراہ ذرائع ابلاغ کی تصویر میں رنگِ نو کو شامل کیا جا رہا ہے۔ ترقیاتی افکار کے ساتھ ہر سمت بہتر سے بہترین کا عمل جاری ہے۔ نئی مشینری، بڑی و اعلیٰ معیاری چھاپے خانے، رنگین پرنٹنگ اور کمپیوٹر کے ذریعہ تمام مشکل امور بہتر طریقہ سے با آسانی انجام دیے جا رہے ہیں۔ اخبارات و جرائد اور رسائل کا معیار، مواد، چمک دمک اور پیشکش میں ایک بڑی تبدیلی ہوئی ہے۔ آج اردو کے تقریباً بیالیس ہزار سے زائد اخبار و جرائد شائع ہو رہے ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ریڈیو، ٹی۔ وی، انٹرنیٹ، ویب سائٹس، بلاگس اور موبائل اپڈیٹ کے ساتھ اردو صحافت سائبر میڈیا کا ایک اہم حصہ بن چکی ہے۔ راجستھان میں بھی اردو صحافت کی تصویر بدلی ہے۔ اردو اخبار خرید کر پڑھنے کی عادت نے اور ایک پروقار پیشے کی رمق نے عوام کو اپنا طلبگار بنا لیا ہے۔ اب مختلف شہروں میں اردو کے اخبار شائع ہو رہے ہیں۔ بلکہ مختلف بڑے اخباروں میں یہ صوبہ بھی نمائندگی کر رہا ہے۔ یہاں کے جریدے گو کہ وہ APRI ٹونک کا جنرل یا اردو اکادمی راجستھان کا جریدہ نخلستان ہو یا دیگر اخبارات ہوں بے حد ایمانداری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔"

صوبے اور خطے سے بالاتر ہو کر اب غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ دراصل صحافی ایک قوم کا نام ہے جو مشکلوں، مسئلوں اور مصیبتوں اور کوششوں کے سائے میں محنت، مشقت اور مسلسل جہت میں اپنی زندگی گزار دیتی ہے۔ یہ زبان نہ خاموش ہوتی ہے نہ خوف و خطر سے گھبراتی ہے۔ یہ قلم نہ تھمنا جانتا ہے، نہ ہی کسی کے تابع رہنا اسے راس آتا ہے۔ وہیں اردو صحافت نے جہاں روزگار کے مواقع پیدا کیے ہیں۔ معاشرے میں مسلمانوں کے مسائل کو اٹھانے اور حق پرستی و سچائی کی جانب راغب کرنے، حکومت تک اپنی آواز بلند کرنے اور ساتھ ہی اسلام سے متعلق بھی بہتر

معلومات فراہم کرنے کا کارنامہ اسی شعبے نے انجام دیا ہے۔ اردو صحافت نے نثر و نظم کے مختلف رنگوں کو سنوارا ہے تو قومی مسائل، تعلیم کے فروغ، تہذیب کی بقا اور مذہب کے پیغامات کو عام کرنے کا فریضہ بھی انجام دیا ہے۔ لہٰذا اب قارئین کا یہ فرض بنتا ہے کہ آپ زیادہ سے زیادہ اردو اخبارات خرید کر پڑھیں۔ اس زبان کے ان خدام کی حوصلہ افزائی کریں اور ان کی قربانیوں اور جذبوں کا احترام کریں۔

چوتھا باب

اردو صحافت کا عصری منظر نامہ

اُردو صحافت: نئے دَور میں

ضامن جعفری

صحافت معاشرے کی رہنمائی کرتی ہے یا اُسے گمراہ؟ یہ تریاق ہے یا زہر کا پیالہ؟ اس کا انحصار اس پر ہے کہ معاشرہ اس کو کس انداز میں اور کس مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔

آج کے ترقی یافتہ دَور نے اپنے جدید ذرائع ابلاغ کے ذریعے صحافت کو انسان کے ہر شعبۂ زندگی میں ایک ایسی قوت عطا کر دی ہے جس کا خواب تک انسان نے اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔ حالانکہ روزنامے کی شکل میں خبریں مشتہر کرنے کی حد تک تو صحافت کا سلسلہ قدیم روم میں ''ایکاڈیورنا'' نامی روزنامچے کی صورت میں کوئی ایک سو تیس اکتیس قبل مسیح میں شروع ہو چکا تھا۔ ''ایکاڈیورنا'' کو ہماری آج کی اردو زبان میں ''دن بھر کی کارکردگی'' کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں عام آدمی کو باخبر کرنے اور باخبر رکھنے کے لیے دن بھر کی خبریں ہوتی تھیں جن کو پتھر یا دھات پر کندہ کر کے ایک جگہ جمع کر دیا جاتا تھا۔ ہمیں یہ بھی ذہن میں رکھنا ہوگا کہ خبر کہتے کس چیز کو ہیں اور خبر سے مراد کیا ہے۔ ''خبر'' کا اصل مطلب کسی بھی چیز کی حقیقت کو یا اصلی صورتِ حال کو جاننا اور اس سے واقف ہونا ہے۔ گویا صحافت کا دائرۂ کار محض خبر کی ترسیل تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس میں

تحقیق اور سچ بھی شامل ہے اور یوں یہ ہمارے معاشرے کا پوری طرح احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ہماری سیاست، معاشیات، اخلاقیات، معاشرے کے مختلف طبقات اور ان کے کردار سب اس کی وسعتِ نظر میں ہوتے ہیں۔ یہ سب موضوعات صحافت میں شامل ہیں۔ برنارڈ شا نے تو تمام عظیم ادب کو صحافت قرار دیا تھا۔ میتھو آرنلڈ نے یہ کہا کہ صحافت جلدی میں تخلیق شدہ ادب ہے۔ صحافت کو ریاست کا چوتھا ستون بھی کہا گیا۔ اب یہ الگ بات ہے کہ باقی تینوں ستونوں سے اس کی کتنی اور کیسے نبھتی ہے۔

دورِ حاضر کی اردو صحافت بنیادی اغراض و مقاصد کو اپنائے ہوئے ہے یا نہیں؟ اگر اپنائے ہوئے ہے تو اس کا اظہار عملی طور پر بھی ہو رہا ہے یا نہیں ہو رہا؟ اور اگر اپنائے ہوئے نہیں ہے تو اس کے اسباب کیا ہیں؟ ہم اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ ان اغراض و مقاصد کے حصول میں کامیابی یا ناکامی کا انحصار مختلف اجتماعی اور انفرادی عوامل پر بھی ہوتا ہے۔ ان عوامل میں تہذیبی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی ماحول اور اقدار نیز انتہائی تیز رفتاری سے آگے بڑھتی ہوئی ٹیکنالوجی سب شامل ہیں اور اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔ دوسرا اہم اور قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ اگر مذکورہ عوامل سازگار نہیں ہیں تو ان کو سدِ حارنے اور سازگار بنانے میں آج کا صحافی خود کیا کردار ادا کر رہا ہے۔ کیونکہ یہ کام صحافی کا ہے کہ اس میدان میں قدم بڑھانے سے پہلے اس سفر کے تقاضوں کو پورا کرنے، اس میں درپیش مشکلات کا حل تلاش کرنے اور اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے خود کو خاطر خواہ طریقے سے تیار کرلے۔

یہاں میں دو امور کی وضاحت کرنا چاہوں گا۔ اوّل تو یہ کہ اس مضمون کا مقصد صحافت کے پیشے سے منسلک کسی خاص شخصیت یا خاص ادارے پر کسی قسم کی انگشت نمائی قطعاً نہیں ہے۔ یہ محض میرے ذاتی مشاہدات، خیالات اور نظریات پر مشتمل ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس میں آپ کو شخصیات اور اداروں کے حوالے اُن کے ناموں کے ساتھ خال خال ہی ملیں گے۔ بہت احتیاط کی ہے کہ کہیں نادانستہ بھی کسی نہ لگ جائے آبگینوں کو۔ دوسرے یہ کہ دنیا کی اردو صحافت کا بیشتر حصہ بھارت اور پاکستان میں ہے۔ باقی ماندہ بیشتر حصہ یورپ، شمالی امریکہ اور کینیڈا میں ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہے وہ آسٹریلیا اور باقی تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ بھارت اور پاکستان کے علاوہ

دوسری جگہوں پر بسنے والے اردو داں طبقے کے حالات، ضروریات، مواقع، ذرائع، مسائل اور ان کے حل اور مجموعی طرزِ زندگی بھارت اور پاکستان سے بہت مختلف ہیں۔ چنانچہ وہاں کی اردو صحافت کے حالات و ترجیحات بھی برصغیر کی اردو صحافت سے بہت مختلف ہیں۔ یوں سمجھیے کہ دو بڑے دریا ہیں جن سے نکلنے والی نہریں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اگرچہ بیرونی ممالک کی اردو صحافت میں بھی وہاں کے اہلِ دانش اور اہلِ قلم کی تعداد روز افزوں ہے لیکن اب بھی کہہ سکتے ہیں کہ نوّے فیصد سے زیادہ پانی انہی دو دریاؤں کا ہے۔ وہاں کے اخبار و رسائل کی سیرابی کا منبع برصغیر ہی میں ہے۔ ایک واضح فرق ان دونوں میں یہ ہے کہ بیرونِ ممالک کی اردو صحافت پر وہ دباؤ نہیں ہیں جو برصغیر کی اردو صحافت پر ہیں۔ اس کی دو واضح وجوہات یہ ہیں کہ وہاں قوانین کا اطلاق و پاسداری اور حقوقِ انسانی کی صورتِ حال کئی اعتبار سے نسبتاً بہتر ہے۔

ان تمام بیان کردہ امور کی روشنی میں اب کچھ سوال اُٹھاتے ہوئے، دورِ حاضر میں اردو صحافت کا جائزہ لیں اور ہر قسم کے لاگ اور لگاؤ کے بغیر دیکھیں کہ دورِ حاضر میں یہ کس صورتِ حال سے گزر رہی ہے اور اس سے کون کیا چاہتا ہے۔

عام آدمی زیادہ کچھ نہیں چاہتا۔ وہ صرف حالات و واقعات کی اصل حقیقت سے باخبر ہونا اور باخبر رہنا چاہتا ہے۔ یعنی اس تک پہنچنے والی معلومات اور خبریں بلا کم و کاست اور بلا مبالغہ پہنچ جائیں، اُن کی حقیقت کو تبدیل نہ کیا جائے۔ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ حقوق کے حصول اور تحفظ کی جدوجہد میں اس کی حیثیت کے بجائے عدل و انصاف کی بنیاد پر اُس کا ساتھ دیا جائے۔ اگر اُس کے حقوق کے حصول میں اُس کی مدد نہیں کی جا سکتی تو کم از کم اُس کے حقوق کی حمایت کے پسِ پردہ اپنے فوائد پر نظر نہ رکھی جائے۔ تحریری، تقریری اور تصویری صحافت میں تہذیب اور اخلاق کی اقدار اور زبان کے معیار پر سمجھوتہ نہ کیا جائے۔ معاشرے میں مختلف فکر و نظر رکھنے والوں کے درمیان ہم آہنگی اور یکجہتی کی فضا قائم کرنے کی کوشش کی جائے جو پُرامن اور پُرسکون زندگی کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

سیاست کی اپنی توقعات ہیں جن پر وہ چاہتی ہے کہ صحافت پوری اُترے۔ اس کے لیے وہ ہر ممکن حربہ استعمال کرتی ہے۔ مشکل وہاں آن پڑتی ہے جہاں ان توقعات کا صحافت کے

اصولوں اور فرائض و ترجیحات سے تصادم ہوتا ہے اور صحافت کے لیے بعض اوقات خواہی نخواہی دامن بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی اس کی اپنے فرائض اور مقاصد سے وفاداری کی آزمائش کا مرحلہ ہوتا ہے۔

بدلتے وقت کا اہم ترین تقاضا ہے کہ اردو صحافت بے لاگ اور غیر جانبدار ہو، کسی خاص نقطۂ نظر اور اندازِ فکر کی آلۂ کار نہ ہو۔ اُس پر عدم انصاف پر مبنی طرف داری اور عقیدہ و مذہب کی چھاپ نہ ہو۔ کیونکہ صحافت کا کوئی مذہب اور عقیدہ نہیں ہوتا۔ اس کا کام صرف دودھ کو دودھ اور پانی کو پانی کہنا، لکھنا اور دکھانا ہے۔ پاکستان اور بھارت میں مذہبی انتہا پسند حلقوں کے ہاتھوں دانستہ یا نادانستہ استعمال ہو کر اردو صحافت نے بہت نقصان اُٹھایا ہے۔ اِسی تصویر کا دوسرا اور خوشنما رُخ یہ بھی ہے کہ ابھی ماضی قریب میں لکھنؤ اور بعض دیگر مقامات کے اخباروں نے مختلف عقائد کے حامل افراد کی باہمی مثالی یکجہتی کی خبریں، تصویریں اور اُن پر مثبت تبصرے شائع کیے اور یوں معاشرے میں اپنا سچا، صحیح اور قابلِ تعریف کردار ادا کیا۔ میری دعا ہے کہ پورے برصغیر کی اردو صحافت اس عمل کی تقلید میں قدم اُٹھائے اور یہ ثابت کرے کہ مذہب انسان کے لیے پیدا کیا گیا ہے نہ کہ انسان مذہب کے لیے۔ لہٰذا اوّلیت انسان ہی کو حاصل ہے نہ کہ مذہب کو اور صحافت انسان کو جوابدہ ہے مذہب کو نہیں ہے۔

اردو صحافی کے بغیر اردو صحافت کا ذکر ممکن نہیں ہے۔ بھارت اور پاکستان میں اردو اخبارات اور رسائل کی تعداد دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ صحافت کا پیشہ اور اس سے منسلک صحافی کتنی بڑی عددی قوت، ماہرینِ فن اور خوشحال ہوں گے۔ کیونکہ وہ بھارت کے تقریباً چھ کروڑ اور پاکستان کے تقریباً پونے دو کروڑ اردو پڑھنے والوں کی آواز ہوں گے لیکن اصل صورتِ حال ایسی نہیں ہے۔ کیونکہ طبقاتی نظام یہاں بھی موجود ہے۔ ایک طرف کروڑ پتی اور ارب پتی صحافت ہاؤسز کے اخبار و رسائل اور وسائل ہیں تو دوسری طرف ایسے بھی ہیں جن کی بساط ایک ایک دو دو کمروں سے زیادہ کی نہیں ہے اور جن کی افرادی قوت محض ایک دو لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ اِدھر اُدھر کے مواد پر مشتمل تراشے چسپاں کر کے اور چھوٹے چھوٹے اشتہارات حاصل کر کے بمشکل اپنا گزارا کرتے ہیں۔ ان حالات میں معیار کا کیا تصور کیا جا سکتا ہے۔

بڑے صحافت ہاؤسز سے منسلک صحافیوں کی زندگی بھی پھولوں کی سیج نہیں ہے۔ صرف اخبار میں اپنی تصویر اور نام چھپ جانے سے، ریڈیو پر اپنی آواز سنائی دینے سے اور ٹیلی ویژن پر اپنی صورت نظر آ جانے سے صحافی کی زندگی میں سکون، خوشحالی اور احساسِ تحفظ پیدا نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات یہی دَور کے سہانے ڈھول عدم تحفظ کا سبب بن جاتے ہیں۔ نہ جانے کتنے صحافی جان سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔ اِس کی مثالیں برِصغیر کی تاریخ صحافت بالخصوص دَورِ حاضر میں بآسانی مل جاتی ہیں۔

عالمی تناظر میں اور عالمی زبانوں کے اعداد و شمار کی روشنی میں جب ہم اردو صحافت کو دیکھتے ہیں تو خوشی بھی ہوتی ہے اور دُکھ بھی۔ خوشی اس بات کی ہے کہ یہ زبان دنیا کے کونے کونے میں پہنچی ہوئی ہے اور اردو صحافت جس حال میں بھی ہے، کم و بیش اس کے ساتھ ساتھ ہے۔ دُکھ اس کا ہے کہ برصغیر میں جہاں یہ پیدا ہوئی اور پروان چڑھی وہاں اس کو وہ مقام اور اعتبار ابھی تک حاصل نہ ہو سکا جو ہو سکتا تھا اور ہونا چاہیے تھا۔ اس کا ایک سبب اس میں دَر آنے والی زرد صحافت بھی ہے۔ تعلیم یافتہ اور سُلجھا ہوا ذہن رکھنے والا طبقہ زرد صحافت سے دُور بھاگتا ہے جو اردو صحافت کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔ زرد صحافت میں تحقیق کی کمی یا عدم موجودگی، سنسنی خیزی، چونکا دینے والی سُرخیاں، مبالغہ آرائی، غیر شائستہ زبان، اخلاق سے گرا ہوا مواد اور اختلاف کرنے والوں پر کیچڑ اُچھالنا یہ سب قباحتیں شامل ہیں۔ اپنے شائقین کے دل واپس جیتنے کے لیے اردو صحافت کو ان تمام رُکاوٹوں کو دُور کرنا ہوگا۔ اس کے لیے اس سے منسلک افراد اور اداروں کو اپنا اپنا محاسبہ کرنا ہوگا۔

زبان کے حوالے سے مشاہدہ بتاتا ہے اگر سنبھالنے والے موجود ہوں تو نامساعد حالات سے زبانیں کبھی گھبرایا نہیں کرتیں۔ ہمارے سامنے عبرانی زبان کی جیتی جاگتی مثال موجود ہے۔ اس کے بولنے والے سیکڑوں بلکہ ہزاروں برس تک ساری دنیا میں منتشر رہنے اور اپنی اقدار کو زندہ رکھنے کی جدوجہد میں مصروف ہونے کے باوجود اس کو زندہ رکھنے میں کامیاب رہے۔ آج بھی ساری دنیا میں یہ زبان بولنے والے صرف تیرہ لاکھ اور ایک کروڑ کے درمیان ہیں جو دُنیا بھر میں اردو بولنے والوں کے دَسویں حصّے کے برابر بھی نہیں لیکن دونوں میں بہت بڑا اور بنیادی فرق

منصوبہ بندی کا اور نظم و ترتیب کا ہے جس کو ڈسپلن کہتے ہیں۔

مضمون کے اختتام پر میں دو باتیں اور عرض کرنا چاہوں گا۔ اوّل یہ کہ اردو صحافت کو اپنے ذرائع ابلاغ میں تیزی سے بدلتے وقت کے لحاظ سے تبدیلیاں کرنا ناگزیر ہو گیا ہے۔ وہ زمانہ جلد آنے والا ہے جب لوگ دس دس بیس بیس صفحات کے اخبار پڑھنا تو کجا سنبھالنے کے لیے بھی وقت نہیں نکال پائیں گے۔ انٹرنیٹ کی سہولت قارئین کی زندگیوں میں زبردست انقلاب لا چکی ہے اور مزید لائے گی۔ اب وہ وقت نہیں رہا ہے کہ قاری خبر پڑھ کر سوچتا رہے کہ نہ جانے یہ صحیح ہے یا غلط ہے اور اس کی تصدیق میں کئی کئی دن درکار ہوں۔ اب وہ اپنے ہاتھ میں موجود چھوٹے سے موبائل فون پر گوگل سرچ اور دیگر ذرائع سے فوراً خبر اور ذریعۂ خبر کے متعلق رائے قائم کر سکتا ہے اور اکثر کر بھی لیتا ہے۔ لہٰذا وسائل کی کمی اور مشکل حالات کے باوجود اپنا جائز مقام حاصل کرنے اور برقرار رکھنے کے لیے اردو صحافت کو اپنے سراپا کا از سرِ نو جائزہ لینا ہوگا کہ کہیں اصل مقاصد کو پسِ پشت تو نہیں ڈال دیا گیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ملکوں ملکوں اور شہر شہر جاری علاقائی اور مقامی سرگرمیوں سے قطع نظر غالباً ایک ایسے عالمی ادارۂ اردو صحافت کے قیام کے امکان پر غور کرنے کا وقت آ گیا ہے جو ہر قسم کے علاقائی، سیاسی اور مذہبی دباؤ اور مصلحتوں سے بے نیاز ہو کر اردو صحافت کی کمزوریوں، مجبوریوں اور مشکلات کی نشاندہی کر کے ان کے حل تلاش کر سکے۔ اس ادارے کو مقامی سطح پر اردو صحافت و زبان کے فروغ میں پہلے سے مصروف سرکاری، نیم سرکاری اور نجی اداروں سے مدد اور رہنمائی حاصل ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اس عالمی ادارے کے ارکان ان ہی اداروں سے اسی میدان کا علم و تجربہ لے کر آئیں گے۔ ادارے کے دائرۂ اختیار و فرائض میں اردو صحافت اور اس کے معیار سے متعلق قوانین بنانا، قوانین کے اطلاق کو یقینی بنانا، مشکلات سے باخبر ہونا، ان کا حل تلاش کرنا اور رُکاوٹوں کو دُور کرنا اور دیگر اہم امور ہوں گے۔

ہر لحاظ سے آزاد اور غیر جانبدار ادارے کی تشکیل شاید دورِ حاضر کی اردو صحافت کو ہر سطح پر زیادہ قابلِ اعتنا، زیادہ قابلِ یقین اور زیادہ قابلِ تعریف بنا دے اور حکومتوں اور حکومتی اداروں کے لیے بھی معاون ثابت ہو۔ یہ امر شاید خود اردو صحافت کے لیے بھی باعثِ سکون ہو۔ کیونکہ اس

کی مشکل یہ بھی ہے کہ کوئی طبقہ اسے اپنا مددگار دیکھنا چاہتا ہے تو کوئی اپنا آلۂ کار۔ ایک طرف اس سے ذہنی تعمیر و تربیت کی توقع ہے تو دوسری طرف اس پر انسانی فکر کو مفلوج و معذور کر دینے والوں کا دباؤ ہے۔ بقول شاعر:

ہے سخت مشکل میں جانِ ساقی پلائے آخر کدھر سے پہلے
سبھی کی آنکھیں یہ کہہ رہی ہیں اِدھر سے پہلے اِدھر سے پہلے

مراجع و مصادر:

1- وکیپیڈیا

2- رپورٹ آف دی ہیرالڈ گروپ۔ تحریر: ذہبی سمجھ

3- اخبار اردو: اپریل 2007، اپریل 2009

4- ہلی گزٹ

5- ورلڈ میٹرز ڈاٹ انفو

6- پریس کونسلز اینڈ اوبلی گیشنز آف جرنلزم۔ گفتگو شفقت منیر

اُردو صحافت کا عصری منظر نامہ

احمد اشفاق۔ قطر

صحافت عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی کتاب یا رسالے کے ہوتے ہیں۔ صحافت کسی خبر، حادثہ، کوئی اہم پیش رفت یا رونما ہونے والے کسی اہم واقعہ کو تحقیق اور تجزیہ کے ساتھ قارئین تک پہنچانے کے عمل کا نام ہے بشرطیکہ اس سارے کام میں نہایت ہی ایمانداری اور اخلاص کا عنصر موجود ہو، صحافت نام ہے لوگوں کی رہنمائی کا، صحافت نام ہے تبصروں کے ذریعے عوام الناس کو روشناس کرانے کا، صحافت عوامی معلومات، رائے عامہ اور تفریحات کی باضابطہ اور مستند اشاعت کا فریضہ ادا کرتی ہے، صحافت انسانی اقدار کے تحفظ کی ضامن اور مظلوم و مجبور عوام کے جذبات و احساسات کی ترجمان ہوتی ہے، صحافت کی قوت دراصل عوام کی قوت ہوتی ہے، کسی تحریک جماعت یا حکومت کی پالیسی کی کامیابی و ناکامی میں صحافت ایک اہم کردار ادا کرتی ہے جس کا مشاہدہ ہم روزمرہ کی زندگی میں کرتے ہیں۔

دنیا میں صحافت کی تاریخ آزادیِ اظہار اور ظلم و جبر سے نبرد آزمائی کے پہلو بہ پہلو اپنے مقاصد طے کرنے کی وجہ سے اعتبار حاصل کرسکی۔ صحافت کے مؤرخین نے بادشاہی فرمان جات اور

مفادِ عامہ کے اعلان ناموں کو صحافت کا اوّلین نمونہ مانتے ہوئے قبل مسیح عہد ہی سے صحافت کا آغاز تسلیم کیا ہے۔ اس اعتبار سے یونان، قدیم ہندوستان اور مصر میں تاریخی طور پر صحافت جیسی اوّلین شے کی تلاش کی جاتی ہے ہندوستان میں صحافت کی تاریخ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بعض (اصحاب الرائے) ملازمین کی مرہونِ منت رہی۔ ولیم بولٹس اور پھر جیمس آگسٹس ہکی اس اعتبار سے محترم ہیں کیونکہ انھوں نے ہندوستان میں صحافت کے موضوعات، مضامین اور مواد پر نہ صرف یہ کہ غور کیا بلکہ اس کے عملی نمونے ظاہر کر کے اٹھارھویں صدی کے اواخر میں باضابطہ اخباری نمونے بھی پیش کیے۔ انگریزی کے بعد بنگلہ اور فارسی کے اخبارات بھی فوراً انیسویں صدی کے آغاز میں سامنے آگئے۔ ''جامِ جہاں نما'' (1822) سے ''دہلی اردو اخبار'' (1836) تک باضابطہ طور پر اردو صحافت نے خود کو واضح سماجی اور سیاسی نقطۂ نظر کے ساتھ جوڑ لیا تھا۔ اس دوران انگریزی، بنگلہ، فارسی، گجراتی، اردو اور ہندی زبانوں کی صحافت نے اپنا ایک قوی منظر نامہ مرتب کر لیا۔ دیکھتے دیکھتے کلکتہ، مدراس، بمبئی اور دلّی سے باہر علاقائی صحافت کا آغاز بڑی سُرعت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ انگریزی حکومت کے پھیلنے اور متعدد سماجی و حکومتی جبر ہی تھے جن کی وجہ سے ہندوستان میں عمومی طور پر علاقائی اور کثیر لسانی صحافت کا فروغ ممکن ہوا۔ 1857 سے کافی پہلے اگر علاقائی اور کثیر لسانی صحافت کا فروغ نہیں ہوا ہوتا تو یہ ممکن ہے کہ 1857 کا انقلاب اور آزادی کی جنگ کا بہترین آغاز شاید ہی ہو پاتا۔ اردو اور ہندوستانی صحافت کا یہ رُخ کم و بیش آج بھی اپنے واضح اور ہمہ گیر اثرات کے اعتبار سے قائم ہے اور انگریزی کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانوں اور جغرافیائی خطوں کی صحافت خوب پھل پھول رہی ہے۔

ابتدا میں صحافت صرف خبروں پر مشتمل تھی مگر موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق صحافت میں تبصرے، تجزیے، تجاویز اور آرا شامل ہوتی ہیں، صحافت کی تمام اقسام میں واقعات اور مسائل کے متعلق جو حقائق و ثبوت حاصل کیے جاتے ہیں اسے قارئین کی ایک بڑی تعداد قبول کرتی ہے۔ صحافت جس ملک کی نمائندگی کرتی ہے قدرتی طور پر اس ملک کی ثقافت کا رنگ اس پر غالب آجاتا ہے اور وہ غیر ارادی طور پر اس کی تشہیر کرتی ہے، اخبارات کو اپنی ثقافت کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔

صحافت اب محدود تعداد کے قارئین سے نکل کر انتہائی وسعت اختیار کر چکی ہے اب اخبارات ورسائل کے ذریعے جو معلومات دی جاتی ہیں وہ ساری دنیا سے متعلق ہوتی ہیں اس لیے صحافت کی طاقت بھی اس کے حلقۂ اثر کے ساتھ ساتھ بڑھ رہی ہے اور کروڑوں لوگوں کی رائے کو متاثر کرتی ہے جس سے اس کی ہم گیر قوت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

صحافت کی مختلف النوع ترقی کے باعث اب خبروں کا علم کتابوں، صحافیوں، تک محدود نہیں رہا زمانہ بدلنے کے ساتھ ساتھ صحافتی مواد کی نوعیت بھی تبدیل ہوتی چلی گئی، صحافتی مواد کی اتنی افراط ہو گئی کہ اخبارات کے صفحات میں اضافہ ہوا۔ صحافت کے ابتدائی دور میں اخبارات چھوٹے ہوتے تھے اور مواد کم اس وقت قارئین کی سہولت کے لیے مختلف حصوں کو نمایاں طور پر پیش کرنے کی ضرورت نہیں تھی مگر اب ہر چیز کو نمایاں طور پر پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے۔

ترسیل کے حوالے سے صحافت کی دو قسمیں ہیں پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا۔

پرنٹ میڈیا: پرنٹ میڈیا سے مراد طبع ہونے والے اخبارات و رسائل ہیں جیسے روزنامہ، سہ روزہ ہفت روزہ اخبارات، سہ ماہی، ماہانہ، ششماہی اور سالانہ رسائل و جرائد اور ڈائجسٹ وغیرہ کیونکہ یہ سبھی طباعت کے مراحل سے گزر کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ہندوستان میں پرنٹ میڈیا کی روایت کافی قدیم ہے۔

الیکٹرانک میڈیا: الیکٹرانک میڈیا سے مراد ہر وہ ذرائع و ابلاغ و ترسیل ہیں جو Electronic اور Electromechanical قوت کے استعمال سے چلتے ہیں اس میں ریڈیو، ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ پر شائع ہونے والے اخبارات ورسائل ہیں۔

آج الیکٹرانک میڈیا کا دائرہ کافی وسیع ہو گیا ہے لہذا اس دائرے میں عوامی رابطے کی ویب سائٹ جیسے گوگل، فیس بک، ٹوئٹر وغیرہ شامل ہیں۔

صحافت دراصل کسی بھی زبان کے فروغ میں ایک اہم رول ادا کرتی ہے کیونکہ عوام سے اس کا براہ راست رشتہ ہوتا ہے، اطلاعات معاشرے کی اساس اور صحافت ضرورت بنتی جا رہی ہے۔ صحافت کا شاندار ماضی رہا ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم اردو دنیا کے اداریے میں لکھتے ہیں کہ:

"ماضی میں صحافت کی ایک درخشاں اور زریں تاریخ رہی ہے۔ صحافت نے جمہوری حقوق، مساوات، امن، سیکولرزم، اتحاد، یگانگت اور یکجہتی کے لیے جو کردار ادا کیا ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی میں بھی صحافت کا بہت فعال انقلابی کردار رہا ہے۔ اردو صحافت نہ ہوتی تو شاید ہندوستان کی آزادی کا سورج دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ ماضی کے زیادہ تر صحافیوں نے فرنگیوں کے خلاف جو محاذ کھولا تھا اس کا ہندوستانی عوام کے شعور پر بہت گہرا اثر پڑا۔ آزادی اور انقلاب کے جذبے کو بیدار کرنے میں سب سے اہم رول اردو صحافت ہی کا رہا ہے۔"

(ہماری بات۔ اداریہ، اردو دنیا، دسمبر 2015)

صحافت بالخصوص اردو صحافت نے جدو جہد آزادی میں جو کردار کیا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مگر ایسا نہیں ہے کہ آج صحافت کی ضرورت اور اہمیت کم یا ختم ہو گئی۔ آج بھی اردو صحافت اپنی ذمہ داری بخوبی نبھا رہی ہے حالانکہ اردو صحافت کے بہت سے مسائل ہیں جن پر موجودہ تناظر میں سنجیدگی سے غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

ہندوستان میں اردو صحافت کا ماضی کافی شاندار رہا ہے۔ سر سید احمد خاں کا 'تہذیب الاخلاق' محمد علی جوہر کا 'ہمدرد' اور مولانا آزاد کے اخبارات 'الہلال' اور 'البلاغ' کی زریں اور بیباک صحافت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ ان اخبارات نے جو قومی اور ملی فریضہ انجام دیا ہے اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

صحافت کی تاریخ بہت قدیم اور تابناک ہے۔ انسانی مفاد اور تہذیب و ثقافت کی بقا کے لیے صحافیوں نے جس طرح کی قربانیاں دی ہیں انھیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ حکومت کے خلاف آواز بلند کرنے سے بھی گریز نہیں کیا یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہندوستان میں صحافت کو دستور ہند کے چوتھے ستون کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ماضی اور حال کی صحافت کا اگر موازنہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ صحافت خواہ پرنٹ ہو یا الیکٹرانک اپنی اصل پہچان کھوتی جا رہی ہے۔ چند صحافیوں کو چھوڑ کر بیشتر صحافیوں کی نظر میں صحافت نوکری اور آمدنی کے

وسیلے سے بڑھ کر کچھ نہیں، بلکہ بعض صحافی ایسے بھی ہیں جنھوں نے صحافت کو بلیک میلنگ کا ذریعہ بنا لیا ہے۔

اردو صحافت کے معیار کا جہاں تک تعلق ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسری زبانوں کی صحافت کی طرح اردو صحافت کا معیار گرا ہے۔ موجودہ عہد کی صحافت کا جائزہ لیتے ہوئے ہم اسے دو حصوں میں منقسم کر سکتے ہیں۔ پیشہ ورانہ صحافی اور دوسرا آزاد صحافی۔ پیشہ ور صحافی سے میری مراد وہ لوگ ہیں جو باضابطہ صحافت سے جڑے ہوئے ہیں جبکہ آزاد صحافی سے میری مراد ان لوگوں سے ہے جنھوں نے صحافت کو بطور پیشہ اختیار نہیں کیا ہے۔ پیشہ ور صحافیوں کے ساتھ کئی قسم کے مسائل ہوتے ہیں مثلاً انھیں اپنے مالکان کی ترجیحات کا خیال رکھنا پڑتا ہے، دوسرے لفظوں میں ان کے ساتھ کچھ پابندیاں بھی ہوتی ہیں جبکہ آزاد صحافی کو ان مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ جہاں تک صحافت کی موجودہ صورت حال کی بات ہے تو میں نے عرض کیا کہ صحافت کا معیار گرا ہے۔ اگر اردو صحافت کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے اردو اخبارات کو کئی قسم کے مسائل کا سامنا رہا ہے۔ مثلاً

1۔ اخبارات کی مالیات: اخبار نکالنے کے لیے جذبے کے ساتھ ساتھ پیسوں کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ اخباروں کی اپنی ایک دنیا ہے اس میں اپنی شناخت بنانے اور معیاری صحافت کے لیے سب سے زیادہ ضرورت پیسوں کی ہوتی ہے۔ اخبار مالکان کو اگر مالی مسائل رہے تو اس کو اچھے اسٹاف کی کمی بھی جھیلنی پڑے گی خبر ایجنسیوں سے بھی خبر لینے میں دشواری ہوگی، ایسا ہونے پر اچھی خبر کی امید نہیں کی جا سکتی۔

2۔ تربیت یافتہ صحافی کی کمی: اردو صحافت کے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ تربیت یافتہ صحافی کی کمی ہے۔ یہ کافی افسوسناک پہلو ہے کہ آج اردو صحافت کی طرف عموماً وہ لوگ آ رہے ہیں جن کا داخلہ کہیں نہیں ہوتا یا ناتجربہ کاری ان کو اچھی نوکری نہیں دلا پاتی۔ صحافتی اصول سے ناآشنائی کے سبب ان صحافیوں کے ذریعہ لکھی ہوئی خبریں معیار اور استناد حاصل نہیں کر پاتیں۔ فی زمانہ اردو اخبارات میں تربیت یافتہ افراد کا زبردست بحران ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے تو اس کا سیدھا سا جواب ہے اردو صحافیوں کو چونکہ اچھی اجرت نہیں ملتی اس لیے اردو

تعلیم یافتہ طبقہ اردو صحافت کو بحیثیت پیشہ اختیار کرنے کے لیے متوجہ نہیں ہوتا۔

3۔ اچھے مترجم کا فقدان: جہاں تک مترجم کا تعلق ہے تو اس کا حال بھی برا ہے۔ ماہر فن اس طرف رجوع نہیں کرتے کیونکہ انھیں دوسری جگہ موٹی تنخواہ مل جاتی ہے، نا تجربہ کار یا نا اہل لوگوں کے مترجم دوسری زبان کے رموز و اوقاف سے ناواقف ہوتے ہیں جس سے انھیں دوسری زبان سے ترجمے کرنے میں بھی دشواری ہوتی ہے۔

4۔ موجودہ سیاسی نظام: اردو اخبار گندی سیاست کا بھی شکار ہوا ہے۔ اردو کو ایک خاص مذہب سے جوڑ کر دیکھا جاتا رہا ہے جس سے سرکار سے ملنے والی کئی مراعات اردو اخبار کو نہیں مل پاتیں اور جو کچھ مراعات اور گرانٹس اردو اخبارات کو حکومت ہند کی جانب سے ملتی بھی ہیں، اسے مالکان اخبار، اخبار کی ترقی میں نہیں لگاتے۔

5۔ اخباری کاغذ اور سرکاری اشتہارات کی کمی: اخبار والوں کی آمدنی کا اصل وسیلہ سرکاری اشتہارات اور مراعات پر ملنے والے کاغذ ہوتے ہیں۔ یہ مراعات جن اخبار والوں کو حاصل ہیں ان کی مالی حالت بہتر ہے، اردو اخبار والے کہیں نہ کہیں سرکار کے تعصب اور تنگ نظری کا شکار ہوئے ہیں، انھیں سرکاری اشتہار نہیں مل پاتے۔ اردو نیوز ایجنسی، نیوز سروس، ٹیلی پرنٹر، لیتھو طباعت کی بوسیدہ تکنیک، کالم نویسی، فیچر نگاری، رپورٹنگ پریس میں اداریہ نگاری وغیرہ کا حال بھی تشفی بخش نہیں ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ اس میدان میں ایماندار لوگ اب نہیں رہے ایسے بہت سے صحافی آج بھی ہیں جن کے لیے حقیقت بیانی سے بڑھ کر کچھ نہیں وہ آج بھی اپنی قلم سے انقلاب برپا کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں مگر ایسے صحافیوں کی تعداد میں دن بدن کمی واقع ہوتی جارہی ہے۔ میڈیا مالکان کی نظر میں اخبار محض آمدنی کا ایک وسیلہ ہے، یہی وجہ ہے کہ آج حقیقت کو مسخ کرنے کی دانستہ کوشش کی جارہی ہے۔ آج اخبار والوں نے اپنے اپنے نظریات، کسی خاص طبقے کی تبلیغ و تشہیر بلکہ کئی موقعوں پر دوسرے مذاہب اور طبقے کے لوگوں کی تذلیل کرنے کا کام بھی شروع کردیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحافت سے لوگوں کا اعتماد اٹھتا جارہا ہے۔ ان تمام مسائل سے اردو صحافت بھی متاثر ہے۔

عوام کا نظریہ: اردو اخبار کے متعلق عوام کو ہمیشہ ایسا لگتا ہے کہ اردو اخبارات معیاری نہیں ہوتے اور ان میں اطلاعات ناقص ہوتی ہیں۔ بسا اوقات کچھ لوگ کہتے ہیں فلاں فلاں اخبارات میں املا کی غلطی تھی۔ فلاں میں یہ خبر غلط تھی۔ یہ خبر پرانی تھی وغیرہ۔ یہ غلط فہمیاں ہیں۔ اس طرح کی چیزوں سے انگریزی اور ہندی اخبارات بھی بھرے پڑے ہیں مگر ہمارے اندر دوسرے کی چیزوں سے مرعوب ہونے کی عادت پڑ گئی ہے۔

بہر حال اردو صحافت کے تعلق سے قطعی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، آج بھی کئی اخبار اور صحافی ایسے ہیں جو اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سب لوگ اخبار و رسائل خرید کر نہ صرف پڑھیں بلکہ دوسروں کو یہ ترغیب بھی دیں کہ وہ کم از کم اردو کے دو اخبار ضرور خریدیں، ساتھ ہی ساتھ خبروں کو معیاری بنانے کے لیے مدیر سے رجوع بھی کریں۔ صحافت کے معیار کو بلند کرنے کی ذمہ داری ہم قارئین پر بھی اتنی ہی واجب ہے جتنی کہ مالکان اور صحافیوں کی۔

اُردو جرنلزم، دورِ حاضر میں

ڈاکٹر مختار احمد فردین

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے　　جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

اردو صحافت کے ارتقا کا جائزہ لینے سے پہلے میں یہ بتاتا چلوں کہ "جام جہاں نما" اردو کا پہلا اخبار تھا جس کا 1822 میں کلکتہ سے اجرا عمل میں آیا۔ جس کے ایڈیٹر منشی سدا سکھ تھے۔ جام جہاں نما کے اجرا کے قریب 10 سال تک ہندوستان کے کسی گوشے سے کوئی اردو اخبار کے نکلنے کی اطلاع نہیں۔ لیکن 1832 میں ممبئی کے فارسی اخبار "آئینۂ سکندر" نے اردو ضمیمہ شائع کیا پھر 1836 میں شاہجہاں آباد دہلی سے دہلی اردو اخبار کا اجرا عمل میں آیا۔ بہر حال کلکتہ، دہلی اور حیدرآباد میں اردو صحافت 1948 کے بعد ایک انقلاب کی شکل میں آگے بڑھنے لگی اور پھر عوام میں سیاسی شعور نے اخبار کی اہمیت کو منوالیا۔ رہنمائے دکن اور سیاست جیسے اخبارات عوام کے بہترین صحافتی رہبر ثابت ہوئے اور اب منصف، سیاست رہنمائے دکن اور اعتماد، سہارا، صحافی دکن وغیرہ حیدرآباد کے مشہور اردو روزنامے ہیں۔

ٹکنالوجی نے آج دنیا کے ہر شعبے میں انقلاب برپا کیا اور صحافتی دنیا میں تو انقلاب ہر

دن دنیا کو ایک نئی دنیا بنا کر پیش کرنے لگا ہے۔ دنیا کی تین بڑی زبانوں میں ایک بڑی زبان اردو مانی جاتی ہے۔ اعداد و شمار کے لحاظ سے یہی دیکھا گیا ہے۔ لفظ جرنلزم (Journalism) (صحافت) کو ہم اردو زبان کے شیدائیوں نے، جن کی مادری زبان اردو ہے اپنے علم کا سرچشمہ اور منبع قرار دیا ہے۔ موجودہ زمانے میں صحافت کو کتنے ہی ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ جیسے زرد صحافت، سرخ صحافت، پیڈ صحافت یعنی پیشہ صحافت کو اس کی اصل روح سے ہٹ کر صرف پیشہ ورانہ نگاہوں سے دیکھا جارہا ہے اور بغیر تحقیق و تفتیش کے مغربی، صیہونی خبر رساں ایجنسی کے حوالے سے شائع کیا جاتا ہے اور اس میں اردو جرنلزم بھی جیسے شامل ہوتا جارہا ہے جس سے سماج میں ایک نئی ذہنیت پیدا ہورہی ہے جس کے ذریعہ سچائی کے بنیادی اصولوں سے ہٹ کر پوری قوم کو جیسے آتش نمرود میں جھونک دیا جاتا ہے جو صحافت کی تذلیل ہے۔ جبکہ صحافت کو ہم زندگی کا عکس کہتے ہیں۔ طاقت و قوت اور اصل صحافت کو پارلیمنٹ کے مماثل قرار دیا گیا ہے۔ صحافت کا اصل مادہ آسمانی کتاب صحیفہ سے لیا گیا ہے جسے اللہ نے اپنے نبیوں پر نازل کیا ہے جس کو سچائی سے تصور کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم یہاں قرآن کریم کے حوالے سے بات کرتے ہیں، سورۃ الحجرات :6 میں اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے "اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق (جو شریعت کے احکام کی خلاف ورزی کرتا رہتا ہے) کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کرلیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو (اس کی بات اور بے بنیاد اطلاع پر اعتماد کرکے) تم کسی قوم کے خلاف نادانی میں کوئی اقدام کر بیٹھو اور پھر اپنے کیے پر پشیمانی کا سامنا کرو۔

آج کا یہ میڈیا پرنٹ ہو یا الکٹرانک، کس کے اشارے پر کام کررہا ہے۔ فائنس اس کو کون کررہا ہے؟ اجارہ داری اس پر کس کی ہے؟ یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے میڈیا کا 96 فیصد حصہ صرف اور صرف چھ کمپنیوں کی ملکیت ہے اور وہ چھ کی چھ کمپنیاں یہودیوں (Jews) کی ہیں، دنیا کی سب سے بڑی کمپنی والٹ ڈزنی (Walt Disney) ہے۔ اس کمپنی کے امریکہ میں سب سے زیادہ پروڈکشن ہاؤس ہیں۔ کمپنی کے پاس سات بڑے نیوز پیپرس، تین میگزین اور بڑا کیبل نٹ ورک ہے، جس کے چودہ ملین صارف ہیں دوسری بڑی کمپنی ٹائم وارنر (Time Warner) جس کی ملکیت HBO امریکہ کا سب سے بڑا پے ٹی وی (Pay TV) کیبل نٹ ورک ہے۔

اس کے علاوہ امریکہ کی سب سے بڑی میگزین ٹائم میگزین (Time Magazine) بھی اس کی ملکیت ہے، یہ میگزین امریکہ میں سب سے زیادہ شائع ہونے والی میگزین ہے، یہ کمپنی غالباً یہودیوں کی ہے، تیسری کمپنی وائی کام Wai Com ہے، پیراماؤنٹ پکچرس Paramount Pictures اور ایم ٹی وی M.TV اس کی ملکیت ہے۔ یہ لوگ نہ صرف میڈیا کو کنٹرول کر رہے ہیں بلکہ انسانی ذہنوں کو تبدیل کرنے کا کام انجام دے رہے ہیں۔ بچوں کے کارٹون چینل کے ذریعہ اپنے مخصوص انداز میں ہر گھر میں داخل ہو گئے ہیں، بچوں بڑوں، خواتین ہر ایک کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے جس سے اب نکل پانا ناممکن ہے۔

گویا اب انھیں کسی سے براہ راست لڑنے کی بھی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ چوتھی کمپنی نیوز کارپوریشن News Corporation ہے جس کی ملکیت Fox TV نٹ ورکس Fox Television Net Work، Broad Casting ہے۔ وہ اپنی رائے اپنے ناظرین پر تھوپنے کا کام انجام دیتا ہے۔ ڈریم ورکس پر میڈیا کمپنی یہودیوں کی بالادستی کو دکھانے کا کام کرتی ہے، ایک امریکی فلم ساز میل گبسن Mel Gibsen نے گذشتہ دنوں ایک فلم دی پیشن آف دی کرائسٹ The Passion of the Christ بنائی تھی۔ جس میں اُس نے یہودیوں کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی تھی اس فلم کے خلاف یہودیوں نے مورچہ کھول دیا۔ اور اب وہ پردے سے غائب ہو چکی ہے۔

خبر کہاں سے آرہی ہے؟ کس نے دی ہے؟ کیسے پہنچی ہے؟ کن راستوں سے پہنچی ہے؟ اور کیوں پہنچی ہے؟ یہ سب سمجھے بغیر بلکہ سمجھنے کی کوشش کیے بغیر رائے قائم کر لینا نہ صرف یہ کہ جہالت اور نادانی ہے بلکہ ایک گناہ ہے جو ہم سے سرزد ہو رہا ہے۔ غیبت کا دروازہ اسی سے کھلتا ہے۔ بدگمانی کو راہ اسی سے ملتی ہے، غلط فیصلے لینے کا سبب یہی چیز بنتی ہے جو رائے ٹی وی کی نشریات پر قائم کی جاتی ہے جو فیصلہ اخبارات میں شائع خبروں کی بنیاد پر لیا جاتا ہے وہ اکثر غلط ثابت ہوتا ہے اور اس کا نقصان صرف ہم کو اور آپ کو نہیں پوری قوم کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔

1794 میں شیر میسور ٹیپو سلطان نے ہفت روزہ ''قوی اخبار'' کے نام سے جاری کر کے انگریزوں کو للکارا تھا اور فوجی جوانوں میں حریت کے شعلوں کو تیز کر رہا تھا۔ اور انھیں قرطاس و قلم اور اردو صحافت کے ذریعہ شیر میسور شہید حضرت ٹیپو سلطان کے یہ الفاظ ''گیدڑ کی سو سالہ زندگی

سے شیر کی ایک دن زندگی بہتر ہے" تمام حریت پسندوں کو ملک کی آزادی میں اپنی جان نچھاور کرنے کا پیغام ملا تھا۔ ان کے یہ الفاظ تا قیامت امر ہو گئے اور اردو صحافت کو یہ پیغام دیا کہ جذبہ ملت، حریت اور صحافت کی اصل روح ہوتی ہے جس کا مادہ ہمیں آسمانی کتابوں سے ملا ہے۔

شمالی ہند کے پہلے اخبار اردو دہلی "اردو اخبار" کے مدیر مولوی محمد باقر تھے۔ اسے وہ 1837 سے نکالتے تھے۔ مولوی محمد باقر علامہ محمد حسین آزاد کے والد تھے جنھیں انگریز حکومت نے گولی مار کر شہید کر دیا۔ کیونکہ انگریزوں کو ان کی جرأت اور بیباکی پسند نہیں تھی، وہ پہلے صحافی تھے جنھوں نے آزادی کی جدوجہد میں شہادت کا درجہ حاصل کیا۔ "صادق الاخبار" دہلی کا ایک اور بیباک اخبار تھا جس کے ایڈیٹر مولوی جمیل الدین تھے۔ وہ بھی انگریز حکومت کے عتاب کا شکار ہوئے۔ اس طرح دیکھا جائے تو تحریک آزادی کو آگے بڑھانے کا سہرا اردو صحافت کے سر ہے جو جذبۂ وطن پرستی سے سرشار ہے۔

1903 میں مولانا حسرت موہانی کا رسالہ "اردوئے معلی" نے اپنے ولولہ انگیز مضامین کے ذریعہ انگریزی حکومت کے ایوان میں زلزلہ پیدا کر دیا۔ "انقلاب زندہ باد" کا پُر جوش انقلابی نعرہ انھیں کی دین ہے۔ 1909 میں مولانا ظفر علی خان کا اخبار "زمیندار" 1912ء میں مولانا محمد علی جوہر کا اخبار "ہمدرد" 1912 ہی میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اخبار "الہلال" اور 1915 میں "البلاغ" جاری کیا ان اخباروں نے عوام کے شعور کو بیدار کرنے اور جذبۂ وطن پرستی کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا جو سچائی پر مبنی ہے۔ ان تفصیلات سے ظاہر ہے کہ تحریک آزادی میں اردو کا کردار نا قابل فراموش رہا ہے۔ اردو صحافت عوام کو جوڑنے کا لفظ "صحافت" کا صحیح مفہوم اور بہترین ذریعہ تھی۔ تقسیم ملک سے پہلے تقریباً ہر سیاسی جماعت کے پاس اردو کا ایک جریدہ تھا۔ مہاتما گاندھی کے مشہور اخبار "ہریجن" کا بھی اردو ایڈیشن نکلتا تھا۔ ان حوالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو صحافت اور اردو زبان کے تاسیس کے ایام سے ہی ہمارے اسلاف نے ان آسمانی صحیفوں کو مدنظر رکھ کر اردو صحافت کی داغ بیل ڈالی تھی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ صحافت کا نام ہی سچائی ہوتی ہے سچائی رقم کرنے کی سزا بسا اوقات صحافی کے پاؤں کے نیچے کی سخت زمین کھینچ کر دی جاتی ہے۔

انھیں بے دست و پا بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے تا کہ انھیں دیکھ کر دوسرے عبرت حاصل کریں جبکہ اردو جرنلزم سچائی سے ہی عبارت ہونا چاہیے۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے کہ سچائی اپنے آپ کو منوا کر رہتی ہے۔ اور اس سچائی کی حقیقت آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ اگر ہم اردو (جرنلزم) صحافت اور اس کا مادہ آسمانی کتابوں و صحیفوں سے مضبوط رکھیں گے اور صحافت میں ان مادی جذبوں کا قلع قمع کریں گے جو مغربی اور صیہونی ذرائع ابلاغ سے ہم تک پہنچ رہے ہیں۔ اس طرح ہم اپنے اسلاف کی سنتوں کو ادا کریں گے۔ چونکہ سچ کو پابند زنجیر نہیں کیا جاسکتا ہے نہ سچائی کی راہوں میں کوئی ایسی دیوار کھڑی کی جاسکے گی جو قابل عبور نہ ہو۔ آج کے دور میں سب سے بڑا جہاد سلطان جابر کے سامنے کلمۂ حق ادا کرنا ہے۔ جرنلزم کو اپنے قلم کا سودا کبھی نہ کرنا چاہیے اور پرورش لوح و قلم کو ہمیشہ ترجیح دینا چاہیے، قلم کی آبرو کے محافظ پر خود آنچ آجائے، قلم کی حرمت پر آنچ نہ آنے پائے۔ یہی ذمہ داریاں اردو جرنلزم سے منسلک افراد کو نبھانی چاہئیں جو ہمارے لیے نجات کا ذریعہ ہوگا اور صحافت کا تقدس بحال ہوگا یہی اردو جرنلزم کی شان اور پہچان ہے۔ مگر کیا ہم اس تقدس کو.....

جہاں تک میرا اور اردو صحافیوں کا تعلق ہے اور جنھیں دنیا آج بھی سلام کرتی ہے ان میں سرسید احمد خان، مولانا ابوالکلام آزاد اور جوہر برادران، اور عصر حاضر کے جن صحافیوں نے زبان و ادب کا حق ادا کیا اور جن کے تذکرے کے بغیر یہ مضمون ادھورا ہے، ان میں فیض احمد فیض، خواجہ احمد عباس، خوشونت سنگھ، کلدیپ نیر، آر کے کرنجیا، عابد علی خان، رزاق ملیح آبادی، کریم مونگیری، ایم جے اکبر، سیما مصطفیٰ، پرنورائے، راجیو سردیسائی، برکھادت، ارنب گوسوای، سعید ملیح آبادی، سید وقار الدین، وقار مشرقی، عزیز برنی، احسن مفتاحی، وسیم الحق، ابراہیم علوی، محمد قاسم، یعقوب میراں، شاہد صدیقی، ڈاکٹر فاضل حسین پرویز، ڈاکٹر الحاج عبدالرؤف، یعقوب میراں مستعدی، خورشید اکرم، عبدالسلام، اشہر ہاشمی، اطہر حسین انصاری شامل ہیں جنھوں نے اردو دنیا کو اپنے بیباک قلم سے خوب سینچا اور دوسروں کے لئے خاص کر آج کی دنیا اور نئی نسل کے لیے رول ماڈل کا کام کیا ہے اور اخبار کو توپ سے بھی زیادہ طاقتور بنا دیا ہے۔ بقول شاعر ؎

کھینچو نہ کمان اور نہ تلوار نکالو گر توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو

پانچواں باب

اردو کے اہم اخبارات ورسائل

''جامِ جہاں نما'' کا مکمل تعارف
امتیازات وخصوصیات

پروفیسر یوسف تقی

انیسویں صدی میں شہر کلکتہ کو جہاں اپنی مختلف النوع خصوصیات کی بنا پر اہمیت حاصل ہے، وہیں اردو کے جدید نثری ادب کی بنیاد گزاری کے لیے اس شہر کا خاص مقام ہے۔ میری مراد فورٹ ولیم کالج سے ہے، جس کی بنیاد 10 جولائی 1800 میں پڑی۔ اس کالج کے قیام کا مقصد بقول ڈاکٹر عبیدہ بیگم :

> '' ولیزلی نے بنگال، مدراس اور بمبئی کی ریاستوں کے جونیر ملازمین کی بہترین تعلیم وتربیت کے لیے قائم کیا تھا، جس کا واضح اور واحد مقصد یہ تھا کہ وہ دیسی زبانوں کی تعلیم حاصل کر کے ملکی معاملات اور دیگر فرائض عمدہ طور سے انجام دے سکیں اور اس طرح برطانوی اقتدار کو استحکام نصیب ہو۔'' [صفحہ 40]

ویسے اس کالج کے ملازم منشیوں نے اپنی تصنیف وتالیف کا کام انجام دیا۔ یہ سلسلہ کئی

برسوں تک جاری رہا۔ صرف 13 برسوں کی قلیل مدت میں یعنی 1813 تک پچاس سے زائد کتابیں تصنیف و تالیف ہی نہیں ہوئیں بلکہ شائع بھی ہوئیں۔ اس کے علاوہ اس شہر میں اردو کی مطبوعہ صحافت کی عمارت کی نیو بھی اس صدی کی ابتدائی 20 دہائیوں کے درمیان رکھی گئی۔ یعنی ''جام جہاں نما'' کا اجرا۔

''جام جہاں نما'' کی پہلی اشاعت کی تاریخ کے سلسلے میں مختلف محققین میں اختلاف ہے۔ کچھ کا تو یہ عالم ہے کہ وہ ''جام جہاں نما'' کو اردو کا پہلا اخبار تسلیم بھی نہیں کرتے۔ جیسے محمد سعید عبدالخالق کی کتاب ''میسور میں اردو'' جس کی اشاعت 1943 میں حیدرآباد سے ہوئی کے بیان کے مطابق اردو کے سب سے پہلے اخبار کی اشاعت کا سہرا 18ویں صدی کی آخری دہائی میں ٹیپو سلطان کے سر ہے۔

جبکہ سید محمد اظہر نادم سیتاپوری اپنی کتاب ''فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی'' میں اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ اکرام علی نے کلکتہ سے 1800 میں ''اردو اخبار'' کے نام سے ایک اخبار کو شائع کیا تھا۔ ایک طرف مولوی محمد حسین آزاد ''آب حیات'' میں اپنے والد محمد باقر کے ''دہلی اردو اخبار'' کو اولیت کا درجہ دیتے ہیں، آزاد حقیقت بیانی کے ساتھ ساتھ کہانی گڑھنے میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں اس کی بہت سی مثالیں ''آب حیات'' میں مل جائیں گی، ہو سکتا ہے یہ بھی ان کی داستان طرازی کا حصہ ہو، تو دوسری طرف مولوی ذکاء اللہ سید محمد خاں کے ''سید الاخبار'' کو پہلا اخبار قرار دیتے ہیں۔

اسی طرح کچھ اور بھی افراد ہیں جو اپنی اپنی دلیلیں بجا کر، اپنے انداز تحریر کے زور پر اپنے دعووں کو درست قرار دیتے نظر آتے ہیں۔ سید محمد اظہر نادم سیتاپوری اکرام علی کے اخبار کو اولیت دینے پر مصر ہیں۔ بہرکیف اخبار ''جام جہاں نما'' کی پہلی اشاعت کی تاریخ سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اردو کا پہلا اخبار یہی ہے۔ گربچن چندن نے اپنی تحقیقی تحریر میں ''جان بل'' کا بیان پیش کیا ہے جو آجکل نومبر 1992 کے صفحہ 14 پر شائع ہوا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''اس وقت کلکتہ سے دیسی عالموں کی نگرانی میں دو بنگلہ اخبار جاری ہیں..... آج صبح ایک نیا اخبار ہندوستانی (اردو) زبان میں جاری ہوا

ہے، لیکن اس کا رشتہ کس سے ہے؟ یا اسے کس نے جاری کیا ہے؟ اس بارے میں ہمیں کوئی بھی کچھ بتا نہیں سکتا نہ اس کا کوئی پراسپکٹس ہے، نہ اس پر چھاپنے والے کا نام درج ہے۔ یہ اخبار کوارٹر سائز کے تین اوراق پر مشتمل ہے اور اس کا نام ''جام جہاں نما'' ہے اس کا پہلا شمارہ بدھ کے دن 27 مارچ 1822 کو شائع ہوا۔'' [آجکل نومبر 1992 صفحہ 14-13]

اس سے یہ بات تو ثابت ہو جاتی ہے کہ ''جام جہاں نما'' اردو کا پہلا اخبار ہے اور جس کی پہلی اشاعت مذکورہ تاریخ کو ہوئی تھی اور جس کی تصدیق نادر علی خاں اپنی کتاب ''اردو صحافت کی تاریخ'' میں یوں کرتے ہیں:

'' دور جدید کے انکشافات سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان کا سب سے پہلا اخبار 'جام جہاں نما' جو 27 مارچ 1822 کو کلکتہ سے جاری کیا گیا۔ یہ منشی سدا سکھ مرزا پوری کی ادارت میں، جو پہلے سماچار چندریکا سے منسلک رہ چکے تھے، ایم ہاچنس پیٹرسن کے مطبع مشن پریس میں طبع ہو کر ہری ہردت کے اہتمام سے شائع ہوا تھا'' [صفحہ 33]

نادر علی خاں کے اس بیان سے تاریخ اشاعت کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ 27 مارچ 1822 کو اخبار ''جام جہاں نما'' کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا تھا۔ وہیں یہ غلط فہمی بھی پیدا ہوتی ہے کہ اخبار کے مدیر سدا سکھ لال اور ان کا وطن مرزا پور ہے۔ دوسری بات یہ کہ ہری ہردت کی حیثیت کیا تھی؟ یا وہ کس طرح کا اہتمام کرتے تھے؟

پہلی بات یہ کہ سدا سکھ 'مرزا پوری' نہیں تھے بلکہ وہ کلکتہ کے ایک علاقہ جس کا نام مرزا پور ہے اور جو سیالدہ اور رابعہ بازار کے قریب، آج بھی عرف عام میں مرزا پور ہی کہا جاتا ہے۔ وہاں کاغذ کی دکانیں اور چھاپہ کارخانے اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ رہی بات ہری ہردت کی حیثیت کی تو اس سلسلہ میں مختلف حضرات کے مختلف نظریات ہیں، جسے محمد عتیق صدیقی اپنے ایک مضمون ''جام جہاں نما'' اردو کا پہلا اخبار، (آجکل فروری 1956 کے صفحہ 43 میں فرماتے ہیں

'' 'جام جہاں نما' کے اجرا کی درخواست ہری ہردت نے 18 مارچ 1822 کو دی تھی۔ اس کے ایڈیٹر منشی سدا سکھ تھے، لیکن ان دونوں کا تعلق ''جام جہاں نما'' سے مالکانہ نہیں بلکہ ملازمانہ تھا۔ اخبار کے مالک کلکتہ کی ایک انگریزی تجارتی کوٹھی ولیم ہاکنس پیٹرسن اینڈ کمپنی تھی۔''

اس بیان میں دو باتیں قابل غور ہیں۔ پہلی بات یہ کہ 18 مارچ 1822 کو اخبار کے اجرا کی تاریخ بتائی گئی ہے جو درست نہیں ہے۔ دوسری بات 'ولیم ہاکنس پیٹرسن اینڈ کمپنی' کی مالکانہ حیثیت کی ہے یہ بھی غلط ہے۔ حالانکہ نادر علی خان نے اپنی کتاب اردو 'صحافت کی تاریخ' میں واضح طور پر لکھا ہے کہ 'ولیم ہاکنس پیٹرسن کے مطابق مشن پریس میں طبع ہو کر ہری ہردت کے اہتمام سے شائع ہوتا تھا۔ نادر علی خان کے اس بیان کی تصدیق The Calcutta Annual Directory and First quarterly Register کے مندرجات میں ولیم ہاکنس پیٹرسن کے نام کے ساتھ ان کا پیشہ ''پرنٹر'' درج ہے۔ اس کے علاوہ جب گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگ بنگال سے رخصت ہوا اور اس کی جگہ کونسل کے سینئر ممبر جان ایڈم قائم مقام گورنر جنرل بنے تو سب سے پہلا کام یہ کیا کہ 14/اپریل 1823 کو ایک حکم نامہ جاری کیا جس کی رو سے اخباروں اور چھاپہ خانوں کے لئے حکومت سے باضابطہ لائسنس لینا اور اس کے اڈیٹر پرنٹر کو حلف نامہ داخل کرنا لازمی قرار دیا۔ اس حکم نامہ کے جاری ہونے پر 'جام جہاں نما' کی طرف سے جو درخواست دی گئی تھی اُس درخواست کے متن سے کچھ باتیں صاف ہو جاتی ہیں جو یوں ہیں:

''.....اخباروں کی آئندہ رہنمائی کے لیے حال میں جو ریگولیشنز نافذ کیے گئے ہیں ان کے حوالے سے میں مطلوبہ حلف نامہ اور یہ باضابطہ پیش کرنے کا اعزاز حاصل کرتا ہوں اور نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ آپ مجھے مطلوبہ لائسنس کے اجرا کی منظوری عطا فرمائیں تاکہ میں فارسی اور ہندوستانی (اردو) کا اخبار جس کا نام 'جام جہاں نما' ہے، جس کا میں واحد مالک ہوں، جاری رکھ سکوں۔''

کلکتہ کولوٹولہ آپ کا وفادار اور حقیر خادم

دستخط ہری ہردت

19 اپریل 1823

[بحوالہ ہری ہردت اردو صحافت کا بانی مگر بچن چندن، آجکل نومبر 1992]

اب یہ سوال ہی نہیں اٹھتا کہ کسی اور کو اخبار کی ملکیت میں شامل کیا جائے۔ ہری ہردت کے سلسلے میں معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بقول گربچن چندن، وہ آزاد طبیعت کے مالک تھے۔ ان کے والد تاراچند دت، جو سر چارلس ڈائل کے تحت کسٹم ہاؤس کے دیوان تھے، وہ بنگلہ سماج کے ایک معزز اور باعزت افراد میں شامل تھے۔ ان کی مالی حیثیت بھی کافی اچھی تھی اور انھوں نے اپنے خاندان کے لیے اچھی خاصی دولت چھوڑی تھی۔ تاراچند دت کلکتہ کے کولوٹولہ کے علاقے میں ایک سڑک کا نام آج بھی موجود ہے۔ اسی سڑک پر ان کا خاندان رہائش پذیر تھا۔ ان کے بارے میں گربچن چندن لکھتے ہیں:

> ''4 دسمبر 1821 کو جب ان (ہری ہردت) کے والد (تاراچند دت) نے رام موہن رائے کی..... رہبرانہ معاونت سے سنباد کومدی.... کے نام سے ایک بنگلہ ہفتہ روزہ جاری کیا گیا۔ تو یہ اخبار ہری ہردت کے شوق صحافت کے لیے پہلا زینہ ثابت ہوا۔ اس کے شعبۂ تحریر میں ایک اور رکن بھوانی چرن بندو پادھیائے بھی شامل ہوئے۔ لیکن وہ اپنے قدامت پسند خیالات کی وجہ سے اصلاح پسند رام موہن رائے کے ساتھ نہ چل سکے جو ہندو سماج کی ستی کی پرانی رسم کو ختم کرنا چاہتے تھے اور برہمو سماج کے نام سے ایک نئے ہندو سماج کے مبلغ تھے۔ اس لیے بھوانی چرن بندو پادھیائے جلد ہی اس اخبار سے علاحدہ ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے سماچار چندریکا جاری کیا.....
>
> دیوان تاراچند نے جلد ہی اپنے بیٹے ہری ہردت کو سنباد کومدی کے مالکانہ حقوق دے دیے۔ اخبار کی مالی حالت بسرعت خراب سے خراب تر ہوتی جارہی تھی جس سے ہری ہردت اس سے ناامید ہو گئے اور اُسے نئے ہاتھوں میں دے دینے کی سوچنے لگے۔ اسی زمانے میں اُنھیں ایسٹ

انڈیا کمپنی کے ایک دفتر میں ملازمت بھی مل گئی۔ لیکن ان کے دل میں اپنا اخبار نکالنے کی آرزو تڑپتی رہی۔ اس وقت وہاں ایک عوامی زبان بنگلہ کے اخبار تو موجود تھے۔ لیکن دوسری عوامی زبان اردو کا کوئی اخبار نہیں تھا۔ چنانچہ اولوالعزم ہری ہردت نے اردو زبان میں جسے اس وقت ہندوستانی کہا جاتا تھا اخبار نکالنے کی درخواست دے دی۔ یہ زبان ایک تو عوام میں بہت مروج تھی، دوسرے فرنگی حلقوں میں جو اقتدار حاصل کرنے کے فوراً بعد عوام کی زبان سیکھنے کے بڑے آرزومند تھے۔ عالی خاندان اور اُمنگ پسند ہری ہردت کے لیے یہ ایک بڑا نفسیاتی وقت تھا۔ ایک طرف سداسکھ کی مالیاتی پریشانی اور دوسری طرف بھوانی چرن بندوپادھیائے کا جو کل تک ان کا ایک نائب تھا، صاحب اخبار ہو جانا ان کے لیے ایک چیلنج تھا۔"

اسی طرح ان کے معاون سدا سکھ لال جو شنو پرشاد گلاب راؤ کے فرزند تھے۔ الٰہ آباد کے رہنے والے ایک کائستھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے نثر و نظم کے سلسلے میں مرصع خورشید کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اس کے علاوہ ... دو میں حکایات پر مبنی ایک کتاب ان کے نام سے منسوب ہے۔ ان کو فن قلم کاری پر عبور حاصل تھا اور وہ اردو، ہندی، فارسی، انگریزی، عربی زبانوں پر اچھی دسترس رکھتے تھے۔ وہ اردو صحافت کے اولین کثیر لسانی مترجم اور مولف تھے۔ ان کی آؤ بھگت جس طرح فورٹ ولیم کالج میں تھی، کالج سے باہر بھی وہ ایک معتبر اور مستند مترجم و مولف کی حیثیت سے مشہور تھے اور ان کی یہ شہرت علم، ادب سے گہری دلچسپی کے باعث تھی۔ ان کی علمی دلچسپی صحافت کے علاوہ کئی موضوعات سے، جیسے تاریخ، سائنس، اخلاق، قانون اور فنون وغیرہ سے تھی۔ ساتھ ہی ساتھ انھیں صحافتی معاملات سے دلچسپی بھی تھی۔ انھوں نے کئی اخبار بنگال کے علاوہ دوسرے صوبوں سے بھی جاری کیے تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ درجن بھر سے زیادہ کتابوں کے مترجم اور مولف تھے۔

اسی دوران بھوانی چرن جو خود بھی کلکتہ کے زمیندار تھے، ان سے رسہ کشی شروع ہوئی

اور انھوں نے ہری ہردت اور ان کے خاندان کو زک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ شاید انہی وجوہ سے'' جام جہاں نما'' کی ملکیت کے سوال پر شروعات میں خاموشی اختیار کی گئی اور دیکھا جائے تو'' جام جہاں نما'' انہی حالات میں ظہور پذیر ہوا۔

لیکن خوش قسمتی سے ہری ہردت کے والد تاراچند دت نے اپنے لائق بیٹے کو سمجھنے میں بڑی عقلمندی دکھائی اور اس کی ہر طرح سے رہنمائی کی اور'' جام جہاں نما'' کے کاروباری انتظامات اپنے ہاتھوں میں رکھے۔ اس طرح اس اخبار کی بقا کی جنگ لڑتے ہوئے انھوں نے اخبار کو ایک طویل عمر بخشی' جام جہاں نما' نے چار سال سے زیادہ عمر پائی اور شاید بنگال کے اس دور کا یہ واحد اخبار تھا جو اتنی طویل مدت تک جاری رہا۔ اس مدت میں ہری ہردت کو کئی قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مثلاً اس کو جو چندہ حکومت کی طرف ملتا تھا وہ بھی بند ہو گیا۔

'' جام جہاں نما'' کی طویل زندگی میں بے شمار علاقائی اور ہندوستان گیر خبروں کے علاوہ اور بھی بہت کچھ شائع ہوئی ہوں گی۔ مثلاً غزلیں، مضامین، تاریخ وغیرہ۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے اس کی اشاعت کی تمام فائلیں کہیں بھی دستیاب نہیں ہیں۔ جیسا کہ گربچن چندن نے اپنی تحقیقی کتاب'' جام جہاں نما'' میں لکھا ہے۔ البتہ کچھ فائل گربچن چندن کی نظروں سے گزری ہیں اور بقول گربچن چندن جنھوں نے اس فائل کی تلاش میں ہندوستان اور بیرون ہندوستان بھی مراسلت کے ذریعے اس کی تلاش کی تھی اور ان کے چند شمارے نیشنل آرکائیو میں ہی ملے ہیں۔ ظاہر ہے اس طویل مدت میں بہت سی خبریں شائع ہوئی ہوں گی۔ مثال کے طور پر چند اہم خبریں جو دستیاب شماروں سے حاصل ہوئی ہیں اور جنھیں'' جام جہاں نما'' پر کام کرنے والے سبھی اہل قلم نے اپنے مضامین اور کتابوں سے نقل کیا ہے، پیش خدمت ہیں:

''شاہ جہاں آباد کی خبر

جام جہاں نما (اردو) یکم اکتوبر 1825 کی خبر ہے پھول والوں کے میلے کی تقریب سے جب حضرت جہاں پناہ قطب صاحب کی درگاہ میں رونق افروز ہوتے تھے، اکثر سواری جھولنے پر جاتی تھیں۔ حضرت راگ سننے اور زنانے بندوبست میں نہانے کا تماشہ دیکھتے۔ خواتین کس کس خوبی

سے جھپٹی لڑتیاں اور جھنڈ کے جھنڈ باہم لپٹ کر کنارے سے پانی میں گر پڑتیاں، کوئی مسکرا کے بالوں کو نچوڑتی، کوئی شرما کے انگیا مروڑتی، ایک ایک کرتی چاک کرتی، دوسری شرم سے انگلی دانتوں میں پکڑتی، کوئی پکارتی ہوا بہاؤ میں نہ جاؤ وہاں بڑا زور ہے، کوئی للکارتی دوگانہ چڑھاؤ پڑاؤ دیکھو تو کیا توڑ ہے۔ غرض ان پری پیکروں کی چھیڑ چھاڑ اور آپس میں اختلاط کی مار دھاڑ جنھوں نے دیکھی وہی جانئے میں لکھنے سے کیا فائدہ، سننے والے کب سچ جانیں گے۔"

[بحوالہ اردو صحافت کی تاریخ/ناور علی خان صفحہ 90]

"لکھنؤ کی خبر

عرض ہوئی کہ شہر میں غلہ بہت گراں ہو گیا تیرہ سیر گیہوں بارہ سیر چاول ناکارہ بڑی خرابی سے ایک روپے کو میسر آئے..... انعامات کو کیا لکھا جائے ہر روز محتاجوں اور فقیروں کو روپے بٹتے ہیں۔ فضلی میوہ شہر اور بیرون جات کے باغات کا بادشاہی چاکروں کو تقسیم جاتا ہے۔"

ان دو خبروں کے اقتباسات کے علاوہ اور بھی خبریں ہیں مثلاً ستی کی خبر، ڈھویں کا جہاز کی خبر، رنگون کی خبر وغیرہ وغیرہ۔

مذکورہ بالا دو خبروں کے اقتباسات کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ انگریز کتنی سرعت سے حکمرانی کی دہلیز تک پہنچنے کے درپے تھے۔ دوسرے حکمران طبقہ، جو بڑے حکمراں تھے، اپنی نااہلی اور ذہنی پس ماندگی کا مظاہرہ کر رہے تھے اور خود کو کس قدر خود اور عوام کو مریضانہ تفریح میں مشغول رکھے ہوئے تھے۔

ان خبروں کی اشاعت کے پیچھے، ہو سکتا ہے. اخبار کے ایڈیٹر ہری ہردت کا منشا اور مقصد عوامی اصلاح رہا ہو اور موجودہ حکمرانوں کو یہ باور کرانا چاہتے ہوں کہ تمھارے اسلاف کی کارگزاری کیا ہے؟ (خصوصاً آخری دور کے شاہوں میں، تاریخ عالمگیری کے اختتام کے بعد نوٹ مترجم نے تحریر کیا) اور تم کیا کر رہے ہو؟

اخبار کی زبان بہت سادہ، سلیس اور رواں تھی اور اس بات کی کوشش ہوتی تھی کہ زبان ثقالت اور الفاظ کی پیچیدگی سے پاک ہو، تاکہ عوام اور خصوصاً یوروپین اس خبار کے ذریعے اپنی اردو دانی میں مزید مہارت حاصل کر سکیں۔ نادر علی خان نے اپنی کتاب 'اردو صحافت کی تاریخ' میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، لکھتے ہیں:

> '' یکم، مارچ 1826 سے خبروں کا سلسلہ منقطع کر کے تاریخ انگلستان کی اشاعت شروع کی گئی اور چار ماہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا پھر تقریباً ایک سال تک محاربات نپولین کی روداد درج ہوتی رہی۔ 17 جون 1827 سے 22 جون 1828 تک تاریخ عالمگیری زینت اخبار بنتی رہی بالآخر اسی اشاعت پر اردو اخبار کا خاتمہ ہو گیا۔'' [صفحہ 39]

آخری ترجمہ '' تاریخ عالمگیری'' تقریباً 8 ماہ تک برابر شائع ہوتا رہا۔ اختتام پر مترجم نے ایک نوٹ لکھا ہے، جو اُس زمانے میں بڑی اہمیت کا حامل تھا، جسے ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

> '' اب راقم گزارش کرتا ہے کہ اورنگ زیب تیموریہ خاندان میں بہت لائق و فائق ہوا۔ سب علم و فنون پر اس کو بخوبی مہارت تھی۔ رعیت پروری جیسی اس نے کی، اس کے خاندان میں دوسرے سے نہیں کی ہوگی۔ اگرچہ تیموریہ خاندان میں کسو کی نیت میں فساد نہ تھا۔ خلق اللہ کو سب دوست رکھتے تھے۔ شاہجہاں نے بہت اچھی فرماں روائی کی۔ جہانگیر ایسے ہی عادل تھے..... اکبر کی صفات کہاں تک لکھی جائیں.....''
>
> [بحوالہ اردو صحافت رنادر علی خان صفحہ 50]

اخبار کے بند ہونے کی وجہ مالی مشکلات بتائی گئی ہے لیکن میرے خیال میں '' تاریخ عالمگیری'' کا ترجمہ اور مترجم کا نوٹ بھی ہو سکتا ہے اس سے حکومت یا کمپنی کے ناخوش ہونے کا جواز پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ اخبار کے سرنامہ پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا ''لوگو'' ہوا کرتا تھا لیکن اس سے قبل سرکاری چندہ کے بند ہونے کی بات کہی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اخبار نے سرکاری پالیسی کے بند ہونے کے باوجود کبھی کبھی در پردہ اپنی تنقید و تبصرہ کا ہدف کمپنی کو بنایا ہوگا۔

سے چھپکی لڑتیاں اور جھنڈ کے جھنڈ باہم لپٹ کر کنارے سے پانی میں گر پڑتیاں، کوئی مسکرا کے بالوں کو نچوڑتی، کوئی شرما کے انگیا سر درتی، ایک ایک کرتی چاک کرتی، دوسری شرم سے انگلی دانتوں میں پکڑتی، کوئی پکارتی بوا بہاؤ میں نہ جاؤ وہاں بڑا زور ہے، کوئی للکارتی دوگانہ چڑھاؤ پڑاؤ دیکھو تو کیا توڑ ہے۔ غرض ان پری پیکروں کی چھیڑ چھاڑ اور آپس میں اختلاط کی مار دھاڑ جنھوں نے دیکھی وہی جانے میں لکھنے سے کیا فائدہ، سننے والے کب سچ جانیں گے۔"

[بحوالہ اردو صحافت کی تاریخ رشاد رلی خان صفحہ 40]

"لکھنؤ کی خبر

عرض ہوئی کہ شہر میں غلہ بہت گراں ہو گیا تیرہ سیر گیہوں بارہ سیر چاول ناکارہ بڑی خرابی سے ایک روپے کو میسر آئے..... انعامات کو کیا لکھا جائے ہر روز محتاجوں اور فقیروں کو روپے بٹتے ہیں۔ فصلی میوہ شہر اور بیرون جات کے باغات کا بادشاہی چاکروں کو تقسیم جاتا ہے۔"

ان دو خبروں کے اقتباسات کے علاوہ اور بھی خبریں ہیں مثلاً ستی کی خبر، ڈھویں کا جہاز کی خبر، رنگون کی خبر وغیرہ وغیرہ۔

مذکورہ بالا دو خبروں کے اقتباسات کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ انگریز کتنی سرعت سے حکمرانی کی دہلیز تک پہنچنے کے درپے تھے۔ دوسرے حکمران طبقہ، جو بڑے حکمراں تھے، اپنی نااہلی اور ذہنی پس ماندگی کا مظاہرہ کر رہے تھے اور خود کو کس قدر خود اور عوام کو مریضانہ تفریح میں مشغول رکھے ہوئے تھے۔

ان خبروں کی اشاعت کے پیچھے، ہو سکتا ہے، اخبار کے ایڈیٹر ہری ہردت کا منشا اور مقصد عوامی اصلاح رہا ہو اور موجودہ حکمرانوں کو یہ باور کرانا چاہتے ہوں کہ تمھارے اسلاف کی کارگزاری کیا ہے؟ (خصوصاً آخری دور کے شماروں میں، تاریخ عالمگیری کے اختتام کے بعد نوٹ مترجم نے تحریر کیا) اور تم کیا کر رہے ہو؟

اخبار کی زبان بہت سادہ، سلیس اور رواں تھی اور اس بات کی کوشش ہوتی تھی کہ زبان ثقالت اور الفاظ کی پیچیدگی سے پاک ہو، تاکہ عوام اور خصوصاً یوروپین اس خبار کے ذریعے اپنی اردو دانی میں مزید مہارت حاصل کر سکیں۔ نادر علی خان نے اپنی کتاب 'اردو صحافت کی تاریخ' میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، لکھتے ہیں:

> ''یکم، مارچ 1826 سے خبروں کا سلسلہ منقطع کر کے تاریخ انگلستان کی اشاعت شروع کی گئی اور چار ماہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا پھر تقریباً ایک سال تک محاربات بیونین کی روداد درج ہوتی رہی۔ 17 جون 1827 سے 22 جون 1828 تک تاریخ عالمگیری زینت اخبار بنتی رہی بالآخر اسی اشاعت پر اردو اخبار کا خاتمہ ہو گیا۔'' [صفحہ 39]

آخری ترجمہ ''تاریخ عالمگیری'' تقریباً 8 ماہ تک برابر شائع ہوتا رہا۔ اختتام پر مترجم نے ایک نوٹ لکھا ہے، جو اُس زمانے میں بڑی اہمیت کا حامل تھا، جسے ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

> ''اب راقم گزارش کرتا ہے کہ اورنگ زیب تیموریہ خاندان میں بہت لائق و فائق ہوا۔ سب علم و فنون پر اس کو بخوبی مہارت تھی۔ رعیت پروری جیسی اس نے کی، اس کے خاندان میں دوسرے سے نہیں کی ہوگی۔ اگرچہ تیموریہ خاندان میں کسو کی نیت میں فساد نہ تھا۔ خلق اللہ کو سب دوست رکھتے تھے۔ شاہجہاں نے بہت اچھی فرماں روائی کی۔ جہانگیر ایسے ہی عادل تھے..... اکبر کی صفات کہاں تک لکھی جائیں.....''

[بحوالہ اردو صحافت، نادر علی خان صفحہ 50]

اخبار کے بند ہونے کی وجہ مالی مشکلات بتائی گئی ہے لیکن میرے خیال میں ''تاریخ عالمگیری'' کا ترجمہ اور مترجم کا نوٹ بھی ہو سکتا ہے اس سے حکومت یا کمپنی کے ناخوش ہونے کا جواز پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ اخبار کے سرنامہ پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا ''لوگو'' ہوا کرتا تھا لیکن اس سے قبل سرکاری چندہ کے بند ہونے کی بات کہی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اخبار نے سرکاری پالیسی کے بند ہونے کے باوجود کبھی کبھی در پردہ اپنی تنقید و تبصرہ کا ہدف کمپنی کو بنایا ہوگا۔

مذکورہ اقتباس اس لیے اہم ہے کہ یہ ترجمہ اُس وقت کیا گیا جب حکمران طبقہ نے منصوبہ بند طریقے سے بادشاہوں، خصوصاً آخری دور کے حکمرانوں کی کردار کشی اپنے تاریخ دانوں کے ذریعہ کروانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ کاش ترجمے کا یہ سلسلہ بعد کے دنوں میں بھی جاری رہتا تو آج ملک کی حالت وہ نہیں ہوتی اور قومی یکجہتی کو برقرار رکھنے کے لیے اتنے سارے جتن نہیں کرنے پڑتے۔

بہرکیف "جام جہاں نما" کی اشاعت کے پیچھے جو بھی مقصد کارفرما رہا ہو لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس اخبار نے آنے والے وقت کے لیے ایک چراغ رہ گزر کا کام کیا ہے اور اس کی روشنی خواہ کتنی ہی مدھم رہی ہو، اس کی ضو میں اردو صحافت اپنے قدم بڑھاتی رہی۔ اس لیے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ آج اردو صحافت جس مقام پر پہنچی ہے اور اس نے جتنے بال و پر نکالے ہیں وہ سب "جام جہاں نما" کے رہین منت ہیں۔

کہنے والے یہ کہہ سکتے ہیں کہ "جام جہاں نما" نے تو اُس وقت کے انگریزی اخباروں سے کسب فیض کیا ہے، ضرور کیا ہے لیکن کچھ ایسی باتوں کی اختراع بھی کی ہے جس کی روشنی میں اس کی دور اندیشی اور معاملہ فہمی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک طرف تاریخ انگلستان کا ترجمہ شائع کر کے جہاں موجودہ حکومت کو خوش کرنے کی کوشش کی، وہیں دوسری طرف تاریخ عالمگیری کا ترجمہ کر کے اپنی حب الوطنی اور وطن پرستی پر عائد الزامات کی صفائی بھی دی۔

شمالی امریکہ کا پہلا اردو اخبار 'غدر'

جاوید دانش

ہندوستان میں اردو صحافت کی ابتدا جس طرح "جامِ جہاں نما" 28 مارچ 1855 سے جانی جاتی ہے، اسی طرح شمالی امریکہ اور کینیڈا میں اردو کا پہلا ہفت روزہ اخبار "غدر" یکم نومبر 1913 میں امریکہ کے شہر سان فرنسسکو سے شائع ہوا۔ کیونکہ کینیڈا کے برعکس امریکہ برطانیہ کی حاکمیت سے آزاد ہو چکا تھا اور اُس پر برطانوی راج کا کوئی دباؤ نہیں تھا۔ ساتھ ہی امریکی ہندوستان کی آزادی میں دلچسپی لے رہے تھے اور اُن کا ساتھ دے رہے تھے۔ اخبار "غدر" ایک منظم لائحہ عمل کے تحت پارٹی کے کارکنوں نے شروع کیا تھا۔ اِس لیے غدر پارٹی کی تمام دستاویزی تاریخ میں اس اخبار کی تفصیل ملتی ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، غدر ایک سیاسی اور غدر پارٹی کا علمبردار اور بائیں بازو کا پروپیگنڈا اخبار تھا۔ پہلے شمارے سے ہی اس کے تیور باغیانہ تھے جیسا کہ اس کے سلوگن سے اندازہ ہوتا ہے۔ پیشانی پر آویزاں یہ نعرہ برطانوی راج کے خلاف کھلی بغاوت کا اعلان تھا۔

- "انگریزی راج کا دشمن..... بندے ماترم۔ ہندی جوانو! جلدی لو ہتھیار"۔
- پارٹی کا پرچم لال، سبز اور بسنتی رنگ، اور دو تلوار کے ساتھ تھا۔

ایک اور اشتہار میں یہ اعلان بھی قابلِ غور ہے۔

درکار ہیں، جوان اور جانباز سپاہی، ہندوستان میں غدر کے لیے۔

تنخواہ.....موت.....انعام.....شہادت.....پنشن.....آزادی.....ٹھکانا۔ ہندوستان

''غدر'' اخبار کی آئیڈیالوجی خالص سیکولر تھی۔ بقول سوہن سنگھ بھکنا، جو بعد کے دنوں میں پنجاب کا معروف کسان لیڈر بنا، ''ہم سکھ یا پنجابی نہیں، ہمارا مذہب حب الوطنی ہے، ہمیں کسی پنڈت اور مُلا کی ضرورت نہیں''۔ غدر تحریک کا آغاز انگریزوں کے خلاف 1857 کی پہلی شورش سے ہو گیا تھا۔ مارکس نے اس کو پہلی جنگِ آزادی کا نام دیا تھا۔ جب کہ برٹش سرکار اسے میوٹنی یعنی بغاوت کا نام دے رہی تھی۔ دہشت گرد اور بنیاد پرست جیسے الفاظ دیے جانے کے باوجود جنگِ آزادی کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ برطانیہ کے سائے میں پلنے والے کسی وقائع نگار کی اس غدر کو اس وقت تک جنگِ آزادی لکھنے کی ہمت نہ ہوئی جب تک ہندوستان پر برطانیہ کا تسلط رہا سوائے مجمدار کے جنھوں نے Sepoy Mutiny and Revolt of 1857 میں کھل کر اسے جنگِ آزادی کہا۔ اس معرکے سے ہندو مسلم فوجی اور دیگر مذاہب کے سپاہی ایک دوسرے کے قریب آ گئے اور متحد ہو کر انگریز کے خلاف ہوئے۔ 1857 کی کوشش رائگاں نہیں گئی۔ ساری دنیا میں پھیلے تارکینِ وطن اس میں شامل ہوتے گئے۔ برٹش راج کے ظلم، سیاسی اور مالی دُشواریوں نے ہندوستانیوں کو امریکہ اور کینیڈا منتقل ہونے پر اُکسایا مگر کینیڈا کے نسلی امتیاز اور دوغلی پالیسی نے انھیں بے حد مایوس کیا۔ 21 اپریل 1913 ایسٹوریا امریکہ میں ایک انجمن ''ہندی ایسوسی ایشن آف دی پیسفک کوسٹ آف امیرکا'' وجود میں آئی۔ سوہن سنگھ بھکنا اس کے صدر اور ہردیال سکریٹری بنے۔ پہلی نومبر کو انجمن نے اپنا اردو اخبار ''غدر'' شائع کیا۔ ہردیال اس کے ایڈیٹر تھے جس کا یقین تھا کہ یہ اخبار 1857 کی دبی چنگاری کو شعلہ بنا دے گا۔ کچھ ہی عرصے بعد اس کا پنجابی ایڈیشن شائع ہوا۔ کرتار سنگھ سرابھا نے اردو کو پنجابی میں ترجمہ کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ ہندوستانی انجمن اور پارٹی ممبروں سے ایک ڈالر ماہانہ فیس لی گئی تا کہ اخبار کی اشاعت کا کام سنجیدگی سے جاری رہے۔ اخبار کی ڈسٹری بیوشن کچھ ہی عرصے میں شمالی امریکہ اور کینیڈا سے نکل کر فلپین، جزیرہ فیجی، سماترا، جاپان، شنگھائی، ہانگ کانگ، جاوا، سنگاپور، ملایا، برما، ایسٹ افریقہ، یہاں تک کہ

ہندوستان کے تمام سیاسی اڈوں اور فوجی چھاؤنیوں پر پہنچائی جانے لگی۔ تھوڑے عرصے بعد ہی اس کا گجراتی، پشتو، بنگالی اور نیپالی ایڈیشن بھی شائع کیا گیا۔ غدر اخبار کی تحریک اور پروپیگنڈا نے ہندوستانیوں کے دل میں ایک نیا جذبہ، ایک نیا احساس جگایا۔ برٹش سرکار نے اس کی اشاعت اور تقسیم پر پابندی لگانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اس روک تھام نے اخبار کی شہرت کو مزید بڑھاوا دیا اور اس کی اشاعت میں اضافہ کرنا پڑا۔ اخبار کے ایڈیٹر ہردیال کی سوانح میں ایملی براؤن بتاتی ہیں کہ جرمنوں نے غدر تحریک کو نہ صرف بڑھ چڑھ کر سپورٹ کیا بلکہ ان کے اخبار اور سیاسی مقاصد کو دنیا کے دُور دراز کونوں میں جہاں جہاں ہندوستانی آباد تھے، پہنچایا۔ ''غدر'' اخبار بہت جلد اپنے انتہا پسند مضامین اور نظموں کی وجہ سے تارکینِ وطن میں بے حد مقبول ہو گیا۔ یہ کھلے طور پر انگریزوں کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔ جلد ہی انجمن کا نام بدل کر غدر پارٹی رکھ لیا گیا۔ ان کا ہیڈ کوارٹر سان فرانسسکو بنا، جو کہ ان دنوں چین، آئرلینڈ اور رُوس کے باغیوں کا مرکز تھا۔ ''غدر پارٹی'' پہلے پہل پنجاب کے ہندوستانی طالب علم اور انتہا پسند تارکینِ وطن نے امریکہ اور کینیڈا میں قائم کی مگر بعد میں اس میں ہندو مسلم کسان اور مزدور بھی شامل ہو گئے۔ ان کے ساتھ منگورام مگووال بھی پارٹی میں شامل تھا جو بعد میں دلت تحریک کا معروف لیڈر بنا۔ برٹش راج کا ہندوستان میں تختہ اُلٹنے اور شمالی امریکہ کی نسلی امتیاز، ''وہائٹ اونلی پالیسی'' کو للکارنے کے لیے یہ جوان یکجا اور متحد ہو گئے۔ کیونکہ ہندوستانیوں کے خلاف ایک منظم نسلی امتیاز اور ترجیحی سلوک اور اذیتیں ایک مثبت قوت میں اور ناانصافیوں کے خلاف منظم احتجاج میں تبدیل ہو گئیں۔ غدری یا غدر کے جہادی جوانوں نے ہر جگہ برٹش راج کا بائیکاٹ کرنا شروع کیا۔ ساتھ ہی عالمی پیمانے پر پیشنز جاری کیں اور یہ بھی پلان بنایا کہ ہندوستان واپس جا کر ہندوستانی سپاہیوں کو، برٹش فوج نہ صرف چھوڑ دینے پر راضی کیا جائے بلکہ اپنی بندوق سرکار پر اُٹھا لینے کے لیے آمادہ کیا جائے۔ پہلی جنگ عظیم کے چھڑتے ہی غدر پارٹی کے کافی جوان پنجاب واپس گئے اور ہندوستانی جنگِ آزادی کے ساتھ ہبر اکالی تحریک میں بھی شامل ہوئے۔ ان کی موجودگی اور حرکات و سکنات سے انگریزی سرکار پریشان ہو گئی اور پنجاب کے اندرونی گاؤں میں فوج کی سختیاں بڑھ گئیں۔ غدر پارٹی کی تحریک یقیناً آئندہ کی کاوشوں اور جنگِ آزادی کی پہلی پیش رفت مانی جاتی ہے۔ ان کا نعرہ تھا، نام

ہمارا نعرہ، کام ہمارا غدر۔ پارٹی لیڈروں کا کہنا تھا کہ وقت آ گیا ہے اب ہم قلم اور روشنائی کی جگہ بندوق اور خون کا استعمال کریں گے۔

پارٹی کے خاص کارکن لالہ ہردیال، سوہن سنگھ بھکنا، عبدالحفیظ برکت اللہ، کرتار سنگھ سرابھا، راش بہاری بوس اور کریم بخش تھے۔

19 ویں صدی کے آخر میں، ہندوستان سے ہجرت صرف مالی دشواریوں کی وجہ سے نہیں ہو رہی تھی، ایک بڑی تعداد میں سیاسی رہنما جی بھی یورپ اور امریکہ میں پناہ گزین تھے۔ کچھ معروف لیڈروں کو بھی وطن چھوڑنا پڑا تھا۔ دنایاک دامودار سوارکار لندن میں پناہ گزین تھے، جہاں اُنھوں نے 1857 کی پانچویں برسی کا پروگرام کیا اور ایک بہت اہم کتاب "1857 کی جنگِ آزادی" لکھی جو انگریزوں کے جھوٹے بیانات کے خلاف تھی۔ برٹش سرکار نے اس کتاب پر فوراً پابندی لگا دی مگر اس کی کاپی غدر پارٹی کے ہاتھ لگ چکی تھی جس کو غدر اخبار میں قسط وار شائع کیا جانے لگا۔ اخبار کے مضامین اور نظمیں جلد ہی بہت مشہور ہو گئیں اور انھیں رسالے اور کتابچے کے طور پر دوبارہ شائع کیا جانے لگا۔ غدر اخبار کے پروپیگنڈا نے کئی اور تصانیف کو جنم دیا جن میں چار بہت مشہور ہیں: اعلانِ جنگ، غدر کی گونج، نیا زمانہ اور برٹش سرکار کی بیلنس شیٹ۔ غدر اخبار کے مضامین نے عام تارکینِ وطن کے دلوں کو نہ صرف گرما دیا تھا، حب الوطنی کو جگا دیا تھا، بلکہ بھگوان سنگھ، ہرمن سنگھ اور رشنا سنگھ دُکھی کی نظموں نے اس تحریک میں آگ لگا دی تھی۔ ہندوستانی ورکرز اور مہاجروں کی روزمرہ کی پریشانیوں اور دُکھ درد کو اس اخبار نے زبان اور دماغ عطا کر دیا تھا۔ غدر اخبار نے نہ صرف ہندو اور مسلمانوں کو یکجا کر دیا تھا۔ بلکہ برٹش سرکار کی سازش، جاسوسی اور پھوٹ ڈال کر تقسیم کرو اور حکومت کرو کی حکمتِ عملی سے ہوشیار بھی کر دیا تھا۔ بلکہ انھیں تنبیہ بھی کرتا رہتا تھا۔ غدر اخبار کا عکس اس مضمون میں شامل ہے۔ 19 مارچ 1914 کی جلد اوّل، شمارہ نمبر 22 کا پہلا صفحہ کچھ ایسا ہے۔ انگریز راج کا کچا چٹھا — چند موٹی موٹی باتیں:

1- انگریز ہر سال پچاس کروڑ روپیہ ہندوستان سے کھینچ کر انگلستان لے جاتے ہیں۔ اس وجہ سے ہندوستانی اتنے غریب ہو گئے ہیں کہ روزانہ آمدنی فی کس پانچ پیسہ ہے۔

2- زمین کا لگان 65 فیصد سے زیادہ ہے۔

3- چالیس کروڑ آدمیوں کی تعلیم پر پونے آٹھ کروڑ روپیہ، اور انتظام حفظ صحت پر دو کروڑ روپیہ، مگر فوج پر تیس کروڑ روپیہ۔

4- انگریزی راج میں قحط بڑھتے جا رہے ہیں اور گزشتہ دس برس میں دو کروڑ مرد، عورت اور بچے بھوک سے مر گئے ہیں۔

5- ہندوستانی ریاستوں میں نفاق اور ابتری پھیلانے کی اور انگریزی راج کا رسوخ بڑھانے کی ترکیبیں عمل میں لائی جاتی ہیں۔

6- انگریزوں کو ہندوستانیوں کو قتل کرنے اور ہندوستانی عورتوں کی عزت برباد کرنے کی کوئی سزا نہیں دی جاتی ہے۔

7- ہندو مسلمان کے روپیوں سے عیسائی پادریوں کی مدد کی جاتی ہے۔

8- ہندو مسلمان میں فساد کرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

9- ہندوستان کی صنعت و حرفت کو انگلستان کے فائدے کے لیے برباد کیا جاتا ہے۔

1857 کے غدر کو 56 برس گزر گئے ہیں، اب ایک دوسرے کی سخت ضرورت ہے۔ تو یہ تھی برٹش سرکار کی بیلنس شیٹ۔

غدر پارٹی کے لیڈر کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ جب برطانیہ اور جرمنی میں تناؤ شروع ہوا، یہ لوگ بھی بھرپور گوریلا جنگ کے لیے تیار ہونے لگے۔ انھیں معلوم تھا اب جنگ برسوں چلے گی۔ اس کا فائدہ اُٹھا کر غدر پارٹی نے کھل کر جرمنی کا ساتھ دینا شروع کیا، مگر پارٹی لیڈر ہردیال کو برٹش دباؤ کے تحت امریکہ میں بدامنی پھیلانے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ یہ 1914 کا بڑا نازک دور تھا۔ ہردیال کو مجبوراً سوئٹزرلینڈ جانا پڑا، مگر اس کے بعد بھی پارٹی کی سرگرمی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ جاپان میں بھی اس تحریک کا خوب چرچا ہوا اور مولوی برکت اللہ، جو اُن دنوں ٹوکیو یونیورسٹی میں پروفیسر تھے، جب برٹش سرکار کی مداخلت سے اُنھیں یونیورسٹی چھوڑنی پڑی تو وہ سان فرانسسکو پہنچے اور اس تحریک میں زور شور سے شامل ہو گئے۔ کینیڈا میں بھی پارٹی پر حکومت کی سختیاں اور پابندیاں شروع ہو گئیں۔ کچھ سکھ سپاہی جو برٹش آرمی سے نکل کر کینیڈا آئے تھے، اُنھوں نے احتجاجاً اپنے تمغے، یونیفارم اور سرٹیفکیٹس کو نذرِ آتش کر دیا۔ غدر اخبار نے

اس خبر کو بڑے نمایاں طور پر شائع کیا اور جنگ کا اعلان بھی کر دیا۔

23 مئی 1914 کو ایک "کوماگاتا مارو" نامی جاپانی بحری جہاز ہانگ کانگ سے 376 ہندوستانی مسافروں کو لے کر وینکوور کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ اس میں 340 سکھ، 12 ہندو اور 24 مسلمان مسافر تھے۔ کینیڈین حکومت نے ہندوستانی مسافروں کو منظم نسلی امتیاز اور ترجیحی سلوک کے امتیازی قانون کے تحت جہاز سے نکلنے کی اجازت نہیں دی۔ یہ قانون محض ہندوستانیوں کو کینیڈا میں آباد ہونے سے روکنے کی سازش تھی۔ بندرگاہ پر یہ جہاز کوئی دو مہینے رُکا رہا پھر واپس ہندوستان کے سفر پر مجبور ہو گیا۔ 1901 کی مردم شماری کے مطابق شمالی امریکہ میں کوئی دو ہزار پچاس ہندوستانی آباد تھے۔ ان میں بے شمار پنجابی سکھ تھے جو کینیڈا، خصوصاً وینکوور میں آباد ہوئے تھے۔ کینیڈین حکومت ایک طرف "براؤن انوے ژن" اور "گرین ٹائیڈ" کو روکنا چاہتی تھی، مگر یہ بھی ممکن تھا کہ برٹش سرکار کے دباؤ پر یہ قانون بنائے جا رہے تھے۔ 60 دنوں کے لیے بھوکے پیاسے مسافروں کو اس لیے بھی جہاز میں نظر بند کیا گیا کہ سفید فام حکام شہر کی سفیدی کو برقرار رکھ سکیں۔ مسافروں نے ہر طرح سے اپنے حقوق کی جدوجہد کی، وینکوور کے ہندوستانی تارکینِ وطن عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتے رہے، مگر پولیس کی سختی اور حکومت کی ہٹ دھرمی کے آگے کچھ نہ ہو سکا۔ یہ سانحہ کینیڈا کی تاریخ میں "کوماگاتا مارو انسیڈنٹ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ ہندوستانیوں کے خلاف ایک سوچی سمجھی، داغدار کینیڈین امیگریشن اسکیم اور قانون تھا۔ سر رچرڈ مک برائیڈ، برٹش کولمبیا کا وزیر اعلیٰ، کہتا ہے کہ ہمیں بڑی تعداد میں اور مغلو یعنی مشرقی لوگوں کے داخلے پر پابندی لگانی چاہیے۔ ورنہ ہماری سفید فام نسل کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ہمیں یہ بھی ذہن نشین کرنا چاہیے کہ یہ ایک سفید فاموں کا ملک ہے، یعنی یہ ملک سفید فام ہے۔ ٹائمز آف لندن اخبار 23 مئی 1914، نے سرخی لگائی کہ ایشیا کینیڈا کے صدر دروازے پر دستک دے رہا ہے اور اس خبر سے ساری دنیا میں کھلبلی مچ گئی، مگر ہندوستان کی برٹش سرکار خاموش رہی۔

مسافروں کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی۔ غذا، دوائیں، پانی، ہر چیز پر پابندی تھی۔ ایک مسافر بیماری سے مر گیا، بے شمار بھوک اور غلاظت سے بیمار پڑ گئے، مگر کسی طرح کینیڈین امیگریشن اور حکام کا دل نہ پسیجا۔ غدر اخبار نے مسافروں کے استحکام اور کینیڈین حکومت

کے خلاف ایک خاص ضمیمہ نکالا۔ غدر پارٹی کے کارکن چاہتے ہوئے بھی عملی طور پر ان مسافروں کی مدد کرنے سے قاصر تھے، مگر چھپے چوری جہاز میں غذا اور دوائیں پہنچائی جارہی تھیں۔ تمام کوششوں کے باوجود صرف 24 مسافروں کو جن کے پاس پہلے سے ڈومیسائل پیپرز تھے، ان کو جہاز سے اُترنے کی اجازت دی گئی۔ 23 جولائی 1914 کو "کوماگاتا مارو" کو زبردستی وکٹوریا ہاربر چھوڑنے کی وارننگ دی گئی اور بالآخر ناک جہاز ہانگ کانگ کے لیے روانہ ہوا اور 26 ستمبر کو جب یہ کولکاتا کے ساحل کے قریب پہنچا، ایک یورپین گن بوٹ نے اسے رُکنے کا سگنل دیا اور پھر جہاز کو "بج بج" پورٹ پر لنگر انداز کیا گیا۔ مگر یہاں بھی مسافروں کو پولیس کی نگرانی میں رکھا گیا۔ وطن واپسی پر اس نئی مصیبت سے مسافر اور بھی پریشان ہوئے، پتہ چلا ایک اسپیشل ٹرین سے ان سب کو پنجاب بھیجا جائے گا۔ پولیس اور مسافروں میں بات بڑھی اور برٹش افسروں کی فائرنگ سے کوئی 22 مسافر ہلاک ہو گئے۔ اس طرح کوماگاتا مارو کا سفر ختم ہوا۔ مگر کینیڈین تاریخ میں ایک بدنما داغ لگ گیا۔ جنگِ عظیم اور کوماگاتا مارو کے سانحے نے غدر تحریک کو مزید بڑھایا اور اخبار غدر کی رپورٹ کے مطابق، پارٹی کے خاص خاص کارکنوں نے ہندوستان واپس جاکر اسلحہ جمع کر کے انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی شروع کر دی۔ ایک ریکارڈ کے مطابق غدر پارٹی کے 2312 جوان 13 اکتوبر 1914 سے 25 فروری 1915 تک ہندوستان میں داخل ہوئے اور 1916 تک کوئی آٹھ ہزار غدری وطن واپس جا چکے تھے۔ پارٹی ممبروں نے طالب علموں اور جوانوں کو یکجا کرنا شروع کیا، برٹش فوج میں لگے ہندوستانی جوانوں کو بھی اپنے ساتھ ملایا گیا، بنگال کے باغیوں کو بھی ساتھ لیا، رش بہاری بوس اس تحریک میں جُوے۔ مگر برٹش سرکار اپنے ہندوستانی جاسوسوں کی مدد سے اس تحریک کو ہر طرح سے ناکام کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ ناکامی کی بڑی وجوہات میں فنڈز کی کمی کے علاوہ، فوجی لیڈر شپ، ماہر جاسوس اور ہر وہ شاطرانہ داؤ پیچ جو ایک کامیاب جنگی مداخلت کے لیے ضروری ہے۔ ان سب کا نہ ہونا شامل تھا۔ برٹش انٹیلی جینس کو غدر جوانوں کی ہر ایک چال کا پہلے سے علم ہو جاتا تھا، ان کی کمزوریوں پر بھی نظر تھی، انگریزوں کے مخبر بھی تحریک میں شامل تھے۔ انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ اپنی طاقت کے بل پر نہیں بلکہ سازشوں اور جاسوسی کے بہتر نظام سے کیا۔ وہ ہندوستانیوں کی اس کمزوری سے واقف ہو چکے تھے کہ معمولی سی دولت یا عہدے کا

لالچ دے کر بعض ہندوستانیوں کو خریدا جا سکتا ہے۔ سرجان ولیم کی کتاب Sepoy War in India کا ایک اقتباس 1857 کے انقلاب کو ناکام بنانے میں جاسوسوں کے رول کا اعتراف یوں کرتا ہے:

"حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوستان میں ہماری بھلائی کا سہرا ہمارے ہندوستانی پیروکاروں کے سر ہے، جن کی ہمت اور جسارت نے ہندوستان کو اپنے ہم وطنوں سے لے کر ہمارے حوالے کر دیا۔"

ان تمام کمزوریوں اور نادانیوں کے باوجود غدر تحریک کی چنگاری بجھی نہیں۔ پارٹی کے کارکن جو پولیس اور فوج کی زد سے بچ نکلے تھے، جدوجہد کرتے رہے۔ کچھ لوگ دوسری تنظیموں سے لگ گئے اور اس وقت تک کوشش کرتے رہے جب تک مادر وطن کو 1947 میں آزادی نہ ملی۔ شہید بھگت سنگھ، ایک قد آور باغی جوان، نے برٹش سرکار نے ایک انگریز کو مارنے کی سزا میں پھانسی پر چڑھا دیا تھا، غدر پارٹی سے بہت متاثر تھا، کرتار سنگھ سرابھا اس کا رول ماڈل تھا۔ الٹرا لیفٹسٹ گروپ "نیکسا لائٹ" کے جوان بھی غدر تحریک سے متاثر ہوئے ہیں۔ غدر تحریک کی مزید تفصیلات اس مضمون میں ممکن نہیں۔

1930 اور 1940 کے دوران ہندوستانی تارکین وطن اپنے حقوق کے لیے ہر طرح سے تیار ہو چکے تھے۔ 1947 میں جب ہندوستان آزاد ہوا، ان کو ووٹ ڈالنے کی اجازت ملی۔ آج کے ہندوستانی مہاجر اور دیگر اسٹوڈنٹ امیگرینٹس کو مائی کلچرل ہسٹری کی جانب سے ہر طرح کی مذہبی، زبان و ادب اور ثقافتی شناخت کی مکمل آزادی ہے۔ آج ہم [illegible] کر اپنا جینا بھلا کر خود کو کینیڈین کہتے ہیں مگر ان مراعات، فخر اور تحمیل کی بنیادوں میں غدر تحریک کی قربانیاں بھی شامل ہیں۔

آج شمالی امریکہ اور کینیڈا میں انٹرنیٹ پریس کے نام پر کئی اردو اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ اردو اخبار بھی کینیڈا میں پچاس سے زائد ہیں، مگر سارے پاکستانی ہفت روزہ ہیں اور مفت تقسیم کیے جاتے ہیں، اشتہار سے ان کا خرچا پورا ہوتا ہے۔ 1971 میں سقوط ڈھاکہ کے بعد لطیف اویسی نے صدائے پاکستان کے نام سے ٹورنٹو میں ایک ہفت روزہ شائع کرنا شروع کیا، تاکہ تارکین وطن کا اردو میں ایک پلیٹ فارم قائم ہو۔ 1974 میں [illegible] اللہ اویسی صاحب کی ادارت میں ماہنامہ اخبار الہلال بن گیا، جس میں ہند و پاک کی خبروں کے ساتھ ادب، شاعری اور

دینیات پر بھی مضامین شائع ہوئے۔ یہ شمالی امریکہ کا اس دور کا پہلا اردو اخبار تھا۔ 2002 تک اس کا سلسلہ چلتا رہا، یعنی 30 سال۔ اس دوران 1973 میں مائٹریال سے جنگ اور 1980 میں عابد جعفری کا امروز اور صبیح الدین منصور کا پاکیزہ ٹورنٹو سے شائع ہوا۔ 2000 کے بعد اردو ہفت روزہ اخبار کی باڑھ آ گئی، اردو ٹائمز، اردو پوسٹ، جیو پاکستان، خبرنامہ، پاکستان پوسٹ، وائس آف پاکستان اور ایسے بے شمار اخبار آج گروسری اسٹورز اور مساجد کے دروازوں پر نظر آتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ سب کمرشیل جنک ہے اور اس سے ہمیں یا اردو صحافت کو کوئی فائدہ یا فروغ نہیں ملتا، مگر کچھ سنجیدہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اخباروں کی اس کٹ اور پیسٹ کی اشاعتوں سے ہمارے سینئر اور تارکین وطن کو جو ابھی تک انٹرنیٹ کی دنیا سے بے خبر ہیں، ان کو وقت گزاری کے لیے کافی مواد مل جاتا ہے۔ یعنی یہ نہ صرف اردو کا آموختہ ہے بلکہ بھولے ہوئے غالب کے اشعار، رضیہ کا دسترخوان، بابا اجمیری کے زائچے، احادیث اور ماثورہ دعائیں بھی یاد کروا دیتا ہے تاکہ حسب ضرورت ان بچوں کے لیے، جو انھیں گھر پر یا سینئر ہومز میں تنہا چھوڑ کر اپنے جاب یا اپنی دنیا میں مگن ہیں، سینئر ماں باپ یا سنگل دادا یا نانی اپنے بچوں کو دعا دے سکیں۔ مجھے بھی یقین ہو چلا ہے کہ اردو صحافت کا یہ پہلو کتنا خوش فعال اور خوش آئند ہے۔ کچھ لوگ یوں بھی افسردہ ہیں کہ اردو کا مستقبل نہیں تو اردو صحافت کہاں، میں نے اپنے ایک بی بی سی کے انٹرویو میں کہا تھا کہ اردو ایک مہاجر زبان ہے، جب تک مہاجرت کا سلسلہ باقی ہے، زبان نہیں مر سکتی، یعنی مہاجر زندہ اردو باقی۔ خوش باش۔

References:

1. Ghadr-Encyclopedia Britanica...
2. Sikhlionz-Sikh History 1912-1926.
3. A Brief History of Ghadr Movement: people's Voice Canada's leading communist newspaper. Vancouver
4. Ghadr Party -Wikipedia
5. 1857 kay Ghaddaroc kay Khufeea Asbaab Karn Saleem Qureshi.

ابوالکلام آزاد کا الہلال
پہلی جنگ عظیم کے دنوں میں
ایک مختصر مطالعہ

ایلن ڈیسروئرس

پہلی جنگ عظیم کے دو سال قبل ابوالکلام آزاد نے ہندوستان کا شہرۂ آفاق مصوّر سیاسی ہفت روزہ ''الہلال'' 1912 میں کلکتہ سے جاری کیا۔ اُردو صحافت کی دوسو سالہ سالگرہ منانے کے تعلق سے ''الہلال'' کے ایک شمارے (کلکتہ اگست 1914) پر ایک نگاہ ڈالنا چاہیں گے۔

— ابوالکلام آزاد کا طریقہ اور طرزِ بیان کیا تھا؟ یعنی صحافتی اعتبار سے اور پہلی عالمی جنگ کے زمانوں میں ''الہلال'' کیسا جریدہ تھا؟

— اُس نوعمر ہندوستانی صحافی کا نظریہ کیا تھا؟ اور خاص طور سے وہ عالمی جنگ کے بارے میں اپنے تنقیدی خیالات کیسے پیش کرتا تھا؟

اِن سوالوں کا جواب دینے کے لیے میں نے سب سے پہلے ''الہلال'' سہ جلد اُتر پردیش اردو اکادمی 1988 کی اشاعت کی مدد لی۔ پھر اس لیے کہ اُس شمارے میں فرانس اور

فرانسیسی خبر رساں (انگریزی ایجنسی کے ذریعے) کا ذکر بہت ہے۔ میں نے ایک پرانے اور مشہور فرانسیسی رسالے کا جائزہ بھی لیا ہے۔L'ILLUSTRATION (پیرس اگست 1914)۔ دیکھیے ''کتب نامہ''۔

نوعمر اور انقلاب پسند ابوالکلام آزاد کا ہفت روزہ ''الہلال'' 1912 میں شائع کرنا۔

— کلکتہ شہر کا انتخاب: نئے برطانوی دارالحکومت تعمیر کرنے کے باوجود کلکتہ اب بھی (1912 میں) بڑی سیاسی اہمیت رکھتا تھا، خاص طور سے صوبۂ بنگال کی پہلی تقسیم کی تنسیخ کے بعد جبکہ انقلابی اور حریت پسند فضا رائج تھی جو کہ نوآبادنئی دلی میں بالکل نہیں تھی۔ وہ بھی نوشہنشاہی دربار کے دنوں میں۔

— صحافت میں آزاد کا کیا تجربہ تھا؟ بقول جی ڈی چندن (اُردو صحافت، اردو کے نامور صحافی 1987، ص105):

> ''ابھی دس ہی سال کے تھے کہ ملک بھر کے سرکردہ اخباروں اور رسالوں کا ناقدانہ مطالعہ کرنے لگے [آزاد 1888 میں پیدا ہوا تھا] نوعمری کی سطح پر یعنی بارہ سال کی عمر سے آزاد نے محسوس کیا کہ خیالات کی اشاعت اور عام بحث ونظر کا اخبار سے بہتر کوئی اور ذریعہ نہیں۔ سن بلوغ تک پہنچنے سے پہلے اپنی نظم اور پھر بہت جلد نثر سے ملک کے ممتاز جرائد کے کالموں میں جگہ پانے لگے۔ سولہ سال کی عمر تک کم از کم دس سنجیدہ مقامی اور غیر مقامی جریدوں کی ادارت یا ان کی قلمی امداد کی۔''

سقوط اینٹورپ:

اینٹورپ کی دفاعی استحکامات پر اوّلین حملہ 20 ستمبر سے شروع ہوا اور خود شہر پر حملے کی ابتدا 51 اکتوبر کی خوفناک گولہ باری سے ہوئی۔ جرمن یہاں اس شہر کی تسخیر کے لیے اپنی آتشباری کا بہترین ساز وسامان لے آئے تھے۔ گولہ باری کے لیے کوئی 2 سو توپیں تھیں جن کے دہانوں کے قطر مختلف طور پر 28، 30 اور 42 سینٹی میٹر کے تھے اور زد 8 میل تک۔ 5 سے 8 تاریخ تک تو خیر

معمولی انداز میں گولہ باری ہوتی رہی۔ مگر آٹھویں دن آتشباری ہولناک طور پر شدید ہوگئی اور جرمن حملہ آور شہر پر روغن نفط اور اسی قسم کے دیگر شہر میں آگ لگا دینے والے گولوں کی موسلا دھار بارش کرنے لگے۔ شہر میں ہر طرف اطلاع نامے چسپاں کیے گئے کہ لوگ فوراً شہر چھوڑ کر بھاگنا شروع کریں۔ گو بہت سے اُمید پرست اور سادہ لوح متحدہ فوج کے جوابی حملے سے کوئی ڈھائی لاکھ بے خانماں اور تہی دست ہالینڈ میں جا کر پناہ گزین ہو گئے۔ جمعہ کی صبح کو جب آفتاب طلوع ہوا ہے تو اس وقت نصف شہر سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ جرمن فوج نے اُن تیل کے حوضوں پر گولے اُتارے جو دریا کی گودی کے برابر برابر چلے گئے تھے۔ گولوں کے آتے ہی آگ لگی اور سارا شہر آگ اور شعلوں سے ایک منظرِ مہیب بن گیا۔

(البلاغ 18 نومبر 1914ء بحوالہ نقوش: سقوط اینٹورپ)

اس ہولناک چراغاں کے حلیفوں کی فوج کے جوابی حملے کی امداد برابر ثابت قدم آبادی کے بھی پیر اُکھیڑ دیئے اور اُس نے بھی اضطراب و بدحواسی کے عالم میں (جو ایسے وقت میں طبیعی اور ناگزیر امر ہے) بھاگنا شروع کیا۔ مگر تاہم محافظ فوج ثابت قدم رہی اور برابر جواب دیتی رہی۔ اس جوابی آتشباری میں خود شاہ البرٹ نے حصہ لیا اور قلعوں کے کمانڈر جنرل ڈی گائس کے ساتھ فوجی کارروائیوں کی رہنمائی کرتے رہے۔ ۹ اکتوبر یوم جمعہ کو دوپہر کے وقت یہ واضح ہوا کہ نازک وقت قریب آگیا ہے۔ نواح "مدنیم" کا جنوبی حصہ تباہ ہو چکا تھا اور وسط شہر کے قلعے خاموش تھے۔ ان کے علاوہ قلعوں میں جہاں جہاں سے نشانہ دشمن تک پہنچ سکتا تھا ان مقامات پر مدافعین نے جرمن فوج پر ہر ممکن خوفناک گولہ باری کی، جس سے خوفناک نقصانات پہنچے۔ اُس کے بعد جب بلجین فوج کو یہ نظر آگیا کہ اب قسمت کے فیصلے سے سرتابی فضول ہے تو اُس وقت اُنھوں نے قلعوں کو اپنے ہاتھ سے اُتار دیا اور ایک۔ سپاہی کے ہتھیار ڈالے بغیر شہر خالی کر دیا گیا۔

یہ سقوط اینٹورپ کی وہ مختصر داستان ہے جو مقامی معاصر اسٹینڈرڈ کے نامہ نگار لندن کے مراسلہ سے ماخوذ ہے۔ یہ مراسلہ نگار اس کے بعد لکھتا ہے:

"اس داستان میں بہت سے تفصیلی امور کی کمی ہے۔ کیونکہ بعض ناقابل اندازہ اسباب کی بنا پر محکمہ حساب نے منع کیا ہے]۔"

فرانسیسی خبر رساں (انگریزی ایجنسی کے ذریعے) کا ذکر بہت ہے۔ میں نے ایک پرانے اور مشہور فرانسیسی رسالے کا جائزہ بھی لیا ہے۔ L'ILLUSTRATION (پیرس اگست 1914)۔ دیکھیے ''کتب نامہ''۔

نوعمر اور انقلاب پسند ابوالکلام آزاد کا ہفت روزہ ''الہلال'' 1912 میں شائع کرنا۔

— کلکتہ شہر کا انتخاب: نئے برطانوی دارالحکومت تعمیر کرنے کے باوجود کلکتہ اب بھی (1912 میں) بڑی سیاسی اہمیت رکھتا تھا، خاص طور سے صوبۂ بنگال کی پہلی تقسیم کی تنسیخ کے بعد جبکہ انقلابی اور حریت پسند فضا رائج تھی جو کہ نو آبادیاتی دلی میں بالکل نہیں تھی۔ وہ بھی نوشہنشاہی دربار کے دنوں میں۔

— صحافت میں آزاد کا کیا تجربہ تھا؟ بقول جی ڈی چندن (اُردو صحافت، اردو کے نامور صحافی 1987، ص 105):

> ''ابھی دس ہی سال کے تھے کہ ملک بھر کے سرکردہ اخباروں اور رسالوں کا ناقدانہ مطالعہ کرنے لگے [آزاد 1888 میں پیدا ہوا تھا] نوعمری کی سطح پر یعنی بارہ سال کی عمر سے آزاد نے محسوس کیا کہ خیالات کی اشاعت اور عام بحث ونظر کا اخبار سے بہتر کوئی اور ذریعہ نہیں۔ سن بلوغ تک پہنچنے سے پہلے اپنی نظم اور پھر بہت جلد نثر سے ملک کے ممتاز جرائد کے کالموں میں جگہ پانے لگے۔ سولہ سال کی عمر تک کم از کم دس سنجیدہ مقامی اور غیر مقامی جریدوں کی ادارت یا ان کی قلمی امداد کی۔''

سقوط اینٹورپ:

اینٹورپ کی دفاعی استحکامات پر اوّلین حملہ 20 ستمبر سے شروع ہوا اور خود شہر پر حملے کی ابتدا 5 اکتوبر کی خوفناک گولہ باری سے ہوئی۔ جرمن یہاں اس شہر کی تسخیر کے لیے اپنی آتشباری کا بہترین ساز وسامان لے آئے تھے۔ گولہ باری کے لیے کوئی 2 سو توپیں تھیں جن کے دہانوں کے قطر مختلف طور پر 28، 30 اور 42 سینٹی میٹر کے تھے اور زد 8 میل تک۔ 5 سے 8 تاریخ تک تو خیر

معمولی انداز میں گولہ باری ہوتی رہی۔ مگر آٹھویں دن آتشباری ہولناک طور پر شدید ہوگئی اور جرمن حملہ آور شہر پر روشن نقط اور اسی قسم کے دیگر شہر میں آگ لگا دینے والے گولوں کی موسلا دھار بارش کرنے لگے۔ شہر میں ہر طرف اطلاع نامے چسپاں کیے گئے کہ لوگ فوراً شہر چھوڑ کر بھاگنا شروع کریں۔ گو بہت سے اُمید پرست اور سادہ لوح متحدہ فوج کے جوابی حملے سے کوئی ڈھائی لاکھ بے خانماں اور تہی دست ہالینڈ میں جاکر پناہ گزین ہوگئے۔ جمعہ کی صبح کو جب آفتاب طلوع ہوا ہے تو اس وقت نصف شہر سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ جرمن فوج نے اُن تیل کے حوضوں پر گولے اُتارے جو دریا کی گودی کے برابر برابر چلے گئے تھے۔ گولوں کے گرتے ہی آگ لگی اور سارا شہر آگ اور شعلوں سے ایک منظر مہیب بن گیا۔

(البلاغ 18 نومبر 1914 بریڈفورڈ بحوالہ مقوط اینورپ)

اس ہولناک چراغاں کے حلیفوں کی فوج کے جوابی حملے کی امداد پر ثابت قدم آبادی کے بھی پیر اُکھیڑ دیے اور اُس نے بھی اضطراب و بدحواسی کے عالم میں (جو ایسے وقت میں طبعی اور ناگزیر امر ہے) بھاگنا شروع کیا۔ مگر تاہم محافظ فوج ثابت قدم رہی اور برابر جواب دیتی رہی۔ اس جوابی آتشباری میں خود شاہ البرٹ نے حصہ لیا اور قلعوں کے کمانڈر جنرل ڈی گاس کے ساتھ فوجی کارروائیوں کی رہنمائی کرتے رہے۔ ۹/اکتوبر یوم جمعہ کو دوپہر کے وقت یہ واضح ہوا کہ نازک وقت قریب آگیا ہے۔ نواح "لرینیم" کا جنوبی حصہ تباہ ہو چکا تھا اور وسط شہر کے قلعے خاموش تھے۔ ان کے علاوہ قلعوں میں جہاں جہاں سے نشانہ دشمن تک پہنچ سکتا تھا، ان مقامات پر مدافعین نے جرمن فوج پر ہر ممکن خوفناک گولہ باری کی، جس سے خوفناک نقصانات پہنچے۔ اس کے بعد جب بلجین فوج کو یہ نظر آگیا کہ اب قسمت کے فیصلے سے سرتابی فضول ہے تو اُس وقت اُنھوں نے قلعوں کو اپنے ہاتھ سے اُتار دیا، اور ایک سپاہی کے ہتھیار ڈالے بغیر شہر خالی کر دیا گیا۔

یہ سقوط اینورپ کی وہ مختصر داستان ہے جو مقامی معاصر اسٹینڈرڈ کے نامہ نگار لندن کے مراسلہ سے ماخوذ ہے۔ یہ مراسلہ نگار اس کے بعد لکھتا ہے:

"اس داستان میں بہت سے تفصیلی امور کی کمی ہے۔ کیونکہ بعض ناقابل اندازہ اسباب کی بنا پر محکمہ احتساب نے منع کیا ہے]۔"

— الہلال ستمبر 1912 جنگ کے رعد و برق میں حُسن و عشق کا نغمۂ الم!

دنیا کے مختلف بے تعلق واقعات میں بعض اوقات عجیب عجیب سلسلے ربط و تعلیل کے پیدا ہو جاتے ہیں۔ فرانس کے ایک مشہور مقدمہ قتل کی سرگذشت ''الہلال'' میں شائع ہو چکی ہے، جس میں موسیو کالمیو کی بیوی نے ایڈیٹر فگارو کو قتل کر دیا تھا۔ اُس کے بعد گذشتہ ہفتے یہ تار برقی تعجب کے ساتھ پڑھی گئی کہ عدالت نے مسز کالمیو کو بری کر دیا۔ اب ایک اور واقعہ سُنیے — موجودہ جنگِ یورپ میں فرانس کی بری فوج کا سپہ سالار جنرل جوفر ہے، جس کے بری اقدامات پر تمام دُنیا کی نظریں لگی ہوئی ہیں۔ لیکن جنرل جوفر کے تقرر کا واقعہ بھی ایک دلچسپ سرگذشت ہے۔ فرانس میں 1911 تک سپہ سالاری عہدہ نہ تھا۔ ایک جنگی مجلس تھی۔ لیکن اُسی زمانے میں پبلک نے مجلسِ وزارت پر سخت اعتراضات کیے کہ اُس نے سپہ سالاری جیسے اہم عہدے کی جگہ بالکل خالی چھوڑ دی ہے۔ اس اعتراض میں ایڈیٹر فگارو نے سب سے زیادہ حصہ لیا تھا۔ چنانچہ مجلس جنگی ٹوٹ گئی تھی۔ مجلسِ وزارت ترتیب دی گئی اور جنرل جوفر سپہ سالار عام مقرر ہوا۔ یہ تمام مراتب اُسی موسیو کالمیو کے ہاتھوں انجام پائے اور اعتراف کیا گیا ہے کہ اگر جنرل جوفر کا تقرر اُس وقت نہیں کیا ہوتا تو موجودہ جنگ کے متعدد جنگی اہتمامات ناقص رہ جاتے۔

مسز کالمیو کے رہا ہو جانے میں بھی موجودہ جنگ کو بہت دخل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایسے نازک موقع پر اگر اس مقدمہ کو زیادہ سنگین بنایا جاتا تو ملک کے اندر مضر اور خلاف وقت داخلی اختلافات پیدا ہو جانے کا خوف تھا۔ ان تمام الگ الگ واقعات کو جمع کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسز کالمیو کا مقدمہ موجودہ جنگ کی داستان کا ایک باب ہے۔ اگر مسز کالمیو چاہے تو موجودہ واقعات کو دُنیا سے بالکل الگ ہو کر دیکھا سکتی ہے۔ اُسے حق ہے کہ اس دنیا کی سب سے بڑی جنگ کو محض ایک حُسن پرستانہ شورش سمجھے، جو اس لیے کی گئی تا کہ ایک حسین قاتل کو عدالت کی سزا سے بچا لیا جائے۔

ان خطوط کو پڑھ کر ہمیں پتہ چلتا ہے کہ آزاد کا اندازِ بیان کتنا طنز آمیز ہو سکتا تھا۔

حوالے:

- اردو صحافت، اردو صحافت کے سیمنار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ، مرتبہ انور علی دہلوی، اُردو اکادمی، دہلی 1987۔
- اردو صحافت عہد بہ عہد، رئیس الدین فریدی۔
- ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں) از محمد صدیق Indus Publishers۔ کراچی 1980
- روح صحافت، از امداد صابری، مکتبہ شاہراہ۔ اُردو بازار، دہلی، 1968
- "الہلال" (3) جلد پنجم، جلد ششم (البلاغ) و جلد ہفتم۔ ابوالکلام آزاد، اتر پردیش اردو اکادمی۔ 1988: جلد پنجم یکم جولائی 1914 تا 18 نومبر 1914۔

– L' ILLUSTRATION, JOURNAL UNIVERSEL_1914

(فرانسیسی زبان کا رسالہ۔ پیرس۔ مع تصاویر)

L' ILLUSTRATION, années 1914-1916_HISTOIRE D'UN SIÈCLE_1843-1944_

LE LIVRE DE PARIS_1985

PP 12-54, 68-71, 102-103

DOUGLAS (1988) ABUL KALAM AZAD

OXFORD UNIVERSITY PRESS (REVISED Ed.)

مولانا آزاد کی نثر کا نمونہ الہلال اور البلاغ

ندیم احمد

غیر افسانوی نثر ہونے کے باعث صحافت تخیل کے بجائے تعقل کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔ تخیل کی عدم موجودگی کے سبب یہ چیزوں کو ان کی اصلی حالت میں پیش کرنے پر تو قادر ہے لیکن چیزیں کیسی ہو سکتی تھیں یہ بتانا اس کے بس کا روگ نہیں۔ جو لوگ صرف صحافتی تحریروں کی بنیاد پر خود کو ادیب منوانے کے لئے بچوں کے بل کھڑے ہو جاتے ہیں انھیں ارسطو کے اس خیال کو ذرا رک کر پڑھنا چاہیے جہاں وہ ادیب اور مورخ کا فرق بیان کرتا ہے۔ حقائق کے اطلاقی لیکن بے جان اظہار کی حد تک تاریخ اور صحافت کی سرحدیں کہیں کہیں اتنی مل جاتی ہیں کہ ارسطو کے اس بیان کو ہم ادیب اور صحافی کے موازنے کے طور پر بھی دیکھ سکتے ہیں:

> ''شاعر کا تفاعل یہ نہیں ہے کہ وہ ان چیزوں کو بیان کرے جو واقع ہو چکی ہیں۔ دراصل اس کا تفاعل ان چیزوں کو بیان کرنا ہے جو واقع ہو سکتی ہیں، یعنی جن کا واقع ہونا قانون لزوم یا احتمال کی روشنی میں ممکن ہے۔ شاعر اور مورخ میں فرق یہ نہیں ہے کہ ایک نظم میں اظہار خیال کرتا ہے اور دوسرا نثر

میں۔ ہیروڈوٹس کی تصنیفات کو اگر منظوم کر دیا جائے تو بھی جس طرح وزن و بحر سے معرا صورت میں وہ تاریخ تھیں، اسی طرح وزن و بحر کے التزام کے باوجود وہ تاریخ کی ہی ایک صنف شمار ہوں گی۔ اصل فرق یہ ہے کہ مورخ صرف وہی باتیں لکھتا ہے جو ہو چکی ہیں اور شاعر ان باتوں کا ذکر کرتا ہے جو واقع ہو سکتی ہیں۔"

صحافی واقعات بیان کرتا ہے۔ وہ سچائی کا متلاشی ہوتا ہے لیکن واقعات اور سچائی کو خلق کرنا اس کے لیے ممکن نہیں ماورائے واقعات اور حقیقت کے بدلتے ہوئے تصور کے بجائے ان چیزوں کا مطلق تصور ہی اس کے پیش نظر ہوتا ہے۔ جدید مادہ پرست تہذیب نے واقعات اور حقیقت کے مطلق تصور کو جس طرح چکنا چور کیا ہے اس کا احساس بھی صحافت کے لیے بند کتاب کی مانند ہے۔ صحافت کی موجودہ قوت اور شہرت کے پیش نظر یہ بات کہنا بھڑوں کا چھتہ چھیڑنا ہے۔ لیکن نطشہ (Friederich Nietzsche) سے تو میں نے یہی سیکھا ہے کہ "سچائی نے آج تک کبھی مطلق کے بازوؤں کا سہارا نہیں لیا"۔ اور یہ کہ "ہر وہ چیز جس کو تخیل میں لایا جا سکتا ہے، اس کا سچ ہونا لازمی ہے۔"

اب تک کی بحث اور خصوصاً ارسطو کی منقولہ عبارت کی روشنی میں ادب، تاریخ اور صحافت کے امتیازات کو واضح شکل میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ارسطو چونکہ ادب عالیہ پر گفتگو کر رہا تھا لہٰذا اس کی مملکت میں تاریخ یا علمیاتی سطح پر اس کے مماثل اصناف نثر کے لئے بہت ہی کم جگہ تھی۔ آگے چل کر ادب کے متعلق ارسطو کے بیان کردہ معیارات کو تھوڑی ڈھیل دی گئی اور صحافی بھی ادیب کہے جانے لگے ہمارے زمانے میں محمد حسن عسکری جیسے خالص ادب کے پرستار نے بھی یہ بات کہی کہ:

"اب سے ڈیڑھ دو سو سال پہلے تک ادب اور صحافت کے درمیان کوئی حد فاصل نہ تھی۔ صحافت نگاروں کو بھی ادیبوں میں ہی شامل سمجھا جاتا تھا۔ ادیب روز مرہ کے مسائل پر لکھنے میں اپنی کسر شان نہ سمجھتے تھے۔ دوسری طرف صحافی لوگ اس احتیاط سے لکھتے تھے گویا ادب تخلیق کر

رہے ہوں، چنانچہ بہت سی چیزیں ہیں، جو صحافت کے خانے میں آتی ہیں لیکن ادب کا حصہ بن گئی ہیں۔ مثلاً آزادی رائے کے متعلق ملٹن کا پمفلٹ، یا سوفٹ کی سیاسی تحریریں۔''

غرض یہ کہ صحافت ادب کی کوئی باقاعدہ صنف نہیں البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ انفرادی طور پر اسالیب بیان کی وجہ سے کوئی صحافتی تحریر ادب کا درجہ حاصل کر لے۔

اردو کی حد تک یہ بات جن صحافتی تحریروں کے متعلق کہی جا سکتی ہے ان میں الہلال اور البلاغ کی وہ تحریریں بھی شامل ہیں جو مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے بہترین لمحات میں قلم بند کی ہیں۔ الہلال کے مقاصد کو واضح کرنے کے لیے اس کے پہلے ہی شمارے میں مولانا نے یہ عبارتیں لکھیں جو صحافتی طرز سے بہت بلند اور ادبی اظہار کے بہت قریب ہیں۔ انھوں نے لکھا:

''اگر خدا مجھ میں سچائی اور خلوص کی سرگرمی دیکھتا ہے، اگر اس کی ملت مرحومہ اور اس کے کلمۂ حق کی خدمت کی کوئی سچی تپش میرے دل میں موجود ہے، اور اگر واقعی اس کی راہ میں فدویت اور خود فراموشی کی ایک آگ ہے، جس میں برسوں سے بغیر دھوئیں کے جل رہا ہوں تو اپنے فضل ولطف سے مجھے اتنی مہلت عطا فرمائے کہ اپنے بعض مقاصد کے نتائج اپنے سامنے دیکھ سکوں لیکن اگر یہ میرے تمام کام محض ایک تجارتی کاروبار اور ایک دکان دارانہ شغل ہیں جس میں قومی خدمت اور ملت پرستی کے نام سے گرم بازاری پیدا کرنا چاہتا ہوں تو قبل اس کے کہ میں اپنی جگہ پر سنبھل سکوں، وہ میری عمر کا خاتمہ کر دے۔''

اس بیان کے علاوہ الہلال اور البلاغ میں مختلف موضوعات پر مولانا کی جو تحریریں ملتی ہیں ان کے ایک بڑے حصے پر ادبی اظہار غالب ہے۔ یہ اقتباسات دیکھیں:

''آہ کاش مجھے وہ صور قیامت ملتا جس کو میں لے کر پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر چڑھ جاتا۔ اس ایک صدائے رعد آسا غفلت شکن سے سر گشتگانِ خوابِ ذلت و رسوائی کو بیدار کرتا اور چیخ چیخ کر پکارتا کہ اٹھو!

کیونکہ بہت سو چکے اور بیدار ہو کیونکہ تمھارا خدا تمھیں بیدار کرنا چاہتا ہے۔ پھر تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ دنیا کو دیکھتے ہو پر اس کی نہیں سنتے جو تمھیں موت کی جگہ حیات، زوال کی جگہ عروج اور ذلت کی جگہ عزت بخشتا ہے۔

(الہلال 13 جولائی 1912)

''زمانے کے خیالات یکسر پلٹ گئے ہیں اور وقت کے طوفان نے بڑے بڑے محکم ستونوں کو بھی اپنی جگہ سے ہلا دیا ہے۔ جو لوگ پچھلی صحبتوں کے مشہور رکن سمجھے جاتے تھے اور کل تک اپنے گذشتہ اصولوں کا وعظ کر رہے تھے، انھوں نے بھی زمانے کا رنگ دیکھ کر بالآخر اپنی جگہ چھوڑی اور زیادہ نہیں تو نئے خیالات و عقائد کی طرف دو چار قدم تو ضرور بڑھ آئے، مگر تاہم لوگ دیکھ رہے ہیں کہ نواب صاحب ممدوح اپنے خیالات پر اسی استحکام و استواری سے قائم ہیں جس طرح گذشتہ عہد میں تھے۔''

''یقین کرو کہ جب حضرت (مسیح) نے بنی اسرائیل کی ذات و ہلاکت پر ماتم کیا تو شریعت موسوی کے احکام و اعمال کا بعینہ یہی حال تھا جو آج تم نے خدا کی شریعت کا بنا رکھا ہے۔ مسیح اگر ان فروسیوں اور صدوقیوں پر روتا تھا، جو گو بڑی بڑی آستینوں کے جبے پہنتے، ہر وقت دعائیں مانگتے، اور بڑی بڑی مہیب تسبیحیں اپنے ہاتھوں میں رکھتے تھے، پر شریعت کے حکموں کو انھوں نے مسخ اور اعمال صالحہ کو بے اثر کر دیا تھا، تو ہمیں بھی اپنے عالموں اور صوفیوں پر ماتم کرنا چاہیے جو ان کی طرح یہ سب کچھ کرتے ہیں پر انھیں کی طرح حقیقت سے بھی خالی ہیں۔''

''آئرش تحریک کے مشہور لیڈروں میں ایک جانباز شخص 'چارلس اسٹوارٹ پارنل'' تھا۔ آئرش تحریک کے تمام ہوا خواہوں میں اس کی پرستش کی جاتی تھی اور تمام قوم اس کی مطیع و منقاد تھی لیکن اس کے بعد کچھ ایسے واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے پارنل یکایک نظروں سے گر

گیا، اور خود اس نے بھی محسوس کیا کہ اس کی علمی قوت شکست کھا کے اسے چھوڑنا چاہتی ہے۔"

"یہ انقلاب جو ایک محبوب القلوب اور پر عظمت و رفعت زندگی میں ہوا۔ اور جس سے آفتاب شہرت کو عین نصف النہار کے وقت گہن لگ گیا، اس کی علت ایک عورت کی نگہ ساحر کی افسوں طرازی تھی، جس کے آگے آئرلینڈ کو استقلال دلانے والے دماغ نے اپنے تئیں بالکل بے دست و پا پایا، اور ہمت و عزائم کے جس تاج و تخت کو حکومت کی سطوت و ہیبت مرعوب نہیں کر سکتی تھی، وہ ایک متبسم چہرے، ایک شگفتہ چشم و ابرو، ایک پراز عشق نگہ ناز کے آگے اضطراب و تزلزل سے کانپنے لگا۔"

(الہلال، تبصرہ)

درج بالا اقتباسات کے اسالیب بیان نے اخباری طرز کو بالکل شکست دے دی ہے۔ ان بیانات کو اگر کسی افسانوی نثر کے درمیان رکھ دیا جائے تو معمولی نقاد تو خیر کیا چیز ہے تیز نظر اور نہایت محتاط نقاد بھی دھوکا کھا جائے گا۔

اخبار کی حیثیت سے الہلال اور البلاغ کی موجودہ عزت و شہرت کے پیش نظر ان کے بارے میں کوئی نئی بات کہنا خود کو خطرے میں ڈالنا ہے۔ نئی بات کہنے میں خوف تو ہے لیکن پٹے ہوئے میدانوں کی شہ سواری سے بہتر ہے کہ ہم یہ جوکھم مول لیں۔ مذکورہ دونوں اخباروں کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ یہ اخبار تو ہیں لیکن ان معنوں میں نہیں جن معنوں میں ہم معاصر اخباروں کا نام لیتے ہیں۔ جن چیزوں نے الہلال اور البلاغ کو اخبار کے مروجہ معنوں سے ممتاز کیا وہ مولانا اور ان کے چند ممتاز معاصرین کی تحریریں ہی تھیں۔ ان تحریروں کی موجودگی میں الہلال اور البلاغ کے لیے اخبار کے بجائے ایک رجحان ساز رسالے کی اصطلاح زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے۔ محمود الٰہی صاحب نے درست لکھا ہے کہ:

"الہلال ہفتہ وار اخبار نہیں تھا بلکہ یہ ایک جرنل تھا، جسے آسانی کے لئے مجلہ یا رسالہ کہہ لیجیے اور جرنل بھی وہ جس نے مغربی زبانوں کے معیار کو

مشعل راہ بنایا تھا۔ کسی جرنل میں عام طور پر ایسا مواد پیش کیا جاتا تھا جو ایک طرف تو علم و ادب کے تقاضوں کو پورا کرتا تھا اور دوسری طرف حیات شناسی اور کائنات کی گرہ کشائی کا محرک ثابت ہوتا تھا۔ مولانا آزاد نے بھی الہلال کے لیے یہی راہ اپنائی۔ اس میں تنوع تھا مگر تنوع کے نام پر سستا اور مبتذل مواد نہیں کھپایا جاتا تھا۔"

الہلال اور البلاغ میں مضامین کا تنوع اور تجربۂ حیات کی کثرت ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ سیاست سے چل کر فلسفے تک اور ادب سے لے کر تنقید و تبصرے تک ان کا سفر اس قدر طویل اور امکانات سے پر ہے کہ ہمیں رشک آتا ہے۔

قومیت کا تصور ہو یا سیکولرزم کا فروغ، روشن فکری کی بات ہو یا مذہبی مسائل، آزادی کا مطالبہ ہو یا سماجی اور سیاسی تقاضوں کا بیان الہلال اور البلاغ کسی چیز میں بند نہیں تھے۔ ان دونوں جریدوں نے اردو صحافت کو اتنی ترقی دی کہ اس کے آگے سوچنا محال ہو گیا۔ صحافت کو الہلال اور البلاغ نے جس مقام تک پہنچایا اس کو نظر میں رکھیں تو معاصر اردو صحافت کے زوال اور نام نہاد صحافیوں کی ذہنی پسماندگی کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اخبار نور افشاں پر ایک نظر

ڈاکٹر سہیل عباس

Abstract: Nur-i-Afshan was a multifacted newspaper of nineteenth century published by the Prebyterian Mission in Punjab, in Urdu , from 1877 to 1966 and carried local and international news summaries, government postings, commodity prices, and advertisements, but also opinion articles, essays, proverbs, and religious poems.

اخبار نور افشاں تقسیم ہند سے قبل شائع ہونے والے اخبارات میں سے ایک تھا۔ یہ اخبار بنیادی طور پر عیسائیت کی تبلیغ کے لیے تھا، لیکن اس میں سیاسی مباحث مثلاً خلافت عثمانیہ کا خاتمہ، پہلی جنگ عظیم، مذہبی مباحث میں عیسائیت کے ساتھ ساتھ احمدیت بھی شامل تھی۔ اس میں انتظامی امور کی بھی خبریں تھی، اور ادبی شذرات بھی تھے۔ برٹش لائبریری نے اسے EAP 660[1] کے تحت برقی کتب میں محفوظ کیا ہے، اس کے دو شمارے البتہ دستیاب نہیں ہیں۔

(1) جولائی 1911، جلد 39 نمبر 29، (2) جولائی 1911، جلد 39 نمبر 30۔ دستیاب شماروں کی تعداد

(3045) اور صفحات (21361) ہے۔ نور افشاں کا مطالعہ نہ صرف انیسویں صدی کی صحافت میں مفید ہے بلکہ اس سے نوآبادیات کی تفہیم میں بھی مدد ملتی ہے۔ سب سے پہلے ہم اس کے اغراض و مقاصد کا جائزہ لیتے ہیں۔

نور افشاں کا پہلا شمارہ، جلد 1، مارچ 1873 میں شائع ہوا اور آخری دستیاب پرچہ دسمبر 1945، جلد 73 شمارہ 25 ہے۔ پہلا پرچہ لدھیانہ سے 6 مارچ 1873 میں شائع ہوا اور اس کی قیمت [illegible] تھی۔ یہ شمارہ چار صفحات پر مشتمل تھا۔ پہلے صفحے پر ایک اشتہار بعنوان "اعلان اخبار نور افشاں" تھا۔ اس کے مندرجات درج ذیل ہیں:

"امرائے نامدار اور روسائے عالی دیار و امصار پر ظاہر و باہر ہو کہ ملک ہندوستان جب سے زیر دست حکومت سرکار نامدار انگلشیہ ہوا ہے تب سے ہنوز اخبارات کی ترقی دن بدن کثرت پر ہے اگرچہ وہ کثرت اس قدر بے شمار ہے کہ حد بیان سے باہر ہو مگر تاہم بھی اُس کا بیان طوالت رکھتا ہے علاوہ انگریزی اخباروں کے اردو زبان کے بھی اخبار بہت طبع ہو کر شائع ہوتے ہیں کہ جن میں مضامین رنگین مختلف اور خبریں بنظر فوائد علوم درج ہوتے ہیں اور ترغیب تہذیب الاخلاق اور فوائد علوم و فنون اور ترقیات تجارت و زراعت اور ترمیم رسومات دینی و دنیوی اور تعلیم نسواں و اطفال اور حرفت کاری و حکمت اور خوشنودی حکام و بہبودی رعایا اور انتظام ملکی و استقامت ریاست و آسودگی معاش و آسایش خانگی وغیرہ کے باب میں تذکرہ ہوتا ہے کہ جسے ایک عالم کو فیض پہنچتا ہے اور اُن اخبارات کے صاحب مہتمم اور صاحب اڈیٹر کمال دانائی کو کام فرما کر اپنے اپنے رسالے روشن سے مشاہیر عام کی طرح خاص و عام کو صلاح دیتے ہیں اگرچہ اُن اخبارات کے آگے اور کسی نئے اخبار کا فروغ پانا سورج کو چراغ دکھانا ہے اور اُن کے خیالات متین کے روبرو ایک طرح کی خفت اٹھانا ہے لیکن [illegible] کی توجہات اور برقی الات سے کیا بعید ہے کہ یہ اخبار اور [illegible]

اقتباس حاصل کر کے اپنے میں روشنی پیدا کرے اور اُس روشنی کی تجلیات کا مطلع انوار ہو جائے۔ لہذا اس غرض سے صاحب مہتمم اخبار نے ایک اخبار الموسوم اخبار نور افشاں اجرا کیا ہے کہ جس میں ہر ایک معاملہ کا تذکرہ بلا تعصب و طرف داری بیان ہوگا اور بایں ہمہ قیمت بنظر کفایت خریداروں کی طرف ایک آنہ ماہیانہ مقرر ہے کیونکہ اکثر غریب و غربا جو شائقین اخبارات ہیں اور باعث گرانی قیمت کے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہتے ہیں اور اخبار کے سیر و مطالعہ سے محروم۔ مگر یہ اخبار ہفتہ میں ایک بار شائع ہوگا اور ہر ایک صاحب مہتمم اخبار کی خدمت عالی درجت میں التماس ہے کہ وہ از راہ توجہات دوستانہ اس اشتہار و اعلان کو اپنے اپنے اخبار مطلع انوار کے کسی گوشے میں جگہ دلائیں، اور صاحب مہتمم کو اپنا اپنا مرہون و احسان فرمائیں۔ العبد۔ صاحب مہتمم اخبار نور افشاں مشن پریس، لودیانہ۔"[2]

پہلے اکیس شمارے چار صفحات پر مشتمل تھے، بائیسویں شمارے سے ضخامت آٹھ صفحات کر دی گئی، لیکن قیمت وہی تین پائی رہی۔ تیئیسواں شمارہ چھ صفحات پر مشتمل تھا۔ چوبیسواں پھر چار۔ اسی طرح کئی بار صفحات کی تعداد بیس تک جا پہنچتی تھی اور اکثر چار صفحات کے ضمیمے بھی شائع ہوتے تھے جن میں سے بعض انگریزی اور بعض اردو زبان میں ہوتے تھے۔ وقت کے ساتھ جوں جوں صفحات بڑھتے گئے قیمت بھی بڑھتی گئی، 1944 میں اس اخبار کی قیمت دو روپے تھی۔

نور افشاں میں "ایڈیٹوریل" کے عنوان سے اداریہ بھی لکھا جاتا تھا۔ 22 دسمبر 1927 کا اداریہ کرسمس کے حوالے سے تھا۔ اس کا عنوان تھا "بڑا دن مبارک ہو"۔[3]

نور افشاں میں اعراب کا بھی اہتمام کیا جاتا تھا، خصوصاً تراکیب کے استعمال میں۔ انگریزی ناموں کے صحیح تلفظ کے لیے قوسین میں انگریزی میں لکھا جاتا تھا۔ مثلاً "سوویٹ اخبار (IZVESTIA) نے اعلان کرتے ہوئے کہا ہے....."۔ اس لیے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں املا اور تلفظ کا ایک خاص اہتمام ملتا ہے جو آج کی اردو صحافت میں ناپید ہے۔[4]

اس اخبار کی زبان میں فارسیت زیادہ ہے نیز قوافی کا التزام بھی ملتا ہے۔ برکات حکومت انگلشیہ تو بہت سوں نے بیان کی ہیں، یہ اخبار بھی انگریزوں کی وکالت میں کم نہیں تھا، ایک مثنوی ملاحظہ ہو:

سب اہل ہند کو اس بات کی شکایت ہے — کہ یورپین کی کیوں ہم پہ کم عنایت ہے
جو بے غرض بھی کوئی اُن سے ملنے جاتا ہے — تو روکھی باتوں سے لب خشک ہوکر آتا ہے
سب اہل ہند جو شاکی ہیں اس رکاوٹ کے — تو دل میں سوچتے ہیں سب سبب ملاوٹ کے
پتہ جو اُن کے تنفر کا کچھ نہیں لگتا — تو وہم ہوتے ہیں دل میں ہزار ہا پیدا
کوئی کہے ہے کہ ہم کالے لوگ ہیں محکوم — ہماری ہستی ہے گوروں کی آنکھ میں معدوم
وہ کالا آدمی کہہ کر پکارتے ہیں ہمیں — ہر ایک بات میں تند ہو کے جھاڑتے ہیں ہمیں
کوئی کہے ہے کہ بولی ہماری ہندی ہے — عجب نہیں کہ یہی وجہ ناپسندی ہے
جو لوگ کرتے ہیں انگریزی پڑھ کے کچھ گٹ پٹ — سو بیٹھ رہتے ہیں آخر کو وہ بھی کچھ ہٹ ہٹ
بغور دیکھا تو آخر یہی نظر آیا — کہ دراصل یہی شاید سبب ہے نفرت کا
بدون میم کے مجلس میں اور خلوت میں — اکیلے رہتے نہیں ہیں کسی وہ حالت میں
جو ایسے فرقہ عادت سے ہوں جدا یارو — اسی سبب سے نہیں غیر پر پیار اُن کو
وہ اپنے آپ میں پورا تو رکھتے ہیں اخلاق — ادھورے لوگوں پہ فرمائیں کس طرح اشفاق
کم التفاتی کا شکوہ اُن سے بے جا ہے — کہ وہ ہیں ایک طرف اک طرف اکیلا ہے
جو خلط ملط رکھا چاہیں لوگ اُن کے ساتھ — تو لازم ہے کہ وہ ہم کو لے کے آئیں ساتھ
تو پھر وہ دیکھیں کہ کیسی عنایت ہو اُن پر — ہر ایک بات میں ظاہر حمایت ہو اُن پر [5]

ظاہر ہے ایسا ہونا ممکن نہیں یہ دو تہذیبوں کا فرق ہے جسے مٹایا نہیں جاسکتا، اور یہ ویسے بھی ''نوآبادیات'' کے حوالے سے ایک الگ موضوع ہے کہ مغربی تہذیب کے کتنے اثرات مشرقی تہذیب پر پڑے۔

نور افشاں کے موضوعات:

نور افشاں میں کتابوں پر تبصرہ بھی کیا جاتا تھا۔ مثلاً ڈبلیو۔ ایم رائبرن، ایم، اے کی کتاب ''مسیح اور انسان'' کا تبصرے کا ایک ٹکڑا ملاحظہ فرمائیں اس کی زبان میں عربی و فارسی الفاظ کا استعمال عام اخباری زبان سے بالکل مختلف ہے:

> ''یہ واقعہ ہے کہ مضامین کتاب ہذا اپنی نوعیت میں معرفت خیز اور حقیقت بیز ہیں۔ مؤلف نے ان مضامین بائبل کو جو انسانی ذہنیت سے بلحاظ مفہوم وحقیقت غیر قریب تھے اپنی قابلیت کی بنا پر اور بہ امداد خداوند انسانی تفہیم و تفاہم کے لیے قریب تر کر دیا ہے۔ مسائل الٰہیات جو بائبل میں بصورت استعارہ و بشکل ایما تھے ان کی تفسیر عام فہم زبان میں اس خوش اسلوبی کے ساتھ کی ہے جس سے مفہوم کلام جو ضمناً کتاب مقدس سے تصور ہو سکتا تھا صحیح طور پر صفحۂ حقیقت پر واضح ہو گیا ہے۔''[6]

اس اخبار میں بھی اشتہارات دیئے جاتے تھے، ایک اشتہار کے مشمولات ملاحظہ ہوں۔

ہماری تازہ ترین مطبوعات: ذیل کی نادر الوجود اور عالمانہ کتب حال ہی میں چھپی ہیں، ہمیں یقین ہے کہ ذوق مطالعہ اور معلومات کے لیے یہ کتابیں بیش بہا ثابت ہوں گی۔ مسیحی علوم پر اگر عبور حاصل کرنا ہو تو ان کتابوں کو منگوا کر خود بہرہ انداز ہو جیے اور اپنے دوستوں اور غیر مسیحیوں کو ان سے متمتع کیجیے۔

بقائے روح: از مولٰنا پادری سلطان محمد صاحب پال پروفیسر ایف۔ سی کالج لاہور۔ کتاب ہذا میں روح کے معاملہ پر ایک نہایت ہی جامع اور بسیط بحث کی گئی ہے۔ اس کا اندازہ مطالعہ سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ ص: 152۔

بہترین مسیحی گھر: مصنفہ بیگم ایف۔ ڈی وارث صاحب۔ جتنے مسیحی ریویو مسیحی جرائد میں شاید اس کتاب پر لکھے گئے ہیں۔ کم ہی اور کتابوں کے حصے میں آئے ہیں۔ اگر ازدواجی اور خانگی زندگی کو مسیحی معیار کے مطابق قائم رکھنا مقصود ہو تو اس کتاب کو پڑھیے اور عمل کرنے کی

کوششیں کیجیے۔

کتاب مقدس کا مسلسل بیان: مصنفہ پادری چارلس فوسٹر صاحب۔ (پیدائش سے لے کر مکاشفہ تک) بائبل مقدس کو جاننے کے لیے اس کتاب کی رہنمائی ضروری ہے، 576 صفحات کی ضخیم کتاب ہے۔

بن حور: پبلک کے اصرار پر اسے دوسری مرتبہ چھپوایا گیا ہے۔ اس میں جس انداز میں حضور پرنور جناب خداوند کے سوانح حیات ہیں وہ بہت ہی دلفریب ہے۔ صفحات 376۔ لکھائی چھپائی دلفریب۔

ان کے علاوہ کلیسائے عربستان کی تاریخ۔ کلیسا کے نورتن۔ دہان شیر۔ شہیدان کا رتھیج زیر طبع ہیں۔ جو بجلد پبلک کی خدمت میں پیش کی جائیں گی۔ پروفیسر علامہ لطفی لیونان کے ٹریکٹ عالمانہ عرق ریزی کا نتیجہ ہیں۔ ہر پڑھے لکھے مسیحی کا فرض ہے کہ ان ٹریکٹوں کے ذریعے اپنی معلومات بڑھا کر غیر مسیحیوں میں خداوند کی بادشاہت کی توسیع کے لیے کوشاں ہو۔ ان کی قیمت صرف ایک ٹریکٹ ہے۔ اور دینی معلومات کا سب سے عمدہ آلہ ہیں۔ اس کے علاوہ غیر مسیحیوں میں بشارت کے لیے ہمارے اپنے تیار کردہ بہترین پوسٹر ہیں۔ ہماری تازہ ترین فہرست طلب کر کے ہم سے کتابیں منگوایئے۔ السٹمر سیکرٹری پنجاب ریلجس بک سوسائٹی انارکلی لاہور۔[7]

دیکھا جائے تو یہ اشتہار صرف کتابوں کے ناموں پر ہی مشتمل نہیں بلکہ ان پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ ان کتابوں کی قیمتیں بھی درج کی گئی ہیں۔

ایک گوشہ مراسلات کا بھی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے اس اخبار میں شائع ہونے والی عیسائی تبلیغ کے لیے اسلامی اصطلاحات کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک مراسلہ کا عنوان ہے "میلاد شریف"۔ عبارت آرائی ملاحظہ ہو:

> "اب دیکھیے کہ ہم بڑے دن کی صبح کیا کیا کرتے ہیں۔ صبح ہی لوگوں کے گھروں میں مختلف چیزیں نوکروں کے ہاتھ یا ڈاکیہ کے ساتھ بڑے دن کا پارسل یا بڑے دن کا کارڈ مبارکبادی لفافوں میں بھیجتے ہیں۔ اور بہت سے لوگ صبح ہی اپنے جگہ کے لوگوں کو مختلف چیزیں دیتے اور ہندو اپنے

اپنے سرکاری افسروں کو نذر و تحائف دیتے ہیں۔ اور پھر لوگ نہا دھو کر بڑے دن کے طرح طرح کے لذیذ کھانے کھا کر جن کو ناظرین سب سمجھتے ہیں، مثلاً کیک۔ مٹھائی۔ پلاؤ۔ قورمائی وغیرہ وغیرہ اڑا کر کوئی دس گیارہ بجے بڑے دن کی تیاری کرتے ہیں اور وہاں عجیب طرح طرح کی صورتیں اور خاکی مورتیں گوناگوں رنگوں کے لباس میں خداوند تعالیٰ کی حمد میں تیار ہوتی ہیں۔ غرضیکہ سال بھر کی کمائی ایک غریب سے غریب عیسائی اسی خوشی کے موقع پر لگا دیتا ہے۔ خیر جو کچھ ہو سنجیدگی کے ساتھ اس کے جلال کے لئے ہوتا۔ اس کی خوشی پورے طور سے منائی جاوے۔ صرف ان چند سطور پر اکتفا کرتا ہوں۔ کیونکہ دیگر اصحاب نے بھی رنگین اور مقفیٰ عبارتوں سے میلاد شریف پر کالم مرصع کیے ہیں۔ فقط۔"[8]

مقامی خبروں کے لیے گلدستہ اخبار اور عالمی خبروں کے لیے تار و برقیات کے نام سے گوشے ہیں۔

عالمی خبروں میں تاریخوں کے اندراج کی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً جاپان میں کاگوشیرا (Kagoshima) کے مقام پر 12 رجنوری 1914 صبح نو بج کر اٹھائیس منٹ پر چھ اعشاریہ سات شدت کے زلزلے کی خبر یوں بیان کی گئی ہے۔

"13 رجنوری کاگوشیما (جاپان) جزیرہ ساکر شیما میں سنیچر میں سنیچر کے روز سے ساٹھ زلزلے واقع ہو چکے ہیں اور ہر روز ہیبت ناک طور پر مختلف مقامات میں زمین پھوٹتی رہی۔ ایک گاؤں تو بالکل تباہ ہو گیا ہے۔ اور دیگر دس کی بابت احتمال ہے کہ وہ بھی برباد ہو گئے ہیں۔ شعلہ زن لاوا شہر کاگوشیما تک پہنچ گیا ہے۔ حالت بہت ہی خطرناک ہے اور نقصان بے قیاس ہو گیا ہے۔ اور جاپانی دخانی جہاز بڑی سرعت کے ساتھ رقبات متاثرہ کو روانہ ہو گئے ہیں۔ 13 رجنوری ٹوکیو ساکر شیما میں جو ابھار اؤ ظہور میں آیا ہے اس میں سے بڑے بڑے پتھر نکل کر 20-30 میل کے فاصلے پر

جا پڑے ہیں۔ سارا جزیرہ جل اٹھا ہے۔ کاگوشیما سے ۷۰ ہزار آدمی بھاگ گئے ہیں۔ مگر صرف محکمہ تار برقی ہی وہاں باقی ہے۔ سارا شہر لاوا کی راکھ سے ڈھپا پڑا ہے۔ ابھی تک معلوم نہیں کہ کس قدر جانیں ہلاک ہو چکی ہیں۔ اس پر اضافہ اور ہوا کہ کاگوشیما میں بحری مد کی ایک ایک روز نے آکر اور غضب ڈھایا۔ جس کے سبب سے اس شہر میں مال و جان کا سخت نقصان ہو گیا ہے۔"[9]

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کی کوریج بھی اس اخبار میں بھرپور انداز میں کی گئی ہے۔

اس اخبار میں سروے بھی ملتے ہیں۔ اگرچہ یہ سروے مردم شماری کی بنیاد پر ہوتے تھے۔ مثلاً ایک سروے ملاحظہ ہو۔ عنوان ہے "ہندوستان میں خواندہ مستورات" اور مندرجات یہ ہیں۔

وہ بھی دن تھا کہ لکھنا پڑھنا مستورات کے لیے معیوب اور مضر سمجھا جاتا تھا۔ اور ہندو مسلمان اس نیک کام پر عمل پیرا ہونے سے احتراز کرتے تھے۔ مگر جہاں شکر کا مقام ہے کہ یہ احتراز دن بدن دور ہوتا جا رہا ہے اور ان کا رجحان تعلیم النسواں کی جانب بڑھ رہا ہے۔ وہاں افسوس بھی ہے کہ اس مرحلہ میں ترقی بہت ہی کم ہے۔ چنانچہ گذشتہ مردم شماری کے رو سے خواندہ مستورات کی تعداد فی ہزار حسب ذیل ہے۔

	کل	صوبہ کی زبان	دیگر زبانیں	انگریزی
عیسائی	125	74	615	۔
بودھ	42	42	۔	۔
جین	18	17	1	۔
سکھ	7	7	۔	۔
ہندو	5	4	1	۔
مسلمان	3	2	1	دیگر

شکر اور خوشی کی بات ہے کہ مسیحی مستورات کی تعداد نسبتاً بہت افزا ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ ابھی

تک تسلی بخش حالت نہیں ہے۔ ہزار پیچھے 125 کی کیا حقیقت ہے۔ مسیحیوں کو اس طرف زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ کیونکہ مستورات ہی قوم اور مذہب اور گھر اور مجلس کی ترقی کی جان ہیں۔[10]

ادبی طور پر بھی اس اخبار کی بڑی خدمات ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے اس اخبار میں ان مقامی عیسائی شاعروں کا کلام ملتا ہے جن کا ابھی تک کوئی تذکرہ شائع نہیں ہوا۔ یہ کلام مختلف صورتوں میں بکھرا ہوا ہے۔ اس کے لیے ایک گوشۂ شعر و سخن کے نام سے بھی اس اخبار میں وقف ہے۔ واضح ہو کہ زیادہ تر کلام مذہبی ہے، جو عیسائیت سے متعلق ہے۔

''ضرورت'' کے اشتہارات بھی شائع کیے جاتے تھے۔ ان اشتہارات میں بھی عیسائیوں کی برتری کا احساس ہوتا ہے۔ لگتا ہے انگریزی دور میں مقامی عیسائی ہندوؤں اور مسلمانوں سے خود کو برتر سمجھتے تھے۔ اشتہار ملاحظہ ہو۔

> ''کوئٹہ میں پرائمری اسکول کے واسطے ایک مسیحی اردو مڈل پاس کی ضرورت ہے جو اچھوت ذات کے لوگوں میں کام کرنے میں رضامند ہووے اور تجربہ کار ہو۔ مع سرٹیفکیٹ ذیل کے پتہ سے خط و کتابت کرے۔ منیجر نور افشاں۔ لودیانہ''۔

مجموعی طور پر یہ اخبار نہ صرف ادبی زبان کا مجموعہ ہے بلکہ اردو کی عیسائی مذہبی شاعری کے ایک غیر مرتب تذکرے کا اہم ماخذ بھی ہے، اس اخبار میں توریت کا منظوم ترجمہ بھی چھپا تھا جو منشی اشرف علی اشرف نے کیا تھا۔ یہ اخبار محققین کو دعوت فکر دے رہا ہے۔[11]

ذیل میں کچھ کلام بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے، کلام چونکہ تمام نور افشاں سے لیا گیا ہے، اس لیے حوالے کے لیے قوسین میں جلد، شمارہ اور سنہ دیا جا رہا ہے:

(بی۔ ان) ایک نیا مسیحی گیت ہندوستانی راگ پر (نظم) (3۔16۔اپریل 1875)

(منشی حسن علی سفیر نصیر آباد) غنچۂ لب بستہ دل کا دانہ یہاں اک دم رہا گلشن گیتی میں ہر دم خوف خار غم رہا (غزل) (4۔14۔اپریل 1876)

(جیمس امریل گل، روڑکی) تو گر شکل اپنی دکھاتا رہے گا: تو دل کو مرے صبر آتا رہے گا

(غزل)(4-16-اپریل1876)

(رحمت مسیح ،امرتسر) ہمارا دوست ہے عرش بریں پر: وہ آ کر تھا بنا خاکی زمیں پر)
(غزل)(4-17-اپریل1876)

(جیمس امریل گل،روڑکی)نہیں پیدا ہوا عالم میں کوئی اس کا ثانی ہے: میرا سونس میرا ہمدم میرا وہ یار جانی ہے(غزل)(5-14-اپریل1877)

(جیمس امریل گل،روڑکی)اس شعلہ رو کی شکل پہ جلوہ الٰہی ہے: پروانہ اس کے حسن کی ساری خدائی ہے(غزل)(5-15-اپریل1877)

(جیمس امریل گل،روڑکی)خدا کی ازلیت وابدیت (نظم)(5-15-اپریل1877)

(جیمس امریل گل،روڑکی)خار دل پر تیری فرقت کا کھٹکتا جائے گا: تجھ بغیر از اے مسیحا جی بھٹکتا جائے گا(غزل)(5-16-اپریل1877)

(جیمس امریل گل،روڑکی)دل تو کیا جاں تک بھی تجھ کو اے صنم دے دیں گے ہم: شوق سے لیجے بلا دام و درم دے دیں گے ہم(غزل)(5-16-اپریل1877)

(جیمس امریل گل،روڑکی)کیا جس پر نثار اے دل یہ ہم نے تن بدن اپنا: وہی ہے محرم راز نہاں غنچہ دہن اپنا(غزل)(5-17-اپریل1877)

(ایس-ایف-سوانٹری تخلص صابر،نصیر آباد ملک راجپوتانہ)جوانو دلاورا ب ہو شادماں: مقید ہوا دشمن مرد ماں(غزل)(5-17-اپریل1877)

(منشی حسن علی سفیر،نصیر آباد)رخ عینی کا میسر جو نظارہ ہو جائے: رشکِ صد مہر ہر اک عرش کا تارا ہو جائے(غزل)(6-14-اپریل1878)

(جیمس امریل گل،روڑکی)امیر انہ اجل کو پہنچی بوے جانفزا کیسی: گل روح خزاں دیدہ کو ہے جیسے فزا کیسی(مخمس)(6-15-اپریل1878)

(منشی حسن علی سفیر نصیر آباد) سلامی کو دنیا میں کیا چاہیے: بس اک مدح عیسیٰ کیا چاہیے (سلام) (6-17-اپریل 1878)

(جیمس امریل گل، روڑکی) رخ عیسیٰ کا میسر جو نظارا ہو جائے: مشکل آسان ہو سب کام ہمارا ہو جائے (غزل) (6-17-اپریل 1878)

(جیمس امریل گل، روڑکی) خیال (نظم) (7-15-اپریل 1879)

(جیمس امریل گل، روڑکی) تبتل کی ہے بے شبہ ہر اک پاک عبارت: بے جس کے تلاوت نہیں مقبول عبادت (غزل) (7-16-اپریل 1879)

(جیمس امریل گل، روڑکی) ہے خطا اپنی ہی اے دل یہ سزا کا باعث: کچھ نہیں اور ہے خفگی خدا کا باعث (غزل) (7-17-اپریل 1879)

(جیمس امریل گل، روڑکی) ہے تر و تازہ ہر یک گل سبز ہے ہر گل کی شاخ: غنچۂ دل تنگ بلبل کا نہ ہو کیونکر فراخ (طرحی غزل) (7-17-اپریل 1879)

(جیمس امریل گل، روڑکی) جب کرے لب بستہ گل باد صبا چل کر فراخ: غنچۂ دل تنگ بلبل کا نہ ہو کیونکر فراخ (طرحی غزل) (7-17-اپریل 1879)

(منشی اشرف علی اشرف) کیا روشنی کو اندھیرے سے دور: اسی دم ہویدا ہوا تیرا نور (توریت کا منظوم ترجمہ، باب اول) (8-18-1880)

(جیمس امریل گل، روڑکی) ہو چکا ہم کو ہر یک طرح سے بس یہ تحقیق: نہیں جز نام خدا کوئی یہاں اور شفیق (غزل) (8-15-اپریل 1880)

(جیمس امریل گل، روڑکی) حال دل آپ پہ عیسیٰ ہے سب عیاں مشتاق: راز تم سے ہے مسیحا نہ کچھ نہاں مشتاق (غزل) (8-15-اپریل 1880)

(منشی اشرف علی اشرف) خدایا تو ہے پاک پروردگار: ہر ایک امر میں تجھ کو ہے اختیار (توریت کا

منظوم ترجمہ، باب اول)(8-16-اپریل 1880)

(جیمس امریل گل، روڑکی) یاد حق کر لے کوئی دم ورنہ پھر پچھتائے گا: تو مسافر ہے یہاں آخر سفر کر جائے گا(9-14-اپریل 1881)

(جیمس امریل گل، روڑکی) بچن بھاگن کی لے میں (نظم)(9-14-اپریل 1881)

(منشی حسن علی سفیر، نصیر آباد) مسیحا میں جس کو خدا مل گیا: سلامی ہر اک مد عا مل گیا (سلام) (9-15-اپریل 1881)

(جیمس امریل گل، روڑکی) رخصت سرا سے ہو جو ہم اپنے مکاں چلے: ہمراہ سب عزیز بھی کرتے فغاں چلے (غزل)(9-16-اپریل 1881)

حوالہ جات

1- http://cap.bl.uk/database/results.a4d?projID=EAP660

2- نور افشاں، جلد ۱، شمارہ ۱، مارچ 1873، ص: 1-2

3- نور افشاں، جلد 73، شمارہ 25، دسمبر 1924، ص: 2

4- نور افشاں، جلد 73، شمارہ 25، دسمبر 1924، ص: 2

5- نور افشاں، جلد ۱، شمارہ ۱، مارچ 1873، ص: 3

6- نور افشاں، جلد 73، شمارہ 25، دسمبر 1924، ص: 2

7- نور افشاں، جلد 73، شمارہ 24، یکم دسمبر 1944

8- نور افشاں، جلد 41، شمارہ 52، 26 نومبر 1914

9- نور افشاں، جلد 42، شمارہ 3، 16 جنوری 1914

10- نور افشاں، جلد 42، شمارہ 8، 20 فروری 1914

11- نور افشاں، جلد 42، شمارہ 10، 6 مارچ 1914

اُردو کے دو عہد ساز ادبی جرائد
'ادبِ لطیف' (لاہور) 'شاعر' (ممبئی)

احمد سہیل

اردو کے ادبی و علمی جرائد کی صحافت کوئی سوا سو سال پرانی ہے۔ کچھ ادبی جرائد تو اردو کی تاریخ میں ایک دستاویز کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے علمی، ادبی، تنقیدی مضامین، مباحث اور نئی فکر اور تراجم سے اردو کے کئی جرائد کو شناخت و پہچان ملی۔ اردو کے ادبی جرائد میں شائع ہونا ادبا و شعرا کے لیے عزت و منزلت کی بات ہوا کرتی تھی اور ایک زمانے میں مدیر صاحبان کا درجہ ''استاد'' کا ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنے جرائد میں کمزور تحریروں کو شائع نہیں کرتے تھے۔ اب بھی ادبی جرائد اور کتابی سلسلے چھپتے ہیں مگر اب ان کی مانگ کم ہے۔ ان میں شائع ہونے والی بے مزہ اور بے رنگ تحریروں کی اب وہ وقعت نہیں جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ شاید اس کا سبب انسان کا معاشرتی اور معاشی سرگرمیوں میں مصروف ہو جانا ہے جس کی وجہ سے علم و ادب کی اہمیت کم ہو گئی اور برقیاتی میڈیا کے مشاغل زیادہ بڑھ گئے ہیں۔

میں آج اردو کے دو تاریخ ساز ادبی جرائد پر بات کروں گا جو ایک عرصے سے چھپ

رہے ہیں جن میں اردو کے تقریباً سب ہی معتبر اور تاریخ ساز ادبا و شعرا شائع ہوتے رہے اور ان جرائد نے اردو زبان و ادب کی آبیاری کی اور نئے رجحانات سے روشناس بھی کروایا، نئی مباحث کیں، نئی نسل کی تربیت کرتے ہوئے اردو جیسی نوخیز زبان کو عالمی سطح پر لا کھڑا کیا۔ عموماً جب مدیر کا انتقال ہو جاتا ہے تو رسائل بند ہو جاتے ہیں یا معاشی مسئلے کے سبب ان کی اشاعت روکنی پڑتی ہے۔ مگر دیکھا گیا ہے کہ مدیران کے خاندان کے لوگ ہی جرائد کو بند ہونے نہیں دیتے اور اپنے خاندان کی اس ادبی روایت کو ٹوٹنے نہیں دیتے۔

اردو میں ادبی رسائل و جرائد اور ادبی صحافت کی ابتدا سرسید احمد خاں کے ''تہذیب الاخلاق'' سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد لکھنؤ سے عبدالحلیم شرر نے جنوری 1887 میں ''دل گداز'' کا سولہ صفحات کو پہلا شمارہ جاری کیا۔ جب شرر ملازمت کے سلسلے میں حیدرآباد (دکن) پہنچے تو رسالے کو وہاں اپنے ساتھ لے گئے۔ مگر وہاں پابندی سے شائع نہیں ہوتا تھا۔ جب شرر لکھنؤ واپس آئے تو یہ لکھنؤ سے چھپنے لگا۔ پھر دسمبر 1926 میں یہ پرچہ بند ہو گیا۔ پھر ایک عرصے تک اورنگ آباد سے چھپا۔ اردو کا پہلا ادبی جریدہ ''گلدستہ'' انیسویں صدی کی پچاسویں دہائی میں مولوی کریم الدین پانی پتی نے شائع کیا۔

''ادب لطیف'' لاہور اور ''شاعر'' ممبئی اردو کے سب سے پرانے جرائد ہیں جو قریب اسی سال سے شائع ہو رہے ہیں اور اردو کی چار نسلیں ان سے مستفید ہوتی رہیں اور جو اس میں چھپا وہ اردو کی تاریخ میں اپنا کام اور نام تاریخ میں درج کروا گیا۔ 1947 میں تقسیم ہند کے بعد بھی یہ وہ بڑے ادبی رسائل ہیں جو آج بھی اپنی آب و تاب کے ساتھ پابندی سے شائع ہو رہے ہیں۔ ان دونوں ادبی رسائل کی عمر تقریباً ایک جیسی ہی ہے۔ یہ اب بھی چھپتے ہیں، لوگ ان کو پڑھتے ہیں جس میں ناسٹلجیاتی جمالیات بھی ہے۔ ان دونوں رسائل کے لکھنے والوں کی کئی نسلیں آئیں اور دنیا سے چلی گئیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں کئی جغرافیائی اور معاشرتی تبدیلیاں آئیں، لوگوں کے مزاج اور سوچوں میں بھی تبدیلی آئی مگر یہ دونوں رسائل اپنی روایت کے ساتھ نئی ہواؤں کو خوش آمدید کہتے رہے اور آج بھی اردو کی دنیائے ادب ان دونوں جرائد کی خوشبو سے معطر ہے۔

''ادب لطیف'' 1935 سے شائع ہونے والا ایک ایسا جریدہ ہے جو آج بھی مسلسل

شائع ہو رہا ہے اور اس کے قاری اس کا بے چینی سے انتظار کرتے ہیں۔ اس پرچے کو پڑھ کر اردو کی عصری رفتار کا پتہ بھی چلتا ہے اور نئے لکھنے والوں کو بڑی فراخ دلی کے ساتھ ان میں شائع کیا جاتا ہے۔ آج کل صدیقہ بیگم اور ان کے صاحبزادے محمد خالد چودھری کے ہاتھوں میں ''ادب لطیف'' کی عنانِ ادارت ہے اور یہ پرچہ بڑی آب و تاب سے نکال رہے ہیں۔ ''ادب لطیف'' کو صدیقہ بیگم کے والد صاحب چودھری برکت علی (1902-1952) نے شائع کیا۔ انھوں نے 1929 میں لاہور میں نصابی کتابیں چھاپنے کا ایک ادارہ ''پنجاب بک ڈپو'' کے نام سے کھولا۔ چودھری برکت علی نے اپنے ادارے میں ایک چھوٹا سا کتب خانہ بنا رکھا تھا، جہاں عام لوگ آتے اور کتابوں کا مطالعہ کرتے اور کتابیں پڑھنے کو اپنے گھر بھی لے جاتے تھے۔ ''خون بہا'' کے مصنف حکیم شجاع نے ایک دن باتوں باتوں میں انھیں ایک ادبی رسالہ جاری کرنے کو کہا۔ پہلے تو چودھری برکت علی کچھ نہ بولے اور بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر کچھ دن بعد حکیم شجاع کے ساتھ صلاح مشورے کے بعد رسالے کا نام ''ادب لطیف'' تجویز کیا گیا۔ سب نے اس نام کو پسند کیا تعاون کا بھی یقین دلوایا۔

''ادب لطیف'' کے پہلے مدیر طالب انصاری بدایونی کے تھے۔ طالب انصاری فلموں میں گانے لکھا کرتے تھے۔ اسکول میں استاد تھے اور اضافی آمدنی کے لیے ٹیوشن پڑھایا کرتے تھے۔ وہ زیادہ وقت پرچے کو نہیں دے سکے اور اس سے علاحدہ ہو گئے۔ اس وقت ''ادب لطیف'' کے مینیجنگ ایڈیٹر امتیاز علی چودھری تھے۔ پھر ''صحرا نورد کے خطوط'' کے خالق مرزا ادیب اس پرچے کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور ''ادب لطیف'' کو اپنی محنت اور اپنے اعلیٰ ادبی ذوق کے سبب آسمان پر پہنچا دیا۔ یہ ان کی محنت کا ہی ثمر تھا کہ انھی کے خلوص اور اعلیٰ ذوق اور صحافتی ہنرمندی کے سبب یہ پرچہ آج بھی زندہ ہے اور اس میں مرزا ادیب کی روح بھی دکھائی دیتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مرزا ادیب کا بطور مدیر ''ادب لطیف'' کا رویہ نہایت ستھرا اور میانہ روی کا تھا۔ مگر بعد میں ''ادب لطیف'' کی تخلیقات کے انتخاب کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ اس زمانے کی ادبی صورت حال سے بددل تھے۔ وہ ترقی پسندی سے بھی بددل ہو گئے تھے۔ وہ سکہ بندی کو توڑنا چاہتے تھے۔ انھوں نے غیر ترقی پسند اور بسیار یت پسندوں سے بیزار نئے لکھنے والوں کو ''ادب لطیف'' میں سراہنا شروع کر دیا اور اس نئے منظر نامے میں نئے رنگ بھرنا شروع کر دیے۔ ساتھ ہی مرزا

ادیب نئے لکھنے والوں کو ادبی فضا کو سمجھنے کی تلقین بھی کرتے رہے۔

1947 سے پہلے یہ رسالہ ترقی پسندوں کے زیر اثر تھا اور ان کے مدیران راجندر سنگھ بیدی، چودھری نذیر احمد، ساحر لدھیانوی، باری علیگ، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، فکر تونسوی تھے۔

ہندوستان کے بٹوارے کے بعد پھر پانسہ پلٹ گیا اور ترقی پسند شعرا و ادبا "ادب لطیف" کے خلاف ہو گئے اور اس پر ادب کی آڑ میں بازارکاری کا الزام لگایا اور یہ تاثر بھی گشت کرنے لگا کہ یہ پرچہ رجعت پسندوں کی رکھیل بن گیا ہے اور ترقی پسندوں نے اس کا بائیکاٹ کر دیا۔

اس کو غلط فہمی بھی کہا گیا تو "ادب لطیف" کے مالک چودھری برکت علی نے احمد ندیم قاسمی سے کہا "زندگی اور ادب کی ترقی پسند قدروں پر میرا عقیدہ اتنا پختہ ہے کہ میں آپ لوگوں کے عتاب سے بوکھلایا نہیں بلکہ مرزا ادیب صاحب کی مدد سے ترقی پسند ادب بھی پیش کرتا رہوں گا۔"

اس زمانے میں لوگوں نے از روئے مذاق کہا تھا کہ ادب لطیف ترقی پسند، حقیقت پسندانہ، عوامی، انقلابی ادب و فکر کو پیش کرتا ہے۔ جبکہ ادب لطیف کے معنی .....تو اس انشا کو کہتے ہیں جس میں تخیل و جذبات کا اظہار ہوتا ہے اور اسلوب بیان کی خوبی نمایاں ہو جس میں اسلوب موضوع پر مقدم ہو۔ یہ نظم منثور رومانیت، شگفتہ نگاری پر مشتمل ادب ہوتا ہے، جس میں ہلکے پھلکے افسانے ہوتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا کہ مرزا ادیب اردو کی رومانوی تحریک کے دستے کے آخری سپاہی تھے۔ اُنھوں نے اسی سبب "ادب لطیف" کو تا حیات سینے سے لگائے رکھا۔

آزادی کے بعد مدیران کی نئی نسل "ادب لطیف" کی ادارت میں شامل ہوتی رہی جن میں عبدالمتین عارف، انتظار حسین، قاسم محمد، ناصر زیدی، کشور ناہید، ذکاء الرحمٰن اور معاونین میں مسعود اشعر اور اظہر جاوید کے نام اُبھر کر سامنے آئے اور نہایت خوش اسلوبی سے یہ لوگ پرچے کو نکالتے رہے۔ ان دنوں صدیقہ بیگم اور ان کے گھرانے کی علم دوستی، فراخ دلی کے سبب آج بھی یہ پرچہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

"ادب لطیف" کا 1950 نومبر میں دھماکہ خیز طویل مختصر افسانہ نمبر شائع ہوا۔ اس میں

بڑے پائے کے افسانے اور مضامین شامل تھے۔ خاص کر جلیل کریر کا مضمون ''طویل مختصر افسانے کا فن'' بہت پُر مغز اور فکر انگیز ہے اور اس نمبر میں شامل تمام افسانہ نگاروں اور نقادوں کے کوائف اور تصاویر بھی شائع ہوئیں جن میں شوکت صدیقی، خواجہ احمد عباس، تسلیم سلیم چھتاری اور ابن سعید وغیرہ کے افسانے شامل تھے۔ 1950 میں ہی ''ادب لطیف'' کے سالنامے میں ''تین شاعر۔ تین نقاد'' کے تحت ڈاکٹر سعید عبداللہ کا مضمون ''درد کی شاعری میں صوفیانہ لہجہ''..... عطا محمد کا مضمون ''حضرت داغ'' اور سید اقبال عظیم کا مضمون ''اقبال کی شاعری کا پہلا دور'' چھپے اور ایک عرصے تک موضوع بحث رہے۔ ''ادب لطیف'' نے کئی عہد ساز نمبر نکالے جس میں فیض احمد فیض، اشفاق احمد، مرزا ادیب اور عصمت چغتائی پر بڑے معرکے کے مضامین پڑھنے کو ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ گولڈن جوبلی نمبر، جوبلی نمبر 63، 55 سالہ نمبر، بولیور (Bolivar) کی نظمیں، پیٹرا اینجل کی تحریریں، اپرنش فریڈ کی نظمیں، سال نامہ 1994، افسانہ نمبر 1995، غزل نمبر 1995، افسانہ نمبر 1997، غزل و نظم نمبر 1995، تراجم، کہانیاں 1998 اور 75 سالہ نمبر بھی ''ادب لطیف'' کے ادبی کارناموں میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

اشفاق احمد نمبر میں 25 مضامین شامل ہیں۔ آغا سہیل کا ''اشفاق احمد بے مثال داستان گو''۔ احمد عقیل روبی کا ''ستیا گو بھیشم پتامہ''۔ اشفاق احمد اور غالب احمد کا دلچسپ مضمون ''داستان سرائے'' اور ''صدق تلقین شاہ'' پڑھ کر فنی آگاہیاں دریافت ہوتی ہیں۔ فیض احمد فیض کے خصوصی شمارے میں کرشن گولڈ کا فیض کے ساتھ بہترین مصاحبہ..... اور مضامین میں فیض سے ملاقات'' (کرشن چندر) فیض صاحب کی یادیں باتیں (تجمل حسین) قرۃ العین حیدر کا مضمون ''اپنے عہد کی آواز'' پڑھنے کے لائق ہے۔ اس شمارے میں ایک پینل کے ساتھ فیض صاحب کے ساتھ طویل انٹرویو بھی شامل ہے، جس میں سہیل احمد، جاوید شاہین، مسعود اشعر اور محترمہ منور حفیظ نے بڑے ہی پائے کے سوالات اور گفتگو دلچسپ ہی نہیں بلکہ اس میں فیض صاحب کی زندگی کے کئی پوشیدہ گوشے بھی سامنے آئے ہیں۔

مرزا ادیب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے 10 مضامین اور دو مصاحبے اور نظمیں شامل ہیں۔ مرزا ادیب کے ساتھ صدیقہ بیگم، سید فخر الدین بلے، ظفر علی راجہ، ظفر معین بلے اور

اختر راہی کی گفتگو بھی پڑھنے کو ملتی ہے۔ اس ملاقات میں مرزا ادیب نے ترقی پسند تحریک کے حوالے سے ایک سوال کے جواب میں کہا..... ''یہ تحریک (ترقی پسندی) لادینیت کی طرف تو ہرگز نہیں لے جاتی۔ البتہ اسے بنیاد پرستوں کے عمل کا ردعمل ضرور کہا جا سکتا ہے۔''

عصمت چغتائی نمبر میں پطرس بخاری، سعادت حسن منٹو، فیض احمد فیض، قرۃ العین حیدر، الطاف فاطمہ، افضل توصیف اور سرفراز کے مضامین خوب ہیں۔ اس میں عصمت چغتائی کے لکھے ہوئے تین مضامین ..... ''میرا دوست میرا دشمن''، ''میں کیوں لکھتی ہوں'' اور ''آپ بیتی'' بھی پڑھنے کو ملتے ہیں۔

''شاعر'' کا پہلا پندرہ روزہ شمارہ 15 فروری 1930 کے دن شائع ہوا۔ اس کے مدیر اور منتظم سیماب اکبرآبادی تھے۔ اس پرچے کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ غالب کی جنم بھومی آگرہ سے بڑے سائز میں شائع کیا گیا۔ اس رسالے کی بھی ایک دلچسپ تاریخ اور کہانی ہے۔ جب ''شاعر'' کو شائع کرنے کا ارادہ ہوا تو سیماب صاحب کے ذہن میں کئی خدشات تھے۔ کیونکہ اردو ادبی جریدے کا اجرا آسان نہیں ہوتا۔ 14 دسمبر 1929 میں ایک رسالے ''تاج'' میں ''شاعر'' کا اشتہار چھپا جس میں ''شاعر'' کو پندرہ روزہ رسالہ لکھا گیا اور یہ بات بتائی کہ جنوری 1930 میں یہ شائع ہوگا۔ مگر ''شاعر'' مقررہ تاریخ پر شائع نہیں ہو سکا۔ 28 جنوری 1930 میں منیجر کی جانب سے اطلاع دی گئی کہ یہ جلد شائع ہوگا اور اس کا سائز بڑا ہوگا اور اشاعت کی تعداد 5 ہزار ہوگی۔ شاعر کے ابتدائی پرچوں کے سرورق پر لکھا ہوتا تھا ''جمعیۃ الشعرائے ہند کا واحد اخبار'' — ''ہندوستان چار کروڑ شاعروں کا واحد آرگن'' — خاص ادبی مصور ماہانہ صحیفہ۔

ساتھ ہی نگراں اصول: سیماب اکبرآبادی..... اور مدیر مسئول منظر اکبرآبادی..... اگست ستمبر 1933 تک جتنے بھی ''شاعر'' کے شمارے شائع ہوئے وہ تمام کے تمام منظر صدیقی کی ادارت میں شائع ہوئے۔ اس کی وجہ منظر اکبرآبادی بیمار ہو گئے تھے۔ ان کا جگر اور معدہ خراب ہونے کے سبب اختلاج کے دورے پڑتے تھے۔ اس لیے وہ ''شاعر'' کی ادارت سے بحیثیت مدیر الگ ہو گئے تھے۔ کچھ عرصے جگندر ناتھ، ندا فاضلی، عمر حسین، آغا رشید مرزا اور یونس اگاسکر اس

کی ادارت میں معاون رہے۔ ''شاعر'' اس زمانے میں اردو کے پڑھے لکھے گھرانوں اور ادب کے عام قاری کے حلقوں میں پڑھا جاتا تھا۔ اس جریدے نے نئے شعرا کی تربیت بھی کی اور سیماب اکبرآبادی معاوضہ لے کر ان شعرا کی اصلاح بھی کیا کرتے تھے۔ ''شاعر'' نے سب سے پہلے پابند نظمیں شائع کرنا شروع کیں۔

سیماب اکبرآبادی ''شاعر'' میں شعرا کو موضوع دیتے تھے اور ان موضوعات پر شعرا سے نظمیں لکھواتے تھے۔ مصرع طرح بھی دیتے تھے اور ڈاک سے غزلیں منگواتے تھے اور انھیں اصلاح کر کے چھاپتے تھے۔ ''اصلاح سخن'' کے عنوان سے کسی ''استاذ'' کی غزلیات کو ترجیح دیتے تھے اور تحقیق و فصاحت کے ساتھ اس پر بحث کرتے اور سوالات کے جوابات بھی دیتے تھے۔ ''شاعر'' میں ان کے اداریوں کو کلیدی مقام حاصل ہوتا تھا۔ ان دنوں دیگر ادبی رسائل میں بھی اداریوں پر سب سے زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ اس سے انکار ممکن نہیں کہ ادبی جرائد میں تو اداریہ ہی پرچے کا ''دل'' ہوتا ہے۔ ماضی کے ادبی رسائل کے کئی اداریے اردو کی تنقیدی اور تحقیقی تحریروں کا حوالہ ہے۔

سیماب صاحب نے ''شاعر'' کا ''امروز نمبر'' نکالا، جس میں وہ اعتراضات کے جواب دیتے تھے..... ''شاعر'' مالی پریشانیوں میں بھی گھرا رہا، ''شاعر'' کی جلد 36/3-4 کے شمارے میں مہندر ناتھ کے دستخط سے قارئین سے ''شاعر'' کے لیے دس ہزار روپے کی ضرورت کی اپیل بھی کی گئی۔ سیماب اکبرآبادی پہلے ''شاعر'' کو آگرہ سے شائع کیا کرتے تھے۔ مگر جب وہ 1950 میں ایک مشاعرہ پڑھنے کراچی گئے تو آگرہ میں ہنگامہ اور فساد ہو گیا تو وہ پرچے کو بمبئی لے آئے۔ آگرہ سے شروع ہونے والا یہ رسالہ ایک ''دبستان'' بن گیا۔ سیماب صاحب کے ہزارہا شاگرد تھے۔ یہ سلسلہ اردو کی تاریخ میں حاوی رہا جیسے دہلی، لکھنؤ کے شاعری کے مکتبہ فکر رہے۔ سیماب صاحب کے شاگرد پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے۔ وہ ان سے اصلاح لیتے تھے لیکن یہ ایک مثبت بات ہے کہ دوسرے حلقوں اور دبستانوں سے ان کی مخاصمت نظر نہیں آتی جو آج بھی شاعر کا طرۂ امتیاز ہے۔ ''شاعر'' ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی چھتری کے نیچے کبھی نہیں آیا۔ حالانکہ اس پرچے نے تمام نظریاتی فکر، تنقیدی مباحث اور تحریروں کو چھاپا اور

سب کو کھل کر بات کرنے کی آزادی دی۔

''شاعر'' میں عہد ساز موضوعات جیسے ''افسانہ نمبر''، ''غالب نمبر''، خواتین شعرا اور مقالہ نگاروں کا نمبر، نثر نظم نمبر، آزاد غزل نمبر، کرشن چندر نمبر، سردار جعفری نمبر، راجندر سنگھ بیدی، احتشام حسین، خواجہ احمد عباس، کھیالال کپور، ساحر لدھیانی، ناولٹ نمبر کے علاوہ ''شاعر'' کا ایک معرکۃ الآرا کام ''ہم عصر اردو نمبر'' کا 1240 صفحات کا ضخیم نمبر ہے، جس میں اردو ادب کی تاریخ کی اہم شخصیتوں کو اکٹھا کر دیا گیا ہے۔

''شاعر'' کو ایک ہی خاندان کی تین نسلوں نے زندہ رکھا ہوا ہے۔ سیماب اکبرآبادی کے بعد منظر صدیقی، اعجاز صدیقی، تاجدار احتشام صدیقی، افتخار امام صدیقی، ناظر نعمان صدیقی اور جاوید اقبال صدیقی نے ''شاعر'' کی شاندار اردو کی ادبی صحافت کا ذمہ سنبھال کر رکھا جو ایک اردو کی ادبی تاریخ کا حصہ ہے۔

'مدینہ' اخبار اور تحریکِ آزادی

ڈاکٹر فرزانہ خلیل

ہندوستان میں ابتدائی اردو صحافت کی تاریخ دراصل تحریک آزادی کی زائیدہ ہے۔ اس نے جب اپنی آنکھیں کھولیں تو ہندوستان انگریزی سامراج کا حصہ تھا۔ ملک کی تاریخ ایک نئے دور اور بحران سے گزر رہی تھی۔ اردو صحافت نے اپنے ابتدائی ایام ہی سے تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگی۔ گویا اردو صحافت کی ابتدا سے یہ پالیسی رہی تھی کہ وہ شمع آزادی کے پروانوں میں جاں نثاری کا جذبہ پیدا کرے اور ظالم و جابر حکمرانوں کی چیرہ دستیوں کے خلاف آواز اُٹھائے۔ اس کی مثال مولوی عبدالباقر کی قربانی سے دی جاسکتی ہے جس نے 1857 کے زمانے میں انگریزی حکومت کے خلاف ایک محاذ کھولا تھا جس کی پاداش میں اُنھیں توپ سے اُڑا دیا گیا۔ گویا اردو صحافت کی ابتدا قربانیوں سے ہوئی اور پوری تاریخ میں یہ ظلم و جبر کے خلاف صف آرا نظر آتی ہے۔ مولوی باقر کے ''دہلی اردو اخبار'' کی اردو صحافت میں قربانی کی پہلی اینٹ لگی۔ ان کے نواسے محمد حسین آزاد جنھوں نے ''آب حیات'' لکھ کر ایک بڑا ادبی کارنامہ انجام دیا تھا۔ وہ بھی فرنگیوں کے ظلم و ستم سے بچ نہ سکے۔ ''دہلی اردو اخبار'' میں ان کی ایک نظم چھپی تھی ''تاریخ

انقلاب افزا" اس نظم کا شائع ہونا تھا کہ آزاد کی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو گیا۔ چند اشعار دیکھیں:

ہے کل کا ابھی ذکر کہ جو قوم نصاریٰ
تھی صاحب اقبال و جاں بخش و جہاں دار
تھی صاحب علم و ہنر و حکمت و نصرت
تھی صاحب جاہ و حشم و لشکرِ جرار

اس طرح کے حالات اور واقعات سے اردو صحافت کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ اردو کے صحافیوں اور بالخصوص علما نے جنگ آزادی کے تئیں نہ صرف اپنے قلم کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا بلکہ اپنی زندگی اور جانِ عزیز کو بھی قربان کر دیا۔ نہ جانے کتنے صحافیوں کو جیل کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ ان ہی مقاصد اور تحریک آزادی میں روح پھونکنے اور حکومت برطانیہ کے خلاف رائے عامہ تیار کرنے کے لیے 1857 سے 1900 کے درمیان تقریباً بیس اخبارات شائع ہوئے لیکن بیسویں صدی کے ابتدائی عشرے میں تحریک آزادی اپنے شباب پر پہنچ گئی تھی۔ ایک طرف "زمیندار" جیسے اخبار اور ظفر علی خاں جیسے صحافی نے مورچہ سنبھال رکھا تھا تو دوسری طرف بجنور سے اخبار "مدینہ" نے ایک ہراول دستے کی حیثیت سے اردو صحافت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔ یہ ایک انتہائی پُر آشوب دور تھا۔ اخبار مدینہ کے ابتدائی ایام کا ذکر کرتے ہوئے دور حاضر کے معتبر صحافی اور محقق سہیل انجم لکھتے ہیں:

"مولوی مجید حسن نے ایک پُر آشوب دور میں "مدینہ" اخبار شروع کیا تھا جو جنگ آزادی کے ہراول دستے میں شامل رہا۔ مدینہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ ہزاروں دقتوں کے باوجود مسلسل نکلتا رہا اور طویل عمر پائی۔ مدینہ کے بانی مولوی مجید حسن نے اسے قلیل پونجی کے ساتھ یکم مئی 1913 کو ہفتہ وار اخبار کی شکل میں بجنور سے جاری کیا تھا جو یکم جنوری 1917 سے سہ روزہ ہو گیا بعد میں روزنامہ بھی نکلا مگر وہ زیادہ دن چل نہیں سکا۔ اخبار مدینہ نے قومی تحریکِ آزادی کی تائید اور آزادی خواہ جماعتوں کی حمایت، مسلمانوں کے سیاسی، تمدنی اور لسانی حقوق نیز اسلامی آثار و شعائر کے

تحفظ کی جس پالیسی کا آغاز روزِ اول سے کیا تھا اس پر پوری سچائی کے ساتھ آخر تک قائم رہا۔ (بحوالہ اردو صحافت اور علما: صفحہ 240)

اس اخبار کے اجرا سے متعلق شہناز تبسم نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ یکم مئی 1913 کو بجنور سے ہفتہ وار اخبار مدینہ کا اجرا ہوا۔ (بحوالہ مدینہ اخبار اور تحریک آزادی: صفحہ 25) جبکہ مجید حسن نے مدینہ بجنور 15 ستمبر 1913 کے شمارے میں یکم مئی 1912 ہی لکھا ہے۔

اخبار مدینہ بجنور کی تاریخ اجرا اور پالیسی سے قطع نظر اس اخبار کی پالیسی اور اس کے حلقۂ ادارت میں شامل افراد کا ذکر ضروری ہے۔ اخبار کی یہ خوش بختی تھی کہ اس زمانے میں اسے بہترین مدیر اور انشا پرداز ملے جن کی صاف ستھری تحریروں نے قارئین مدینہ کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔ ان مدیروں میں بینا بھی تھے اور نابینا بھی لیکن فن ادارت اور حب الوطنی کے جذبے میں کہیں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ ایک نظر مدینہ کے مدیروں پر ڈالیں تا کہ ان جلیل القدر صحافیوں کا ذکر ہو سکے جنھوں نے مدینہ کو آزادی کے ہراول دستے میں کھڑا کر دیا تھا۔ شہناز تبسم نے اپنی کتاب میں 23 مدیران کا زمانی اعتبار سے حوالہ دیا ہے:

> ''آغا رفیق بلند شہری، ملک الکلام قوی امروہوی، نور الحسن ذہین (نابینا)، مولانا مظہر الدین شیر کوٹی، شاہ خلیل الرحمٰن، قاضی بدر الحسن جلالی، سید مظفر الدین ندوی، حمید حسن فکر، محمد حسن صالحی، عثمان فارقلیط، ابو اللیث ندوی اور دیگر کے نام قابل ذکر ہیں: ان حضرات کی ادارت میں یہ اخبار 66 برس تک ملک کی آزادی (1947) تک اور عوام میں سیاسی اور سماجی بیداری نیز تعلیمی بیداری پیدا کرنے کی سعی جمیل کرتا رہا اور نامساعد حالات کے تحت 1976 میں اس اخبار کا اشاعتی سلسلہ بند ہو گیا۔ تاہم آج بھی اس اخبار کے نقوش قارئین کے اذہان پر محفوظ ہیں اور تاریخ میں یہ اخبار ایسے نقش پا چھوڑ گیا جسے ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ اس اخبار کی پیشانی پر عزیز لکھنوی کا یہ شعر نمایاں طور پر درج ہوتا تھا:

معجزہ شق القمر کا ہے مدینہ سے عیاں
مہ نے شق ہو کر لیا ہے دین کو آغوش میں

اس دور کے تمام اخبارات میں یہ رجحان عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ اخبار کی پالیسی سے لگا کھاتے ہوئے کوئی نہ کوئی شعر پیشانی پر درج ضرور ہوتا ہے۔

اخبار مدینہ پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر سید عقیل رضوی لکھتے ہیں:

"مدینہ اخبار بیسویں صدی کا ایک اہم اخبار تھا۔ مولانا حسرت موہانی کے "اردوئے معلی" کے بعد مدینہ اخبار پر ہمیشہ حکومت کی نظر رہی اور یہ اخبار بھی وقتاً فوقتاً حکومت کے عتاب کا نشانہ بنتا رہا۔ مدینہ یکم مئی 1912 سے نکلنا شروع ہوا۔ یہ پہلی مرتبہ بجنور شہر کے محلہ مردھگان سے نکلا۔ ابتدا میں یہ ہفتہ وار تھا پھر ہفتے میں دو بار شائع ہونے لگا۔ اس اخبار کے مالک و مہتمم مولوی محمد مجید حسن بجنوری تھے۔ حالات کے تحت ابتدا میں اس اخبار کی پالیسی براہ راست حکومت کے خلاف نہ تھی بلکہ مدیر اول اسے بین بین لے کے چلنے کے حق میں تھے۔ مگر رفتہ رفتہ اس اخبار میں اردو کی مروجہ صحافت کا مزاج پیدا ہونے لگا۔"

(بحوالہ مقدمہ انتخاب مدینہ بجنور صفحہ 9)

اخبار مدینہ ابتدا سے لے آخری ایام تک اپنی پالیسی پر گامزن رہا۔ مگر اس اخبار کی پالیسی کانگریس پارٹی کے حق میں ایک نرم گوشہ رکھتی تھی لیکن کسی بھی مسئلے پر اگر یہ پارٹی حق و صداقت کا دامن چھوڑتی تو اخبار مذکور اس کی بھی گرفت کرنے سے نہیں چوکتا تھا۔ اخبار مدینہ کے صفحات اور اس میں درج خبریں اور رپورٹیں اس بات کی شاہد ہیں کہ اس اخبار نے آزادی کے حصول سے لے کر قومی یکجہتی کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس اخبار کی پالیسی کا اگر جائزہ لیا جائے تو مندرجہ ذیل نکات اُبھر کر سامنے آتے ہیں:

- انگریزی حکومت کی ہر سطح پر مخالفت
- مصلحتاً کانگریس کی حمایت

- مسلمانوں کے ملی مسائل
- مسلم لیگ کے تئیں اخبار مدینہ کا رویہ
- قومی یکجہتی کا فروغ
- اور تحریک آزادی۔

مذکورہ نکات کے تمام خطوں کو یکجا کیا جائے تو مدینہ کا بھرپور خدوخال اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ تاہم ہم یہاں اخبار مدینہ کی تحریکِ آزادی سے متعلق کوششوں کا جائزہ لیں گے۔ لیکن اس اخبار کے مالک مجید حسن ایک روشن خیال شخص تھے اور تمام مدیروں کو اظہار رائے کی آزادی دیتے تھے۔ اُنھیں بعض معاملے میں کسی کی بھی مخالفت پسند نہیں تھی۔ وہ انگریز کو ایک غاصب قوم ضرور تصور کرتے تھے لیکن بلاوجہ اس کی مخالفت کو درست نہیں سمجھتے۔ ان خیالات کے اشارے خود اخبار مدینہ میں شائع وہ سطور ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ کبھی کبھی وہ انگریزوں کے تئیں اپنا رویہ نرم بھی رکھتے تھے۔ اخبار مدینہ میں شذرات بھی شائع ہوتے تھے۔ 15 اپریل 1913 میں شائع ایک شذرہ دیکھیے:

گورنمنٹ ہند کے زیر اثر رہ کر ہمیں جس قدر آزادی حاصل ہے اس کا منشا یہ ہے کہ ہم ہر وقت گورنمنٹ ہند کی خوشنودی کو اپنا نصب العین سمجھیں اور گورنمنٹ کی خیرخواہی کرتے رہے۔ لیکن ان سطور میں ظاہر کیے گئے خیالات کے باوجود 'مدینہ' نے ہمیشہ ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کرنا اپنا نصب العین سمجھتا تھا۔ 1913 میں کانپور کی ایک مسجد کا کچھ حصہ شہید کر دیا گیا اس پر مسلمانوں نے سخت احتجاج کیا۔ عوام سے لے کر خواص نے اس کی مذمت کی۔ اخبار مدینہ بھی اس معاملے میں پیچھے نہ رہا بلکہ اس نے کئی شماروں میں اس مذموم حرکت کی مذمت کی اور اداریے لکھے اور دوسرے مضامین شائع کیے۔ شبلی نعمانی کانپور کے اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئے اور ایک نظم ''کشتگانِ معرکۂ کانپور'' لکھی اخبار مدینہ نے اسے بڑے اہتمام سے شائع کیا۔

1919 میں برطانوی حکومت نے ہندوستان میں رولٹ ایکٹ نافذ کیا تاکہ آزادی کے سرفروشوں کی سرگرمیوں کو کچلا جا سکے۔ اس جابر اور ظالم قانون کے تحت حکومت کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ شک کی بنیاد پر کسی کو بھی بغیر کسی وارنٹ کے گرفتار کر سکتی ہے۔ اس کالے قانون

کے خلاف پورے ملک میں احتجاج کیا گیا لیکن اس قانون کا ایک اہم مقصد ہندوستانی صحافت کو قابو میں کرنا تھا تاکہ وہ حکومت کے خلاف نہ لکھیں لیکن اس زمانے کا اردو پریس ایک مشن تھا اور تمام اخبارات نے کھل کر اس کی مخالفت کی۔ پنجاب میں اس کا زیادہ اثر دیکھا گیا۔ اس کے باوجود "مدینہ" نے اپنی ابتدائی نرم پالیسی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے حکومت پر نکتہ چینی کرنے سے گریز نہیں کیا اور 13 اپریل 1919 کے اداریے میں مذکورہ اخبار کے مدیر نے لکھا کہ

> "بے شک رولٹ کمیٹی میں بعض ہندوستانی ممبر تھے لیکن وہ اہلِ ہند کے منتخب ممبر نہ تھے۔ بلکہ حکومت کے مرغانِ دست پرور تھے۔ پر ان کے اختیارات بہت محدود کر دیے گئے تھے۔ اگرچہ گرفتاری و تلاشی حکومتی صوبہ کے تحریری حکم سے ہوگی۔ وہ جو تحریر کریں گے پتھر کی لکیر ہوگی۔ لہٰذا جو لوگ کالے قانون کی حمایت کر رہے ہیں وہ عوام کو دھوکہ دے رہے ہیں۔"

اس اخبار سے وابستہ کئی اہم نام ہیں ان میں مولانا حامد الانصاری غازی ایک ایسا نام ہے جن کی تحریروں نے اخبار مدینہ کو بام عروج پر پہنچا دیا تھا۔ مولانا 1930 سے 1949 تک مدینہ کے مدیر رہے۔ صرف ایک برس کے لیے 1938 میں اخبار "زمیندار" سے وابستہ ہوئے تھے۔ ان کے تحریر کردہ اداریے اور مضامین ان کے سیاسی تدبر اور فکر کی غماز ہیں۔ وہ عصری حالات و واقعات پر شذرات بھی لکھتے تھے۔ ان کے اسلوب نگارش اور مدبرانہ صلاحیت نے انھیں ہندوستان کے صف اول کے صحافیوں میں لا کر کھڑا کر دیا۔ سہیل انجم لکھتے ہیں کہ

> "حامد الانصاری غازی کی تحریروں میں ہمیں جوش و جذبہ بھی ملتا ہے اور عزم و حوصلہ بھی۔ ان کے مضامین اور شذرات قاری کو سوچنے اور غور کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ وہ اپنے جذبہ و فکر کو قرطاس و قلم کے وسیلے سے اُجاگر کرنے کا بہترین ہنر جانتے ہیں۔" (اردو صحافت اور علما، صفحہ 124)

مولانا حامد الانصاری کے ایک مضمون ہم سب ہندوستانی ہے کا حوالہ بھی سہیل انجم نے دیا ہے۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں جس سے مدینہ اخبار اور مولانا کے مطمح نظر کا پتہ چلتا ہے۔

''ہندوستان ہمارا وطن ہے اور ہم سب ہندوستانی ہیں۔ یہ افسانہ نہیں بلکہ ہماری روح کا تقاضا ہے۔ تاریخ کے سینے میں بہت سے زخم ہیں مگر ان زخموں کو کریدنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہزار اختلاف ہو سکتے ہیں مگر آج ہم سب اس بات پر متحد ہیں کہ ہم سب ایک ہیں اور ہمارا یہ ایکا وطن کی سرحدوں سے قائم ہے۔ ہندوستان ہماری زندگی کا قلعہ ہے اور یہ قلعہ قومی اتحاد کے فولاد سے تیار ہوا ہے۔'' (بحوالہ ایضاً: صفحہ 129)

جنگ آزادی کے دوران سب سے زیادہ سیاسی اعتبار سے متاثر ہونے والا صوبہ پنجاب تھا۔ جہاں آزادی کے سرفروشوں نے حکومت وقت سے لوہا لیا۔ اسی صوبے میں جلیانوالا باغ کا واقعہ پیش آیا جس نے نہ صرف ہندوستانی عوام کو لرزہ براندام کر دیا بلکہ ایوانِ فرنگ میں بھی اس کی صدائے بازگشت سنی گئی۔ اخبار مدینہ نے اس کے خلاف نہ صرف خبریں شائع کی بلکہ سخت اداریے تحریر کیے۔ 13 مئی 1919 کو جلیانوالا باغ کا واقعہ پیش آیا اور حکومت پنجاب اخبار مدینہ کے اداریوں اور خبروں سے اتنی خوف زدہ تھی کہ اس نے اخبار مذکور کا پنجاب میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا اور کہا کہ اس اخبار کی وجہ سے پنجاب میں امن و امان کو خطرہ لاحق ہے۔ اس حکم نامے کا جاری ہونا تھا کہ اخبار مدینہ نے اس کی سخت مخالفت کی اور 31 مئی 1919 کے شمارے میں ایک سخت قسم کا اداریہ چھپا

''ایک طرف ہم بیسویں صدی اور اس کی برکات آزادی کو دیکھتے ہیں۔ مسٹر لائڈ جارج اور مسٹر ولسن کے نغمہ ہائے حریت نواز ہمارے کانوں میں آ رہے ہیں۔ دوسری طرف پنجاب کی زبان بندی و قلم بندی ہمارے سامنے اور ہم متعجب ہیں کہ یہ بیسویں صدی ہے یا اٹھارویں صدی۔ یہ عہد تو حضور ملکِ معظم کا ہے جو برطانیہ عظمیٰ کے تخت و حریت و انصاف پر متمکن ہیں لیکن یہ کیا قیامت ہے کہ آپ کے بعض تنخواہ دار نوکر ہندوستان میں بااختیار ہو کر یہ سعی کر رہے ہیں کہ فرانس کے بادشاہ لوئی چہاردہم اور لوئی شانزدہم کی یاد تازہ کر دیں۔''

اخبار مدینہ نے اپنے قارئین کو واضح لفظوں میں باور کرایا کہ حکومت پنجاب کی اس پابندی کا مقابلہ کیا جائے گا اور 25 مئی 1919 سے یہ اخبار یثرب کے نام سے شائع ہونے لگا اور اس پابندی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مولوی مجید حسن نے 17 راپریل 1919 کو پھر اسے مدینہ کے نام سے شائع کرنے لگے اور آخر کار حکومتِ پنجاب نے 19 راپریل 1920 کو اپنی پابندی اُٹھالی۔

اخبار مدینہ کا اداریہ ملک میں ہونے والی سیاسی، سماجی اور ملی سرگرمیوں کا آئینہ دار ہے۔ اس کے اداریوں میں موضوعات کی تلخی تو ملتی ہے لیکن لب ولہجہ میں شائستگی برقرار ہے۔ اخبار کا اداریہ بیک وقت عوام اور حکومت دونوں کو مخاطب کرتا ہے اور جہاں کوتاہی نظر آتی ہے اس کی نشان دہی کرتا ہے۔ ملک کی آزادی اور خود مختاری پر ہونے والی بحث اور حکومت کے پس وپیش پر اخبار مدینہ نے ہنگامی قوانین۔ حکومت ہند کی حکمت عملی پر ایک لمحہ فکریہ کے عنوان سے طویل اداریہ لکھا جس میں حکومت وقت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا کہ

> ''حکومت اور عوام دونوں باخبر ہیں کہ ہم اپنے ملک سیاسی کے لحاظ سے آزادیٔ ہند کے زبردست داعی اور پُر جوش مبلغ ہیں اور ہمارا مطمح نظر ایک ایسا آزاد اور خود مختار ہندوستان کی تشکیل ہے جو دنیا میں اپنے حقوق سیاسی کا خود محافظ ہو جس کے پاس اپنا نظام ہو، اپنا انتظامی عملہ ہو، اپنی فوج ہو اور جس کو اپنے مالی امور پر پورا پورا قبضہ اور تصرف حاصل ہو۔ اس کے لیے ہم ان تمام ذرائع کے حق میں ہیں جن کو دنیا کے قدرتی قوانین جائز اور مناسب قرار دے چکیں۔ ایک حریت پسند مسلمان اور ایک محب وطن ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے ہم نہایت بلند آہنگی کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہمیں اپنے ملک کے عزائم و مآل اور اپنے ملک کے باشندوں کی قدرتی آرزوؤں کا حکومت کے ان ارکان سے زیادہ صحیح علم ہے۔'' (اداریہ مدینہ 13 جون 1932: صفحہ 2)

اخبار مدینہ میں مسئلہ فرقہ وارانہ فسادات پر متعدد اداریے شائع کیے گئے ہیں جن میں مدیر موصوف نے نہایت صاف گوئی اور بیباکی سے اس کے وجوہ بیان کیے ہیں۔ 13 راگست

1932 کو اخبار مذکور میں اجتباہ کے عنوان سے ایک اداریہ شائع ہوا۔ ایک اقتباس دیکھیے:

''یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم واقعات و حوادث کی زد میں اس طرح بے ساختہ پن کے ساتھ بہہ جاتے ہیں کہ اصول اور مقاصد بالکل آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور راہ کا ہر پتھر ہماری منزل مقصود بن جاتا ہے۔ جہاں تک فرقہ وارانہ قضیہ کا تعلق ہے وہ کسی ایک شئے پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کے متعدد گوشے ہیں۔ بہت سے پہلو ہیں اور بہت سے امور ہیں لیکن ہماری کوتاہ عقل کا عالم یہ ہے کہ وہ موجودہ حالات میں صرف پنجاب بنگال کی جداگانہ آئینی اکثریت پر منتہی ہو کر رہ گیا ہے۔''

ہندوستان کی تحریک آزادی جب اپنے شباب پر تھی، مسلم کانفرنس بھی بہت سرگرم تھی لیکن جب جب اس تنظیم نے ملک کی آزادی اور عوام سے بے توجہی برتی یا اندرونی خلفشار کی شکار ہوئی۔ مدینہ کے اداریوں میں اس کی سخت گرفت کی گئی۔ یکم جولائی 1932 میں شائع اداریہ مسلم کانفرنس غداری و بے عملی کا عملی مظہر اسی جانب اشارہ کرتا ہے۔

ملک میں جب سودیشی تحریک نے زور پکڑا تو مدینہ اخبار بھی اپنی تحریروں کے ذریعہ اس تحریک میں شانہ بشانہ شریک رہا اور ملک کی معاشی بدحالی پر انگشت بدنداں رہا۔ ایک اداریہ میں اخبار لکھتا ہے کہ

''افلاس نے ہمارے ملک کے نظام معاشی کو درہم برہم کر دیا ہے اور اس وقت ہماری زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جس میں اضطراب کارفرما نہ ہو۔ جو لوگ وطن کے دردمند ہیں اور جن کو معاشیات میں دستگاہ حاصل ہے۔ انھوں نے غور و فکر کے بعد یہ طے کیا ہے کہ تحریک سودیشی کو وسیع پیمانے پر جاری کیا جائے۔ ان محبان وطن کے رائے ہے کہ سودیشی استعمال کرو اور سودیشی خریدو۔ یہ دونوں نعرے ہمارے اقتصادی تباہی کا علاج ہیں اور دنیا کا کوئی آئین ان پر معترض نہیں ہو سکتا۔''

(بحوالہ اخبار مدینہ 9 جون 1932: صفحہ 2)

ہم اور آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ فرنگی حکومت نے ہندوستان میں اپنی حکومت کی ساکھ کو مضبوط کرنے اور استحکام بخشنے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کیے۔ کہیں عیاری اور مکاری سے منزل حاصل کی تو جبر و استبداد کے پہاڑ توڑے اور جب سب حربے ناکام میں پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی حکمت عملی پر عمل پیرا ہوئے۔ اس مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے اخبار مدینہ اپنے اداریے میں لکھتا ہے کہ

'برطانوی شاہکار تقسیم کرو حکومت کرو'

یہ اعلان برطانوی سیاست اور دانائے فرنگ کا ایک ایسا امتیازی شاہکار ہے جس کے زریں نقوش ہندوستانی فرقہ پرستوں کے قلوب پر ہمیشہ ہمیشہ ثبت رہیں گے۔ جس کے بعد محسوس کیا جائے گا کہ قومی نفاق اور سیاسی دریوزہ گری کسی بھی جماعت کے لیے سودمند نہیں ہو سکتی۔

(مدینہ 21 راگست 1932: صفحہ 2)

اس طرح مدینہ اخبار جنگ آزادی کی تحریک میں شانہ بشانہ قوم و ملت کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور 66 سالہ زندگی گزار کر ناسازگار حالات کا شکار ہو کر 1976 میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ یہ اخبار ہندوستانی اخبارات میں ایک شاہکار کا درجہ رکھتا ہے جس کی مکمل جلدیں کہیں بھی دستیاب نہیں ہیں۔ مدینہ پریس کی عمارت اب بھی بوسیدہ حالت میں داستان پارینہ سنا رہی ہے۔

جنگ آزادی کا نقیب: روزنامہ 'ہمدرد'

ڈاکٹر محمد قمر تبریز

ہندوستانی جنگ آزادی کو کامیابی کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں جن عناصر کا اہم رول رہا ہے، ان میں سے ایک اردو اخبارات بھی ہیں۔ تحریک آزادی کی تاریخ ان اخبارات کے مطالعے کے بغیر نامکمل ہے۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں اردو میں روزنامہ، ہفت روزہ اور پندرہ روزہ کی شکل میں بہت سے اخبارات شائع ہو رہے تھے۔ انھیں میں سے ایک مولانا محمد علی جوہر کا اخبار 'ہمدرد' بھی تھا، جو 23 فروری 1913 سے دہلی سے نکلنا شروع ہوا۔ یہ اخبار روزنامہ کی شکل میں شائع ہوتا تھا۔ شروع میں اس کے صرف دو صفحات ہوتے تھے، لیکن بعد میں یہ آٹھ صفحوں پر شائع ہونے لگا۔ اس کا مقصد ہندوستانی عوام اور بالخصوص مسلمانوں میں اسلام اور ہندوستان کی سلامتی اور مختلف قوموں کے درمیان مضبوط جذبۂ اتحاد پیدا کرنا تھا۔ لیکن تحریک خلافت اور دوسری انگریز مخالف سیاسی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کی وجہ سے جب مولانا کو نظر بند کر دیا گیا، تو مجبوراً 10 اگست 1915 کو 'ہمدرد' کو پہلی بار بند کرنا پڑا۔ اس کی دوسری اشاعت 9 نومبر 1924 سے شروع ہوئی، جو 12 اپریل 1929 تک چلی۔ اس کے بعد یہ اخبار مختلف وجوہات کی بنا پر ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

ہندوستان کو انگریزی حکومت سے آزادی دلانے کے لیے جو لڑائیاں لڑی گئیں ان میں 'ہمدرد' نے ایک اہم رول ادا کیا۔ جیسا کہ ہم بھی جانتے ہیں، انگریزوں کے دل میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ انھوں نے ہندوستانی حکومت چونکہ مسلمانوں کے ہاتھ سے چھینی تھی، لہٰذا 1857 کی بغاوت کے پوری طرح ذمہ دار یہاں کے مسلمان ہی ہیں، اور اسی شک کی بنیاد پر انھوں نے پورے ہندوستان میں مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ مسلمان جو کہ پہلے سے ہی تعلیمی اور اقتصادی اعتبار سے دیگر قوموں سے پچھڑے ہوئے تھے، انگریزوں کے اس عتاب کی وجہ سے ان کو مزید رسوائی اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ سرسید، جو مسلمانوں کی اس زبوں حالی سے کافی غم زدہ تھے، انھوں نے اپنی حکمت عملی سے انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت کی راہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں سے انگریزوں کو یہ بھروسہ دلایا کہ ہندوستانی مسلمان ان کے دشمن نہیں بلکہ دوست ہیں اور 1857 کی بغاوت کا سبب مسلمانوں کی انگریز دشمنی نہیں، بلکہ خود انگریزوں کی بعض غلط پالیسیاں ہیں۔ دوسری طرف انھوں نے مسلمانوں کو سیاست سے دور رہنے اور تعلیم کی طرف توجہ دینے کی تلقین کی۔ اسی سلسلے میں انھوں نے مسلمانوں سے یہ بھی کہا کہ وہ کانگریس کی حمایت نہ کریں اور اس سے دوری برقرار رکھیں۔ لہٰذا مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ کانگریس مخالف ہو گیا۔ یہ علی برادران (مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی) ہی تھے جن کی کوششوں سے مسلمان دوبارہ کانگریس میں داخل ہوئے۔ اس وقت پورے ہندوستان میں گاندھی جی کی قیادت میں ترک موالات (یا عدم تعاون) کی تحریک اپنے عروج پر تھی۔ علی برادران نے اس تحریک کا پورے جوش و خروش کے ساتھ خیر مقدم کیا اور ساتھ ہی آل انڈیا خلافت کمیٹی کی بھی بنیاد ڈالی۔ گاندھی جی نے بھی تحریکِ خلافت میں ان کا پورا ساتھ دیا۔ روزنامہ 'ہمدرد' نے ان دونوں تحریکوں کی حمایت میں بہت کچھ لکھا اور اس کے ذریعے ہندوستانیوں میں حب الوطنی کے جذبات کو ابھارنے اور باہمی اتحاد کو فروغ دینے کی بھرپور کوشش کی۔

محمد علی جوہر ایک معزز اور تعلیم یافتہ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے دادا علی بخش مراد آباد کے ایک بڑے جاگیردار تھے۔ یہ جاگیر انھیں 1857 کی بغاوت کے دوران متعدد انگریزوں کی جان بچانے کی خاطر بخشش کے طور پر ملی تھی۔ محمد علی کے والد عبدالعلی خاں بھی رام پور

کے نواب یوسف علی خاں ناظم کے مقربین و معتمدین میں سے تھے۔ محمد علی جوہر کا اصل وطن بجنور تھا۔ لیکن بعض لوگ رام پور کو ان کا وطن مانتے ہیں۔ رام پور میں ہی ان کی پیدائش 1878 میں ہوئی۔ چھ بھائی بہنوں میں محمد علی جوہر سب سے چھوٹے تھے۔ والد کا انتقال ان کی پیدائش کے دو سال بعد ہی ہو گیا تھا۔ لہٰذا تعلیم و تربیت کا سارا بوجھ ماں کے اوپر آن پڑا، جس کو انھوں نے بخوبی پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ اس کے بعد بریلی کے ایک ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا، جہاں ان کے بڑے بھائی شوکت علی پہلے سے ہی زیر تعلیم تھے۔ محمد علی بچپن سے ہی ذہین، تیز، حاضر دماغ اور بچوں کے سردار تھے۔ بریلی سے ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد مولانا محمد علی جوہر مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ چلے گئے جہاں وہ آٹھ سال تک مقیم رہے اور 1896 میں یہاں سے اوّل پوزیشن سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ اس وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔ اس کے بعد ان کے بڑے بھائی شوکت علی نے ان کو اعلیٰ تعلیم کے لیے آکسفورڈ بھیجا تا کہ آئی سی ایس کا امتحان پاس کر سکیں۔ لیکن کامیابی ہاتھ نہ لگی، وجہ تھی تمام مضامین کی طرف یکساں توجہ نہ دینا۔ بھائی کو بڑا صدمہ پہنچا لیکن ماں نے ڈھارس بندھائی۔ اس کے بعد ماں کے کہنے پر ہی محمد علی کو لندن سے واپس بلایا گیا اور پھر رامپور میں امجدی بیگم سے ان کی شادی کر دی گئی۔ کچھ دنوں بعد بڑے بھائی شوکت علی نے انھیں دوبارہ انگلستان بھیجا تا کہ وہ آکسفورڈ سے بی اے میں ''آنرز گریجویٹ'' کی ڈگری حاصل کر سکیں۔ اس بار انھیں کامیابی ملی۔ اس کے بعد وہ ہندوستان واپس آ گئے۔ محمد علی کی دلی خواہش تھی کہ وہ علی گڑھ کالج کے اسٹاف میں شامل ہو کر ملک و ملت کی خدمت کریں۔ اس ضمن میں نواب محسن الملک نے کوششیں بھی کیں لیکن کالج کے پرنسپل تھیوڈور موریسن کی مخالفت کی وجہ سے مولانا کی تقرری کالج میں نہ ہو سکی۔ اسی درمیان رامپور کے نواب حامد علی خاں صاحب نے انھیں اپنی ریاست کا سب سے بڑا افسر تعلیمات مقرر کر دیا۔ ساتھ ہی وہ رامپور ہائی اسکول کے پرنسپل کے فرائض بھی انجام دینے لگے۔ نواب صاحب موصوف کے چھوٹے بھائی نواب ناصر علی خاں آکسفورڈ میں تعلیم کے دوران محمد علی کے ہم جولی اور دوست تھے۔ رام پور میں ملازمت کے دوران چند لوگوں نے والی ریاست نواب حامد علی خاں صاحب کے کان محمد علی کے خلاف یوں بھر دیے کہ وہ ان کو معزول کر کے نواب ناصر علی خاں کو رامپور کا

فرماں روا بنانا چاہتے ہیں۔ یہ بات حامد صاحب کے دل میں گھر کر گئی اور انھوں نے محمد علی کے ساتھ ناروا سلوک کرنا شروع کر دیا، انھیں نظر انداز کرنے لگے۔ یہ بات محمد علی کو ناگوار گزری اور آخر کار انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نواب حامد علی خاں نے محمد علی اور ان کے بڑے بھائی شوکت علی دونوں کے رام پور داخلے پر پابندی عائد کر دی۔ سخت سے سخت ناگزیر ضرورت میں بھی یہ لوگ وہاں نہیں جا سکتے تھے۔

اس کے بعد وہ کچھ دنوں تک اپنے بھائی شوکت علی کے ساتھ رہے۔ اسی درمیان ریاست ... وہ کے ولی عہد کنور فتح سنگھ، جو کہ قیام انگلستان کے دوران محمد علی کے گہرے مخلص تھے، ان کے کہنے پر ان کے والد نے محمد علی کو بڑودہ بلایا اور ان کو محکمۂ افیون میں ایک اعلیٰ منصب پر فائز کر دیا۔ یہاں پر ان کی کارگزاری سے متاثر ہو کر مہاراجہ نے ان کو ریاست کے ضلع نوساری کا کمشنر مقرر کر دیا۔ بعد میں ان کو کنور فتح سنگھ، جو کہ شراب کے بہت زیادہ عادی ہو گئے تھے، کا پرسنل اسسٹنٹ مقرر کر دیا گیا تا کہ وہ اپنے دوستانہ تعلقات کا اثر ڈال کر کنور صاحب کی اس قبیح عادت کو ترک کروا سکیں۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے اور بالآخر فتح سنگھ کی موت ہو گئی۔ اب محمد علی اپنی نوکری سے بیزار رہنے لگے اور چاہتے تھے کہ ملازمت سے سبکدوش ہو جائیں تا کہ ایک اخبار نکال سکیں۔ آخر کار 1910 میں وہ ملازمت سے کنارہ کش ہو گئے۔ اس درمیان سر مائکل اوڈوائر اور بھوپال کی بیگم صاحبہ نے بھی آپ کو اپنے پاس بلانا چاہا، لیکن محمد علی نے انکار کر دیا، کیوں کہ انھیں صحافت کے پر خار میدان میں قدم رکھنا تھا۔ 1910 کے آخر میں ہی انھوں نے کلکتہ سے "کامریڈ" (انگریزی اخبار) نکالنا شروع کیا۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ انگریز اسے پڑھنا باعث فخر سمجھتے تھے اور چھٹیوں میں جب اپنے ملک واپس جاتے، تو دوستوں کے لیے تحفہ میں ہندوستان سے اس اخبار کو لے جایا کرتے تھے۔ 1912 میں جب انگریزوں نے ہندوستان کا دارالحکومت کلکتہ سے دہلی منتقل کر دیا تو محمد علی بھی دہلی چلے آئے اور یہاں سے اردو کا روزنامہ "ہمدرد" 23 فروری 1913 سے نکالنا شروع کیا۔ اس اخبار کو بند ہوئے ایک زمانہ گزر چکا ہے، لیکن آج تک اس جیسا معیاری کوئی دوسرا اخبار اردو میں نہ نکل سکا۔ 1914 میں جس وقت پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی "لندن ٹائمز" نے ترکوں کے خلاف ایک نہایت اشتعال انگیز مضمون شائع کیا۔ اس میں ترکوں کو یہ مشورہ

دیا گیا تھا کہ وہ صرف دور سے تماشا دیکھیں کیوں کہ اس جنگ میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ اس مضمون کو پڑھ کر محمد علی بیتاب ہو اٹھے اور باوجود اپنی بیوی کی سخت علالت کے چالیس گھنٹے کی لگاتار محنت کے بعد اس مضمون کا جواب ''ترکوں کا فیصلہ'' (Choice of the Turks) کے عنوان سے لکھا اور اسے ''کامریڈ'' اور ''ہمدرد'' میں شائع کیا۔ اس کے متعلق وہ خود یوں بیان کرتے ہیں:

> ''میں نے یہ مضمون چالیس گھنٹہ کی لگاتار محنت شاقہ برداشت کر کے لکھا اور اس تمام عرصہ میں ایک منٹ بھی نہ سویا اور جب خود لکھتے لکھتے تھک جاتا تھا تو اخبار کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کو خود بولتا جاتا تھا اور ان سے لکھواتا تھا اور اس چالیس گھنٹہ میں نہ صرف سونے سے محروم رہا بلکہ خوراک بھی قہوہ کی چند پیالیوں سے بہ مشکل ہی آگے بڑھی۔''

(بحوالہ سیرت محمد علی: رئیس احمد جعفری، مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی، 1932، ص 264)

اس کی پاداش میں محمد علی کے دونوں اخبارات کی ضمانت ضبط کر لی گئی اور انھیں 15 رمئی 1915 کو مہرولی میں نظر بند کر دیا گیا۔ یہاں سے بعد میں ان کو چھندواڑہ اور پھر ایک تقریر کی پاداش میں وہاں سے بیتول بھیج دیا گیا جہاں پر وہ 1919 تک زیر حراست رہے۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر 25 ردسمبر 1919 کو ایک شاہی اعلان کے مطابق ان کو رہا کر دیا گیا۔ اس کے بعد محمد علی مختلف سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے جس کی وجہ سے دوبارہ انھیں کئی بار جیل جانا پڑا۔ 1923 میں والدہ محترمہ 'بی اماں' کا انتقال ہو گیا۔ اس صدمے نے انھیں بری طرح جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ اب خود ان کی صحت بھی خراب رہنے لگی۔ محمد علی ذیابیطس کے مرض کے شکار تھے۔ اس مرض میں آرام کی ضرورت ہوتی ہے جو ان سے کوسوں دور تھا۔ داہنے پیر میں کافی ورم اور سوزش تھی جو کراچی جیل میں 1920 میں پیدا ہو گئی تھی۔ پیٹھ اور پنڈلی میں بھی اکثر درد رہتا تھا۔ 1926 میں مکہ معظمہ میں موتمر عالم اسلام کے جلسہ میں شرکت کے دوران ان کے جسم کا آدھا حصہ مفلوج ہو گیا۔ ان دنوں ان کی مالی حالت بھی بہت زیادہ خراب چل رہی تھی۔ قرضوں کے انبار تلے لدے ہوئے تھے۔ چند دوست و احباب مسلسل اس غم میں مبتلا تھے کہ کیسے ان کی مالی پریشانیوں کو دور کیا جائے۔ ان کے مخلص اور 'ہمدرد' کے ایڈیٹر عبدالماجد دریابادی نے کئی خطوط محمد علی کو لکھے جس میں

انھیں صبر و شکر کی تلقین کی۔ ایک خط میں انھوں نے لکھا کہ اگر 'ہمدرد' کو بند ہی کر دینے کا ارادہ ہے تو دوسرے ولایتی انگریزی اخباروں میں چند مضامین لکھ کر کچھ پیسہ کمایا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کا جواب محمد علی نے یوں دیا :

''میں مضمون لکھ کر ہی اگر روٹی کماتا یعنی اس کی تجارت کرتا تو انگریزی اخبارات کم نہیں ہیں۔ مگر مجھے ایڈیٹری کرنا نہیں ہے۔ تبلیغ مدنظر تھی۔''

(بحوالہ محمد علی۔ ذاتی ڈائری کے چند ورق: عبدالماجد دریابادی، معارف پریس، اعظم گڑھ، 1956، ص 17)

اس کے بعد انھوں نے ایک خط میں محمد علی سے پوچھا کہ ایک کھدری لباس والی زندگی گزارنے پر ان کا ماہوار خرچ کیا ہوگا تا کہ یہ اس کا انتظام کر سکیں۔ اتفاق سے اپریل 1928 میں عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر سید محمود (سابق سکریٹری مرکزی خلافت کمیٹی) اور قطب میاں صاحب (مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ کے بھتیجے، داماد اور جانشیں) تینوں فرنگی محل، لکھنؤ میں کسی تقریب کے موقع پر جمع ہوئے اور اتفاق سے اس وقت تینوں کی زبان پر محمد علی کا یہی مسئلہ معاشیات تھا۔ کافی بحث و مباحثے کے بعد انھوں نے یہ طے کیا کہ محمد علی کے خوش حال مداحوں اور معتقدوں میں سے دس بارہ افراد کا انتخاب کر لیا جائے اور سب سے 25 روپے ماہوار کے حساب سے نذرانہ وصول کر کے ڈھائی یا تین سو روپیہ ماہانہ مولانا کی خدمت میں بھیجا جائے تا کہ آسانی سے ان کا گزر بسر چل سکے۔ بعد میں ڈاکٹر محمود صاحب کی اس تجویز پر کہ اس میں شوکت علی کا نام بھی شامل کر لیا جائے کیوں کہ وہ بھی اس کے مستحق ہیں، نذرانے کی رقم بڑھا کر دوگنی کر دی گئی۔ عبدالماجد دریابادی نے تمام لوگوں کو اس کے متعلق خطوط لکھے۔ لیکن جب یہ بات محمد علی جوہر کو معلوم ہوئی تو انھوں نے یہ رقم لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ جب تک زندہ ہوں اپنے زور بازو سے کام لے کر اپنا گزر بسر کروں گا۔ ادھر دوست و احباب اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ عین اسی زمانے میں محمد علی کی مہاراجہ الور سے دہلی کی کسی تقریب میں شناسائی ہوگئی۔ مہاراجہ بڑے دلچسپ انسان تھے۔ مختلف علوم کے ماہر اور انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو اور فارسی پہ بھی دسترس رکھتے تھے۔ انھیں جب یہ معلوم ہوا کہ رامپور کے نواب نے محمد علی کے رام پور داخلے پر پابندی عائد کر

رکھی ہے تو والی رامپور کے لنگوٹیا یار (بہت قریبی دوست) ہونے کی وجہ سے اس حکم کو منسوخ کرانے کی غرض سے محمد علی کو اپنے ساتھ زبردستی رامپور لے گئے۔ لیکن نواب نے مہاراجہ کی بات ٹھکرادی جس کی وجہ سے دونوں رئیسوں میں رنجش بھی پیدا ہوگئی۔ اس واقعے کی وجہ سے مولانا کے ساتھ مہاراجہ کی الفت اور بھی بڑھ گئی۔ اپریل 1928 کے وسط میں مہاراجہ نے ان کو الور بلایا۔ ان دنوں مولانا کی طبیعت ذیابیطس کی وجہ سے کافی علیل تھی۔ مہاراجہ چونکہ خود بھی ڈاکٹری کے بعض شعبوں سے واقف تھے اور ذیابیطس کا علاج مسلسل فاقوں کے ذریعے کرنے کا فن یورپ سے سیکھ کر آئے تھے، مولانا سے مصر ہوئے کہ وہ اپنے علاج کے لیے یورپ کا سفر کریں۔ اس کے لیے وہ آمدورفت اور قیام وطعام کا سارا خرچ اٹھانے کو تیار تھے بلکہ اپنے استادوں کے نام تعارفی خط بھی لکھے تاکہ پوری توجہ سے ان کا علاج کیا جاسکے۔ محمد علی نے فوراً تو وعدہ نہیں کیا بلکہ یہ شرط رکھی کہ پہلے بڑے بھائی شوکت علی اور ڈاکٹر انصاری صاحبان سے مشورہ کرلوں پھر جواب دوں گا۔ جب ان دونوں صاحبان نے منظوری دے دی تو مولانا یورپ جانے کو راضی ہوگئے اور یوں 2/جون 1929 کو بمبئی (ممبئی) کے بندرگاہ سے روانہ ہوئے۔ پیرس کے ڈاکٹر پروفیسر مارشل لابے نے ذیابیطس کا علاج کیا لیکن کھانے میں پرہیز نہ کرنے کی وجہ سے مرض بڑھتا گھٹتا رہا۔ بعد میں لندن میں بھی کچھ دنوں تک علاج چلتا رہا اور آخرکار 26/اگست 1928 کو آپ روبہ صحت ہوگئے اور ہندوستان واپس آگئے۔

مولانا محمد علی جوہر جب تک دہلی میں رہے ڈاکٹر انصاری آپ کے طبیب خاص تھے۔ آپ ان کی تجویز کی ہوئی دوا اور غذا کھاتے رہے اور پرہیز بھی کرتے رہے۔ لیکن ایک بار آب و ہوا کی تبدیلی کی خاطر شملہ کا سفر کیا تو وہاں طبیعت کچھ زیادہ ناساز ہوگئی۔ ایک آنکھ کی بینائی بھی جاتی رہی۔ وائسرائے لارڈ اِروِن نے اپنا طبیب خاص ان کے علاج کے لیے بھیجا جس پر مولانا کے مخالفین نے خوب واویلا مچایا جب کہ حقیقت میں لارڈ اِروِن چاہتے تھے کہ محمد علی جوہر صحت یاب ہوجائیں تاکہ گول میز کانفرنس میں شرکت کرسکیں۔ طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی تھی سو نہیں ہوئی۔ اس علالت کے باوجود مولانا نے گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے زادِ راہ تیار کرنا شروع کردیا اور بمبئی سے وائسرائے آف انڈیا کے جہاز پر اسٹریچر پر لیٹ کر لندن کی طرف روانہ ہوئے۔

جب پیرس پہنچے تو طبیعت اتنی ناساز ہو چکی تھی کہ ڈاکٹروں نے آگے کا سفر رد کرنے کا مشورہ دیا اور آرام کرنے کو کہا۔ لیکن جیسے ہی طبیعت تھوڑی سنبھلی آپ لندن کی طرف کوچ کر گئے اور وہاں جا کر صرف یہی نہیں کہ گول میز کانفرنس میں شرکت کی بلکہ ایک لمبی چوڑی تقریر بھی کر ڈالی۔ اس سے طبیعت اور نازک ہو گئی اور آخر کار 4 رجنوری 1931 کو وہ اس دار فانی کو الوداع کہہ گئے۔ لاکھوں آنکھیں نم ہو گئیں۔ ہندوستان اور دنیائے اسلام کے لیے یہ بہت بڑا سانحہ تھا۔ ہندوستان کے مختلف شہروں سے وہاں سینکڑوں تار پہنچے کہ انھیں ان کے شہر میں دفن کیا جائے۔ لیکن جیسا کہ لندن میں ان کی آخری تقریر میں اس بات کا اظہار کیا گیا تھا کہ وہ غلام ہندوستان میں مرنا نہیں چاہتے۔ وہ انگریزوں سے یا تو آزادی چاہتے تھے یا پھر قبر کے لیے دو گز زمین۔ لہٰذا 23 رجنوری 1931 کو مسجد اقصیٰ کے ایک حصے میں ان کی آخری آرام گاہ بنا دی گئی۔

مولانا کی گول میز کانفرنس کی تقریر کا خلاصہ ہندوستان کے بعض اخباروں نے چھاپا تھا جو انھیں تار سے موصول ہوا تھا۔ تقریر کچھ یوں تھی :

> ''ہم دونوں بھائی وہ پہلے دو شخص ہیں جنہیں لارڈ ریڈنگ نے جیل میں ڈال دیا تھا۔ لارڈ ریڈنگ سے مجھے انتقام لینا مقصود نہیں۔ لیکن اپنے ملک کی آزادی کا تو میں اس وقت قائل ہوں گا جب مجھے یہ اختیار حاصل ہو جائے کہ میں جب چاہوں، لارڈ ریڈنگ کو ان کے کسی جرم پر جیل بھجوا دوں۔
>
> میں درجۂ نوآبادیات کا قائل نہیں۔ میں آزادیٔ کامل کو اپنا مسلک قرار دے چکا ہوں ..... برطانیہ کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ اس نے ہندوستان کو نامرد و بزدل بنا دیا ہے۔ لیکن 33 کروڑ کی جس آبادی نے خود اپنے میں مر جانے کی ہمت پیدا کر لی ہے، اسے مار ڈالنا کچھ آسان نہیں..... اصلی مسئلہ اس وقت ہندو مسلم مفاہمت کا مسئلہ ہے۔ دونوں کو آپس میں لڑا کر حکومت کرنے کا مسئلہ اب ایک بھولا ہوا خواب ہے..... میں مریض ہوں اور اپنے بستر مرض ہی سے یہاں آیا ہوں۔ اب میں اس

وقت تک اپنے غلام ملک میں زندہ واپس نہ جاؤں گا جب تک کہ اپنے ہمراہ روح آزادی کو لے کر نہ جاؤں۔ اگر آپ نے یہ نہ دیا تو میرے لیے اپنے ہاں قبر کی جگہ دیجیے۔"

(بحوالہ محمد علی۔ ذاتی ڈائری کے چند ورق: عبدالماجد دریابادی)

علامہ اقبال نے مولانا محمد علی جوہر کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے یہ شعر کہا تھا ۔

سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت

.....

ملازمت کے دوران ہی مولانا محمد علی جوہر نے ملکی حالات پر مضامین لکھے اور اسے مختلف اخباروں میں بھیجا۔ یہ سلسلہ کافی دنوں تک چلتا رہا جس سے ان کو کافی شہرت ملی اور قلمی تعاون کے لیے مختلف اخبار و رسائل سے درخواستیں بھی آنے لگیں۔ ان کے مضامین کا وہ سلسلہ خاصا مقبول ہوا جو انھوں نے "ٹائمز آف انڈیا"، بمبئی میں "موجودہ بے چینی پر چند خیالات" (Some thought on present discontenment) کے عنوان سے لکھا۔ ان کے ذہن میں یہ بات ہمیشہ گردش کرتی رہی کہ مسلمانوں کو سیاسی مسائل سے آگاہ کرنے اور ان کی سیاسی تربیت کے لیے سب سے بہترین طریقہ اخبار نویسی ہے۔ لہٰذا اسی سوچ کے پیش نظر انھوں نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور "کامریڈ" (انگریزی) اور "ہمدرد" (اردو) کے عنوان سے دو اخبارات نکالے۔ حالانکہ محمد علی کو اخبار نکالنے یا اس کے انتظام و انصرام کا پہلے سے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ لیکن قیام لندن کے دوران مختلف اخباروں کا مطالعہ کرنا ان کا عام مشغلہ تھا۔ لہٰذا وہ صحافت کے گُر سے پوری طرح واقف تھے۔ صحافت کے متعلق ان کے خیالات کتنے درست، جامع اور واضح تھے اس کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل بیانات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے 1913 کے آس پاس گجرات میں مقیم اپنے ایک شناسا نظام الدین صاحب کو، جو خود اپنا ایک اخبار نکالنا چاہتے تھے اور محمد علی سے اس سلسلے میں مشورہ مانگا تھا، کو لکھ کر بھیجا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"اخبار کی کامیابی کے لیے اتنی باتوں کا ہونا لازمی ہے.....

1. ذاتیات سے بالکل مبرا ہو۔ نہ کسی دشمن کے خلاف کچھ لکھا جائے، نہ خواہ مخواہ دوستوں کی تعریف کے قصیدے گائے جائیں۔
2. کسی شخص یا اخبار کی رائے کے خلاف کچھ لکھنا ہو تو وہ مخالفت محض رائے تک رہے ذات کا حصہ شامل نہ ہو۔
3. جو کچھ لکھا جائے عبارت آرائی کے خیال سے نہیں نہ لوگوں کی چٹکیاں لینے کی غرض سے بلکہ متانت سے اور نہایت سنجیدگی سے۔
4. جہاں تک ممکن ہو وہی خبریں چھاپی جائیں جو انگریزی ڈیلی چھاپتے ہیں۔ اگر اس سے زیادہ کوئی لوکل یا باہر کی خبر چھاپنی ہو تو اس کے راوی کا ثقہ ہونا سب سے ضروری ہے۔
5. اخبار کا مقصد اپنی قوم کو نفع پہنچانا ہونا چاہیے نہ کہ دوسری قوم کو نقصان پہنچانا۔ اس لیے دوسروں کے رنج پر اپنے کو خوش نہ ہونا چاہیے، خصوصاً بنود پر بیجا حملہ نہ کرنا چاہیے، ان کے حملہ کا دفعیہ ضروری ہے۔
6. اخبار خبروں کا مجموعہ ہوتا ہے لہٰذا زیادہ تر خبروں کا حصہ ہونا چاہیے۔
7. مضامین میں ایک ایڈیٹوریل ہو، کسی ایسے مضمون پر جو اس زمانہ میں زیر بحث ہو اور یہ مضمون اخبار بھرنے کی غرض سے نہ لکھا گیا ہو بلکہ ایسا ہو کہ جس کا لکھا جانا نہایت ضروری تھا مضمون پولیٹیکل ہو خواہ سوشل خواہ تعلیمی خواہ تجارتی۔
8. ایڈیٹوریل نوٹ حال کے واقعات اور خبروں پر اپنی رائے زنی کے لیے ہیں اس لیے اسی کام میں آنا چاہیے۔
9. ایک مضمون کسی اور کا بھی ہونا چاہیے خواہ وہ کسی خبر کے متعلق ہو یا کسی مستقل مضمون پر۔
10. مختلف مقامات پر چند مضمون نگار دوستوں یا تنخواہ داروں کا بندوبست کرنا چاہیے جو مہینہ میں ایک مرتبہ آدھے کالم میں آسکے۔
11. خطوط وہی چھاپے جائیں جو واقعی کسی ضرورت سے لکھے گئے ہوں، نہ کہ نامہ نگاروں کی جودت طبع کے اظہار کے لیے۔
12. اخبار مذہبی بحث سے بالکل معرا و مبرا ہو۔

13. ایڈیٹر کو خود تمام مسئلوں پر غور کرنا اور دوسرے اخباروں اور کتابوں سے واقفیت حاصل کرنا لازم ہے۔ آپ کو یہ نہیں معلوم ہے کہ روزانہ اخبار کا ایڈیٹر کس قدر سخت محنت کرتا ہے، خود مجھے مصر کے متعلق کچھ لکھنا ہے، روزانہ اخبارات سے بہت سے واقعات معلوم ہوتے رہتے ہیں مگر تین چار کتابیں شروع سے آخر تک پڑھی ہیں تب جا کر ایک دو کالم کا مضمون لکھ سکوں گا، اگر قلم برداشتہ لکھنا چاہوں تو بہت آسان ہے مگر پڑھنے والے کو مشکل ہے۔''

کامریڈ مولانا محمد علی جوہر نے ''ہفتہ وار'' کی شکل میں 1911 سے کلکتے سے نکالنا شروع کیا۔ بقول خود ان کے کامریڈ کا مقصد مسلمانوں کی آواز کو حکومت تک پہنچانا ہے۔ اس اخبار کی زبان دانی کا یہ معاملہ تھا کہ انگریز تک اس پر عش عش کرتے تھے اور اس کے زیادہ تر خریدار انگریز ہی تھے۔ یہاں تک کہ وائسرائے کی بیوی تک اس اخبار کو پہنچنے میں اگر کبھی دیر ہو جاتی تو وہ بے چین ہو جاتیں اور ٹیلیفون کے ذریعے اس کی وجہ دریافت کرتیں۔ کامریڈ تین بار نکلا اور بند ہوا۔ یہ پہلی بار 14 رجنوری 1911 کو نکلا اور 4 رستمبر 1912 کو کلکتے میں ہی بند ہو گیا۔ دوسری بار یہ 12 راکتوبر 1912 سے دہلی سے نکلنا شروع ہوا اور نومبر 1914 تک نکلتا رہا۔ اس کے بعد پھر بند ہو گیا اور تیسری بار 31 راکتوبر 1924 کو نکلا اور 12 رجنوری 1926 کو آخری بار شائع ہوا۔ گویا کامریڈ کی کل مدت حیات پانچ سال تھی۔

مولانا محمد علی مزاجاً کاہل تھے۔ یعنی بعض اوقات کئی کئی دنوں تک کامریڈ کا کوئی مضمون نہ لکھتے جس سے کامریڈ میں کام کرنے والے دوسرے اصحاب ناراض ہو جاتے اور انھیں کھری کھوٹی سناتے کہ پرچہ اگر وقت پہ نہ نکلا تو لوگ کیا کہیں گے اور بدنامی الگ مول لینی پڑے گی۔ لیکن جب مولانا لکھنے بیٹھ جاتے تو ہفتوں کا کام گھنٹوں میں کر دیتے جس سے لوگوں کو کافی حیرت ہوتی۔

انہی دنوں یعنی مئی 1913 میں کانپور کا وہ واقعہ پیش آیا جس میں مسجد کے ایک حصے کو منہدم کر دیا گیا تھا۔ کامریڈ نے اس واقعے کے خلاف اپنے مضامین کے ذریعے زبردست مخالفت کی اور محمد علی جوہر نے نہ صرف کانپور کے کلکٹر بلکہ اپنے دوست اور صوبے کے حاکم اعلیٰ سر جیمس مسٹن کی بھی خوب سرزنش کی۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ 1913 میں کانپور کی میونسپلٹی کی طرف سے ایک سڑک تعمیر ہونی

تھی۔ اس سڑک کے راستے میں ایک مسجد کا کچھ حصہ آنے کی وجہ سے سڑک کی تعمیر میں تاخیر ہو رہی تھی۔ اس وقت مسجد کے جو متولی تھے انھوں نے میونسپلٹی کو اس بات کی اجازت دے دی کہ راستہ میں حائل مسجد کے غسل خانے اور پاخانہ کو ہٹا دیں۔ لہٰذا میونسپلٹی کو موقع مل گیا اور اس نے اسے گرانے کے انتظامات کرنے شروع کر دیے۔ جب لوگوں تک یہ خبر پہنچی تو انھوں نے علما اور ہندوستان کے تقریباً تمام بزرگ رہنماؤں کے ساتھ مل کر مشورہ کیا اور یہ اعلان کیا کہ یہ مسجد کسی متولی کی ذاتی جائداد نہیں ہے جس کے بارے میں وہ اس طرح کا آزادانہ فیصلہ کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ان کے فیصلے کو رد کیا جائے۔ لیکن برسر اقتدار طبقہ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا اور آخر کار انھوں نے مسجد کے اس حصے کو منہدم کر دیا۔ یہ واقعہ مسلمانوں پر بجلی کی طرح گرا۔ کانپور میں بالخصوص اور پورے ہندوستان میں بالعموم غم و غصے کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ہر جگہ انگریزوں کے خلاف جلسے جلوس ہونے لگے اور تجویزیں پاس ہونے لگیں۔ کانپور جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا وہاں کے مسلمانوں نے سر پر کفن باندھ کر مسجد کے اس منہدم حصے کو دوبارہ تعمیر کرنا شروع کر دیا۔ پولیس آئی اور مسلمانوں کو اس کام سے روکنا چاہا لیکن ناکام واپس ہوئی۔ لہٰذا فوج کو طلب کیا گیا۔ اس نے لوگوں کو مرعوب کرنا چاہا، لیکن جب اسے بھی منہ کی کھانی پڑی تو مجبوراً اس نے پہلے تو ہوائی فائر کرنا شروع کیا، اور اس کے بعد لوگوں کے اوپر گولیاں چلانی شروع کر دیں جس سے کافی مسلمان شہید ہوئے۔ اس کے باوجود ان کے عزم و استقلال میں کسی طرح کی کوئی کمی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ یہ سب کچھ دن کی روشنی میں انگریز حکومت کے حکم سے ہو رہا تھا۔ اس واقعے نے مسلمانوں کے غم و غصے میں مزید اضافہ کر دیا اور حالت نازک سے نازک تر ہوتی چلی گئی۔ لیکن صوبے کے گورنر جیمس مسٹن پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

اس سلسلے میں مولانا آزاد سبحانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا مظہر الحق اور مہاراجہ محمود آباد نے اپنے اپنے طور پر معاملے کو سلجھانے کی بھرپور کوششیں کیں لیکن مولانا محمد علی جوہر کی خدمات ان لوگوں سے کہیں زیادہ گرانقدر ہیں۔ انھوں نے پورے معاملے کو اپنے ہاتھ میں لیا اور سب سے پہلے تو خود جیمس مسٹن سے نجی طور پر خط و کتابت کی اس امید پر کہ شاید ان کے آپسی تعلقات کچھ کام آئیں گے لیکن سب کچھ بے سود۔ اس کے بعد انھوں نے ستمبر 1913 میں بمبئی

سے مسٹر میکڈانلڈ کو ایک تار بھیجا اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے وہاں کی پارلیمنٹ میں اس کے متعلق سوال کریں۔ لیکن میکڈانلڈ نے بھی اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ آخر کار مولانا محمد علی آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری وزیر حسن کو ساتھ لے کر اکتوبر 1913 میں خود انگلستان کو روانہ ہوئے تا کہ وہاں کے لوگوں کو اور وہاں کی حکومت کو پورے واقعہ کی تفصیل سنا سکیں اور ان سے انصاف کی گہار کر سکیں۔ انگلینڈ پہنچ کر محمد علی نے کافی پروپیگنڈا کیا، مضامین لکھے، تقریریں کیں، ارباب حکومت اور ممبران پارلیمنٹ اور ارکان کابینہ سے ملاقات کی اور حتی المقدور انھیں معاملے کی نزاکت کو سمجھانے کی کوشش کی۔ آخر کار ان کی کوششیں رنگ لائیں۔ سر جیمز لاڈوش، سابق گورنر صوبہ متحدہ (رکن مجلس وزیر ہند) ان کے دلائل سے کافی متاثر ہوئے اور اس طرح لندن سے اس وقت کے ہندوستانی وائسرائے لارڈ ہارڈنگ کو ہدایت بھجوائی گئی۔ لہٰذا وائسرائے صاحب خود کانپور پہنچے، اسپتال میں زخمیوں کا معائنہ کیا، قیدیوں کو پیار و محبت کی نظر سے دیکھا اور ان کی رہائی کا حکم صادر کروایا اور مسجد کی دوبارہ تعمیر کی اجازت مرحمت فرمائی۔ لہٰذا محمد علی جوہر دسمبر 1913 میں جب ہندوستان واپس لوٹے تو ان کی اس نمایاں کامیابی پر ان کا شاندار خیر مقدم کیا گیا اور سب نے ان کے عزم و استقلال کی جم کر تعریف کی۔ یہ ان کی شہرت کا ایک اہم زینہ تھا۔

دوسرا اخبار ''ہمدرد'' تھا جو اردو زبان میں نکلتا تھا۔ یہ یکم جون 1913 سے دہلی سے نکلنا شروع ہوا۔ اس سے پہلے 23 فروری 1913 سے ہی مولانا نے نقیب ''ہمدرد'' کے نام سے یہ پرچہ شروع کر دیا تھا جو صرف دو صفحے پر مشتمل ہوتا تھا۔ لیکن اس کا باقاعدہ آغاز یکم جون، 1913 سے ہوا۔ اس کے پہلے شمارے کے اداریے میں ''ہمدرد'' کا مقصد بیان کرتے ہوئے محمد علی لکھتے ہیں :

''ہمدرد گو آج اخباری دنیا میں قدم رکھتا ہے مگر سہما ہوا کہ کہیں ننگ وجود ثابت نہ ہو۔ عالم فکر سے عالم ذکر میں آتے آتے کم و بیش دو سال لگے تھے، تو عالم ذکر سے عالم عمل میں آتے آتے ایک سال سے کچھ زیادہ ہی لگ گیا۔

ہمارے اہل وطن میں چند اقوام اپنے تئیں دوبج کہتی ہیں۔ اس لیے کہ ان کا عقیدہ ہے کہ وہ ایک بار سے زیادہ جنم لیتی ہیں۔ ہمدرد کو اس سے فخر و مباہات کی اجازت نہیں ملتی، لیکن ایک

طرح وہ بھی دو بیچ ہے اور آج دوسرا جنم لیتا ہے۔ 23 فروری کو ایک ورقہ نکلا تھا، جس نے اپنے تئیں نقیب ''ہمدرد'' کہا تھا۔

جو حضرات ہمدرد کے جلوس کا تماشا دیکھنے لب بام آ گئے تھے، انھوں نے نقیب ''ہمدرد'' کی آواز بھی سنی ہوگی اور انھیں یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہمدرد کی سواری اس قدر دیر میں کیوں آئی۔

جس وقت ہمدرد کا خیال پہلے پہل ظاہر کیا گیا، ہمارے معاصرین نے اسی وقت سے ہمارا نہایت گرم جوشی سے خیر مقدم کرنا شروع کر دیا۔ اس لیے انصاف کو بھی اگر ہاتھ سے دے دیا جائے تب بھی ہماری ممنونیت ہر قدم پر ہمارا دامن پکڑے گی کہ ہم اپنی احسان مندی کا اعتراف کریں۔ ہم کو ہرگز یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ہم ایک نیا آسمان اور ایک نئی زمین تیار کرنے آئے ہیں۔

شاید بعض حضرات ہم سے یہ امید کریں کہ ہمدرد ہم سے چوکھی لڑے گا۔ مگر ہمدرد کو درس و تدریس سے تعلق ہے نہ کہ دنگل سے، ہمارا اصول تو ہوگا ؎

جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنیے
جو ناسزا کہے اس کو نہ ناسزا کہیے
رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجیے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے

ہمدرد کا فرض ہوگا کہ روز سچی خبریں سنائے۔ ان کے پوری طرح سمجھنے کے لیے جن معلومات کا مہیا کرنا ضروری ہے وہ مہیا کرے۔ رفاہ عام کی تجاویز کے حسن و قبح ناظرین کے پیش نظر رکھے اور ہر روز ان کی معلومات میں اضافہ کیا کرے تاکہ وہ خود رائے قائم کر سکیں نہ کہ اسی کی رائے کے ہمیشہ محتاج رہیں۔ مگر یہ خیال نہ کیجیے کہ ''ہمدرد'' مسجد کا ملا ہوگا اور اس زاہد خشک کی بھی وہی مثل ہوگی کہ 'ملا کی دوڑ مسجد تک'۔ تعلیم کا اصول بھی یہی ہے کہ ایک چیز کا اس قدر مطالعہ کبھی نہ کیا جائے کہ طبیعت اکتا جائے۔ 'ہمدرد' علاوہ ملک و قوم کی ملا گیری کی اپنی رنگینی طبع سے احباب کی رونق محفل بھی ہوگا، سیاسیات کی تو تو میں میں کے ساتھ ساتھ سخن کی جھنکار بھی سنائی دے گی، اقتصاد کے ساتھ مزہ مزہ کے افسانے بھی ہوں گے اور فلسفہ کی پھیکی سیٹھی کھچڑی کے لیے لطیفوں کی چٹ پٹی چٹنی بھی دسترخوان پر موجود ہوگی۔ ''ہمدرد'' آپ سے سیکھے گا اور آپ کو سکھائے گا، خود روئے گا

اور آپ کو رلائے گا اور جس طرح ساون میں کبھی کبھی پھوار کے ساتھ ساتھ دھوپ بھی ہوتی ہے اور دھنک اپنی رنگا رنگ سپہر آرائی کی جھلک دکھا جاتی ہے، ''ہمدرد'' کبھی ہنستوں کو رلائے گا اور کبھی روتوں کو ہنسائے گا۔''

محمد علی کے جیل جانے کی وجہ سے 10/اگست 1915 کو اسے بند کرنا پڑا۔ دوسری بار یہ 9/نومبر 1924 کو نکلنا شروع ہوا اور 20/مئی 1928 کو بند ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی محمد علی نے بھی اس اخبار سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ 21/مئی سے ''ہمدرد'' محمد جعفری کی زیر ادارت اور عبدالماجد دریابادی کی زیر نگرانی نکلنا شروع ہوا اور آخر کار 12/اپریل 1929 کو اس نے اپنی آخری سانس لی۔ یہ اردو کا پہلا ایسا اخبار تھا جو اس وقت کے کسی بھی انگریزی اخبار کے مقابلے میں کھڑا کیا جا سکتا تھا۔ یہ اخبار اتنا مقبول ہوا کہ اس کی تعداد اشاعت پچیس ہزار تک جا پہنچی جو اس وقت کے لیے کیا آج کے بھی کسی اردو اخبار کے لیے بہت بڑی بات ہے۔ ''ہمدرد'' اردو کا پہلا اخبار تھا، جس نے براہ راست ایسوسی ایٹیڈ پریس اور رائٹر کی خدمات حاصل کیں۔ اس کے علاوہ اس نے اردو صحافت کو لیتھو کی چھپائی سے نجات دلا کر اردو ٹائپ کی طرف متوجہ کیا۔ محمد علی جوہر اپنے اصول کے اتنے پابند تھے کہ مہاراجہ الور جنھوں نے انھیں اپنے خرچے پر علاج کے لیے یورپ بھیجا تھا بعض لوگ چاہتے تھے کہ الور کی جوبلی کے موقع پر ''ہمدرد'' کا ایک اسپیشل نمبر شائع ہوتا کہ ایک تو مہاراجہ کا احسان چکایا جا سکے اور ریاست سے اخبار کو کچھ پیسہ بھی مل سکے لیکن محمد علی نے اسے سرے سے انکار کر دیا اور اخبار کے عملے کو یہ ہدایت دے دی کہ :

> ''کہہ دیا جائے کہ ہمدرد کا اس طرح کا اسپیشل نمبر آج تک نہیں نکلا، اس لیے معذوری ہے۔ ہاں ہمدرد پریس میں اگر ضرورت ہو تو ایک پمفلٹ چھپ سکتا ہے۔''

(بحوالہ سیرت محمد علی (مرتبہ) رئیس احمد جعفری، مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی، 1932، ص 242)

اس کے علاوہ محمد علی جوہر اگر چاہتے تو ایسے سینکڑوں اشتہار اپنے اخبار میں چھاپ سکتے تھے جن سے ان کو کثیر رقم حاصل ہو جاتی لیکن انھوں نے اپنے اور اخبار کے نقصان کی کبھی پروا نہ کی اور صحافتی اصول کو سب سے اوپر رکھا۔

''ہمدرد'' کے 23 رجنوری 1928 کے شمارے میں ''میری صحافت'' کے عنوان سے اپنی صحافت کے متعلق تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''میں صحافت کو تھوڑا بہت جانتا ہوں لیکن صحافت کو میں نے کبھی بھی منتہائے نظر نہیں سمجھا۔ ملک وملت کی خدمت کا ایک ذریعہ سمجھ کر کریڈ نکالا تھا اور اسی غرض سے اب تک ہمدرد نکل رہا ہے اور خدا کرے کہ جلد پھر کریڈ بھی نکل سکے۔ اسی لیے میں صحافت میں بعض اوقات وہ طریقے استعمال کرلیا کرتا ہوں جنھیں عام طور پر بدعت سمجھا جاتا ہے۔ 1914 میں دوران جنگ عمومی میں لندن ٹائمز نے ''چوائس آف دی ٹرکس''، 'ترکوں کی پسند' کے عنوان سے ایک مقالہ افتتاحیہ شائع کیا تھا جس میں ترکوں کو اچھی خاصی دھمکی دی گئی تھی۔ میں نے جب اس مضمون کو پڑھا تو مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں ترک اس قدر تلخ وترش لہجے میں لکھے ہوئے مضمون کو پڑھ کر برطانیہ کے خلاف جنگ پر آمادہ نہ ہوجائیں اور چونکہ میں اس جنگ عمومی میں ترکوں کی شرکت کو ترکوں اور عام طور پر مسلمانوں اور بالخصوص مسلمانان ہندوستان کے لیے مضر سمجھتا تھا اس لیے میں مجبور ہوگیا کہ ایک بار پھر کوشش کروں کہ ترکوں کو اس جنگ کی شرکت سے باز رکھوں گو مجھ جیسا حقیر شخص بھلا اس کا کس طرح یقین رکھ سکتا تھا کہ میری آواز ایسے اہم معاملے میں کارگر ثابت ہوگی۔ اس سے پہلے بھی میں اور ڈاکٹر انصاری انور پاشا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں اسی غرض سے ایک تار ارسال کرچکے تھے لیکن ٹائمز کے اس مضمون کو دیکھنے کے بعد مجھے اندیشہ ہوا کہ ہماری صلح جویانہ کوشش کہیں رائگاں نہ جائے اور گو اس ہفتے کے کریڈ کے لیے میں ایک مقالہ افتتاحیہ تحریر کرچکا تھا اور پرچہ چھپنے کے لیے تیار تھا مگر اب میں اس قدر مجبور ہوگیا کہ اس مقالہ افتتاحیہ کو روک لیا اور ٹائمز کے مضمون کے عنوان ہی سے ایک اور مقالہ افتتاحیہ لکھنا شروع

کیا جس میں ترکوں سے پھر التجا کی کہ وہ اس جنگ کی آگ میں نہ کود پڑیں۔ جو کوئی اور لڑتا ہوا سے لڑنے دیں مگر اپنی قوت کو محفوظ رکھیں۔ اس کے باعث 26 ستمبر 1914 کو کریڈ اس تاریخ کے کئی دن بعد ہی نکل سکا مگر میں نے اس کی بھی پروا نہیں کی۔ میرے دفتر کے لوگ اور میرے سیکڑوں احباب اس امر سے واقف ہیں کہ میں نے یہ مضمون لگاتار چالیس گھنٹے کی محنت شاقہ برداشت کر کے لکھا اور اس تمام عرصے میں ایک منٹ بھی نہ سویا اور جب خود لکھتے لکھتے تھک جاتا تھا تو اخبار کے اسسٹنٹ منیجر دہلی کے سید شوکت صاحب کو بلا بھیجتا تھا۔ خود بولتا جاتا تھا اور ان سے لکھواتا تھا اور اس چالیس گھنٹے میں نہ صرف سونے سے محروم رہا بلکہ خوراک بھی قہوے کی چند پیالیوں سے بہ مشکل ہی بڑھنے پائے۔ اس کا نتیجہ وہ 19 کالم کا مضمون تھا جس کی پاداش میں 3 نومبر کو جس دن برطانیہ اور ترکی کے درمیان جنگ چھڑی کریڈ پریس کی ضمانت ضبط ہوئی اور کریڈ کو دس برس بند رہنا پڑا۔ اس مضمون پر انگلستان کے مشہور ہفتے وار اخبار نیو اسٹیٹسمین نے اس عنوان سے ایک مقالہ افتتاحیہ میں تبصرہ کیا کہ یہ مسلمانان ہندوستان کو وفاداری کے لیے ایک انوکھے انداز پر ترغیب دی جا رہی ہے۔ اور جب سے جنگ عمومی چھڑی تھی اس وقت سے کریڈ کے تمام پرچوں کو لفظ بہ لفظ پڑھ کر اس مضمون نگار نے میری اس طرح تعریف کی تھی اور حکومت کو اس طرح لتاڑا تھا کہ "کریڈ" کا بند کیا جانا بھی کچھ زیادہ محسوس نہ ہوا اور شوق گنہ سزا کے بعد اور بھی بڑھ گیا۔ اس تبصرے میں نیو اسٹیٹس مین کے مقالہ افتتاحیہ لکھنے والے نے میرے مضمون کی طوالت اور میرے چالیس گھنٹے کی لگاتار محنت شاقہ برداشت کر کے اسے لکھنے کی طرف بھی اشارہ کیا تھا اور ایک مشہور انگریزی صحیفہ نگار کے ایک نہایت ہی غیر معمولی طوالت والے مقالہ افتتاحیہ کا حوالہ

دے کر لکھا تھا کہ جب ان سے کہا گیا کہ آپ کا مضمون تو بے حد طویل تھا روزانہ کیا ہفتے وار اخباروں کے لیے بھی اس قدر طویل مقالات نہیں لکھے جایا کرتے تو انھوں نے کہا کہ ضرورت ہوئی تو آئندہ اس سے بھی زیادہ طویل مضمون لکھنے کے لیے تیار ہوں۔ حقیقتاً یہ تبصرہ کرنے والا برطانیہ کا ایک مشہور صحیفہ نگار میرے خیالات کو بھی خوب سمجھ گیا تھا۔ صحافت سے میری غرض صحافت نہیں ہے ملک وملت کی خدمت ہے اور اگر ایک مختصر مضمون سے صحیح طور پر ملک وملت کی رہنمائی ہو سکتی ہے تو میں وہ بھی لکھ سکتا ہوں اور لکھوں گا لیکن انیس نہیں اگر اڑتیس کالموں ہی کے مضمون سے صحیح رہنمائی ہو سکتی ہے تو میں اتنا طویل مضمون بھی لکھ سکتا ہوں اور ضرور بالضرور لکھوں گا۔ غرض ملک وملت کی خدمت ہے۔ جس طرح بہترین طریقے پر ملک وملت کی خدمت ہو سکے گی انشاء اللہ کی جائے گی۔''

'ہمدرد' کے امتیازات:

1. اعلیٰ صحافتی اصولوں کا پابند۔
2. ٹائپ مشین کے ذریعے شائع ہونے والا۔
3. ایسوسی ایٹیڈ پریس اور یونائیٹیڈ پریس کی خدمت حاصل کرنے والا۔
4. ٹیلی گرام کے ذریعے خبریں حاصل کرنے والا۔
5. روزانہ اخبار کے شائع ہونے سے پہلے پابندی کے ساتھ ایڈیٹوریل کمیٹی کی میٹنگ کا ہونا۔
6. خبر کو ذمہ داری کے ساتھ اور تصدیق ہو جانے کے بعد ہی شائع کرنا۔
7. ان ذرائع کا نام لکھنا جن سے خبر حاصل ہوئی ہے۔
8. اشتہار کا شائع نہ کرنا۔
9. چھپائی عمدہ اور دیدہ زیب ہونا۔

'ہمدرد' کے خصوصی کالم:

'ہمدرد' ایک ایسا اخبار تھا جس میں صرف ملکی و غیر ملکی خبریں ہی شائع نہیں ہوتی تھیں بلکہ یہ ایک ایسے ادارے کے طور پر بھی کام کرتا تھا جس نے سماج و معاشرے کی اصلاح کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے رکھی تھی۔ وقت و حالات کے مطابق اخبار کے مدیر نے جب جب ضرورت محسوس کی اپنے اس اخبار کو ملک و قوم کی بہترین رہنمائی کا آلہ بنایا۔ مثلاً اگر کبھی یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت یہاں کے عوام پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہی ہے تو اس کے خلاف آواز بلند کی گئی۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران جب برطانیہ اور اس کے حمایتی ممالک نے ترکی کی تقسیم کر کے اس کے حصے بخرے کر لیے، وہاں سے خلافت کا خاتمہ کر دیا گیا تو 'ہمدرد' نے مسلسل ترکیوں کی ہمدردی میں مضامین لکھے، ان کی مدد کے لیے ہندوستانیوں سے چندے جمع کیے اور اسے ان تک پہنچایا۔ اگر کبھی یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ہندوستان کی دو بڑی قومیں امن و آشتی اور اتحاد کے راستے کو چھوڑ کر منافرت کی راہ پر گامزن ہے تو انھیں ڈانٹ ڈپٹ لگائی گئی اور انھیں راہِ راست پر لانے کی کوشش کی گئی۔ ہندوستانی مسلمانوں میں اگر کسی مذہبی مسائل کے متعلق اختلافات پیدا ہوئے تو 'ہمدرد' کے ذریعے انھیں اسلامی قانون اور قرآن و حدیث کے احکامات سے مطلع کیا گیا اور ان میں اس مسئلے سے متعلق اتفاق رائے پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اسی طرح ہمارے سماج میں عورتیں بھی رہتی ہیں، لہٰذا ان کے مسائل سے متعلق بھی اکثر گفتگو کی جاتی تھی۔ گویا اس ایک اخبار کے ذریعے سماج و معاشرے کے ہر گوشے تک پہنچنے کی کوشش کی گئی۔

'ہمدرد' میں شائع ہونے والی جن سرخیوں کو ہم خصوصی کالم کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں ان میں 'اسلامی دنیا'، 'برقیات'، 'عالم نسواں'، اور 'تجاہل عامیانہ' کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان میں برقیات کو چھوڑ کر باقی تمام کالم پابندی کے ساتھ ہمیشہ نہیں چھپتے تھے بلکہ ان کی جب جب ضرورت محسوس ہوتی تھی تبھی انھیں شائع کیا جاتا تھا۔

'اسلامی دنیا' کے کالم کے تحت عام طور پر مذہب اسلام سے متعلق بحث و مباحثہ ملتا ہے، یا پھر اس کالم میں عربوں کی تاریخ یا ان کے سماجی، سیاسی، تہذیبی و ثقافتی واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر 'ہمدرد' کے 20/مئی 1914 کے شمارے میں اس کالم کے تحت جو سرخی لگائی

گئی ہے وہ ہے "شیخ سنوسی کا اعلان"۔ اس میں عربوں اور اطالیوں کے درمیان صلح کے دوران شیخ سید احمد شریف السنوسی کا عربوں کی رائے کے متعلق وہ اعلان درج ہے جو آپ نے عربوں کی طرف سے اطالیوں کے سامنے رکھے تھے۔ اس اعلان میں حمد و نعت کے بعد ان مکتوبات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اطالیوں نے موصوف کے پاس بھیجے ہیں۔ اس کے بعد قرآن و حدیث سے جہاد کے متعلق دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد شیخ سنوسی نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کے پیر و مرشد سیدی محمد مہدی نے ان کو تلقین کی ہے کہ کسی کی بات پر عمل کرنے سے پہلے یہ پرکھ لو کہ قرآن و حدیث کی رو سے وہ بات صحیح ہے۔ اس لحاظ سے اطالیوں نے جن اصول پر صلح کرنی چاہی ہے وہ شریعت کے خلاف ہے اور تمام ائمہ کے نزدیک ناجائز ہے۔ پھر صلح حدیبیہ اور صلح خندق کا واقعہ پیش کیا گیا ہے۔ پھر کہا گیا ہے کہ وہ اس وقت تک لڑتے رہیں گے جب تک دشمن ان کے وطن سے نہ چلے جائیں۔ وہ دوسروں کی سیادت قبول کرنے کو تیار نہیں، البتہ اگر کوئی حکومت سیادت کے بغیر ان کے وطن کی خدمت کرے تو اس کی اسے اجازت ہے اور ان کے تجارتی حقوق بھی انھیں تسلیم ہیں۔

'برقیات' کالم کے تحت بغیر سرخی کی غیر ملکی خبریں اختصار کے ساتھ شائع ہوتی تھیں۔ یہ وہ خبریں ہوتی تھیں جو 'ہمدرد' کو بذریعہ ٹیلی گرام یا خط کے ذریعے حاصل ہوتی تھیں لیکن 'ہمدرد' میں انھیں شائع کرتے وقت ان کے ذرائع کا نام ضرور درج ہوتا تھا، جیسے عیسائی ذرائع یا اسلامی ذرائع یا یوروپی ذرائع یا پھر ان اخبارات کا نام لکھ دیا جاتا تھا جہاں سے یہ خبریں لی گئی ہوتی تھیں۔ اس کالم کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اس میں جو بھی خبریں چھاپی جاتی تھیں وہ بڑی دیانت داری کے ساتھ شائع ہوتی تھیں۔ مولانا محمد علی جوہر نے کبھی بھی اسلامی فوج کی شکست اور یوروپی فوج کی فتح کی خبر چھاپنے میں کسی طرح کی جانبداری سے کام نہیں لیا۔

اسی طرح 'تعلیم نسواں' کالم کے تحت عورتوں کے مسائل سے متعلق خطاب ملتا ہے۔ مثال کے طور پر 'ہمدرد' میں مئی 1914 میں 'عورت اور اقتصادیات' کے عنوان کے تحت پانچ مضامین قسط وار شائع ہوئے۔ اسی طرح اس کالم کے تحت 'اقترا عیات' کے عنوان سے 15 نومبر 1913 میں مسز پنکھرسٹ کے متعلق تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ انھوں نے عورتوں کے حقوق کے لیے بہت سی

لڑائیاں لڑیں اور کئی بار جیل بھی گئیں۔ انھوں نے انگلستان میں جو تحریک چھیڑی اس سے وہاں کے وزرا کی ناک میں دم ہو گیا۔ جنگ طرابلس کے متعلق جب ان سے پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ انھیں ترکوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں ہے کیوں کہ ان لوگوں نے عورتوں کی آزادی کو مذہبی زنجیر میں باندھ رکھا ہے۔ مسز پنکھرسٹ میں شخصی آزادی موجود تھی، یعنی وہ مردوں کی محکوم نہیں تھیں، پردہ نہیں کرتی تھیں، گھر کا انتظام نہیں کرتی تھیں، رسموں کی پابندی نہیں کرتی تھیں، اپنی آئندہ زندگی کے لیے خود ہی فیصلہ کر لیتی تھیں پھر آخر کون سی آزادی تھی جس کی وہ متلاشی تھیں اور جس کے لیے وہ 'سفر بجٹ تحریک' چلا رہی تھیں۔ پھر مضمون نگار خود ہی اس کا جواب دیتا ہے۔

'تجاہل عامیانہ' ہمدرد کا مزاحیہ کالم تھا جو 'ہمدرد' کے آخری دور میں، یعنی 1924 سے شائع ہونا شروع ہوا۔ یہ 'ہمدرد' کا سب سے مقبول و معروف کالم تھا جس کا انتظار قارئین کو بڑی شدت سے رہا کرتا تھا۔ اس کالم کو لکھنے کی ذمہ داری فاروق دیوانہ گورکھپوری کے سپرد تھی۔ بقول ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی :

> ''دیوانہ گورکھپوری نے پہلے اور دوسرے دونوں ہمدرد کے ادوار میں کام کیا دوسرے دور میں چیف ایڈیٹر ہو گئے تھے۔ فاروق دیوانہ گورکھپوری 'تجاہل عامیانہ' کالم میں مستقل طور پر لکھتے تھے۔
>
> عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے کہ ملفوظات حاجی بغلول، فاروق صاحب لکھا کرتے تھے۔ بزم تجاہل عامیانہ میں حاجی بلغ العلی کا نام فاروق صاحب پر چسپاں کیا گیا تھا۔ چنانچہ حاجی صاحب کا شعر ہے ؎
>
> بلغ العلی تھا نام میرا اس کو دیکھیے
> اتنا مروڑا یاروں نے بغلول کر دیا
>
> ہمدرد کا دوسرا دور 9/نومبر 1924 سے شروع ہوتا ہے۔ فاروق صاحب ستمبر میں دہلی پہنچ گئے تھے لیکن بہت کم عرصے رہ کر واپس آ گئے۔''

(مولانا محمد علی اور جنگ آزادی: ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی، رام پور رضا لائبریری، یوپی، 1998، ص 41-140)

ذیل میں ''تجاہل عامیانہ'' کے چند اقتباسات ان کے عنوان کے ساتھ پیش کیے جاتے

ہیں تا کہ اس کی اعلیٰ ظرافت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکے:

حاجی صاحب کی آواز بازگشت

(تجاہل عامیانہ، ہمدرد، 13 نومبر 1924)

''کیا نام کہ جس زمانہ میں ہم سے اور قیصر جرمنی سے تنازعہ آراضی بمقام یورپ درپیش تھا تو ایک شخص مسمی پریسیڈنٹ ولسن عرف ڈاکٹر ولسن ساکن امریکہ نے بغیر ہمارے پوچھے سب کام بگاڑ دیا۔ کیا معنی کہ اوّل تو اس نے بہت ساری فوج بھیج دی پھر چودہ اصول بھیج دیے جن کو انگریزی فورٹین پوائنٹس کہتے ہیں۔ پھر خود چلے آئے جس سے بڑا بھاری نقصان ہو گیا اور لڑائی ختم ہو گئی۔ مگر الحمدللہ کہ صلح ہنوز جاری ہے۔ کیا معنی کہ مجلس اقوام جس کو لیگ آف نیشن بھی کہتے ہیں بدستور بجائے ہمارے کام کر رہی ہے اور ہم جہاں پہلے تھے وہیں واپس آ گئے۔ پس ثابت ہو گیا کہ زمین گول ہے اور تاریخ اپنے کو دہراتی ہے۔ کیا معنی کہ تاریخ اور جغرافیہ دونوں گول ہیں بلکہ کیا عجب ہے کہ تمام علوم گول ہیں۔ کیا نام کہ اس کی تحقیقات پروفیسر قطرب کریں گے اور ہم بالفعل ہندو مسلم فساد پر تقریر کریں گے۔ وھو ہذا

کیا نام کہ ہمارے اور لالہ خوش وقت رائے کے درمیان نہایت سخت ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ کیا معنی کہ جب ہم ہر دو افراد نے دیکھا کہ تمامی ملک بلکہ دیہات و قربات و قصبات و محلات مثلاً شہر امینھی و شہر شاہجہاں پور و شاہجہاں آباد عرف دہلی جہاں ہم مقیم ہیں و شہر الہ آباد جہاں کانگریس اور مسلم لیگ میں پہلے پہل دوستی ہوئی تھی اور پنڈت مالویہ بھی رہتے ہیں اور شہر لکھنؤ جہاں راجہ جہاد لال کا پل واقع ہے جو نواب آصف الدولہ کے وزیر تھے اور جہاں ڈاکٹر لکشمی سہائے روز شام کو لکچر دیتے ہیں اور دیگر اطراف و اکناف عالم میں ہندو مسلم فساد ہوئے اور ہو رہے ہیں اور ہوں

گے فلہٰذا مطابق رواج دیہہ واندراجات کاغذات سرکاری بندوبست حال
(کیا نام کہ بندوبست ہائے سابق میں اس رواج کا کوئی ذکر نہیں ہے)
طائعاً بلا اجبار و راضیاً بلا اکراہ بہ سقوط حواس و تعطل عقول و بتراضی طرفین بہ
معاملہ پوری کچوری و گوشت روٹی یا خود با ہندو مسلم فساد کرلیا اور دوسروں کو
بھی ترغیب دیتے ہیں کہ وہ بذریعہ اشتہار خواہ عدم اشتہار یا صرف
اخباروں میں صدائے احتجاج بلند کر کے یا گورنمنٹ سے ایک دوسرے کی
شکایت کر کے یا محض زبانی گالی گلوچ کے ذریعہ سے باہم ہندو مسلم فساد
کر سکتے ہیں اس میں کسی کو وجہ شکایت نہ ہونی چاہیے۔ اور نہ اس سے کسی
پر روزہ یا نماز یا حج یا زکوٰۃ لازم آتی ہے۔ کیا معنی کہ ہم نے بغیر کسی واقعہ
ہائلہ کے پہلے ہی سے حج کر رکھا ہے اور نماز مولانا لوگوں اور روزہ مہاتما
جی کے واسطے چھوڑ دیا ہے اور چونکہ ہم نے اپنی تمام آمدنی جنگ یورپ
میں صرف کر دی ہے پس زکوٰۃ دینا بھی ہم پر فرض نہیں ہے۔ رہا کیا نام کہ
جہاد تو آپ لوگوں کو چاہیے کہ ہندو مسلم فساد میں شریک ہو کر اور سر
پھوڑوا کر اس سے بھی سبکدوش ہو جائے۔ مثل مشہور ہے "خون لگانے
سے انسان شہیدوں میں داخل ہو جاتا ہے۔" پس ثابت ہو گیا کہ جنگ
یورپ بے نتیجہ تھی اور ہندو مسلم فساد دونوں جہاں میں فلاح و بہبود کا باعث
ہے نہیں کہتے ہیں کہ "خسر الدنیا والآخرہ۔" کیا نام کہ بہت سے لوگوں کا
تقاضا ہے کہ ہم اپنا سفرنامہ کیوں نہیں چھپواتے سو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم
نے اپنا سفرنامہ دل میں تصنیف کر لیا ہے اور ہمارا ارادہ ہے کہ بہت جلد
بطریق "خود کاشت" جس کو انگریزی میں "براڈ کاسٹ" کہتے ہیں اور
جس کے ذریعہ سے بادشاہوں اور وزیروں اور بڑے بڑے لوگوں کی
تقریروں کی لوگوں میں تحریر کی جاتی ہے اپنے تجربات کو بھی لوگوں
میں پھیلائیں بلکہ ممکن ہو تو بصورت ایمان مجمل بہ سبیل الہام سب کو علم و

یقین حاصل کرادیں تاکہ کہنے سننے یا لکھنے پڑھنے کی ضرورت باقی نہ رہے اور لوگ خود بخود ہمارے تجربات اور مشاہدات کے قائل ہو جائیں اور سمجھ لیں کہ ہم نے تمام روئے زمین کی سیر کی ہے اور دنیا کے تمام بڑے بڑے لوگوں سے ہم سے ملاقات ہے مثلاً قیصر جرمنی وزار روس اور شاہ یونان و شاہ آسٹریہ کہ سب ہمارے ساتھ لڑائی میں شریک تھے اور اب اپنا اپنا گھر چھوڑ کر ہماری تقلید میں سفر کرنے چلے گئے ہیں۔ و شاہ اٹلی و شاہ سرویا و انور پاشا جو پہلے لڑکوں کو پڑھاتے تھے۔ کیا معنی ناظم تعلیمات تھے اور اب وزیر اعظم ہو گئے ہیں اور مسٹر ریمزے میکڈونلڈ سے مباحثہ کرنے گئے تھے اور امیر فیصل جنھوں نے موصل کا قضیہ چھیڑا ہے بقول شخصیکہ "او کھلی میں سر دیا تو موسلوں کا کیا شمار"۔ و ملک الحجاز عرف شریف مکہ جو لوگوں کو حج کراتے تھے اور جن کو ابن سعود نے کہا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ اور اب وہ ہمارے ملک ہندوستان میں بمقام بدایوں تشریف لانے والے ہیں تاکہ بدایوں شریف ہو جائے۔ بقول ریاضی

بدایوں + شریف = بدایوں شریف

کیا نام کہ پھر وہ سب کو یہیں حج کرادیں گے۔ اور لوگوں کو لمبا چوڑا سفر اختیار کرنے کی ضرورت نہیں باقی رہے گی۔ پس جب ہم کو ان کو تمام لوگوں سے تقرب حاصل ہے اور ہم نے دنیا بھر کا سفر کیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم جھوٹ بولیں۔ نہیں کہتے کہ

جہاں دیدہ بسیار گوید دروغ

کیا نام کہ "ہمدرد" کا صفحہ ختم ہو گیا۔ فلہذا ہم پھر تقریر کریں گے۔ فقط

الحقیر راجی بفضل۔"

اشتہار قابل اظہار

(تجائل عارفانہ، ہمدرد، 26 نومبر 1924)

''کیا نام کہ اس کے تئیں ہم اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ آج کل ہم نے نکلنا، بیٹھنا، لکھنا پڑھنا سب چھوڑ دیا ہے۔ یعنی ہم نے ہتیا گرہ شروع کر دی ہے جس کا نمبر ستیا گرہ کے بعد آتا ہے۔ اب ہم تا صدور حکم ثانی نہ قدم اٹھائیں گے نہ قلم۔ اور آئندہ چارپائی پر لیٹے لیٹے پان کھایا کریں گے اور کبھی کبھی پیڑے بھی کھالیا کریں گے۔ کیا معنی کہ اس کی ایک وجہ یہ ہے۔ وہ ہوا۔ جو حسب ذیل درج ہے۔

ہم نے نہایت معتبر ذریعے سے اپنے دوست حاجی عبد اللہ بیابانی کی زبانی یہ خبر سنی ہے اور راست دروغ پر گردن روی۔ فلہٰذا ہم اس خبر کے ہرگز ذمہ دار نہیں ہو سکتے۔ کیوں کہ کوئی شخص جو آڈیٹر یعنی مدیر (بروزن مخبر) ہو اپنے نامہ نگاروں کی خبر کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ یہ اور بات ہے کہ بالفعل ہم کسی اخبار کے آڈیٹر یعنی مدیر نہیں ہیں اور نہ ہونا چاہتے ہیں۔ اور نہ ہو سکتے ہیں۔ کیوں کہ ہم سوائے پان کے اور کسی چیز کے عادی نہیں ہیں۔

المختصر قصہ کوتاہ۔ یعنی یہ کہ کیا نام اس کے تئیں۔ ہم نے نہایت معتبر ذریعے سے یہ خبر سنی ہے کہ آج کل اس ملک ہندوستان میں جسے زبان انگلیس یعنی صاحبان انگریز بہادرانِ عالی شان کی بولی میں ہنڈیا کہتے ہیں اور جسے پنڈت جی لوگ بھاری بُرش (یا بھارت ورش) کہنے لگے ہیں۔ ایک شخص المسمّٰے بہ سنکھ ٹن ولد سرطان اند، آ گیا ہے، اور بڑے شہروں اور منجھولے شہروں اور چھوٹے شہروں میں ہر جگہ مار کٹائی اور خون خرابے ہو رہے ہیں۔ اور باوجود اس کے کہ ہمارے دوست مہربان باپو گاندھی داس موہن چند کرم چند جی۔ نے جنھیں سب لوگ ہندوستانیوں کی حماقتوں پر ماتم کرنے کے باعث ماتما جی کہتے ہیں۔ ونیز یہ کہ وہ ایک صوفی ہیں۔ اور

ایک صوفی عطار بھی تھے۔ فلہٰذا وہ عطار بھی اور عطار کو ہمارے ہاں گندھی اور گجراتی میں گاندھی کہتے ہیں۔ اور وہ چونکہ گجراتی بھی ہیں فلہٰذا ثابت ہوا کہ وہ گاندھی بھی ہیں۔ ہاں تو کیا نام کہ اُس کے تئیں باوجود اس کے کہ ہمارے دوست مہربان باپو موہن داس جی عرف ماتما جی عرف گاندھی جی نے ایک اوپر بیس روز کا برت بھی رکھا اور ہم اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ اس عرصے میں انھوں نے کچھ نہیں کھایا جیسا کہ ہمیں اپنے دوست ڈاکٹر انصار احمد مختاری اور ڈاکٹر للہ برآمیان یعنی عبدالرحمٰن کے اُن خطوں سے معلوم ہوا جنھیں بیدین یا بکی ٹین کہتے ہیں۔ ہاں تو کیا نام کہ اُس کے تئیں باوجود اس کے کہ مشفقہ الیہ نے ایک اوپر بیس دن کا برت بھی رکھا اور ہم تصدیق کرتے ہیں کہ اس عرصے میں انھوں نے کچھ نہیں کھایا۔ اس غرض سے کہ موی الیہ کے بھوکے رہنے سے ہندوستان کے لوگ کمزور ہو جائیں۔ اور اُن میں لڑنے بھڑنے کی طاقت نہ رہے۔ لیکن اس پر بھی ہندوستان کے لوگ کمزور نہ ہوئے۔ اور اُن میں لڑنے بھڑنے کی طاقت بدستور رہ۔ اور برابر اب تک لڑے جاتے ہیں اور ہرگاہ کہ صاحبان انگریز بہادران عالی شان ہمیشہ سے یہ کہا کرتے تھے کہ ابھی ہم اس ملک سے اپنی حکومت کا ہاتھ ہٹا نہیں سکتے۔ کیا معنی کہ تم ابھی بچے ہو اور کھیلتے کھیلتے ذرا ذرا سی باتوں پر لڑنے بھڑنے لگتے ہو۔ فلہٰذا بیچ بچاؤ کے لیے ہماری موجودگی نہایت ضروری ہے۔ اور فلہٰذا ہم حکومت کا ہاتھ نہیں ہٹا سکتے۔

اس پر ہندوستان کے وہ لوگ جنھوں نے اس کتاب کو خود پڑھا یا پڑھوا کر سنا ہے جسے کیا نام کہ اُس کے تئیں ریڈر کہتے ہیں۔ اور اسی واسطے ان کا تخلص لیڈر ہوتا ہے۔ صاحبان انگریز بہادران عالی شان کو جواب دیا کرتے تھے کہ ''ہرگاہ کہ اب ہم بالغ ہو گئے ہیں اور اپنے گھر کا خود انتظام کر سکتے ہیں۔ فلہٰذا تمھاری اتالیقی کی اب ضرورت نہیں۔'' تو اب جب

کہ ہر طرف لڑائی دنگا اور شر فساد دیکھتے ہیں تو ہمیں یقین ہے کہ مشارٌ الیہم اپنے منہ پر رومال رکھ کر خوب ہنستے اور کہتے ہوں گے کہ 'ہن۔مُس ملات کی ہے!'' ہم جو بات کہا کرتے تھے وہی ٹھیک ہے۔ کیا معنی کہ ابھی ہم اس ملک سے یعنی ہندیا سے اپنی حکومت کا زور گھٹا نہیں سکتے۔ کس لیے کہ تم ابھی تک کھیلتے کھیلتے چھوٹے چھوٹے کھلونوں اور مٹھی بھر چنوں اور ریوڑیوں پر آپس میں لڑنے اور سر پھوڑنے لگتے ہو۔ فلہٰذا ثابت ہو گیا کہ تم ابھی نابالغ ہو۔ اور فلہٰذا تم ابھی اس قابل نہیں ہو کہ ہم تمھیں اکیلا چھوڑ کر چلے جائیں۔ کس لیے کہ اگر ہم چلے جائیں یا کل انتظام تمہارے ہاتھ میں دے دیں تو تم کھیلتے کھیلتے آپس میں ضرور اس بات پر لڑ پڑو گے کہ چنے یا گڑ دھانی اُس لڑکے کو دی جائے جو جانگیا پہنے ہے یا اُسے جو انگوٹی باندھے ہے۔ اور تم آپس میں خون خرابے کرو گے۔ اور ایک دوسرے کو مار ڈالو گے۔ فلہٰذا ہمارا اخلاقی فرض ہے کہ ہم یہاں سے نہ جائیں۔

چنانچہ کیا نام کہ اس کے تئیں۔ درین ولا جب ہم نے تحقیق سن لیا کہ نامبردہ یعنی سنکھ ٹن ولد سرطان اند، یہاں آ گیا ہے اور الہ آباد، بمبئی، جبل پور، دہلی اور شاہ جہاں پور، کلکتہ، کوہاٹ، گلبرگہ، لکھنؤ، لاہور، ناگپور وغیرہ وغیرہ دیگر بلاد و امصار و دیہات و قریات خرد و کلاں میں لاٹھی پاٹھی اور سنگ و تفنگ اور دیگر آلات حرب و حزب کا استعمال ہوا اور ہو رہا ہے تو ہم نے محض یہ عرض حفاظت خود اختیاری جس کا ہمیں بہ فحوائے قانون انڈل پنڈل کوٹ یعنی تاثیرات ہند پورا حق حاصل ہے۔ یہی مناسب سمجھا کہ آج کل ہم نے گھر سے باہر قدم نکالا تو ہماری شخصیت چھپ تو سکتی نہیں۔ فلہٰذا سب لوگ یعنی جمیع خرد و کلاں ہمیں فوراً پہچان لیں گے کہ ''اہا کیا نام کہ اُس کے تئیں جناب حاجی صاحب ہیں!'' اور جو کچھ آج کل خطاوار

اور بے خطا کا امتیاز اٹھ گیا ہے۔ فلہٰذا اگر کسی نے ہم پر حملہ کرنے کا ارادہ بھی کیا تو لاریب کہ ہم فوراً متوفی ہو جائیں گے۔ اور متوفی ہونے کو بالفعل ہمارا جی نہیں چاہتا کس واسطے کہ ہمارے بیدخلی کے مقدمے عدالت میں دایر ہیں۔ ونیز مزید بران ہماری طرف گنگا ورام گنگا ومہابا، و آرلی، وبھینسوڑ وسوت وجمیع دریاہائے وندی ہائے فرودگاں کے درمیان حال ہی میں طغیانی کا امتحان مقابلہ ہو چکا ہے جس میں گنگا کو اوّل درجے کا اور مہابا اور بھینسوڑ کو دوم درجے کا تمغۂ مصائب ہندل چکا ہے۔ اِن کھلاڑیوں کی بھاگ دوڑ کی وجہ سے لوگوں کے کھیتوں اور گھروں کو نقصان پہنچا ہے۔ اور چونکہ اس کا اثر ہمارے کرتے اور چوغے کی جیبوں پر بھی پڑا ہے۔ ایسی حالت میں اگر ہم بالفعل متوفی ہو جائیں تو ہمارے پس ماندگان کو غیر ضروری اخراجات کی زیر باری ہوگی۔ فلہٰذا ثابت ہوا کہ بالفعل ہم متوفی ہونا نہیں چاہتے۔ اندریں حالات ہم آج کل اپنے گھر کے اندر ہی رہنا چاہتے ہیں۔ فلہٰذا ہم نے ہتیا کرو شروع کر دی۔

اس کی دوسری وجہ کیا نام کہ اس کے تئیں یہ ہے کہ آج کل سونس پل نیاں جنھیں اخباروں کے آڈیٹر یعنی مدیر کچھ دنوں سے اپنے اپنے اخباروں میں بل دیا (بروزن چل دیا) لکھنے لگے ہیں۔ اپنے اپنے ہاں یہ مسئلہ پیش کرنے والی ہیں جیسا کہ لکھنؤ میں سنا ہے کہ پیش بھی ہو چکا ہے کہ ''مقامات تفریح مذہبی کاموں کے لیے استعمال نہ ہوں۔'' اوّل تو آج کل کے لکھے پڑھوں کے نزدیک۔ جن کا مقولہ ہے کہ ''کھاؤ پیو اور مزے کرو''، دنیا خود ہی مقام تفریح ہے۔ پھر یہ کہ دنیا کے بڑے بڑے شہر مثلاً لندھن (بروزن بندھن) اور پی رس (یعنی ہنوش آپ نیشکر) مقامات تفریح ہیں۔ پھر شہروں کی سڑکیں، باغیچے، دریاؤں کے کنارے، اشٹی سن، کلب گھر (سگ خانے)، عجائب خانے، کتب خانے سب مقامات

تفریح ہیں۔ پھر وہ اونچے اونچے لوگ جو کہ از قسم جنڈل مین (بروزن بنڈل زین) ہیں ان کے بنگلے اور کوٹھیاں اور مکانات جن کے اندر سامان تفریح مثل پیانوں (بروزن کیا خون یعنی خون کرو) اور ہرمنیا (بروزن دَر دُنیا) وغیرہ وغیرہ آلات تفریح ہوتے ہیں۔ سب کے سب مقامات تفریح ہیں۔ فلہٰذا ان میں سے کسی ایک کو بھی مذہبی کاموں کے لیے استعمال نہ کیا جاسکے گا اور چونکہ سب سے بڑا مذہبی کام نماز ہے۔ اور ہم چونکہ حاجی واقع ہوئے ہیں۔ فلہٰذا ہم نماز کے پابند ہیں۔ اور اب تک اس بات کے عادی رہے ہیں کہ ہم چاہے امین آباد کے پارک میں بیٹھے ہوں چاہے بوری بندر کے پریٹ فارم پر ٹہلتے ہوں۔ جب نماز کا وقت آیا اپنا دیسی گاڑھے کا نیلا رومال بچھا کر دس پانچ منٹ میں نماز ادا کر لیتے تھے۔ اب جب کہ ایسے ایسے احکام جاری ہو گئے تو ہم ایسا نہ کر سکیں گے۔ فلہٰذا ہم اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر ہی رہنا چاہتے ہیں کہ جب وقت آئے تو نماز تو بے کھٹکے پڑھ لیں۔ کیوں کہ یہ بات ہمیں تحقیق سے معلوم ہے کہ ہمارا گھر مونس پل ٹی کی حدود میں چاہے شامل ہو مگر مقامات تفریح کی فہرست میں ہرگز شامل نہیں ہے اور اگر مونس پل ٹی ہماری نماز بند کرے گی تو ہم اپنے یہاں سے اُسے خیر و خیرات دینا بند کر دیں گے۔"

.....

درج بالا اقتباس میں 'ستیاگرہ' کی مناسبت سے لفظ 'ہتیاگرہ' کا استعمال، 'انڈیا' کی مناسبت سے 'ہنڈیا'، 'بھارت ورش' کی مناسبت سے 'بھاری بُرش'، 'انڈین پینل کوڈ' کی مناسبت سے 'انڈل پنڈل کوٹ'، 'تعزیرات ہند' کی مناسبت سے 'تاثیرات ہند' کا برمحل استعمال اور اسی طرح 'بلدیہ' کی جگہ 'نل دیا'، 'لندن' کی جگہ 'لندھن'، 'پیرس' کی جگہ 'پی رس'، 'اسٹیشن' کی جگہ 'اشٹی سن' جیسے الفاظ کا جگہ جگہ استعمال اپنے آپ میں خود ایک مزاحیہ عنصر پیدا کرتا ہے اور قاری ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا۔ گویا کہ یہ اعلیٰ طنز و مزاح کے وہ نمونے ہیں جن سے 'ہمدرد' کے عالی مقام ہونے کا

اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اوپر کے اقتباس میں بعض الفاظ کی تشریح سے بھی بلا اختیار ہنسی آجاتی ہے، بلکہ ان الفاظ میں چھپی معنویت اور ان پر طنز، یہ دونوں چیزیں ہمارے سامنے واضح طور پر آجاتی ہیں۔ مثال کے طور پر 'کلب گھر' جس کی تشریح 'سنگ خانے' کے طور پر کی گئی ہے، 'جینفل مین' کو 'جنڈل مین (بروزن بنڈل زین)' کہا گیا ہے۔ اسی طرح 'پیانوں (بروزن کیا خون یعنی خون کرد)' اور 'ہرمنیا (بروزن دردنیا)'۔ یہ الفاظ اپنی داستان آپ بیان کر رہے ہیں۔ لہٰذا یہ تھے وہ خصوصی کالم جو اخبار 'ہمدرد' کو دوسرے ہم عصر اخباروں سے ممیز کرتے تھے۔

مولانا محمد علی جوہر کی پوری زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد جو چیز سامنے آتی ہے وہ یہ کہ مولانا کی طبیعت میں قرار نہیں تھا۔ وہ ایک اچھے شاعر بن سکتے تھے لیکن شاعری میں جس مستقل مزاجی کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان کے اندر نہیں تھی۔ اسی طرح وہ ایک بہترین ماہر تعلیم بن سکتے تھے۔ لیکن یہاں بھی ان کے قدم زیادہ دنوں تک نہیں ٹھہرے۔ ایک عظیم سیاست داں بن سکتے تھے لیکن کچھ دنوں کے بعد اس میدان کو بھی انھوں نے خیرباد کہہ دیا۔ اسی طرح صحافت کے میدان میں بھی جب انھوں نے قدم رکھا تو بڑی کامیابی ہاتھ لگی لیکن بعد میں کئی چیزوں میں ایک ساتھ مشغول رہنے کی وجہ سے اپنے اخبار کو بھی کم وقت دے پاتے تھے۔ گویا ان کی پوری زندگی اسی بے قراری کی نذر ہوگئی۔ ان تمام چیزوں کے باوجود جو کچھ اثاثہ انھوں نے اردو ادب یا صحافت میں چھوڑا وہ ہمارے لیے بیش قیمتی ہے۔

مولانا کی شاعری پر اگر نظر ڈالیں تو ہمیں کچھ ایسے اشعار ضرور مل جاتے ہیں جن کو ہم بہترین اشعار کا درجہ دے سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے یہ دو اشعار جو آج بھی زبان زد خلائق ہیں:

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

.....

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

.....

مولانا کی یہ شاعری صرف ان ہی دنوں کا نتیجہ ہے جب وہ جیل میں تھے۔ فرصت کے اوقات میں جب کہ ان پر ہر طرح کی پابندی عائد تھی لیکن ذہن و دماغ پر بھلا کون پابندی عائد کر سکتا ہے۔ لہٰذا شاعری کا یہ مختصر ذخیرہ آج ہمارے سامنے ہے۔ جیل سے باہر آنے کے بعد سیاسی ہنگامہ آرائی اور صحافت کی ذمہ داریوں نے انھیں کبھی اس کی مہلت فراہم نہیں کی کہ وہ دو گھڑی فکر شعر و سخن کر لیا کریں۔ ادبی سرمایہ کے طور پر مولانا کے چند خطوط بھی منظر عام پر آ چکے ہیں جو انھوں نے اپنے دوست و احباب کو لکھے۔ ان میں ہمیں ادبی چاشنی دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ یہ خطوط ان کی ذاتی زندگی کے عکاس ہیں۔

مولانا محمد علی جوہر کی سیاسی زندگی پر اگر ہم نظر دوڑائیں تو ہندوستانی تاریخ میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ 'خلافت تحریک' ہے۔ یہ وہ تحریک تھی جو ترکی کے مسلمانوں کی حمایت میں شروع کی گئی تھی لیکن بعد میں اس نے ہندوستانی جنگ آزادی کی شکل اختیار کر لی۔ یہی وہ پلیٹ فارم تھا جہاں سے مہاتما گاندھی نے اپنی ہندوستانی سیاست کا آغاز کیا۔ عدم تعاون اور خلافت تحریک نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کر کے انگریزوں کے خلاف لا کھڑا کیا۔ دونوں قوموں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ انگریز مخالف اقدامات اٹھانے شروع کیے تا کہ ہندوستان کو ان کی غلامی سے آزاد کرایا جا سکے۔ اس کے لیے محمد علی نے ہر طرح کی صعوبتیں برداشت کیں۔ یہاں تک کہ مرتے دم تک انگریزوں سے اس بات کے لیے لڑتے رہے کہ یا تو ملک کو آزاد کر دو یا پھر مرنے کے بعد دو گز زمین اپنے ملک میں دے دو۔ وہ کسی غلام ملک میں مرنا نہیں چاہتے تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ انھوں نے اپنا قول پورا کر کے دکھا دیا۔

سیاسی زندگی میں بہت سے ایسے موڑ بھی آئے جب انھیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ مولانا کبھی نہیں چاہتے تھے کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے کی جان کے دشمن بن جائیں۔ لیکن بدقسمتی سے انھیں ایسے دن بھی دیکھنے پڑے۔ اپنی طرف سے انھوں نے پوری کوشش کی کہ یہ دونوں قومیں دوبارہ متحد ہو جائیں اور بجائے اپنی طاقت کو ایک دوسرے کے خلاف ضائع کرنے کے اسے انگریزوں کے خلاف لگائیں۔ 'ہمدرد' کی فائلیں شاہد ہیں کہ قومی یکجہتی کے لیے مولانا نے کتنی کوششیں کیں۔ مثال کے طور پر محمد علی مسلمانوں کو ہمیشہ یہ سمجھاتے رہے کہ اگر گائے کی قربانی

دینے سے ہندوؤں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہو تو وہ اس سے گریز کریں اور گائے کے بجائے کسی دوسرے جانور کی قربانی دیں۔ اسی طرح وہ ہندوؤں کو بھی اس بات کی تلقین کرتے رہے کہ محرم کا مہینہ چونکہ مسلمانوں کے لیے ماتم وغم کا مہینہ ہوتا ہے اس لیے وہ مسلمانوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے کم از کم ان مقامات پر خوشی کا اعلانیہ اظہار کرنے سے پرہیز کریں جہاں پر مسلمانوں کا عام طور پر آنا جانا ہوتا ہے۔

محمد علی چاہتے تھے کہ دوسرے قومی رہنما بھی ان کے اس مشن میں اسی طرح کوشش کریں جیسا کہ وہ کر رہے ہیں، لیکن دوسروں سے انھیں مایوسی ہوئی۔ آخر کار وہ اس قدر مایوس ہوئے کہ کانگریس سے ہی کنارہ کشی اختیار کر لی۔ کانگریس ایک ایسی سیاسی پارٹی تھی جس پر مولانا کو بڑا اعتماد تھا لیکن بعد میں کچھ ایسے حضرات اس میں شامل ہو گئے جن کے کارنامے شک کے دائرے میں آتے تھے۔ اس طرح مولانا کا اعتماد اس پارٹی سے اٹھ گیا۔

بحیثیت صحافی مولانا نے عظیم کارنامہ انجام دیا۔ وہ اعلیٰ صحافتی اصولوں کے پابند تھے۔ ان اصولوں کو زندہ رکھنے کے لیے وہ بڑا سے بڑا مالی نقصان برداشت کرنے کو تیار رہتے تھے۔ مولانا کا یہ اصول تھا کہ کوئی بھی خبر بغیر تصدیق کے نہ چھاپی جائے۔ خبر چاہے دوست کی ہو یا دشمن کی، اسے غیر جانبداری کے ساتھ شائع کیا جائے۔ مولانا اخبار میں اشتہار چھاپنے کے سخت مخالف تھے۔ اگر وہ چاہتے تو ایسا کر کے بہت سارا پیسہ کما سکتے تھے لیکن انھوں نے مالی نفع کے بجائے اعلیٰ صحافتی اصول کو ترجیح دی۔ مولانا روزانہ شام کو تمام اسٹاف کے ساتھ میٹنگ کرتے اور اخبار سے متعلق اہم موضوعات پر ان کے ساتھ گفتگو کرتے۔ اس کے علاوہ انھوں نے خبریں حاصل کرنے کے لیے رائٹر اور ایسوسی ایٹیڈ پریس کی خدمات بھی حاصل کیں اور لیتھو کے بجائے ٹائپ کی چھپائی کو فروغ دینا چاہا لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا محمد علی جوہر نے ادب، سیاست یا صحافت میں جو کچھ بھی اثاثہ چھوڑا اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے بغیر ہندوستانی تاریخ تکمیل کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ ضرورت ہے کہ ان پر نظر ثانی کی جائے اور مولانا کو ان کا صحیح مقام عطا کیا جائے۔

اس امر کے لیے کسی شہادت کی ضرورت نہیں کہ اردو اخبارات کا ماضی نہ صرف تابناک رہا ہے بلکہ اس نے جنگ آزادی میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا ہے۔ ملک کے ہر چہار جانب سے شائع ہونے والے اردو اخبارات نے انگریز مخالفت کو اپنا ایمان سمجھ رکھا تھا اور حکومت وقت کی ہزاروں پابندیوں کے باوجود اس جنگ کے کسی بھی مرحلے میں اردو اخبارات نے اپنے ضمیر اور قلم کا سودا نہیں کیا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اردو صحافت کے وسیع تر کردار سے روشناس کرانے کے لیے ہندوستان کے مختلف شہروں (کولکاتا، سری نگر، پٹنہ، ممبئی) میں جشن صحافت کے علاوہ 'اردو صحافت کے دو سو سال' کے موضوع پر عالمی اردو کانفرنس (5 تا 7 فروری 2016) کا بھی انعقاد کیا۔ جس میں ملک و بیرون ملک کے ماہرین صحافت اور دانشوران ادب و ثقافت نے پرمغز مقالے پڑھے۔ یہ کتاب صحافت پر منعقدہ مختلف سیمیناروں میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ ہے۔

اس کتاب کے مرتب پروفیسر آفتاب کریم یوں تو اردو دنیا میں بطور فکشن کے ناقد مشہور و مقبول ہیں لیکن صحافت سے ان کو خاص شغف ہے۔ اس سے قبل انھوں نے "دہلی اردو اخبار" کو دو جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ اس کے علاوہ نامور صحافی و ادیب خواجہ احمد عباس کی کلیات پر بھی وہ بھی برسوں سے کام کر رہے ہیں جو کئی ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور منظر عام پر آیا ہی چاہتا ہے۔ ان کی تیس سے زائد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور ان میں "عجائب القصص: تنقیدی مطالعہ"، "اردو فکشن کی تنقید"، "انتظار حسین: ایک دبستان"، "قرۃ العین حیدر: ایک مطالعہ"، "جوگندر پال: فکر فن اور فنکار"۔ اردو میں پاپولر لٹریچر بے حد مقبول ہیں۔

ISBN: 978-93-5160-184-5
NCPUL New Delhi
₹ 435/- (Set)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی-33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025